# مارچ 2018ء کے شمارے کی ایک جھلک

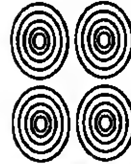
| | |
|---|---|
| تیری زلف کے سر ہونے تک | اقرأ صغیر احمد کا سلسلے وار ناول |
| شب ہجر کی پہلی بارش | نازیہ کنول نازی کا سلسلے وار ناول |
| وہ جو اک میں تھا | یاسمین نشاط کا مکمل ناول |




ڈاکٹر تنویر انور خان، تحسین انجم انصاری، قرۃ العین سکندر، صباء احمد خان
سلمٰی غزل، فرح بخاری، ثمینہ فیاض، نورعین کی خوب صورت تحریریں

**مستقل سلسلوں میں پڑھیے**

آپ کی صحت، ڈش مقابلہ، بیوٹی گائیڈ، غزلیں
نظمیں، بیاض دل، دوست کے پیغام آئے ودیگر

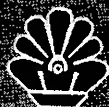


women.magazine
womenmagazine
aanchalpk.com

# نئے اُفق

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹر
رکن چیمبر آف کامرس



مدیر اعلیٰ
مشتاق احمد قریشی
مدیر
اقبال بھٹی
گروپ ایڈیٹر
طاہر احمد قریشی
تزئین
نورالدین

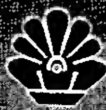


| | |
|---|---|
| پاکستان (فی پرچہ) | 50روپے |
| پاکستان (سالانہ) | 600روپے |



اشتہارات اور دیگر معلومات
0300-8264242

جلد 42
شمارہ 02
مارچ 2018



aanchalpk.com
aanchalnovel.com
naeyufaqonlinemagzine
aanchal.com.pk/blog
onlinemagazinepk.com/recipes
editorufaq@aanchal.com.pk

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

دفتر کا پتہ 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

خط وکتابت کا پتا: ماہنامہ نئے افق پوسٹ بکس نمبر 874 کراچی 74400 فون نمبرز 021-356203771/2
فیکس 021-356203773 نئے افق پبلی کیشنز ای میل Info@aanchal.com.pk

# دستک

مشتاق احمد قریشی

## لینے کے دینے پڑ گئے

گزشتہ دنوں چار یوم اسلام آباد میں گزرے، مختلف افراد سے خوب بات چیت رہی ملکی سیاسی صورت حال زیر بحث رہی کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ملک میں الیکشن نہیں ہوسکتے تمام سیاسی جماعتوں کو مولانا طاہر القادری نے اپنے گرد جمع کرلیا ہے کسی کا کہنا تھا کہ قادری صاحب بیرونی ایجنڈا لے کر آئے ہیں ملک میں ہنگامے بے چینی پھیلانے کا ٹاسک انہیں ملا ہے کچھ کا خیال تھا کہ یہ سارا ٹوپی ڈرامہ ہے ایک صاحب نے بڑے متحکم لہجے میں کہا اردو کا محاورا ہے نائی جی نائی جی میرے سر پر کتنے بال نائی بولا جوان جی ابھی سامنے آئے۔ ابھی چند دن میں قادری اتحاد کا حشر سامنے آجائے گا مختلف سمتوں میں چلنے والے کبھی ایک سمت میں نہیں چلیں گے ابھی تو ابتدائے عشق ہے آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا نوکر شاہی کے ایک ذمہ دار جنہیں پیش گوئیاں کرنا آتی ہیں مسکرا کر بولے ابھی تو مدت پوری ہونے میں کافی وقت پڑا ہے آپ بہت زبردست تماشے دیکھیں گے آپ کا کیا خیال ہے کون بازی مارے گا میں نے کندھے اچکا دیے اور پوچھا جناب مجھے اگر ایسا کچھ علم ہوتا تو آپ سے کیوں دریافت کرتا پھر تو میں آپ کو مطلع کرتا ہوں وہ بڑے متکبرانا انداز میں گویا ہوئے آپ کو اس وقت اسٹیج پر جتنے مداری نظر آرہے ہیں ان میں سے کوئی بھی نہیں آئے گا اسٹیبلشمنٹ ایک بار ن لیگ کو بھاری مینڈیٹ دے کر تماشا دیکھ چکی ہے اب کے بہت کمزور مخلوط حکومت آئے گی جس میں ہر روز جوتم پیزار ہوگی سب کی سب سیاسی جماعتیں اور مذہبی ڈرامہ باز جماعتیں جو آج ایک دوسرے کو پچھاڑنے کے دعوے کررہی ہیں کل یہ منہ کے بل گریں گی سب کے غباروں میں ہوا بھری جارہی ہے ہر کوئی یہ یقین لے بیٹھا ہے کہ اب کے اسی کا نمبر ہے وہی حکومت کا حقیقی حق دار ہے ایک بزرگ سے تربیلا میں ملاقات ہوئی ہم نے ان سے بھی وطن عزیز کے مستقبل کے بارے میں سوال کیا اور پوچھا کہ کون سی جماعت اقتدار میں آئے گی انہوں نے کوئی دو سال قبل ہمارے (مہتاب خان، نکا خان اور میرے) پوچھنے پر بتایا تھا کہ کراچی میں ہنگامہ آرائی کرنے والی جماعت کا کراچی سے قبضہ ختم ہوجائے گا لوگ منتشر ہوجائیں گے نواز شریف اقتدار میں ہونے کے باوجود ذلیل ورسوا ہوگا حکمرانی کے باوجود اس کا منہ کالا ہوگا، اس بار بھی انہوں نے بڑی مضبوط آواز میں کہا کہ بہت کچھ ہونے والا ہے کوئی بھی جماعت اقتدار میں نہیں آسکے گی رلی جولی حکمرانی ہونی ہے کوئی بڈھی (خاتون) حکمران ہوگی اور عمران خان کی زندگی کو خطرہ ہے وہ خواب ہی دیکھتا رہے گا اللہ خیر کرنے والا ہے ملک کو کچھ نہیں ہوگا لوگ آتے جاتے رہیں گے امریکا اپنے تھوکے کو چاٹے گا پاکستان موم کی ناک نہیں جس کا جی چاہے جس طرف موڑ دے اتنی بات کہہ کر انہوں نے ہاتھ اٹھا دیے رب راکھا یہ ہمیں جانے کا اشارہ تھا۔ یہ ساری گفتگو 16 جنوری کی صبح تقریباً گیارہ بجے کی ہے ہم وہاں سے اٹھ کر واپس اسلام آباد آ گئے مہتاب صاحب کے دفتر میں لاہور سے لحہ لحہ کی خبریں آرہی تھیں سترہ جنوری کو مجھے دوپہر کو کراچی کے لیے روانہ ہونا تھا اس وقت تک بہت کچھ کانوں میں پڑ چکا تھا

ہمیں بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ ایک کنٹینر کے پلیٹ فارم پر جمع ہونے والوں کی سمتیں مختلف ہیں ان کے مفادات مختلف ہیں طاہر القادری صاحب کا یہ اجتماع حکومت گرانے اور استعفیٰ لینے کے لیے جمع ہوا تھا لیکن وہاں تو معاملہ ہی الٹا ہو گیا ان کے جوشیلے مقرر استعفیٰ لینے کے بجائے استعفیٰ دینے پر اتر آئے قادری صاحب کو لینے کے دینے پڑ گئے اب دیکھنا یہ ہے کہ آگے آگے ہوتا ہے کیا۔

جوں جوں وقت گزر رہا ہے سیاسی اکابرین کی بے چینی بے یقینی بھی بڑھ رہی ہے ہاں کچھ اکابرین سیاست اقتدار ملنے اور وزیر اعظم بننے کے نشے میں چور حواس باختہ ہوتے جا رہے ہیں ادھر میاں صاحب ہاتھ سے اقتدار کی رسی چھوٹتی دیکھ کر واویلا پر اتر آئے ہیں خود اپنی حکمرانی اور اقتدار ہوتے ہوئے اپنی حکومت کے اداروں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور جو منہ میں آ رہا ہے کہتے جا رہے ہیں نتائج سے بے پروا ہو کر میدان میں حشر برپا کر رہے ہیں یوں وہ اپنی رہی سہی ساکھ بھی داؤ پر لگا رہے ہیں حالانکہ ایسے وقت میں انہیں بڑی دانش مندی ہوشیاری سے ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھنا چاہیے تھا اس کے برعکس وہ خود اپنے ہر قدم کے لیے گڑھے کھودتے چل رہے ہیں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جب سارا دھن جاتا نظر آئے تو آدھا پونا جو بچ سکتا تھا اسے بچا لیتے لیکن انہیں اپنی نا اہلی اب تک ہضم نہیں ہوئی ان کی صاحبزادی جس لائن پر چلانا چاہ رہی ہے وہ اسی پر چل رہے ہیں میاں صاحب کو سوچنا چاہیے حکمرانی اور اقتدار میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا جہاں جیسے موقع ملتا ہے اپنی چال چل جاتا ہے حالانکہ صاحبزادی بھی تلوار کی دھار پر چل رہی ہیں ہو سکتا ہے کہ نیب انہیں ہی نا اہل قرار دے دے پھر کیا ہوگا میاں صاحب اور ان کے تمام ہی حواری آنکھیں بند کر کے دوڑے جا رہے ہیں انہیں جانے کیوں یہ یقین کامل ہے کہ آنے والا وقت بھی ان کا ہے گو کہ ان میں کچھ سمجھ دار لوگ بخوبی سمجھ رہے ہیں کہ میاں صاحب کو مینڈیٹ دینے والوں کو اگر میاں صاحب مطمئن رکھ سکتے تو وہ نا اہلی کا عذاب نہ سہتے۔ اس کے باوجود میاں صاحب آنکھیں کھولنے کو تیار نہیں وہ یونہی حالت خواب میں رہنا چاہتے ہیں ہو سکتا ہے جب میاں صاحب کی آنکھیں کھلیں تو بہت دیر ہو چکی ہو ابھی وقت ہے کہ میاں صاحب اپنے اردگرد کے حصار سے باہر نکلیں اور مناسب اقدام کریں اپنے آنے والے وقت کی خرابیوں، نقصانات کا حساب کریں اور اپنی موجودہ روش کو چھوڑ کر معقول رویہ اپنائیں تاکہ انہیں بہتر حالات مل سکیں ورنہ اگر وہ یونہی اپنی انا اور ضد پر اڑے رہے تو پھر مشکل ہوگی کہ ان کی جماعت کسی بھی طرح اقتدار حاصل کر سکے میاں صاحب کو بہت سوچ سمجھ کر ایک ایک قدم اٹھانا ہوگا آج کی جگہ آنے والے وقت پر نظر رکھنا ہوگی جو ہو چکا سو ہو چکا اب جو ہونے والا ہے یا ہونے جا رہا ہے اس کا تدارک کرنا ہوگا وقت کو سمجھنا ہوگا آئینے کے سامنے کھڑے رہنے سے مشکلات آسان نہیں ہوں گی مشکلوں کو آسان بنانا ہوگا مقابلے میں مدمقابل کی چالا کیوں کو سمجھنا ہوگا ورنہ منہ کے بل گر جائیں گے اور حریف بازی لے جائیں گے اللہ تعالیٰ ہمارے سیاست دانوں کو عقل سلیم عطا فرمائے ایمانداری دیانتداری سے نوازے ہماری ہمارے وطن عزیز کی حفاظت فرمائے، آمین۔



# گفتگو

**اقبال بھٹی**

## عزیزان محترم...... سلامت باشد۔

مارچ کا نئے افق حاضر مطالعہ ہے امید ہے آپ کے ذوق مطالعہ پر پورا اترے گا۔

ہم نے فروری کے شمارہ میں محترمہ عمارہ خان کی پراسرار سلسلے وار کہانی، وہ تیس دن مارچ سے شروع کرنے کا اعلان کیا تھا لیکن بعض ٹیکنیکل وجوہات کی باعث وہ شامل اشاعت نہیں، جونہی ہمیں اس کہانی کی پانچ قسطیں موصول ہوئیں ہم قارئین کی خدمت میں پیش کردیں گے البتہ زیرنظر شمارے میں ان کی ایک مختصر کہانی شامل اشاعت ہے اس کے علاوہ انہوں نے پراسرار خوفناک نمبر کے لیے ایک ناول اپرادھی تحریر کیا ہے اس ماہ معروف صحافی اور ادیب بدر سعید کا انٹرویو شامل اشاعت ہے جو آپ کو بہت پسند آئے گا۔

نئے افق کے خوفناک ناک نمبر کی تیاریاں جاری ہیں ان شاء اللہ آپ اسے مدتوں یاد رکھیں گے ہم شکرگزار ہیں اپنے لکھاریوں کے جنہوں نے اس حوالے سے ہمارے ساتھ تعاون کیا۔

**ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم۔** مدیر محترم جناب اقبال بھٹی صاحب سلام مسنون فروری 2018ء کا نئے افق میرے ہاتھ میں ہے ٹائٹل میں ایک بہادر لڑکی دکھائی گئی ہے جو ایک اژدھام آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھی ہے یہ ٹائٹل کی انفرادیت ہے اور مصور کی بہترین کاوش ہے اس بار دستک میں جس طرح نام نہاد سپر پاور امریکا کو بے نقاب کیا ہے یہ محترم و مکرم مشتاق احمد قریشی صاحب کا بہت بڑا کارنامہ ہے امریکا اور پاکستان کی شاید اسی کیفیت کو کسی شاعر نے ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے، ہم کو ہے ان سے وفا کی امید جو نہیں جانتے وفا کیا ہے امریکا نے ہمارے ساتھ دوستی کا حق کب ادا کیا ہے اس کا جھکاؤ ہمیشہ ہمارے ازلی اور کٹر دشمن بھارت کی طرف رہا ہے اور جناب قریشی صاحب کی یہ بات سولہ آنے درست ہے کہ اس نے افغانستان میں بھارت کا عمل دخل کرا دیا ہے جس کی سرحد بھی افغانستان کے ساتھ نہیں ملتی، اب وقت آگیا ہے کہ ہمارے حکمرانوں کو دوست اور دشمن کی پہچان کر لینی چاہیے دشمنوں کو دھتکار کر اپنے مخلص دوستوں کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لینا چاہیے کاش ایسا ہو جائے گفتگو کے آغاز میں آپ نے حسب سابق جو حدیث پاک بیان کی ہے اس سے ہم سب کا بھلا ہوگا اپنی بات میں آپ نے تین سانحات کا ذکر فرمایا ہے پڑھ کر بہت دکھ ہوا رب ذوالجلال سب مرحومین کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔ اس بار آپ نے پھر مجھے کرسی صدارت پر متمکن فرمایا یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے شکریہ قبول فرمایئے، پیارے عمر فاروق ارشد بھائی رب قدوس آپ کو خوش و خرم رکھے بھائی کوشش تو کرتا ہوں کہ تبصرہ بھرپور ہو مگر حالات کو ساتھ لے کر چلنا ہوتا ہے آئندہ ان شاء اللہ بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر ہوا کروں گا آپ کا خط اور تبصرہ قابل ستائش ہے محترم ریاض بٹ صاحب خط کو پسند فرمانے پر میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کوئی چیز اگر قابل تعریف ہو تو اس کی تعریف کرنا ہم سب کا فرض ہے۔ اس بار آپ کی تفتیشی کہانی شامل اشاعت نہیں تو کام ذرا بے مزہ ہوگیا بہرحال آپ کا خط اور تبصرہ کہانی کی کمی کو کافی حد تک پورا کر گیا، محترم بشیر احمد بھٹی نے خلوص دل سے کچھ تجاویز دی ہیں جو قابل عمل ہیں۔ ان پر عمل درآمد فرمائیں، جناب ایم حسن نظامی کا خط بہت اچھا ہے نظامی بھائی تبصرہ پسند فرمانے کا شکریہ، محترم جناب محمد رفاقت صاحب کا عجلت میں لکھا ہوا خط بھی قابل تعریف ہے اللہ کرے زور قلم اور زیادہ رفاقت بھائی خط پسند فرمانے کا بہت بہت شکریہ، گفتگو کے آخر میں پرنس افضل شاہین کا خوب صورت خط ہے جو ایک جاندار قطعہ سے شروع ہوتا ہے پیارے بھائی آپ نے میری بیٹی کے نصیب اچھے ہونے کی دعا فرمائی ہے رب لم یزل آپ کی دعا کو شرف قبولیت عطا فرمائے آمین۔ اس بار گفتگو میں کل سات خطوط شامل کیے گئے ہیں کوئی مجبوری ضرور ہوگی ورنہ پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا، اقرا میں جناب طاہر قریشی صاحب اللہ تبارک و تعالیٰ کے

پیارے المصور کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔ بے شک وہ قادر مطلق ہے اس نے کائنات کی ہر چیز ایسے پیدا فرمائی جس طرح اس نے چاہا صرف انسان کے انگوٹھے کو لے لیں اس میں ان گنت ڈیزائن پیدا فرما دیے کہ کسی شخص کے انگوٹھے کا نشان کسی دوسرے شخص سے نہیں ملتا، سبحان اللہ اس شمارے میں کہانیوں کا انتخاب بہت لاجواب ہے ذوق آگہی میں بے شمار قارئین نے اپنا اپنا انتخاب خوب صورت انداز میں پیش فرمایا ہے بے شک یہ سلیکشن نئے افق کی شان ہے خوش بوئے سخن میں اس دور کے اندوہناک سانحہ زینب بی بی کی شہادت کے بارے میں نظمیں بھی شامل سلیکشن ہیں اور باقی انتخاب بھی بہت خوب ہے۔ رب کریم ہمارے اس پیارے جریدے کو ترقی کی راہوں پر اسی طرح گامزن رکھے، آمین۔

**محمد فرقان رومان...... چکوال۔** السلام علیکم سب سے پہلے تو میں یہ شیئر کرنا چاہتا ہوں کہ نئے افق خریدنے میں میں نے اس ماہ کتنی تگ و دو کی آنچل اور حجاب تو با آسانی مل گئے البتہ نئے افق 25 کو ملا سارا چکوال گھوما تب جا کر ہاتھ لگا شاید چکوال میں نئے افق کے قارئین کی قلت ہے خیر اس ماہ کا شمارہ بہت اچھا تھا ''ایک سو سولہ چاند کی راتیں'' کا خوش کن اختتام تھا، ویل ڈن عشنا کوثر سردار صاحبہ نے اس کہانی کے تانے بانے بڑی ہی چاشنی سے بنے مرشد بھی اچھا جا رہا ہے مگر دلکشی کا عنصر اس ناول میں مفقود ہے بہت بوریت ہوئی روشانے سبحین کے قلم سے ''لیکھ'' بھی فٹ رہا، تنویر خلیل کے قلم سے ''نومبر'' خاصا دلکش تھا واقعی دل کے تار چھو گیا ''ٹوٹا جو بھی تارا'' جس قدر عمدہ منظر کشی اسی قدر پلاٹ بھی اچھا تھا ثنا ناز نے واقعی کمال کر دیا میرے نزدیک کردار نگاری، مکالمہ نگاری، منظر نگاری کے لحاظ سے یہ تحریر اس شمارے کی سپرہٹ رہی، میں نے پچھلی بار بھی کہا تھا کہ فن پاروں میں پریم چند کی کہانی شامل کیا کریں حسب معمول خوش بوئے سخن اور ذوق آگہی اختصار کے سنگ چھائے رہے، بشیر احمد بھٹی صاحب کی تجاویز قابل غور و فکر تھیں ادارے کو اس کی طرف غور کرنا چاہیے۔ پرنس افضل شاہین اور ریاض بٹ صاحب کو ذوق آگہی میں میرا موضوع پسند آیا، آپ دونوں کا میں بہت بہت شکر گزار ہوں میں بھی نئے افق کے لیے ایک افسانہ لکھ رہا ہوں جلد ہی آپ پڑھیں گے دعا کیجیے گا کہ مدیر صاحب میری تحریر کو قبولیت کی سند بخشیں باقی رسالہ ابھی زیر مطالعہ ہے اگلے ماہ تک کے لیے فی امان اللہ۔

کہو وہ دشت کیسا تھا
جدھر سب کچھ لٹا آئے
جدھر آنکھیں گنوا آئے
کہا سیلاب جیسا تھا
بہت چاہا کہ بچ نکلیں
مگر سب کچھ بہا آئے

**ریاض بٹ...... حسن ابدال۔** السلام علیکم اس بار ماہ فروری 2018ء کا شمارہ حبیب لائبریری لائق علی چوک واہ کینٹ سے خریدا، ٹائٹل خوب صورت ہے اور ٹائٹل گرل بھی آج کل کے حالات کے مطابق ایک شعر نوک قلم پر آ گیا ہے تحریر کر دیتا ہوں۔

سانپ ڈس لے تو ہے تریاق کا امکان بہت
آدمی ڈس لے تو ہر سانس بکھر جاتا ہے

آج کل انسان ہی انسان کو ڈس رہا ہے اپنے پاؤ گوشت کے لیے اگلے کی بھینس ذبح کرنے کے چکر میں پڑ جاتے ہیں سب سے پہلے بات ہو جائے محترم مشتاق احمد قریشی صاحب کی تحریر دستک کی یہ بات بالکل صحیح ہے کہ یہ چراغ پھونکوں سے بجھایا نہ جائے گا امریکا کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچ رہا ہے اب پاکستان کو یہ کہہ دینا چاہیے کہ نو مور ہم پہلے ہی اتنی قربانیاں دے چکے ہیں جن کی قدر امریکا نے نہیں کی۔ اس کے بعد بوجھل دل لیے اپنی محفل میں داخل ہوئے ریاض حسین قمر بھائی آپ کو کرسی صدارت مبارک ہو، آپ کا خط ہمیشہ کی طرح خوب صورت الفاظ کا مرقع ہے میرا تبصرہ اور کہانی پسند کرنے کا بے حد شکریہ یہ سب آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے عمر فاروق ارشد بھائی کیسے ہو میں برملا کہوں گا کہ آپ کا تبصرہ خوب

صورت ہے اور لفظوں کا استعمال بھی قابل تعریف ہے میں نے آپ کی کسی بات کا برا نہیں مانا بشیر احمد بھٹی صاحب آپ کی تجاویز اچھی ہیں اور سب سے حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ اقبال بھٹی صاحب نے ان پر عمل کرنے کی کوشش کا بھی ذکر کر دیا۔ ہے ایم حسن نظامی بھائی آپ نے بھی بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضری لگوائی شکریہ، میری کہانی کو بغور پڑھنے اور پسند کرنے کا بے حد شکریہ، مہربانی، پرنس افضل شاہین آپ کا قطعہ بامعنی اور سندر ہے میرا تبصرہ پسند کرنے کا بے حد شکریہ، کہانیوں پر تبصرہ کرنے سے پہلے ذکر ہو جائے باقی سلسلوں کا ذوق آگہی میں عبدالرحمان، گل مہر، ایس حبیب خان، عبدالجبار رومی، پرنس افضل شاہین، ایم حسن نظامی کا انتخاب قابل قدر اور لاجواب ہے خوش بوئے سخن میں سب نے اچھا انتخاب بھیجا ہے اور پرچے کی زینت بنا ہے اب بات کرتے ہیں کہانیوں کی ایک سو سولہ چاند کی راتیں نے بڑے عرصے تک اپنے سحر میں جکڑے رکھا اور آخر اختتام پذیر ہوئی عشنا کوثر سردار اس خوب صورت کہانی لکھنے پر مبارکباد کی مستحق ہیں ویل ڈن مرشد بھی اچھی جا رہی ہے خلیل جبار کی کہانی دھن کی پکی ہمارے موجودہ معاشرے کی کہانی ہے اس کو پڑھ کر نائلہ جیسی لڑکیوں کو سبق حاصل کرنا چاہیے ورنہ انیس جیسے لڑکوں کی کمی نہیں ہے انیس نے جو سزا اپنے لیے تجویز کی ہے وہ بہت کم ہے۔ خدا دور نہیں اتنی خوب صورت رلا دینے والی کہانی ہے کہ جس کی جتنی داد دی جائے کم ہے مہتاب خان آپ کے لیے دل سے دعائیں نکل رہی ہیں بشیر مسیح کا کردار لافانی ہے اس نے جو دعا مانگی وہ قبول ہوگئی اور اس کہانی میں یہ سبق بھی ہے کہ اپنی بیویوں پر بے جا شک نہیں کرنا چاہیے نفیسہ سعید کی ماں جایا بھی ایک پر اثر تحریر ہے یہ بات صحیح ہے کہ قدرت کے قانون کو سمجھے بغیر آمنہ اپنی بھتیجی کو لے آئی تھی لیکن پھر حالات نے اسے جو فیصلہ کرنے پر مجبور کیا اس نے اس کی زندگی کا رخ ہی بدل دیا البتہ ایک بات آشکار ہوگئی کہ اس کا خدشہ بے بنیاد نہیں تھا یاسین صدیق کی خواب کے کیا کہنے بڑی اچھی کہانی ہے جب سنگ حوادث کی چوٹ سارے نرم و نازک آبگینوں کو کرچی کرچی کر دیتی ہے تو دل کے ساحل پر محبت کے یہی ننھے منے لمحات گھونگھے سیپیاں بن کر پڑے رہ جاتے ہیں عارف شیخ کی گھر واپسی مختصر لیکن پر اثر کہانی ہے صفدر نے جلدی کرتے کرتے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار لی، اس لیے سیانے کہتے ہیں کہ کوئی کام کرنے سے پہلے سوچ لینا چاہیے اور صبر کا دامن بھی ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہیے، جس طرح دیکھیں میں نے صبر کا دامن تھام ہوا ہے جب کافی قارئین نے مجھے فون کر کے کہا کہ اس بار آپ کی کہانی کیوں نہیں آئی، میں نے جواب دیا صبر کریں، اس بار کہانی ڈراپ کر دی گئی ہے۔

**محمد رفاقت..... واہ کینٹ۔** محترم اقبال بھٹی صاحب اور آپ کے تمام اسٹاف کو اسلام علیکم، اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے تمام ساتھیوں کو صحت مند اور خوش و خرم رکھے، آمین۔ روشن دن کی طرح جیسے چاند روشن ہوتا ہے سورج کی چمک ہوتی ہے اس ہی طرح ماہ فروری کا چمکتا دمکتا نئے افق بھی حاضر خدمت ہوا، اس وقت بے شمار مسئلے پاکستان کو درپیش ہیں اور ان ہی دنوں زینب کا کسی بھی ہر پاکستانی کے دل کو خون کے آنسو رلا گیا کسی درندگی سے یہ کام کیا گیا اس سے انسانیت بھی شرما گئی یہ شخص تو پکڑا گیا ہے مگر حیرت کی بات ہے کہ یہ شخص اس عمل کے بعد دینی محفل بھی اٹینڈ کرتا اور اس میں بھرپور شرکت کرتا تھا کیا ایسا ممکن ہے کہ محفل میں شامل ہونا اور پھر ایسے کام کرنا پورے پاکستان سے بھرپور آواز آ رہی ہے کہ اسے سزائے موت دی جائے میری بھی یہی رائے ہے کہ ایسے سزائے موت دی جائے اس طرح سے لوگوں کو اس قسم کے کاموں سے باز رکھا جا سکتا ہے اور ہمارے قانون میں بھی قتل کی سزا موت ہے ہر کوئی اپنی اپنی رائے دے رہا ہے اس نے اور بھی کئی معصوم بچیوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا اور بڑی سفاکی سے انہیں بھی قتل کر دیا ہر پاکستانی کی خواہش ہے کہ ایسے جلد سے جلد سزا دی جائے تاکہ اور لوگ اس قسم کے کام سے باز آئیں کہتے ہیں کہ انسانی قتل چھپ نہیں سکتا اور ایک نہ ایک دن ضرور سامنے آتا ہے کراچی میں پولیس مقابلے میں "نقیب" کی موت اس بات کا ثبوت ہے کہ پورے پاکستان میں اس کی گونج سنی گئی اور ابھی تفتیش سے پتا چلے گا کہ سچ کیا ہے انتظار کا قتل بھی تفتیش کے مراحل میں ہے کس کس مسئلے پر بات کریں مسئلے ہیں کہ ختم ہی نہیں ہوتے جو اچھی بات ہے کہ سب اداروں نے اپنی کارکردگی کو بہت بہتر کر لیا ہے پاک فوج نے پاکستان کی بقا کے لیے بھرپور کردار ادا کیا ہے اور بے شمار قربانیاں دی ہیں

پاکستانی قوم ان کی ان قربانیوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہیں اور پوری قوم ان کو سلام پیش کرتی ہے مسائل تو بہت ہیں لکھیں تو صفحے کے صفحے بھر جائیں آتے ہیں اپنے پیارے رسالے کی طرف تو جناب سب سے پہلے ان خطوں کا ذکر جس سے یہ سالہ موتیوں کی طرح جگ مگ کررہا ہے ریاض حسین قمر صاحب پہلے نمبر پر آئے ہیں اتنا اچھا خط پہلے نمبر پر ہی ہونا چاہیے تھا میرے خط کو پسند کرنے کا شکریہ، ریاض بٹ صاحب، ایم حسن نظامی صاحب اور پرنس افضل شاہین نے بھی میرے خط کو پسند کیا میں ان سب بھائیوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں اس دفعہ بھی پہلے کی طرح آپ کے خط بہت خوب تھے خط لکھنے والوں کی تعداد کچھ کم لگتی ہے یا مصروفیت کی بنا پر حاضری نہیں دے سکے ادارے سے گزارش ہے کہ کچھ صفحات کا اضافہ کردیں کہانیاں جو اس رسالے کی جان ہیں جس کی وجہ سے اس رسالے کی مقبولیت بھی اپنی جگہ برقرار ہے، ہمیشہ کی طرح زرین قمر نے گمشدہ میں بھی اپنے قلم کا لوہا منوایا ہے ویل ڈن، دوسری کہانیوں میں تحلیل جبار کی دھن کی پکی مہتاب خان کی خدا دور نہیں تنویر غلیل کی نومبر نفیسہ سعید کی ماں جایا یاسین صدیق کی خواب، عارف شیخ کی گھر واپسی چھوٹی کہانی مگر دل میں اتر گئی وسیم بن اشرف کی آنچ، روشانے سبعین کی لیکھ، ثنا ناز کی ٹوٹا جو بھی تارا بلال شیخ کی اقتدار سلسلے وار ایک سو سولہ چاند کی راتیں مکمل ہوگئی اور اسی طرح مرشد تیزی سے اپنا سفر طے کررہی ہے اور بہت اچھی جارہی ہے۔ فن پارے بھی بہت خوب تھے، مکمل نہیں پڑھ سکا۔ مشتاق احمد قریشی کی دستک میں امریکا کے بارے میں ان کے خیالات کا پتا چلتا ہے امریکا کا شروع سے ہی ایسا کردار رہا ہے اس نے ہمیشہ مسلمانوں کے دشمنوں کو طاقت ور کیا اور ان کی مدد کی امریکا کی دشمنی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہمیں آنکھیں اور کان کھلے رکھنا ہیں گفتگو میں اقبال بھٹی صاحب نے سچی کہانیوں کے مدیر بھائی ناصر رضا، نئے افق کے ایجنٹ شیخ عمر اور محترم لکھاری شہباز اکبر الفت صاحب کی والدہ ماجدہ کے انتقال کی خبر دی اللہ تعالیٰ ان سب کو جنت الفردوس میں جگہ دے آمین، اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، خوش بوئے سخن میں اچھی غزلیں پڑھنے کو ملیں کامران مغل، گوہر فرید، عاصم تنہا، جاناں ملک، کومل جوئیہ، مبشر سعید، ریاض حسین قمر، فریدہ فری، رابعہ افضل، حائبہ اور ظریف احسن کی غزلیں تعریف کے قابل ہیں۔ اجازت چاہوں گا ان شاء اللہ زندگی نے ساتھ دیا تو اگلے ماہ حاضری دوں گا۔ اللہ حافظ۔

**پرنس افضل شاہین...... بہاولنگر۔** اس بار فروری کا نئے افق دلکش سرورق سے سجا میرے ہاتھوں میں ہے جس میں ایک خوب صورت حسینہ سانپ اور درخت کو پکڑے کھڑی ہے ہمیں ایسا لگا

لوٹ کچھ ایسی مچی تھی دن دیہاڑے شہر میں  
کل سپیروں سے بھی سانپوں کے پٹارے چھن گئے  
لٹ گئے بازار میں میرے بھی سب پتھر کے چاند  
اس کے ہاتھوں سے بھی مٹی کے ستارے چھن گئے

آگے بڑھے تو دستک میں انکل جی پاک فوج کو سنہرے الفاظ میں خراج تحسین پیش کررہے تھے جی ہاں انکل جی ہماری پاک فوج سینہ سپر ہوکر اپنے ملک کی سرحدوں کی حفاظت کررہی ہے جو کام صدر اور وزیراعظم کو کرنا چاہیے وہ کام بھی آرمی چیف کررہے ہیں اور دشمن کو منہ توڑ جواب دے رہے ہیں ہمارے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر ہمارا بچپن کا ساتھی چین ہمارے ساتھ کھڑا ہے یاد رہے، مستقبل کا سپر پاور صرف اور صرف چین ہوگا گفتگو میں آپ نے تین افسوس ناک خبریں سنائیں جن میں بھائی ناصر رضا، شیخ عمر دین اور تیسری شہباز اکبر الفت کی والدہ کا بتایا کہ وہ وفات پاچکے ہیں ہم بھی ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان تینوں کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل دے آمین، عشنا کوثر سردار کی ایک سو سولہ چاند کی راتیں کا اختتام شاندار انداز میں ہوا آپ نے کہا ہے کہ آئندہ ماہ سے عمارہ خان کی سلسلہ وار کہانی وہ تیس دن کے نام سے شروع ہورہی ہے ریاض حسین قمر میرا خط شعر پسند کرنے کا شکریہ، عمر فاروق ارشد آپ نے سرورق کی خوب منظرکشی کی ریاض بٹ میرا شعر پسند کرنے کا شکریہ اس بار مجھے نئے افق پچیس تاریخ کو ملا اور ستائیس کو خط ارسال کررہا ہوں جاوید احمد صدیقی کی حاضری ہمیں بھی پسند آئی بشیر احمد بھٹی

مشوروں کی بوری لیے حاضر ہوئے دیکھتے ہیں آپ کے کن کن مشوروں پر عمل ہوتا ہے ایم حسن نظامی میرا خط پسند فرمانے کا شکریہ محمد رفاقت میرا خط پسند فرمانے کا شکریہ عبدالجبار رومی میں نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ آپ کا قطعہ بھی شاندار ہوتا ہے لیکن وہ تحریر اس طرح شائع ہوئی کہ آپ کا ہی شاندار تھا بہر حال ہمیں نئے افق کے سارے اسٹاف اور اس کے پڑھنے والوں اور اس میں لکھنے والوں سے بہت پیار ہے ہماری پیاری آپی اور معروف شاعرہ فریدہ جاوید فری سخت بیمار ہیں میں نئے افق کے تمام پڑھنے والوں سے گزارش کروں گا کہ وہ دعا کریں کہ ہمارے فری آپی مکمل صحت یاب ہو جائیں آمین (اللہ تعالیٰ فریدہ جاوید فری کو صحت کاملہ عطا کرے) وہ کہتے ہیں نا اپنے آپ کو زیر تجویز برنہ سمجھو کیونکہ آپ کو پیش بھی ہونا ہے۔

**بشیر احمد بھٹی...... بھاولپور۔** جناب محترم مدیر صاحب نئے افق السلام علیکم فروری 2018ء کے شمارے میں آپ نے یہ جواب عطا فرمائے کہ تجاویز پر عملی کوشش کی جائے گی میری حوصلہ افزائی کر کے خوش کر دیا ہے جناب محترم ابن صفی کے ناول اگر کتابچے کی صورت میں قارئین کو ملتے رہے تو ماضی کی ایک خوشگوار یاد تازہ ہو جائے گی گویا ناول ملنے پر ماضی کی جھلک نمایاں ہوگی اب ان ناولوں کو نئی نسل پڑھے گی تو اچھا مواد ملنے پر مطالعے کا ذوق شوق بیدار ہوگا نئے افق کی صورت میں ابن صفی صاحب کی نشانی پا کر خوشی ہوتی ہے نیا رخ تو خیر کب کا بند ہو چکا ہے وہ شمارہ بھی یادوں کا مرہون منت تھا اب اگر ابن صفی کے ناول ہمیں نئے افق کے ساتھ کتابچے کی صورت میں ملتے رہیں گے تو یہ ہمارے لیے بھرپور گفٹ حاصل کرنے کا سنہری موقع ہوگا ناول اگر طویل ہو تو آپ اسے تین چار قسطوں میں کتابچوں کی صورت میں شائع کریں پہلی قسط کا پہلا کتابچہ ایسے موڑ پر ختم ہو کہ دوسری قسط یعنی دوسرے کتابچے کا شدت سے قارئین انتظار کریں جونہی اگلے ماہ کا نئے افق مارکیٹ میں آئے گا ناول کا دوسرا کتابچہ یعنی قسط نمبر 2 پڑھنے کے لیے نئے افق ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگا اس طرح ایک طویل ناول چار یا پانچ کتابچوں کی صورت میں قسط کی صورت میں نئے افق کے اگلے پانچ ماہ کے پانچ شمارے قارئین کے لیے حاصل کرنا ضروری ہو جائیں گے یوں ابن صفی صاحب کے طویل ناول قسطوں کی صورت میں ہر ماہ کتابچہ حاصل کرنے پر ایک ریکارڈ کی صورت میں قارئین دوبارہ پالیں گے۔ اس بار نئے افق کا ٹائٹل جادوئی ہے یعنی شہزادی اور اژدھا اس ماہ کے آنے والے شمارے میں بلاشک آپ ایک صفحے کا اشتہار دے کر کوپن کے ذریعے قارئین سے ووٹ حاصل کر کے دیکھ لیں اشتہار کا مضمون کچھ اس طرح ہو کہ ہم قارئین کو ابن صفی صاحب کے ناول کتابچے کی صورت میں ہر شمارے کے ساتھ بطور گفٹ دینا چاہتے ہیں قارئین اپنے ہاں والے خانے کو ٹک کر کے اپنی رائے کا اظہار کریں فوری رزلٹ کے طور پر آپ کو تمام قارئین ٹیس میں جواب دے کر اپنی رائے کا اظہار کریں گے۔ شکریہ

(بھٹی صاحب آپ کی تجویز اچھی ہم بھی یہ چاہتے ہیں لیکن کچھ وجوہات کے باعث اس تجویز پر عمل ہمارے لیے ممکن نہیں اس لیے معذرت)

**ایم حسن نظامی...... قبولہ شریف۔** سب سے پہلے نئے افق کے پروانوں کو ایم حسن نظامی کا خلوص و محبت بھرا اسلام قبول ہو شدت کی سردی میں ٹھٹھرتے موسم میں اپنا نئے افق جلوہ گر ہوا ٹائٹل سے حرف آخر تک بے حد محنتوں اور آپ کی بیکراں کوششوں سے سجا پایا سبھی لکھاری دوستوں نے بھی اپنے اپنے جذبات و احساسات کے فن کا جادو جگاتے ہوئے اچھا معیاری اور موثر مواد فراہم کرتے ہوئے اپنی اپنی موجودگی ظاہر کی اور اسے نئے افق کی بلندیوں پر چمکتا تارہ بنا دیا، دستک میں مشتاق احمد قریشی صاحب پاکستان کی سلامتی اور بقا پر اپنی خوب صورت اور موثر سوچ کا جادو جگا رہے تھے۔ گفتگو میں چند مخصوص سے چہرے محو گفتگو پائے حالانکہ پرچہ پڑھنے والوں کی تعداد لاکھوں نہیں کروڑوں کی بنتی ہے اور پرچہ سبھی کے حال احوال اور دکھ سکھ شیئر کرنے کی انجمن ہے اگر چند قارئین بھی تحریروں پر اپنے تاثرات رقم کریں تو اس کا نکھار اور خوب صورتی دوچند ہو جائے گی بہر حال ریاض حسین قمر، عمر فاروق ارشد، ریاض بٹ، بشیر احمد بھٹی، محمد رفاقت اور پرنس افضل شاہین سبھی عمدہ اور معیاری گفتگو میں رونما ہوئے میری طرف سے سبھی کو یاد رکھنے کا شکریہ، ساتھیو

آپ ہی کی فرمائش پر جلد ہی انہی اوراق میں میری تحریر آپ کو پڑھنے کے لیے ضرور ملے گی انتظار فرمایئے۔ طاہر قریشی صاحب خداوند تعالیٰ کی واحدانیت (المصور) کے خوب صورت اور پرمعنی نام سے بیان فرمارہے تھے انہوں نے اس کی تشریح اچھے انداز سے ادا کی اور آخر میں ہمیں اس کے فضائل سے فیضیاب کیا۔ پرچے کی پہلی تحریر زریں قمر صاحبہ نے گمشدہ اپنے منفرد انداز سے رقم کی انہوں نے انگریزی کہانی کو اردو کے خوب صورت قالب میں ڈھالا اور ہولی، بازیاب ہوئی دھن عمی کی پکی خلیل جبار کا انداز تحریر بہت پسند آیا انہوں نے کورٹ ڈائری کے حوالے سے اپنی تفتیش مکمل کی۔ مہتاب خان کی تحریر موثر اور پرمعنی پائی بشیر جیسے انسان بلاشبہ جس مذہب سے بھی ہوں قابل تعریف اور قابل فخر ہیں اور ہمارے معاشرے کو ایسے جفاکش افراد کی اشد ضرورت ہے جو اپنی جانوں پر کھیل کر ہماری عبادت گاہیں اور عوام کی حفاظت کرسکیں۔ عشنا کوثر سردار کی آخرالوداعی کڑی بے پناہ محبتیں سمیٹ کر منزل پر گامزن ہوئی تیمور اور عین سرخرو ہوئے (ویلڈن جی) نومبر تنویر خلیل کی کوشش محبت کرنے والوں کے لیے ایک سلگتی سی تحریر پائی عارف شیخ اور نفیسہ سعید نے بھی عمدہ لکھا، یاسین صدیق نے خوابوں کے حوالے سے اپنی تحقیق کی اور جاگتی آنکھوں کی تحریر منفرد ٹھہری، آنچ اور لیکھ بھی ایک دوسرے کے مقابل ٹھہریں، ٹوٹا جو بھی تارا شانا ناز نے اپنے انداز تحریر میں خوب صورت اور منفرد الفاظ کا جادو جگا کر حیران کردیا۔ بلال شیخ عمدہ کہانی نویسی میں انہوں نے سیاسی حالات کو منفرد زاویوں سے اجاگر کیا ویل ڈن، فن پارے میں سبھی احباب کی انٹری اچھی رہی، ذوق آگہی کی خوب صورت تحریروں نے پرچے میں نئی روح پھونک دی خوب سخن کو نوشین اقبال نوشی نے اچھا ترتیب دیا، مرشد کی آٹھویں کڑی انمول سوچ پر عبارت پائی۔ کترنیں اور اقتباسات پسند آئے ریاض حسین تبسم کی خودداری اچھی رہی، اب اگلے ماہ تک اجازت سبھی خوش رہے اور ایک دوسرے میں خوشیاں بانٹیں، اللہ بیلی۔

**عبدالجبار رومی انصاری...... قصور سٹی۔**

اژدھے سے جو ہم کلام ہے
وہ دوشیزہ ہے یا روپ ناگن کا
دیو مالائی سین ہے سبز پیرہن میں
کیا خوب انداز صنف نازک کا

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا دستک میں مشتاق احمد قریشی کی تحریر زبردست تھی حالات حاضرہ پر کھل کر لکھا اور بہت زیادہ اچھا لگا گفتگو میں محترم اقبال بھٹی صاحب نے لکھاریوں کے لیے جو طریقہ بتایا اس پر عمل کریں تو شکایت کا موقع بھی نہیں ملے گا ویسے بھی اچھی اور قابل اشاعت کہانیاں باری آنے پر شائع ہوجاتی ہیں باقی لکھنے والے کے لیے انتظار تھوڑا جانکسل ہی ہوتا ہے محفل صدارت ریاض حسین قمر کے حصہ میں آئی جنہوں نے بہت اچھا تبصرہ کیا اور میری قطعہ لکھنے کی روایت کو بھی سراہا بہت اچھا لگا اور بہت شکریہ، ذرا ذرا سی آہٹ پہ دل دھڑکتا ہے اور ان دنوں جیسی سردی پڑ رہی ہے کچھ ایسا ہی حال ہے۔ جی عمر فاروق ارشد صاحب آپ نے بجا کہا ہے اور آپ کا تبصرہ بھی عمدہ رہا ریاض بٹ کا خط بھی بے حد پیار سے لکھا ہوا بہت عمدہ پایا کیا بات ہے، جی آپ کی اب کوئی کہانی نظر نہیں آرہی ہے ہم تبصرہ نگاروں میں جو کہانی کار ہیں ان کی کہانی تو ہم ضرور ہی پڑھتے ہیں محترم بشیر احمد بھٹی کی تجاویز تو بہت اچھی ہیں ادارے کو اس پر ضرور سوچنا چاہیے بلکہ ہوسکے تو عمل بھی کرنا چاہیے ایم حسن نظامی اور محمد رفاقت کے تبصرے بھی اچھے تھے اور تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ، پرنس افضل شاہین کا قطعہ اور تبصرہ دونوں ہی زبردست رہے اور میری حوصلہ افزائی کا بھی بہت بہت شکریہ۔ ہمارے سیکھنے کے لیے اقرأ ایسا خوب صورت سلسلہ اللہ کے مبارک ناموں کی تعریف و تشریح سے دلوں کو منور کررہا ہے جیسا کہ المصور بہت خوب صورت نام ہے صورت گری کرنے والا، چلو بانٹ لیں ایک سو سولہ چاند کی راتیں عین نے جس کے لیے سفر کیا تھا اسی حیدر میاں نے پاکیزہ عین پر کیچڑ اچھال دیا اور اس دوران تیمور جس نے عین کے ساتھ سفر کیا تھا اور گا ہے بگاہے اس کی حفاظت کی تھی، وہی عین کی زندگی کا ہمسفر قرار پایا کیونکہ دونوں ہی پاک سرزمین کی چاہ دل میں رکھتے تھے۔ سو پاک سرزمین نے انہیں ایک کردیا عشنا کوثر سردار نے 47ء کے پس منظر میں محبتوں سے گندھی بہت عمدہ تحریر دی

جو ہمیشہ یاد رہے گی اتنی اچھی تحریر پر آپ مبارکباد کی مستحق ہیں دھن کی پکی نائلہ نے تو محبت سے مجبور ہو کر جان دے دی لیکن انیس کا یہ کہنا کہ وہ خود کو سزا دے گا اور عمر بھر شادی نہیں کرے گا جھوٹ اور غلط ہے کیونکہ ایسا کرنے سے نائلہ کی روح کو تو قرار نہیں آنے والا ایک اور زندہ انسان کہاں تک اپنے اوپر جبر مسلط کر سکتا ہے اور وہ بھی انیس جیسا بھنورا جو دوسروں کی قیمتی جان لے سکتا ہے تو پھر وہ اپنی جان کو بے وقعت جانے کیونکہ مکافات عمل اس کو بھی اپنی لپیٹ میں ضرور لیں گے اور ایسا ہی کچھ ہوا اقتدار کے بھوکے ملک طلال کے ساتھ آخر وہ بھی ہلاک ہوا سیاست پر مبنی اقتدار ٹھیک رہی گھر واپسی میں ابراہیم معصوم صفدر کے لیے کچھ اچھا کرنا چاہتا تھا لیکن دوسری طرف صفدر شیطان کے بہکاوے میں آ کر اپنے لیے گڑھا کھود رہا تھا محبت و نفرت کی کشمکش دونوں کو لے ڈوبی ایک سچائی پر اپنی جان دے گیا تو دوسرا جھوٹ کی ابتدا لے کر جان لے کر جیل چلا گیا گھر واپسی مختصر اور عمدہ تحریر تھی آنچ میں صفدر نے راحیلہ کو اپنانے اور انتقام لینے کے لیے اس کے گھر کو برباد کرنے کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن بعد ازاں اس کی مراد بھی برآئی راحیلہ اس کی ہو گئی تو اس نے اس کے گھرانے کو پھر سے کھڑا کیا اور اپنے کیے کا بھرپور مداوا بھی ادا کیا آخر میں راحیلہ نے صفدر کو آنچ دی تو وہ اس میں پھر سرخرو ہوا اور جان جانے سے بچ گئی راحیلہ بھی سمجھ گئی اور وہ پھر سے ایک ہو گئے آنچ زبردست رہی دشمنوں نے حجاب کو اٹھایا تو مرشد خود بخود اٹھتا چلا گیا ڈری سہمی حجاب کو بھی اس کی مدد کرنا اچھا لگا لیکن وہ ابھی تک دشمنوں کے نرغے میں ہی ہیں دیکھیں اب کون سی غیبی مدد سے مرشد اور حجاب ان کا گھیرا توڑ کر نکلتے ہیں اسٹوری زبردست ہے اب مرشد کی فائٹ دیکھنے والی ہے خواب تو خواب ہی ہوتا ہے اب اس کی اصل تعبیر ملے یا متبادل تو انسان کو بھی چاہیے وہ شکر کرے اب خرم شہزاد کے لیے کلثوم نہ سہی بشریٰ ہی سہی وہ بھی تو بہت محبت کرنے والی ملی ناہاں یہ ضرور ہے کہ پہلی بھرپور محبت کی کسک دل میں کہیں نہ کہیں ضرور رہتی ہے خواب عمدہ کہانی جو 15,20 سال پہلے ہر نوجوان لڑکے لڑکیوں کی لو اسٹوریوں سے مطابقت رکھتی ہے ذوق آگہی سے گل مہر، مدیحہ شبیر اور تنویر جمال کے مراسلے اچھے لگے جبکہ خوشبوئے سخن سے کامران مغل، جاناں ملک اور رابعہ افضل کا کلام عمدہ رہا۔ والسلام۔

**فریدہ فری...... لاہور۔** محترم ایڈیٹر صاحب، السلام علیکم میں نئے افق کی بہت ہی پرانی قاری ہوں بس اس میں کبھی لکھا نہیں ایک دو مرتبہ میری شاعری شائع ہوئی ہے اس مرتبہ تبصرہ بھیج رہی ہوں، ریاض بٹ صاحب اور ایم حسن نظامی ان کی تحریریں تو میں اور میگزین میں بھی پڑھتی ہوں نئے افق میرا فیورٹ میگزین ہے اس کی تحریریں بے حد معیاری ہوتی ہیں میرے بھائی پرنس افضل شاہین بھی اس میں لکھتے ہیں ریاض حسین قمر صاحب بھی بے حد اچھا لکھتے ہیں ان کی تحریر بھی پڑھی ہیں۔ دھن کی پکی، گھر واپسی، ٹوٹا جو بھی تارا شانا ناز نے بے حد اچھا لکھا، ماں جایا، خدا دور نہیں، نومبر، ذوق آگہی میں سب نے اچھا لکھا شاعری سب کی بہترین لگی سپاس گل، نوشین اقبال نوشی اور سب کو بے حد دعا اور سلام، مشتاق احمد قریشی صاحب، طاہر احمد قریشی صاحب کو بے حد سلام۔

**اقرأ جٹ...... منچن آباد۔** اہل پاک پر سلامتی ہو اہل سلام پر سلامتی ہو نئے افق کے تمام اسٹاف کو میرا سلام قبول ہو، بڑے شوق و ذوق سے تیری محفل میں آئے ہیں نئے افق پر تو اب تیری ہی مرضی ہے تو جگہ دے نہ دے، فروری کا جریدہ سر سبز پاکستان کا ہمرنگ ہمارے بھتیجے کی نظر حسین پیکر کے ساتھ پرنٹ ہو گئی (ہائے پھوپھو جانی کتنے پیارے ہاتھ ہیں فنگرز کتنی لمبی لمبی ہیں) اور ہم نے لاڈ سے کہا ڈیئر بھتیجا تم ڈریگن جیسے ہو مہکے جلترنگ قہقہے گونجے سرورق کی ٹینش بہت زبردست لگ رہا تھا بسم اللہ پڑھ کر آغاز کیا ابتداء آنچل و حجاب نئے افق جہاں بھی ملے پڑھ لیتے ہیں دستک لاجواب سلسلہ ہے انکل مشتاق احمد قریشی کی باتیں باکمال ہوتی ہیں اللہ پاک ہمارے پاکستان میں امن و امان عطا فرمائے اور پیاری دھرتی کی حفاظت فرمائے آمین۔

اے پاک وطن
اے سوہنے چمن
توں قائم و دائم رہے

شاداب و آباد رہے
تیری ہی شان کے دم سے
ہم سب کی عزت ہے



گفتگو بہت اچھا سلسلہ ہے تمام تبصرے جاندار تھے ایک صاحب بشیر احمد بھٹی نے جو پہلا مشورہ دیا ہمیں بھی بہت بھلا لگا ہر طرح پڑھتے ہیں سوچا اس دفعہ انٹری مار کر ہم بھی اپنی رائے شریف سے نوازیں ہمیں ویلکم تو کریں اتنی دیر سے تشریف کا ٹوکرا اٹھائے کھڑے ہیں اب تو بہت تھک چکے ہیں ہاہاہاہاہا۔ اقرأ یہ سلسلہ ہمیں دل و جان سے پسند ہے سبحان اللہ انکل طاہر قریشی نے بہت تفصیل و جامع بتایا۔ گمشدہ زریں قمر جی چھائی رہیں دھن کی پکی خلیل جبار لاجواب خدا دور نہیں مہتاب خان ونڈرفل نومبر میرا فیورٹ ملتھ تنویر خلیل کمال کر دیا ماں جایا نفیسہ سعید ہمیشہ کی طرح چھائی رہیں خواب یاسین صدیق بے حد شاندار گھر واپسی، آنچ زبردست لیکھ، ٹوٹا جو کبھی تارا، اقتدار کمال کی تحریریں رقم تھیں خودداری سپر رہی فن پارے پہلی چوری، عالیہ توصیف (لاجواب) میں ٹوٹ کر رو دیا، نورین مسکان سرور (بے مثال، ہمیں بھی رلا دیا) پاداش، حمیرا افضا (ایکسیلنٹ) میری جنت سحرش علی نقوی (نائس، زبردست پوائنٹ سامنے لایا) پھر حوصلہ ٹوٹا پھر میدان سجا، فرحین ناز طارق (ونڈرفل، ہمت اور حوصلہ دونوں ہمیں چاہیے ہوتے ہیں زندگی کا سفر ہو یا کھیل کا میدان) کوکھ عابدہ احمد عالی (سبق آموز) خوش نما عمارہ جے ملک (اولاد کی بے حسی، ہماری دنیا کی سچائی، زبردست) مرشد بہترین جا رہا ہے ایک سو سولہ چاند کی راتیں عشنا کوثر سردار جی بہت بہت مبارک ہو ناول کا اختتام پذیر ہونے پر بہت شوق و جذب سے پڑھا ناول، ہم نے سوچا مبارک دینی تو بنتی ہے اتنی محنت سے زبردست لکھے گئے ناول کی اس لیے آج انٹری دے ڈالی گفتگو میں، ذوق آگہی (آپی سباس گل سلام قبول کریں یو آر گریٹ) سب کی چوائس اعلیٰ تھی۔ خوش بوئے سخن کامران مغل، گوہر فرید، عاصم تنہا، جاناں کومل جویئہ، مبشر سعید، ظریف احسن، فریدہ فری آپی سلام قبول کریں۔ پرنس افضل، ریاض حسین، رابعہ افضل، عبدالجبار اور علی زریون سب نے مل کر بہت اچھی محفل سجائی ہوئی تھی۔ اسی کے ساتھ اس بندی ناچیز کو دیں اجازت اللہ حافظ۔

# اقـــرأ

**ترتیب: طاہر قریشی**

# الغفار

(درگزر کرنے والا)

الغفار: مبالغہ کا صیغہ ہے۔ عربی لغت کے اعتبار سے ''غفر'' کے معنی بچانا ہے جس کا مطلب ہے کہ اس کے اور بندے کے درمیان یعنی گناہ کے درمیان بندے کو گنہگار ہونے سے بچانا۔ بندے کو قصور وار ہونے سے بچانا۔ غفار اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے وہی تو ہے جو اپنے بندوں کے عیبوں کو ڈھانپ لیتا ہے۔ الغفار میں الف لام تعریف کا ہے۔ بڑا معاف کرنے والا' چھپانے والا' درگزر کرنے والا' زیادہ سے زیادہ مغفرت کرنے والا' بہت زیادہ بخشنے والا' رہائی بخشنے والا' خلاصی ونجات دینے والا' بڑی سے بڑی خطا معاف کرنے والا' وہ قادرِ مطلق ہے جسے چاہے اس کی مغفرت فرمادے چاہے وہ کتنا ہی گناہگار کیوں نہ ہو۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی اس صفتِ غفاری کو بے حد وحساب لامحدود رکھا ہے' اللہ تعالیٰ صرف شرک کو معاف نہیں کرتا' اللہ تعالیٰ کے غفار ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انسان گناہوں پر جری ہوجائے اور شرک کے سوا تمام گناہ کرتا پھرے بلکہ اس غفاریت سے یہ واضح کرنا ہے کہ شرک کتنا بڑا اور شدید گناہ ہے کہ دیگر تمام گناہوں کی معافی تو ممکن ہے کہ اللہ غفار اپنی مرضی ومشیت سے معاف فرمادے' لیکن شرک ایسا عظیم گناہ ہے جسے اللہ نے خود ظلم قرار دیا ہے۔ قرآنِ حکیم میں کئی جگہ ارشاد ہوا ہے کہ ''جو شخص اپنے سابقہ گناہوں سے توبہ کرکے باز آجائے اور عملِ صالح اختیار کرلے اور راہِ راست پر قائم ہوجائے تو اللہ بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے۔''

ترجمہ:۔ہاں بے شک میں انہیں بخش دینے والا ہوں جو توبہ کریں ایمان لائیں' نیک عمل کریں اور راہ راست پر بھی رہیں۔(طٰہٰ۔۸۲)

مغفرتِ الٰہی کا مستحق بننے کے لئے چار چیزیں ضروری ہیں' کفر و شرک اور معاصی سے توبہ' ایمان' عملِ صالح اور راہِ راست پر چلتے رہنا۔یعنی استقامتِ دین یہاں تک کہ ایمان پر ہی خاتمہ بالخیر ہو' ورنہ توبہ وایمان کے بعد پھر انسان اگر شرک کا راستہ اختیار کرلے یہاں تک کہ اسے موت آئے تو اس کی موت تو کفر وشرک پر ہی ہوگی تو ایسا انسان مغفرت کے بجائے عذابِ الٰہی کا مستحق ٹھہرے گا۔

ترجمہ:۔جو پروردگار ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے' وہ زبردست اور بڑا بخشنے والا ہے۔(صٓ۔٦٦)



اللہ تبارک وتعالیٰ کی عظیم ہستی ہی ہے جو زمین وآسمان کو بنانے والی ہے وہی ہستی اس سارے نظام کو چلا رہی ہے' وہ مالک الملک وہ قادرِ مطلق جو بے پناہ صفاتِ الٰہی سے آراستہ ہے وہ احکم الحاکمین ہے' وہ مقتدر ہے اسے ہی سارے اختیار حاصل ہیں' تمام کائنات کا خالق و مالک ہونے کی وجہ سے اُسے یہ پورا پورا اختیار ہے کہ وہ جسے چاہے جس طرح چاہے معاف کرسکتا ہے۔بخش سکتا ہے کوئی اُسے روکنے ٹوکنے والا نہیں ہے وہ بڑا ہی زبردست مہربان اور بخشنے والا ہے۔

فضائل:۔کثرت کے ساتھ یا غفار کا ورد کرنے والے کو اللہ تعالیٰ گناہوں سے بچاتا ہے اور سابق گناہوں پر نادم ہونے پر معاف کردیتا ہے اور وہ نیکیوں کی طرف مائل ہوجاتا ہے۔کثرت سے اس اسم کا ورد کرنے والا ہر پریشانی اور مشکل سے دور رہتا ہے۔اللہ اس کے قلب کو سکون واطمینان بخشتا ہے۔ نمازِ عصر کے بعد ایک تسبیح یا غفار پڑھنے والے کو اللہ ان شاءاللہ بخشے ہوئے لوگوں میں شامل کرے گا۔



انٹرویو

# سید بدر سعید



ملک کے نامور ادیب، شاعر، صحافی سید بدر سعید

ایم فل ریسرچ، تحقیقاتی صحافی، کالم نگار، فیچر رائٹر، سکرپٹ رائٹر مطلب میڈیا کے سبھی شعبوں میں کام کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ صحافتی تنظیموں کے کلیدی عہدوں پر فائز رہے۔

چینل اے آر وائی میں سکرپٹ رائٹر، چینل فائیو میں پروڈکشن، روزنامہ جناح میں رپورٹنگ، روزنامہ دنیا میں ایڈیٹوریل سیکشن، جبکہ روزنامہ نوائے وقت میگزین سیکشن میں بطور سب ایڈیٹر ذمہ داریاں ادا ادا کرنے والے سید بدر سعید کو قریبی دوست شاہ جی کے نام سے جانتے ہیں ۔سید بدر صاحب کو ماہنامہ حکایت میں تین سال بطور انویسٹی گیشن سیل کے انچارج کے طور پر تین سال مسلسل ٹائٹل سٹوری دینے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ چھوٹی چھوٹی درجنوں کہانیاں لکھیں ہیں ۔ناول ایک ہی لکھا جو ماہنامہ نئے افق میں شائع ہوا تھا۔اس کا کریڈٹ جناب عمران قریشی اور محترم امجد جاوید کو دیتے ہیں ۔خاص طور پر انٹیلی جنس امور اور طالبانائزیشن اور دہشت گردی پر ان کی رائے کو اہمیت دی جاتی ہے۔اس انٹرویوز سے آپ کو علم ہو گا کہ تعلیم سے زیادہ تربیت پر کیوں زور دیا جاتا ہے۔ تعلیم و تنظیم کا آپس میں کیا تعلق ہے ۔غیر محسوس طریقے سے آپ کو احساس ہوگا کہ خوشی کا اصل راز کیا ہے ۔کامیابی کسے کہتے ہیں ۔محبت کیا ہے اور زندگی کیسے گزاری جائے کہ دین و دنیا دونوں میں اعتدال قائم رہے اور کامیابی کیسے آپ کے قدم چوم سکتی ہے۔آپ خوش کیسے رہ سکتے ہیں ۔سید بدر سعید نے نوعمری میں وہ نام کمایا کہ یہاں تک پہنچنے میں عمریں صرف ہو جاتی ہیں ۔اس میں ان کا کمال تو ہے ہی اس سے کہیں زیادہ ان کی تربیت ان خطوط پر ہوئی ہے ۔اس کا سارا کریڈٹ وہ اپنے والدین کو دیتے ہیں ۔یار باش انسان ہیں ۔ان سے مل کر آپ کو محسوس ہوگا کہ ایک درویش سے مل رہے ہیں ۔تو آیئے ملتے ہیں ہمہ جہت شخصیت جناب سید بدر سعید سے امید ہے یہ انٹرویوز آپ برسوں یاد رکھیں گے۔

ملک کے نامور ادیب، شاعر، صحافی

سوال۔آپ کا نام کس نے رکھا تھا؟

جواب۔میرا نام میرے دادا مرحوم نے رکھا تھا جو عالم دین تھے ۔بالکل ایسے ہی جیسے میرے بچوں کا نام رکھنے کا حق میرے والدین کو ہے ۔ ہمارے یہاں بزرگوں کو اہمیت دی جاتی ہے تا کہ برکت کا سلسلہ جاری رہے ۔ میری پیدائش کے وقت دادا حضور مری تھے اور اس زمانے میں رابطہ کے لئے محلے کے چند گھروں میں صرف لینڈ لائن ہوتا تھا۔سو دادا حضور ایک ہفتے بعد تشریف آئے اور اس عرصہ میں خاکسار صرف منا ہی رہا۔

سوال ۔آپ کی تاریخ پیدائش کیا ہے ۔اصل تاریخ پیدائش بتایئے گا؟

جواب۔22 ستمبر 1988 ہے اور یہ بالکل درست تاریخ پیدائش بتائی ہے۔

سوال ۔آپ نے ابتدائی تعلیم کہاں سے حاصل کی ؟مطلب کس سکول سے ؟وہ اسکول گھر سے کتنی دور تھا ؟جب آپ کو سکول میں داخل کروایا گیا آپ کی عمر کیا تھی؟

جواب۔ابتدائی تعلیم کو والد صاحب اور والدہ سے حاصل کی۔والد صاحب روز صبح نماز کے بعد ناظرہ قرآن پڑھاتے تھے۔دعائیں یاد کرواتے تھے اور والدہ تختی لکھنا سکھاتی تھیں۔ساڑھے چار سال کی عمر میں پہلی جماعت میں داخلہ ملا تو پہلی کلاس کا نصاب گھر سے پڑھ کر گیا تھا۔سکول گھر کے پاس ہی تھا۔اب تو پیدل کا راستہ لگتا ہے تب والدین گود میں اٹھا کر لیجاتے تھے۔ایم سی جونیئر ماڈل سکول میں داخلہ ملا تھا۔

سوال۔پرائمری کس سن میں پاس کیا؟ پرائمری تک کے ان اساتذہ کا مختصر تعارف جنھوں نے آپ کے علم و ادب کے شوق کی بنیاد رکھی حروف شناسی سکھائی؟

جواب۔میں نے 1997 میں پرائمری پاس کی تھی اور ہر سال پہلے تین انعامات میں سے ایک مجھے ملتا رہا۔میری استانیوں میں مس رضیہ مرحوم،میڈم شہلا،مس زریں،مس ثمینہ سمیت دیگر شامل ہیں۔سچ کہوں تو یہ وہ وقت تھا جب کلاس میں پہلی پوزیشن لینے پر میری ٹیچر اپنی تنخواہ سے بھی کوئی نہ کوئی تحفہ خرید کر دیتی تھیں کیونکہ استاد شاگردوں کی کامیابی کو اپنی کامیابی قرار دیتے تھے۔مس رضیہ پہلی جماعت کی استانی تھیں جو ہر روز پوری کلاس کو ایک نظم ضرور سناتی تھیں۔یہ سمجھیں علم و ادب کی بنیاد یہیں سے رکھ دی گئی۔گھر میں والد محترم نے پہلی جماعت سے ہی بچوں کا رسالہ سالانہ بنیادوں پر لگوا دیا تھا۔تب ''بچوں کی دنیا'' اور ''بچوں کا باغ'' گھر آیا کرتا تھا۔جس میں سے والدہ ایک کہانی روز سناتی تھیں۔دادا حضور نے بھی اسی عمر میں اخبار کی خبریں خود پڑھنے کے بعد مجھ سے بھی سننی شروع کر دی تھیں تاکہ میرے پڑھنے کا رجحان بڑھے۔خبریں سنانے پر 25 پیسے ملا کرتے تھے۔

سوال۔سر بچوں کی بہتر تربیت کے لیے جن بھوتوں کی کہانیاں سنائی جانی چاہیے یا محمد بن قاسم،سلطان محمود غزنوی طارق بن زیاد، کے مختصر واقعات یا عادل بادشاہوں کی کہانیاں؟

جواب۔بچوں کی تربیت میں جن بھوتوں والی کہانی سے لے کر تاریخی واقعات اور عادل بادشاہ سب ہی کا اپنا اپنا کردار ہے۔دیکھنا صرف یہ ہے کہ کہانی بچے کو برائی سے نفرت اور نیکی پر ابھارے۔کہانی میں خوف نہیں ہونا چاہئے کہ بچہ بعد میں جن سے ڈر ڈر کر نفسیاتی مریض بن جائے یا اس کے دل میں خوف پیدا ہو جائے۔اس کے برعکس اس میں جن سے مقابلہ کی ہمت پیدا ہونی چاہئے۔

سوال۔میٹرک آپ نے کس اسکول سے کیا؟ میٹرک میں کتنے نمبر آئے تھے؟ اس دور کا کوئی ناقابل فراموش واقعہ؟

جواب۔میٹرک گورنمنٹ ہائی اسکول چوبرجی گارڈنز سے کیا۔میری فسٹ ڈویژن تھی اور سکول کے چند کامیاب طلبا میں شمار ہوتا تھا،مقرر بھی تھا۔یاد پڑتا ہے کہ دسویں میں دو سیکشنز کے درمیان کافی لڑائی ہوئی تھی جس میں ایک لڑکے کی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی۔جھگڑے کے دوران سکول کے گملے اور دیگر سامان بھی ٹوٹ گیا۔اس پر انکوائری کمیٹی بیٹھی۔مخالف گروپ کے "لیڈر" کو سکول سے نکال دیا گیا۔دوسری جانب میرا نام بھی سرفہرست تھا۔اتفاق یہ ہوا کہ میرے ساتھ جو 6 مرکزی "ڈان" تھے وہ بھی سکول میں ٹاپ کرنے والوں میں شمار ہوتے تھے۔انکوائری کمیٹی نے فیصلہ دیا کہ اگر ان 6 طلبا کو بھی نکال دیا گیا تو سکول کا رزلٹ ختم ہو جائے گا اور خراب رزلٹ کی بنیاد پر اگلے سال داخلوں میں مسئلہ بن جائے گا۔آٹھویں کے بعد مجھ سمیت دو اور طلبا صدارتی ایوارڈ کے امتحان کے لئے بھی نامزد ہوئے تھے سو اس بنیاد پر ہمارے جرم کو نظر انداز کر دیا گیا۔

سوال۔آپ کا گھرانہ علمی وادبی ہے۔سبھی ادب سے کسی نا کسی حد تک وابستہ ہیں والد صاحب،اپنے کے بھائی بھی۔ہو سکے تو اپنے آباو اجداد کے تعارف میں ایک مختصر سا پیراگراف لکھیں؟

جواب۔میرے دادا مرحوم عالم دین تھے۔انہوں نے دینی مسائل پر لکھا تھا۔والد محترم قاری ہیں۔دادا جی بچوں کو قرآن حفظ کرواتے تھے لیکن ہمارے یہاں قرآن پڑھانے یا حفظ کروانے کا ہدیہ نہیں لیا جاتا۔دادا حضور بیوروکریسی میں تھے۔والد، تایا اور پھوپھو جی بھی بیوروکریٹ رہے۔ایک چاچو ڈاکٹر ہیں اور سعودی عرب میں شاہی فیملی کے ڈاکٹر ہیں۔والد محترم معروف اخبار پاکستان ٹائمز میں بھی ملازمت کرتے رہے۔سول سروس میں آئے تو گورنر سمیت اہم شخصیات انہی سے تقاریر

لکھواتی رہی ہیں۔ میں اور میرا چھوٹا بھائی بھی حافظ قرآن ہیں۔ تایا اور چاچو نے بھی قرآن حفظ کیا۔ ہمارے یہاں ہر فیملی میں کم از کم ایک حافظ ضرور ہوتا ہے۔

سوال۔آپ کے خاندان میں آپ کے علاوہ اس وقت کون کون علم و ادب یا صحافت سے وابستہ ہیں؟

جواب۔سید نظر زیدی مرحوم میرے انکل ہیں۔ بچوں کے ادب پر ایک معتبر نام ہے۔ حکومت پاکستان کی جانب سے بچوں کے ادب پر نظر زیدی ایوارڈ دیا جاتا ہے۔ میرے والد صاحب سول سروس سے ریٹائرمنٹ کے بعد ایک ماہنامہ جریدے ''افکار جدید'' کے مدیر کے طور پر ذمہداریاں سرانجام دے رہے ہیں۔ چھوٹا بھائی اسعد نقوی بھی کالم اور فیچر لکھ رہا ہے۔ اب تو اسکرپٹ رائیٹر بھی بن چکا ہے۔

سوال۔سب سے پہلی کون سی تحریر (کہانی، تبصرہ، کالم) جو کہیں شائع ہوئی ہو؟ لکھنے کی ابتدا کیسے ہوئی اور کیا لکھنا شروع کیا تھا۔

جواب۔پہلی نظم روزنامہ نیا اخبار (خبریں گروپ) اور پہلا تبصرہ ماہنامہ چاند میں چھپا تھا۔ میری ابتدا طنز و مزاح اور افسانے لکھنے سے ہی ہوئی تھی جو مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے تھے۔ ناول صرف ایک لکھا ہے جو نئے افق میں شائع ہوا تھا۔ یوں کہ مجھے خود بھی علم نہ تھا کہ میں ناول لکھ سکتا ہوں یا نہیں۔ یہ ہنر ناول نویس امجد جاوید بھائی اور نئے افق کے مدیر عمران بھائی نے تلاش کیا ہے اور اس کا کریڈیٹ انہی کو جاتا ہے۔

سوال۔ہمارے معاشرے میں سب سے زیادہ ماں کے او پر لکھا بھی گیا، گایا بھی گیا، علماء حضرات بھی ماں کی محبت، اہمیت اجاگر کرتے نظر آتے ہیں، قرآن و حدیث میں والدین کا ذکر ہے۔ اس بارے آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب۔ہمارے کلچر میں باپ کو سخت گیر دکھایا گیا ہے جس کی وجہ سے باپ کے ذکر پر ریٹنگ نہیں ملتی۔ حالانکہ باپ کی بھی بہت اہمیت ہے جو خود دھوپ میں جل کر بچوں کے لئے سائبان بنتا ہے۔

سوال۔آپ کی شادی کب ہوگئی؟

جواب۔ایک دو سال میں شادی کا ارادہ ہے۔ ابھی تو کام نے کچھ اور سوچنے کی مہلت ہی نہیں دی۔ دعا کریں ایک ہی شادی ہو اور وہ اچھی رہے۔

سوال۔آپ بچپن میں کیا بننا چاہتے تھے؟

جواب۔میں بچپن میں بھی لکھاری ہی بننا چاہتا تھا۔ اسی لئے والدین کی خواہش پر ایف ایس سی میڈیکل کی اور پھر انہیں بتا دیا کہ آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن میں ڈاکٹری کے زیادہ پیسوں میں شاید زندہ نہ رہ سکوں لیکن صحافت کے کم پیسوں میں خوش رہوں گا۔ ان کی اجازت سے جرنلزم میں آ گیا اور اللہ کے کرم سے آج ڈاکٹرز سے زیادہ معاوضہ مل رہا ہے۔

سوال۔آپ کی سب سے زیادہ پسندیدہ شخصیت کون سی ہے؟

جواب۔میرے والدین۔ میں اپنے والد محترم سے راہنمائی لیتا ہوں۔ میرے خیال میں ہمارا سب سے بڑا پیر ہمارے گھر میں ہوتا ہے جس کی دعا اللہ رد نہیں کرتا۔ میرے سینئرز، اساتذہ ہیں جنہوں نے مجھے ہر موقع پر راہنمائی فراہم کی۔ کئی نام ہیں اور سب کے نام لکھنا ممکن نہیں ہے۔

سوال۔آپ کی ذاتی زندگی کتنی کامیاب ہے؟ کیا آپ موجودہ زندگی سے مطمئن ہیں؟

جواب۔کامیابی کا تعلق دلی اطمینان سے ہوتا ہے۔ میں نے صحافت کے اس کوچے میں کئی بڑے بزنس ٹائیکون کو پریشان دیکھا ہے اور کئی درویشوں کو پیپل کی چھاؤں میں مطمئن دیکھا ہے۔ پاکستان کے فائیو سٹار ہوٹلز کی چین کا ایک مالک خود بتاتا ہے کہ اسے اپنے بچوں پر اعتبار نہیں اور وہ اپنی رقم ٹرسٹ کو دے جائے گا۔ ارب پتی کلب کے اکثر لوگ اسی لئے ٹرسٹ بنا دیتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کو کچھ نہیں دینا چاہتے۔ انہیں لگتا ہے انہیں دولت کے لئے اپنے ہی گھر سے کوئی قتل کر دے گا۔ میری ذاتی زندگی انتہائی کامیاب ہے۔ ہم سب بھائی اور والدین ایک ساتھ رہتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ ہمارا خاندان یونہی ساتھ رہے۔ والدین کا احترام بھی ہے اور دوستانہ ماحول بھی۔ ناشتہ بھی اکٹھے کرتے ہیں۔ شام کو بھی جلدی گھر آ جاؤں تو بھی کبھی اکٹھے کھانا کھاتے ہیں۔ ہم سب گھر والے کوشش کرتے ہیں کہ کھانے کی میز پر لازمی اکٹھے ہوں۔ کوئی فرد نہ ہو تو اس کا انتظار کرتے ہیں کہ ایک

دو گھنٹے بعد کھانا شروع ہوتا ہے۔ دفتر سے گھر آؤں تو والدہ، والد اور بھائی اکٹھے ہو جاتے ہیں اور میں اس روز کے دلچسپ واقعات سناتا ہوں۔ والد صاحب ریٹائرمنٹ سے پہلے اسی طرح ہمیں واقعات سناتے تھے

سوال۔ آپ سکرپٹ لکھنے کی طرف کیسے آئے۔ اور اس میدان میں اب تک کیا کامیابیاں حاصل کیں؟۔

جواب۔ پہلا سکرپٹ میں نے کالج کے زمانے میں لکھا تھا۔ ایک مزاحیہ ڈرامہ تھا جو کسی کو بھی نہیں بھیجا کیونکہ جس پروڈیوسر نے کہا وہ خود اس چینل سے کہیں اور چلا گیا، کسی اور کو بھیجنا میں نے مناسب نہ سمجھا۔ لیکن آج دیکھتا ہوں تو وہ سکرپٹ مروجہ اصولوں کے مطابق درست ہے ۔کسی چینل پر باقاعدہ پہلا سکرپٹ لکھنے کی عجیب داستان ہے ۔ میں صرف ایک صحافی تھا۔ غالبا تین سال قبل رمضان شروع ہوا چاہتا تھا کہ معاشرے کی ایک اہم اور قابل احترام شخصیت کی جانب سے مجھے ایک لفافہ موصول ہوا۔ میں نے رمضان سے ایک دن قبل وہ چیک شکریہ کے ساتھ انہیں واپس کوریئر کروا دیا۔ اگلے روز 12 بجے انہیں چیک واپس مل گیا اور ٹھیک اسی وقت مجھے ایک دوست کی کال آ گئی کہ ایک کرائم شو کے پروگرام کا سکرپٹ لکھ دو۔ معاملات پھنس گئے ہیں۔ رمضان میں ہر روز پروگرام چلنا تھا جس میں کرائم سین پر شارٹ ڈرامہ بھی شامل تھا۔ روز ایک ڈرامہ لکھنے کا سن کر چینل کے مستقل سکرپٹ رائیٹر ہاتھ کھڑا کر چکے تھے جس کی وجہ سے مجھ سے رابطہ کیا گیا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر کام شروع کیا اور پورا رمضان لگ بھگ روز ایک شارٹ ڈرامہ دیتا رہا۔ اللہ نے اس قدر ریٹنگ دی کہ یہ مختصر ڈرامہ افطاری کے وقت نشر ہوتا تھا کیونکہ رمضان میں یہی پرائم ٹائم تھا۔ میں نے جو چیک لوٹایا تھا اتنی رقم اللہ نے ایک ہفتے میں ہی حلال راستے سے مہیا کر دی اور پھر بونس سے نوازنا شروع کر دیا۔ یہ کھاتا آج تک چل رہا ہے۔ اس چینل پر لگ بھگ 90 شارٹ ڈرامے لکھ چکا ہوں اور حال یہ ہے کہ پروڈیوسر اور باقی ٹیم سے آج تک نہیں ملا۔ ساری ٹیم کراچی ہے اور میں لاہور۔ فون پر ون لائنر ڈسکس کرتے ہیں اور ای میل پر سکرپٹ بھیج دیتا ہوں۔ اسی دوران ایک اور چینل نے بھی رابطہ کیا اور ان کا سکرپٹ بھی لکھنے لگا۔ وہ معاملہ بھی ایک لفافہ واپس بھیجنے کے بعد شروع ہوا تھا۔ بس سمجھیں کہ اللہ نے اپنا کھاتا شروع کر رکھا ہے کہ حرام لوٹاتے جاؤ میں کئی گنا زیادہ حلال سے نوازتا جاؤں گا۔

سوال۔ بطور کالم نویس آپ نے کتنا سچ لکھا؟۔ کیونکہ سچ لکھنا وہ بھی کالم نویس کے لیے مشکل تو ہے ہی بعض اوقات اسے زیب داستان کے لیے کچھ بڑھانا بھی پڑتا ہے؟

جواب۔ کتنا سچ لکھا یہ رب ہی بہتر جانتا ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ضروری نہیں ہر بار ہم ہی درست سوچ رہے ہوں، عین ممکن ہے تصویر کا کوئی پہلو ہماری نظر سے اوجھل بھی ہو۔ اپنی سطح پر میں نے پوری کوشش کی ہے کہ صرف سچ ہی لکھوں۔ اگر کہیں ابہام ہو کہ منظر نامہ میں کچھ ایسا بھی ہے جو میں نہیں جانتا تو پھر کالم نہیں لکھتا۔

سوال۔ سکون کہاں جا کر محسوس کرتے ہیں۔ اور کیوں ؟

جواب۔ میں آج بھی کسی مشکل میں ہوں تو والدہ کی گود میں سر رکھ کر لیٹ جاتا ہوں۔ وہ بالوں میں انگلیاں پھیرتی ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ میں مشکل حالات سے نکل جاؤں گا۔ ایک عجیب سی روحانی طاقت در آتی ہے۔ میرا گھر میرے خوابوں کی جگہ ہے کیونکہ یہاں موجود رشتے بہت انمول ہیں۔

سوال۔ آپ کی منزل یا مقصد کیا ہے؟

جواب۔ میں صرف اپنا کام کرتا ہوں۔ کہاں تک جاؤں گا اس کا فیصلہ رب کرے گا۔ چاہے تو عروج پر لے جائے، چاہے تو زوال میں لے جائے۔ یہ اس کا کام ہے ۔میرا کام صرف اپنا کام کرنا ہے۔ بس یہ دعا کرتا ہوں کہ جس حال میں رکھے مطمئن رکھے۔ عروج دے تو ساتھ عاجزی بھی دے۔ زوال دے تو کفر کی بجائے شکر کرنے والوں میں رکھے۔

سوال۔ مسلمان ہونے کے ناطے ہمارے موجودہ کہانی نویس کو کیا لکھنا چاہیے کہ وہ جائز آمدن بھی حاصل کر سکے اور ضمیر بھی مجروح نا ہو۔

جواب۔ کہانی میں داستان شامل کریں اور میں نامی کالمی انداز ختم کر دیں۔ ایک بات یاد رہے کہ ہمارے یہاں ریٹنگ کا معیار درست نہیں ہے۔ ہم ہر دیکھی گئی چیز

کو ریٹنگ میں شمار کرتے ہیں ۔کوئی اخبار یا جریدہ جتنی تعداد میں چھپے اسے ریٹنگ سمجھا جاتا ہے ۔کوئی چینل جتنا دیکھا جائے اسے بھی ریٹنگ سمجھا جاتا ہے ۔ پورے پاکستان میں ریٹنگ بوسٹر صرف 700 کے لگ بھگ ہیں۔ یعنی صرف چند بڑے شہروں کے 700 ٹی وی سیٹس پر جو دیکھا جائے اسے ہم ریٹنگ سمجھتے ہیں جبکہ ہر دیکھی گئی چیز ریٹنگ نہیں ہے۔

ترقی یافتہ ممالک میں ہر پسند کی گئی چیز ریٹنگ ہوتی ہے۔جس کے لئے سروے سمیت کئی طریقے رائج ہیں۔ کہانی میں عشق ممنوع یا رشتوں کا تقدس مجروح کر کے ریٹنگ حاصل نہیں کرنی چاہئے ۔ ہمارے سامنے اشفاق احمد،قدرت اللہ شہاب، بانو قدسیہ ایسے نام موجود ہیں۔کیا انہیں ریٹنگ نہیں ملی ؟ ہمیں اپنا معاشرہ ، اپنا کلچر اور اپنی روایات کو ساتھ لے کر چلنا ہے ۔کہانی نویس کا مشاہدہ ، مشق اور مطالعہ جتنا زیادہ ہوگا اس کی تحریر اتنی ہی مضبوط ہو گی ۔محنت اور عاجزی کہانی نویس کو کامیاب بناتی ہے ۔ میں نے محی الدین نواب ، ایم اے راحت ، بانو قدسیہ سمیت سبھی کو عاجز اور محبت کرنے والا پایا ہے۔

سوال ۔معاشرے میں جرائم کا کیسے خاتمہ ممکن ہے؟

جواب ۔مجرم کو سدھارنے کے لئے ہمیں معاشرے کے طبقاتی نظام کو بدلنا ہوگا۔ جرم ہونے سے پہلے پولیس یا کوئی اور ادارہ اسے نہیں روک سکتا کیونکہ اکثر تو مجرم کے گھر والوں کو بھی خبر نہیں ہوتی کہ وہ کیا کرنے لگا ہے ۔بے روزگاری کا خاتمہ یا بے روزگاری الاؤنس دینا ہوگا ۔اسی طرح ہمیں جیلوں میں نفسیاتی ماہرین کا انتظام کرنا ہوگا۔ میڈیا پر ایسے پروگرامز ختم کرنے ہوں گے جن میں ہیرو کو بہادری کے نام پر قانون اپنے ہاتھ میں لیتا دکھایا جاتا ہے ۔اسی طرح ڈراموں سے بے جا گلیمر نکالنا ہوگا۔ہمیں کئی اقدامات کرنا ہوں گے لیکن سرفہرست طبقاتی نظام ہی ہے ۔اسی طرح پولیس اور عدلیہ کو مضبوط کرنا ہوگا ۔جب تک وڈیرے بنا کوئی کام کئے دھقان کی محنت ہڑپ کرتے رہیں اور ان کی عزتوں سے کھیلتے رہیں تب تک جرائم ختم ہونا ممکن نہیں

سوال ۔آپ نے مختلف رسائل و اخبارات میں لکھا آپ کے فین تو لاکھوں میں ہوں گے؟

جواب ۔میرے خیال میں میرا کوئی فین نہیں ہے ۔ میں فینز اور ہیرو کے طبقاتی رویے کے خلاف ہوں جس میں لکھاری کو اس لئے معتبر سمجھا جائے کہ اس کی تحریر پسند کی جا رہی ہے اور وہ تحریر پسند کرنے والے کو فین کہہ کر اس لئے کم درجے پر لایا جائے کہ اس نے تحریر پسند کر کے لکھاری کو معتبر بنا دیا ہے ۔قاری بہت بڑی طاقت ہوتا ہے ۔ یہ کسی بھی لکھاری کی وجہ شہرت اس کا قاری ہی ہوتا ہے اور ناکامی کی وجہ بھی قاری ہی ہوتا ہے ۔میرا واسطہ صرف اپنے قارئین سے پڑتا ہے جو میرے محسن بھی ہیں اور نقاد بھی ۔میں ان کی رائے سے سیکھتا ہوں ۔ان کی محبتیں میرا اعزاز ہے ۔کئی دلچسپ واقعات ہیں ۔مثال کے طور پر چند سال قبل طارق عزیز نامی ایک نوجوان مجھے ملا ۔وہ ڈیزائنر ہے ۔اس نے پہلی ملاقات میں ایک خواہش کا اظہار کیا ۔ وہ خواہش بھی عجیب تھی ۔ کہنے لگا بس یہ اعزاز دیجئے کہ آپ کی شادی کا کارڈ میں ڈیزائن کروں گا ۔ جتنے کارڈ چھپیں گے وہ میری طرف سے ہوں گے ۔ بظاہر بہت معصومانہ خواہش تھی لیکن اس کے پیچھے جو محبت تھی وہ آنکھیں بھگو دیتی ہے ۔ طارق عزیز اب میرا بہترین دوست ہے ۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ لکھاری اور قاری کا رشتہ برابری کا ہوتا ہے ۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ ہماری قاری بہت ظالم ہوتے ہیں ۔ہم انہیں دھوکا نہیں دے سکتے ۔ جہاں لکھتے وقت ڈنڈی ماریں گے ،فوراً پکڑے جائیں گے ۔پڑھنے والا ہم سے زیادہ ذہین ہوتا ہے۔

سوال ۔ہماری نوجوان نسل میں ٹیلنٹ کی کمی نہیں انہیں بہتر رہنمائی کی ضرورت ہے ۔ان کی اصلاح کیسے ممکن ہے؟

جواب ۔میرا سب سے زیادہ فوکس ہی طلبا پر ہوتا ہے ۔ میں نے دیکھا ہے کہ نوجوان لڑکے لڑکیوں میں بہت کرنٹ ہے ۔المیہ صرف یہ ہے کہ انہیں درست ٹریک کا بہت دیر سے علم ہوتا ہے ۔اگر انہیں درست سمت میں ڈال دیا جائے تو یہ بہت جلد اپنے آپ کو منوا لیتے ہیں ۔میں ابھی نصیحت کرنے کے قابل نہیں ہوا ۔البتہ میں ان کے ساتھ انہی کے ماحول میں بیٹھ جاتا ہوں ۔یونی ورسٹی میں ہوں تو وہیں کہیں لان میں یا کیمپس کی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتے ہیں ۔ان سے ڈسکس کرتا ہوں اور جہاں تک ممکن ہو ان کے

رجحان کے مطابق اس فیلڈ کے کسی سینئر سے رابطہ کر کے اسے کہتا ہوں کہ فلاں دوست آپ سے ملے گا۔ اسے ورکشاپ کے چھوٹے کی طرح تمام بڑے کام سکھا دیجئے ۔میڈیا میں نوجوان طلبا و طالبات کے گروپ کا نام ہم نے ینگ میڈیا رکھا ہوا ہے جن سے مکالمہ چلتا ہے اور کئی پراجیکٹس میں ان کے ساتھ بیٹھتا ہوں۔ چینلو میں ان کی انٹرنشپ کے لئے دوستوں سے بات کرتا ہوں۔ اب تو ینگ میڈیا کے ابتدائی گروپس ہی اپنے بعد میں آنے والوں کی ویسے ہی مدد کر رہے ہیں جیسے ان کی سینئرز نے مدد کی تھی۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ کسی کے ساتھ برا نہیں کریں۔ خدا آپ کے ساتھ برا نہیں ہونے دے گا۔ میرے پاس اتنا سا فارمولا ہی ہے کہ جو دوسروں کو راستہ دیتا ہے اللہ اس کے لئے راستے کھولتا جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے۔

سوال۔ محبت کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب۔ ہر وہ شخص جو انسان کہلا سکتا ہے وہ محبت سے مبرا نہیں ہوتا لیکن سوال یہ ہے کہ ہمارے نزدیک محبت کیا ہے۔ محبت نہ تو ہوس ہ اور نہ ہی اٹریکشن کا نام ہے۔ یہ مرشد سے بھی ہوتی ہے۔ والدین سے بھی ہوتی ہے۔ ہر وہ رشتہ جو ہم سے جڑا ہے ہمیں اس سے کہیں نہ کہیں محبت ہوتی ہے میرے پاس ایسے کئی رشتے ہیں جن سے مجھے محبت ہے یا محبت نے ان رشتوں کو جنم دیا ہے۔

سوال۔ اپنی زندگی کے ایک دو یادگار واقعات؟

جواب۔ میری زندگی کا ہر لمحہ ہی یادگار ہے۔ میں مشکلات سے بھی لطف اندوز ہوتا ہوں۔ زندگی کے پر موڑ میں ایک رومانس ہوتا ہے یہ ہم پر ہے کہ ہم اس سے لطف اندوز ہوں یا اس لمحے کو کوستے رہیں۔ مجھے یاد ہے کہ میرے ایک ایڈیٹر کسی بات پر ناراض ہو گئے اور ڈانٹ پلا دی۔ میں اچانک مسکرا دیا تو کہنے لگے۔ مسکرانے والی کیا بات ہے۔ میں نے کہا سر ابھی ابھی ایک کہانی کا پلاٹ سوجھ گیا ہے۔ کہانی کچھ یوں ہے کہ ایک ایڈیٹر نے اپنے کارکن کو کسی بات پر ڈانٹ دیا۔ کارکن صحافی ایڈیٹر کے کمرے سے باہر نکلا تو تھوڑی دیر بعد ایڈیٹر مر گیا۔ اب کرائم سین یہ ہے کہ پولیس نے قاتل تلاش کرنا ہے لیکن ایڈیٹر کی موت کے وقت کمرے میں سرے سے کوئی موجود ہی نہیں تھا اور اس بات کے گواہ کئی لوگ ہیں۔ سر آپ کی ڈانٹ کے دوران ایک مکمل کرائم سٹوری مل گئی ہے۔ ایڈیٹر صاحب کچھ دیر تو ہکے بکے میرا منہ دیکھتے رہے اور پھر ان کا غصہ ختم ہو گیا۔ کہنے لگے سچ بتانا تم نے کہانی میں مجھے ہی تو نہیں مار ڈالا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کا ہر لمحہ ہم نے خود یادگار بنانا ہوتا ہے۔ مشکلات پر کڑھنے کی بجائے ان میں سے خوشیاں کشید کی جاسکتی ہیں۔

سوال۔ پاکستان میں ادب اور مخلص ادیبوں کا مستقبل کیسا دیکھ رہے ہیں آپ؟

جواب۔ میں بہت پر امید ہوں کیونکہ پیراشوٹرز زیادہ عرصہ نہیں چل سکتے۔ ادب میں وہی نام کماتا ہے جو ادب سے مخلص ہو۔ ویسے بھی ہم اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لئے لکھتے ہیں۔ لکھنا عشق کی ایک قسم ہے اور عشق اپنی تسکین کے لیے ہوتا ہے کسی سے داد سمیٹنے کے لئے نہیں۔ کچھ عرصہ ضرور لگے گا لیکن حقیقی ادیب کا راستہ کوئی نہیں روک پائے گا۔ میری کوشش ہے کہ مکالمے کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا جائے۔ ادبی مباحثے ہوں۔ ان کے لئے ہمیں کسی پاک ٹی ہاؤس کی ضرورت نہیں۔ پاک ٹی ہاؤس محض ایک چائے خانہ تھا۔ حلقہ ارباب ذوق کے ابتدائی اجلاس گھر میں ہوا کرتے تھے۔ سو آپ کو جہاں سہولت ہو وہیں بیٹھ جائیں۔ جگہ ادب اور مکالمہ کا مسئلہ نہیں ہے۔ ہم نے کیفے درویش کا ایک منصوبہ بنایا ہے اس کے لیے جس میں ادبا کی نشستیں ہوا کریں گی ان شاءاللہ۔ دوسری بات ہم کہتے ہیں کہ لوگ کتاب نہیں پڑھتے لیکن ہم یہ نہیں دیکھتے کہ اچھی کتب لکھنے والے آج بھی لکھنے سے ہی گھر چلا رہے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ 30 سال سے مسلسل بیسٹ سیلر ہیں۔ عمیرہ احمد، ہاشم ندیم، امجد جاوید اور ایسے ہی کئی لوگوں کی کتب مسلسل بک رہی ہیں۔ محی الدین نواب، ایم اے راحت نے صرف لکھ کر ہی گھر بنائے اور ذاتی گاڑیاں خریدیں۔۔۔۔ سو ادیب کا مستقبل بہت تابناک ہے۔ اب تو معاوضہ بھی لاکھوں میں مل جاتا ہے۔ اچھا قاری ابھی بھی موجود ہے لیکن مفاداتی پبلشرز نے قاری کا اعتماد مجروح کیا ہے جسے ہم نے ہی بحال کرنا ہے۔

سوال۔ ناول، افسانہ، خاکہ نگاری بارے ایک لائیں میں رائے دیں۔

جواب ۔ناول ایک مکمل صنف ہے ۔افسانہ کہانی کا ایک جز ہے جبکہ خاکہ نگاری ایک شخصیت کا احاطہ کرتی ہے ۔اپنی اپنی جگہ تینوں ہی مضبوط اصناف ادب ہیں۔

سوال ۔سرمختصر بتائیں کہ ناول، کہانی اور افسانہ میں کیا فرق ہے؟ ہم کیسے جان سکتے ہیں کہ یہ ناول ہے ۔یہ کہانی ہے۔یہ افسانہ ہے۔اسی طرح ڈرامے اور فلمی کہانی میں کیا فرق ہوتا ہے؟

جواب ۔ہم دو جمع دو والا فارمولا یہاں نہیں لگا سکتے کیونکہ ادب میں مسلسل تجربات جاری رہتے ہیں ۔ناول اور کہانی میں بنیادی چیزیں ایک جیسی ہی ہوتی ہیں ۔ناول طویل اور کہانی قدرے مختصر ہوتی ہے لیکن ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ کہانی ناول کا ایک حصہ ہوتی ہے ۔ناول اپنے اندر مزید کئی اور چیزیں بھی سمیٹے ہوئے ہے ۔افسانہ مختصر کہانی ہوتی ہے لیکن کہانی یا ناول کی طرح اس کا کوئی باقاعدہ آغاز یا انجام نہیں ہوتا۔افسانہ کسی بھی موڑ سے شروع ہو کر کسی بھی موڑ پر ختم ہو سکتا ہے ۔افسانہ نگار بگڑے بچے کی طرح ہے جو کسی کو جوابدہ نہیں کہ اس نے کہانی کی ابتدا میں تمہید کیوں نہیں باندھی یا درمیان میں ہی اچانک کہانی لپیٹ کیوں دی ۔لیکن کہانی یا ناول کے سٹرکچر میں ابتدائیہ اور اختتامیہ باقاعدہ حصہ ہوتا ہے۔ڈرامے اور فلمی کہانی میں فرق بارے یہ سوال میں نے ایک بار سید نور صاحب سے کیا تھا۔ان کا کہنا تھا کہ ڈرامہ حقیقی زندگی کی ترجمانی کرتا ہے لیکن فلم فکشن ہوتی ہے ۔ڈرامہ کا ہیرو اور کردار عام زندگی کی نمائندگی کرتے ہیں لیکن فلم کے کردار آپ کو حیران کرتے ہیں ۔مولا جٹ کئی گولیاں کھا کر بھی زندہ رہ سکتا ہے لیکن ڈرامے کا ہیرو ایک گولی کھانے کے بعد ہی ہسپتال جائے گا یا مر جائے گا۔فلم کی تباہی غیر حقیقی ہو گی لیکن ڈرامے کی تباہی اتنی ہی ہو گی جتنی عام زندگی میں ہو سکتی ہے۔فلم حیرت کا نام ہے ۔آپ کو ہر موڑ پر حیرت ہو گی اور یہ حقیقی زندگی سے قدرے مختلف ہو گا۔

سوال ۔سوشل میڈیا کا اژدھا پرنٹ ادبی رسائل کو کھا جائے گا۔آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب ۔مجھے نہیں لگتا کہ سوشل میڈیا کی وجہ سے ادب کو کوئی خطرہ لاحق ہے ۔سوشل میڈیا نے تو اشفاق احمد، بانو قدسیہ، واصف علی واصف اور قدرت اللہ شہاب کو پھر زندہ کر دیا ہے ۔یہاں کئی ادبی گروپس بنے ہوئے ہیں جو بہترین کام کر رہے ہیں ۔کتابیں تیزی سے ای بک کی صورت اپ لوڈ ہو رہی ہیں ۔کئی ویب سائٹس موجود ہیں ۔عین ممکن ہے مکمل ڈائجسٹ ای میڈیا کی شکل میں آ جائیں ۔ڈرامہ نگاری میں اس وقت سب سے زیادہ پیسہ ہے کیونکہ اس کا اشتہار سب سے مہنگا ہے ۔اچھے فنکار کے پاس اب سامنے آنے کے جتنے مواقع موجود ہیں وہ اس سے پہلے کبھی نہیں تھے۔

سوال ۔نئے لکھاریوں کو کس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے؟ نام و پیسے کمانے کے لیے؟

نئے لکھاری کو محض درست سمت کی نشاندہی کی ضرورت ہوتی ہے ۔بدقسمتی سے سینئرز اور جونیئرز کے درمیان فاصلے بہت بڑھ چکے ہیں ۔مکالمے اور سیکھنے سکھانے کا کلچر ختم ہونے کی وجہ سے نئے لکھنے والے سالوں لکھتے چلے جاتے ہیں اور انہیں یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ انہیں کس ٹریک پر لکھنا تھا۔ہمیں ایسا کوئی پلیٹ فارم بنانا ہو جہاں تنقید کی بجائے لکھنے والوں کے رجحان اور تحریر کا جائزہ لے کر راہنمائی فراہم کی جائے کہ کس شخص کو کن موضوعات اور کن اداروں کے لئے لکھنا چاہئے۔الف کتاب سے میری بہت امیدیں وابستہ ہے ۔۔جدید دور کے ساتھ ساتھ فنکاروں کے لئے جدید انداز بہت ضروری تھا۔اچھے اور برے لوگ ہر شعبے میں ہوتے ہیں ۔ہم برے لوگوں کی وجہ سے اچھے لوگوں کے خلاف بات نہیں کر سکتے۔

سوال ۔خودکش بمبار کے تعاقب میں لکھنے کے پیچھے کون سا عمل کارفرما تھا؟

جواب ۔اپنے معصوم لوگوں کی کٹی پھٹی لاشیں ۔میں نے انتظار کیا کہ کوئی سینئر اس پر لکھے لیکن جب کسی نے نہیں لکھا تو سوچا میں ہی کام کرتا ہوں ۔ہم ایسوں پر ان ماؤں کا قرض ہے جو خون آلود مٹی اٹھا کر چلا رہی تھیں کہ یہ مٹی نہ پھینکنا اس میں کہیں میرا بچہ بھی گم ہو گیا ہے ۔بس یہی قرض ادا کرنے کی کوشش کی تھی۔

سوال ۔انگریزی ادب کی کسی شخصیت سے متاثر ہوں تو اسکا نام اور وجہ تحریر فرما دیں؟

جواب ۔مسٹر چپس لاجواب ناول ہے کیونکہ اس میں

ہیرو ایک عام انسان ہے جو کما تو ہو سکتا ہے لیکن اپنے مقصد سے جڑے رہنا اور مستقل مزاجی سے سفر کرنا اس کی پہچان بنتا ہے۔

سوال۔کوئی ایسا قول کسی کا، کوئی ایسی پرسنیلیٹی، یا آپ کی زندگی کا کوئی ایسا واقعہ، یا کوئی بھی ایسی بات جس سے آپ کو ہمیشہ انسپائریشن ملتی ہو آگے سے آگے بڑھنے کی؟ اسی طرح زندگی کا سب سے بڑا غم کیا ہوتا ہے (عمومی طور پر ہر انسان کا)

جواب۔میرے والد صاحب نے کہا تھا خوشی میں اتنا زیادہ خوش نہ ہونا کہ خوشی برداشت نہ کر سکو اور ہارٹ اٹیک ہو جائے اور غمی میں اتنا غمگین نہ ہونا کہ دکھ سے ہارٹ اٹیک ہو جائے۔زندگی میانہ روی کا نام ہے۔خوشی میں اللہ کی نوازشوں پر سجدہ کرنا اور غمی میں اس سے مدد مانگتے ہوئے سجدہ کرنا۔زندگی کا سب سے بڑا غم۔محسوس کریں تو ہر غم ہی بڑا ہوتا ہے۔نہ محسوس ہو تو کوئی غم بھی بڑا نہیں ہوتا۔

سوال۔سر جس طرح ایک ڈاکٹر بننے کیلئے میڈیکل کالج اور وکیل بننے کیلئے لا کالج میں پڑھنا ضروری ہے۔حکمت و دانائی مگر کسی ڈگری کی محتاج نہیں کئی عطائی ڈاکٹر تعلیم یافتہ ایم بی بی ایس ڈاکٹر سے بہتر تشخیص کر لیتے ہیں۔مگر سند نا ہونے کے وجہ سے وہ بند کر دیے جاتے ہیں تا کہ وہ علاج جو 200 روپے میں کر سکتے وہ ڈگری یافتہ ٹیسٹ اور ایکسرے کے محتاج 2000 روپے خرچ کروا دیتے ہیں۔ادب میں پرائمری پاس بندہ نام کما سکتا ہے؟

جواب۔ڈگری ادیب نہیں بناتی ورنہ ہر پی ایچ ڈی کی ڈگری لینے والا بڑا ادیب ہوتا۔اب تو پی ایچ ڈی ان پر ہو رہی ہے جو پرائمری بھی پاس نہیں تھے۔یہاں ہنر بولتا ہے ڈگری نہیں۔تعلیم اور ڈگریاں ایک ہی چیز نہیں ہیں۔یہ ضروری نہیں کہ صرف ڈگریاں لینے والا ہی تعلیم یافتہ ہو۔ڈگریاں تو یونی ورسٹی میں پڑھنے کی رسیدیں ہیں۔یہ الگ بات ہے وہاں پڑھ کر آپ نے تعلیم حاصل کی یا نہیں۔

سوال۔آپ کی تحاریر کن کن رسائل میں شائع ہو چکی ہیں؟

جواب۔مکمل فہرست تو بہت مشکل ہے لیکن اتنا ہے کہ غالباً 2008 میں ایک بار میں نے ایک ماہ کے رسائل کی فہرست بنائی تھی تب ایک ماہ میں 20 رسائل میں میری مختلف تحاریر شائع ہوئی تھیں۔یہ تعداد ہر ماہ زیادہ یا کم ہو جاتی تھی۔میں ان دنوں ایک رسالے کو ایک ہی ماہ میں ایک سال کی تحاریر بھیج دیتا تھا اور پھر اگلے رسالے کو بھی اسی طرح سال بھر کی تحاریر بھجوا دیتا تھا۔ایک ماہ میں لگ بھگ تین رسائل کو اتنا مواد دے دیتا تھا۔اور اگلے ماہ اگلے تین رسائل کی باری آ جاتی تھی، یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا اور لگ بھگ بیس رسائل میں بیک وقت شائع ہونے لگا تھا۔

سوال۔کیا آپ نے زندگی کے کسی لمحہ میں موت کا حقیقی خوف محسوس کیا؟ اس وقت آپ کے احساسات کیا تھے؟

جواب۔کئی بار ایسا ہوا ہے۔میری صحافت ہی ایسی تھی۔حادثات کی بات کروں تو ابھی چند روز قبل ایک ایسے ہی حادثے میں بال بال بچا تب آخری لمحات میں خیال آیا کہ میرے گھر والوں کو کیسے خبر ہو گی اور اب ان کا خیال کون رکھے گا۔

سوال۔آپ انٹیلی جنس امور اور طالبانائزیشن کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔آپ کی نظر میں طالبان (جو پاک وطن میں دہشت گردی کر رہے ہیں) وہ واقعی مسلمان ہیں؟ اور ان کے پیچھے کس کا ذہن کام کر رہا ہے؟

جواب۔مسلمانی کا فیصلہ تو رب نے کرنا ہے مجھے یہ معلوم ہے کہ پاکستان میں جو گروپ طالبان کے نام سے کام کر رہے تھے ان میں مختلف ممالک کے تیار کردہ لوگ بھی شامل تھے۔را، موساد، خاد، راما، سمیت کئی ایجنسیاں ملوث تھیں۔باقیوں کو چھوڑیں مشہور زمانہ ریمنڈ ڈیوس نسوار کا عادی تھا۔اندازہ خود لگا لیں کہ وہ گرفتاری سے قبل کن علاقوں میں رہا ہو گا جہاں نسوار کی لت لگ گئی۔

سوال۔بچوں کے ادب سے کیا کہتے ہیں، سرکاری سطح پر کوئی کام ہو رہا ہے کہ نہیں؟

جواب۔سب سے زیادہ کام ہی بچوں کے ادب پر ہو رہا ہے۔ایوارڈز اور ورکشاپس بچوں کے ادب میں ہی نظر آتی ہیں۔

سوال۔لکھاری جب تک شہرت کی بلندیوں کو نہ چھوئے پبلیشر اس کی کتاب شائع کرنے کو تیار نہیں ہوتے نئے لکھاری کتاب شائع کروانے کے چکر میں اپنی جمع پونجی

سے ہاتھ صاف کر بیٹھے ہیں، اس بارے کچھ کہیں گے

جواب۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ سمندر کا راستہ نہیں روک سکتے۔ اچھا لکھنے والا اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔ مسئلہ صرف اتنا ہے کہ ہم پہلی ہی تحریر کے ساتھ شہرت کے طلبگار ہو جاتے ہیں جبکہ حقیقی ادیب صرف اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لئے لکھتا ہے۔ شہرت تو خدا خود ہی دے دیتا ہے۔ آپ اچھا لکھتے ہیں تو آپ خود ہی ہر رسالے، اخبار اور ٹی وی کی ضرورت بن جائیں گے۔ مجھے یاد ہے ایک محفل میں ایک نوجوان نے مستنصر حسین تارڑ صاحب سے کہا کہ میں آپ جیسا اچھا کیسے لکھ سکتا ہوں۔ انہوں نے مسکرا کر کہا کہ مجھ جیسا اچھا لکھنے کے لئے آپ کو بھی 70 سال کی عمر چاہئے جس میں مسلسل لکھتے رہے ہوں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ شہرت ایک دن میں نہیں ملتی اور نہ ہی تجربے کا کوئی شارٹ کٹ ہوتا ہے باقی جہاں تک پبلشر کی بات ہے تو وہ تو کاروبار کر رہا ہے۔ اسے جہاں ایسے لوگ مل جاتے ہیں جو کتاب کی اشاعت کے اخراجات اٹھا لیتے ہیں وہیں وہ بھاری معاوضہ دے کر عمیرہ احمد، ہاشم ندیم وغیرہ کو بھی چھاپنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

سوال۔ آپ کو ملک کا وزیر اعظم بنا دیا جائے تو پہلا قانون کونسا سا پاس کروائیں گے، پہلا حکم کیا صادر فرمائیں گے

جواب۔ پارلیمنٹ صرف قانون سازی کرے گی۔ باقی فنڈز، سڑکیں بنانا، گلیاں پکی کروانا، اختیارات، تبادلے، نوکریاں یہ سب کام جن جن محکموں کے ہیں وہی کریں گے۔

سوال۔ میں ڈرامہ لکھنا چاہتا ہوں۔ میری رہنمائی کریں؟

جواب۔ نئے آئیڈیاز سوچیں، کسی ڈرامہ رائیٹر کے ساتھ چھوٹا بن کر کچھ عرصہ کام کریں اور اس سے یہ ہنر سیکھ لیں پروڈیسرز اور پروڈکشن ہاؤسز کے ساتھ رابطے بڑھائیں اور دیکھیں کہ مارکیٹ کی ڈیمانڈ کیا ہے۔

سوال۔ کیسا ادب وقت کی ضرورت ہے تفصیلی جواب درکار ہے

جواب۔ ادب کبھی بھی وقت کی ضرورت نہیں ہوتا۔ وقت ادب کا محتاج ہوتا ہے۔ کئی نامور ادیبوں اور شاعروں کو ان کی موت کے بھی کئی سال بعد تسلیم کیا گیا ہے۔

سوال۔ آپ نے بہت سی اہم شخصیات کے انٹرویو کیے ہیں۔ سب سے پہلا انٹرویوز کس کا کیا تھا؟۔ اور اب تک آخری کس اہم شخصیت کا کر چکے ہیں؟

جواب۔ غالباً سب سے پہلا انٹرویو ایک ایسے سیاست دان کا کیا تھا جو اعلانیہ خود کو ضمیر فروش قرار دیتا ہے اور آمریت کے دور میں اس کا نعرہ تھا کہ مشرف مجھے موقع دے تو میں بوٹ پالش کرنے کے ساتھ ساتھ تسمے بھی باندھا کروں گا۔ بنیادی طور پر یہ شخص موجودہ سیاست پر چلتا پھرتا طنز ہے۔ جو اپنا انتخابی نشان لوٹا رکھتا تھا اور خود کو متبادل وزیر اعظم قرار دیتا ہے۔ تمام بڑی سیاسی شخصیات کے مقابلے میں الیکشن ہار چکا ہے۔ اس کا نام نواب ڈاکٹر امبر شہزادہ ہے۔ یہ صاحب شاعر بھی ہیں۔ دوسرا انٹرویو شاید جنرل حمید گل صاحب کا کیا تھا جو ماہنامہ حکایت میں شائع ہوا۔ فیملی میگزین نوائے وقت کے لئے ایک بڑا اور اہم انٹرویو فن لینڈ کے سفیر کا کیا تھا۔ انٹرویوز کی تعداد تو اب یاد نہیں ہے۔ آخری انٹرویو غالباً جنرل راحت لطیف صاحب کا کیا ہے جو بھٹو کی پھانسی کے حوالے سے تھا کیونکہ جنرل صاحب اس وقت پنڈی کے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر تھے۔

سوال۔ آپ نے اب تک کتنے اخبارات میں کس کس عہدے پر کام؟ کتنا کتنا عرصہ کام کیا ہے؟۔

جواب۔ لگ بھگ دس سال کی صحافتی زندگی گزار چکا ہوں۔ چینل فائیو (خبریں) میں اسسٹنٹ پروڈیوسر، حکایت میں انویسٹی گیشن سیل کا انچارج، حکومت اور سرزمین میں انویسٹی گیشن سیل کا انچارج رہا۔ روزنامہ جناح میں رپورٹر، روزنامہ دنیا میں ایڈیٹوریل سیکشن میں مزدوری کی، نوائے وقت میں سب ایڈیٹر، اے آر وائے میں سکرپٹ رائیٹر، 24 نیوز چینل میں سکرپٹ رائیٹر، سرکاری ریڈیو پاکستان میں بھی سکرپٹ رائیٹر رہا ہوں۔ چند اور اداروں سے بھی منسلک رہا ہوں۔ نئی بات سے بطور کالم نگار منسلک۔

سوال۔ آج کل الیکٹرانک میڈیا کا دور ہے۔ پرنٹ میڈیا بس گزارہ کر رہا ہے۔ یہ بتائیں کہ ویب سائیٹس کو

فنڈنگ کہاں سے ہوتی ہے۔

جواب۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ کوئی فرشتہ اتر کر فنڈنگ کرے گا تو یہ ممکن نہیں ہے۔ ویب سائیٹ کو ریٹنگ کے حساب سے گوگل ایڈ بھی ملتے ہیں لیکن سمجھدار لوگ اس چکر میں پڑنے کی بجائے اپنی مارکیٹنگ خود کرتے ہیں۔ جس طرح اخبار کے لئے اشتہار لیا جاتا ہے ویسے ہی لوگوں کو قائل کرتے ہیں کہ ان کی ویب سائیٹ کو اشتہار دینے سے ان کے کاروبار کو کتنی شہرت مل سکتی ہے۔

سوال۔ کبھی ایسا ہوا ہے کہ آپ کو وہ کچھ لکھنا پڑا، جو آپ لکھنا نہیں چاہتے تھے؟

جواب۔ پروفیشنل لکھاری کو ایسا بہت کچھ لکھنا پڑتا ہے جو وہ نہیں لکھنا چاہتا۔ بطور ادیب یا کالم نگار میں نے وہی لکھا ہے جو میرے مزاج کے مطابق ہو لیکن بطور سکرپٹ رائیٹر بات صرف ہماری مرضی کی نہیں ہوتی۔ پروڈیوسرز سمیت پوری ٹیم ہوتی ہے جو اس معاملے میں شامل ہوتی ہے۔ مثلاً ایک کرائم شو کا سکرپٹ لکھتے وقت میں قتل کا ایک منظر نہیں دکھانا چاہتا تھا لیکن چینل اور پروڈیوسر کی ڈیمانڈ تھی کہ یہ منظر بھی شامل ہونا چاہئے سو وہ شامل کرنا پڑا۔

سوال۔ کمرشل ادیب بننے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟

جواب۔ تحریر کے دم پر۔ اداروں کی ضرورت بننا چاہئے۔ مثال کے طور پر ایک ڈرامہ رائیٹر ایک قسط لکھنے کے 30 ہزار لیتا ہے اور یہیں ایک ڈرامہ رائیٹر ایک قسط لکھنے کے ایک لاکھ سے بھی زیادہ لیتا ہے۔ یاد رہے ایک ڈرامہ کم از کم 36 اقساط کا ہوتا ہے۔ معاوضہ میں یہ فرق اس لئے ہے کہ مہنگے لکھاری کے ڈائیلاگز انوکھے اور فلسفہ سے بھرپور ہوتے ہیں اور اس کا لکھا کوئی ڈرامہ فلاپ نہیں گیا۔ یاد رہے یہ ایک مسلسل سفر ہے۔ ایک قسط کا 30 ہزار لینے والے نے 10 ہزار میں مکمل ڈرامہ بھی لکھ کر دیا تھا۔

سوال۔ صحافتی زندگی کا کوئی مزے دار واقعہ سنائیں؟

جواب۔ میں ایک ہائی پروفائل شخصیت کا انٹرویو کرنے گیا تو ان کے کمرے میں بیٹھتے ہی ان کے اسسٹنٹ نے پستول لا کر میز پر رکھ دیا۔ انہوں ن پستول اٹھایا اور کہنے لگے: اچھا تو شاہ صاحب آپ ہمارا انٹرویو کرنا چاہتے ہیں؟ اور پھر مسکراتے ہوئے پستول جیب میں رکھ لیا۔ یہ محض نفسیاتی گیم تھی لیکن میں نے سخت سوالات پر مشتمل ہی انٹرویو کیا جسے بعد میں انہوں نے بھی پسند کیا۔

ایک بڑے سیاست دان اور اس وقت کے اپوزیشن لیڈر کا انٹرویو کرنے اسمبلی میں اس کے دفتر گیا تو وہ انٹرویو سے قبل عجیب وغریب حرکتیں کرنے لگے۔ کنگھی کی، نئی واسکٹ منگوائی، پانی منگوا کر وہیں باسکٹ میں غرارے کئے۔ پھر کچھ ایسی ہی مزید حرکات کیں۔ میں انٹرویو کئے بنا ہی واپس آ گیا اور پھر کالم لکھ مارا کہ یہ ہمارے نمائندے ہرگز نہیں ہوسکتے۔

سوال۔ حساس عدم تحفظ، لاقانونیت، دہشت گردی، منافقین کے گروہ، سیاسی بازیگریاں، عوام کا جذباتی استحصال، سیاستدانوں کی بے حس خاموشی آپ اس ضمن میں کیا کہیں گے؟

جواب۔ ہماری جذباتیت اور کم علمی۔ یہ سب ہمارا آئینہ ہے۔ ہم ٹھیک ہوتے تو شاید یہ سب بھی نہ ہوتا کیونکہ کہیں نہ کہیں ہم ہی استعمال ہوئے ہیں اور تا حال ہو رہے ہیں۔

سوال۔ جتنا بھی بڑا سانحہ ہو۔ میڈیا کا واویلا دو دن بعد جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔ میڈیا کی اس پالیسی کو آپ کیا کہیں گے؟

جواب۔ ہر سانحہ کے بعد ہمیں ایک اور سانحہ کا سامنا ہوتا ہے۔ میڈیا کب تک کسی سانحہ کو کور کرے گا؟ دوسری بات یہ کہ ہماری اپنی یادداشت بھی تو ایسی ہی ہے۔ میڈیا کسی سانحہ کو دو دن سے زیادہ چلائے تو ہم وہ چینل ہی نہیں دیکھتے۔

سوال۔ آپ کا یہ انٹرویو نئے افق کے لیے کیا جا رہا ہے آپ کی کہانیاں بھی نئے افق میں شائع ہوتی رہی ہیں کچھ کہیں گے؟

جواب۔ نئے افق کی پالیسی جاندار ہے۔ میرا خیال ہے اس کے مالکان کو مشورے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ طویل عرصہ سے اسی فیلڈ میں ہیں اور کم از کم مجھ سے زیادہ بہتر انداز میں مارکیٹ اور قاری دونوں کی ڈیمانڈ سمجھتے ہیں۔ نئے افق میں چھپا کسی اعزاز سے کم نہیں ہوتا۔

سوال۔ آپ کی زندگی میں کوئی ایسا ناخوشگوار واقعہ جس نے آپ کو پہلی مرتبہ قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا ہو اور آپ کے قلم نے اس پر جراحت کا کام کیا ہو؟

جواب۔میری پہلی تحقیقاتی رپورٹ بلوچستان کے حالات پر تھی۔ادیب اور صحافی معاشرے سے الگ نہیں ہوتے۔صحافتی سفر کے دوران بے شمار ایسے واقعات رونما ہوئے جنہوں نے لکھنے پر مجبور کیا اور بعض اوقات کاپی (اخباری ٹرم) روک کر بھی رپورٹ فائل کروائی۔

سوال۔کسی مصنف کی تحریر پر منفی انداز میں تبصرہ مصنف پر کس قسم کا اثر کرتا ہے؟

جواب۔مصنف کے مزاج کے حوالے الگ الگ اثرات ہوتے ہیں۔کوئی بددل ہو جاتا ہے تو کوئی منفی تبصروں پر توجہ ہی نہیں دیتا۔مجھ کو یہ تبصرے اڑنا سکھاتے ہیں۔

سوال۔آپ کس سلسلہ میں بیعت ہیں؟ کوئی ایسی ہستی جس سے آپ بیعت ہونے کے اعتبار سے منسک ہوں؟

جواب۔میں نے اپنی والدین کی بیعت کی ہوئی ہے۔ ہمارا سب سے بڑا پیر ہمارے گھر میں ہوتا ہے۔

سوال۔والدین کے بارے میں اولاد کو دو جملوں میں نصیحت؟

جواب۔زندگی والدین کے بنا نہ تو ملتی ہے اور نہ ہی بنتی ہے۔سو یہ سوچنا بھی غلط ہے کہ والدین کی حکم عدولی کر کے زندگی بن جائے گی

سوال۔ایک پسندیدہ قول سنائیں؟

جواب۔بے وقوف انسان کا دل اسکے منہ میں ہوتا ہے اور عقلمند انسان کا منہ اسکے دل میں ہوتا ہے!

سوال۔اپنی پسند کا کوئی ایک شعر سنائیں؟

جواب۔صبح ہوتے ہی چلے جاتے ہیں
خواب تعبیر کو کھا جاتے ہیں

سوال۔آپ اپنی دس پسندیدہ ترین بکس بتائیں۔ان میں اسلامی بکس شامل نہیں ہیں؟

جواب۔لبیک ،خدا کی بستی ،میڈیا منڈی ، ناپاک ، عمیرہ احمد کے ناول ،عمران سیریز ، پاکستانی سیاست کے رازدان صحافی ، داستان ایمان فروشوں کی ، انگلش ادب میں یوکانٹ ریڈ دس بک وغیرہ

سوال۔اگر آپ کو کوئی چیز چرانے کو کہا جائے ،تو کیا چرائیں گے؟

جواب۔کسی معصوم بچے کی آنکھ کی حیرانی۔

سوال۔آپ اپنا ایک دن کا ٹائم ٹیبل بتائیں؟معمولات زندگی کب بیدار ہوتے ہیں کب سوتے ہیں؟یہ بیداری کا وقفہ کیسے گزارتے ہیں؟

جواب۔کئی صحافیوں کی طرح میرا بھی کوئی ٹائم ٹیبل نہیں ہے۔رات کس وقت گھر پہنچوں گا اس کا بھی علم نہیں ہوتا۔عموما رات 2 بجے تک سوتا ہوں کیونکہ اس وقت والدین تہجد کے لئے اٹھتے ہیں۔صبح 7 بجے مجھ سمیت ناشتہ سب نے ایک ساتھ کرنا ہوتا ہے۔البتہ مجھے یہ علم ہوتا ہے کہ میں نے ایک دن میں کیا کام کرنے ہیں۔دفتر کی ذمہ داریاں، پریس کلبس کی نشست، صحافتی یونین کے احتجاجی مظاہرے میں شرکت ، دوستوں سے ملاقاتیں ،اور رات گئے تک کوئی کتاب پڑھتے پڑھتے سوجانا۔

سوال۔سر کردار نگاری سے کیا مراد ہے ذرا تفصیل سے بتائیں؟

جواب۔ادبی تحریر خصوصا افسانہ ، ناول ، سفرنامہ ، یا ناولٹ وغیرہ کچھ کرداروں کے سہارے چلتا ہے۔اب دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ آپ نے جس کردار کو متعارف کروایا ہے اس کے مکالمے ،نشست و برخاست اور سوچ کو کس طرح نبھایا ہے۔ایسے جملے جن سے اس کی شخصیت کی مکمل عکاسی ہو اور پڑھنے والے کو الگ سے نہ بتانا پڑے کہ فلاں کردار نیک یا بد، یہ سب اس کردار سے خود ہی معلوم ہو جائے۔اسی طرح یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ آپ کی تحریر کی ضرورت کے مطابق ہی سب کردار ہیں، ایسا تو نہیں کہ کسی کردار کی ضرورت ہی نہیں تھی اور آپ نے شامل کر رکھا ہے یا کسی کی بہت ضرورت تھی لیکن آپ نے اسے شامل ہی نہیں کیا۔کردار نگاری بہت اہمیت کی حامل ہے کیونکہ اکثر کردار ہی قاری کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہیں

سوال۔ترقی کیسے ممکن ہے؟

جواب۔میں نے یہی سیکھا کہ ترقی کا کوئی شارٹ کٹ نہیں ہوتا۔اگر آپ ایک مرحلہ طے کئے بنا اگلے مرحلے میں چھلانگ لگا بھی دیتے ہیں تو پھر آپ کو جلد ہی اسی رفتار سے واپس آنا پڑتا ہے اور، میں نے ایسے کئی لوگوں کو گمنامی کی دلدل میں ڈوبتے دیکھا ہے

سوال۔میڈیا میں کون سا شعبہ سب سے اہم ہے

؟ جس میں پیسہ ہو، عزت ہو؟

جواب۔ ہر بیٹ کی اپنی ایک اہمیت ہوتی ہے۔ سوال یہ نہیں کہ زیادہ اہم کونسی بیٹ ہے، سوال یہ ہے کہ آپ کس بیٹ کو زیادہ اچھے انداز میں نبھا سکتے ہیں۔ ویسے مجھے سیکرٹریٹ یعنی بیوروکریسی کی بیٹ زیادہ اچھی لگتی ہے کیونکہ یہاں آپ کو سبھی محکموں سے معلومات ملتی ہیں اور آپ کے جنرل نالج میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ میں نے اس شعبے میں لوگوں کو خون تھوکتے بھی دیکھا ہے، خودکشی کرتے بھی دیکھا ہے۔ میڈیا کی باہر بیٹھ کر جتنی چکا چوند نظر آتی ہے یہ اندر سے اتنا ہی بھیانک شعبہ ہے۔

نئے لوگوں کے پاس آئیڈیاز بہت ہوتے ہیں، جوش و جذبہ بھی بہت ہوتا ہے لیکن انہیں تب مایوسی ہوتی ہے جب انہیں وہ سب نظر نہیں آتا جیسا کہ وہ سوچ رہے ہوتے ہیں۔ زیادہ تر نوجوان اینکر یا کالم نگار بننا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ان میں پیسہ بھی ہے اور عزت بھی۔ لیکن یاد رہے ڈائریکٹ اس پوسٹ پر آنے والے بہت جلد فلاپ ہوجاتے ہیں۔ آپ کو بیک سٹیپ پر رہتے ہوئے پہلے اس فیلڈ کو سمجھنا ہوگا، اپنے فیلڈ تعلقات مضبوط کرنے ہوں گے اس کے بعد فرنٹ فٹ پر آئیں گے تو مشکلات نہیں رہیں گی

سوال:۔ آپ کی باتوں سے خاص کر فیس بک پوسٹ سے محسوس ہوتا ہے۔ آپ محسوس نہ کریں تو آپ کو ایک مجازی محبت ہوئی کبھی یا ہوئی ہے؟

جواب۔ محبت تو خدا کا تحفہ ہے اور یہ وہ سوغات ہے جسے خدا کی صفت کہا جاسکتا ہے کیونکہ خدا نے آقا دو جہان کو اپنا محبوب قرار دیا ہے۔ اگر کسی انسان کے دل میں محبت کا کوئی جذبہ نہیں تو ہم اسے انسان نہیں کہہ سکتے۔ میں ایسی محبت کا قائل ہوں جو آپ پر عشق حقیقی کے مفاہیم آشکار کرنے لگے۔ میں نے انسانوں سے محبت کرنا ہی تو سیکھا ہے۔

سوال۔ لکھنے میں آخر ایسی کیا چس ہے کہ منہ کو لگی یہ نہ چھوڑی جائے؟ ہر ایک کاروباری اور شوقین شخص برے حالات میں اپنا کاروبار بدل لیتا ہے اور بہت سوں نے شوق سے منہ موڑ لیا مگر ادیب واحد قوم ہے جو برسوں نہیں بلکہ عمر بھر خود بھی بھوکے مرتے ہیں اور ساتھ رشتہ داروں کو بھی مارتے ہیں مگر لکھنا نہیں چھوڑتے۔

جواب۔ دراصل ہمارے یہاں ادیبوں کی کیرئر کونسلنگ کا کوئی سسٹم نہیں ہے۔ ہمارے پبلشرز نے بھی ایسا کوئی انتظام نہیں کیا۔ مارکیٹ میں ایسا کوئی پلیٹ فارم بھی نہیں جو پبلشی کے مراحل میں مدد کرتا ہو۔ میں اس حوالے سے کوشش کر رہا ہوں کہ ایسا کوئی سسٹم بن سکے جو ادیبوں کو گائیڈ کرے کہ اس وقت مارکیٹ میں کس طرح کا مواد کمرشل بنیادوں پر بک سکتا ہے۔ لکھنے کے حوالے سے ان کی تکنیکی معاونت کر سکے اور اشاعت کے بعد اس کتاب کی مارکٹنگ کو بہتر انداز میں کر سکے۔ یہ یاد رکھیں کہ کتاب آج بھی پڑھی جاتی ہے اور اچھا لکھنے والا آج بھی پاکستان میں لاکھوں روپے رائلٹی لے رہا ہے۔ اصل میں یہ ایک شوق ہے جیسے دیگر بہت سے شوق ہوتے ہیں۔ شوق یا مشغلہ ہمیں خوشی دیتا ہے۔ اور اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے۔ کچھ اپنا نام و شہرت کے لیے لکھتے ہیں۔ کچھ کتھارسس کے لیے۔ حتمی جواب مشکل ہے۔

سوال۔ برصغیر کا ادیب معاشی خوشحالی کے لحاظ سے مغربی ادیب سے کئی سو سال پیچھے ہے۔ اکثر اپنی کتابیں خود چھپوا رہے ہوتے ہیں اور چند مشہور اور بڑے ادیبوں کے علاوہ باقیوں کو رائیلٹی بھی نہیں ملتی۔ ہمارا ادیب اپنی کہانیوں اور شاعری سے وہ ماحول کیوں نہیں بنا پایا جہاں اسے بھی معاشرے کا ایک فرد سمجھا جائے اور یہ معاشی طور پر خوش حال ہو سکے۔

جواب۔ ایک جگہ پڑھا تھا کہ ہمارا ایک المیہ یہ ہے کہ جنہیں پڑھنا چاہئے وہ لکھ رہے ہیں۔ اگر ہم ادب، فلسفہ اور معاشرت پڑھے بنا بس لکھتے جائیں گے تو کون پڑھنا چاہے گا۔ میری یہی بحث رہتی ہے کہ ہمیں ایک پلیٹ فارم بنانا ہوگا جہاں معلومات کے تبادلے کا انتظام ہو، لکھنے والوں کو راہنمائی فراہم کی جائے، لکھی ہوئی چیزوں پر تبادلہ خیال ہو۔ چیز چھپنے سے پہلے ایڈیٹرز کی رائے لی جائے۔ یعنی یہ ادبی تھنک ٹینک ہو۔ اگر ہم یہ سب نہیں کریں گے تو رسائل و جرائد کو بھی نقصان ہوگا اور ادیب کو بھی۔

سوال۔ صحافت کو آئندہ برس کس سمت کی طرف جاتا دیکھتے ہیں جبکہ کمرشلزم تو پیک پر ہے؟

جواب۔ صحافت کمرشل ازم سے آگے نکل گئی ہے۔

سیٹھ مافیا نے اس کا یہ حال کر دیا ہے کہ اب نہ تو نظریہ رہا ہے اور نہ ہی اصول وضابطہ اخلاق۔ اب تو رپورٹر سے پہلے مالک چیک پکڑ لیتا ہے اور پورے چینل کی ایک پالیسی بنا دیتا ہے۔ اس کے باوجود میں مایوس نہیں ہوں کیونکہ لوگوں کی ناپسندیدگی ہی اسے اس کے اصل روپ میں واپس لانے کا باعث بنے گی۔ میں سمجھتا ہوں ورکرز کو مل کر اپنا ایک گروپ لانا چاہیئے جس کے فنانسز بزنس ٹائیکون ہی ہوں گے لیکن ان کو پالیسی کی بجائے شیئر کے حساب سے شامل کیا جائے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو صحافت بالکل تباہ ہو جائے گی۔

سوال۔ آپ نے ناول پات کو لکھنا کیوں شروع کیا تھا۔ یہ خیال کیسے آیا۔ اس کا مرکزی خیال کیا ہے۔ اب اسے ادھورا کیوں چھوڑ رہے ہیں۔

جواب۔ پات دراصل ایک انٹرویو کے درمیان ہونے والی ایک بحث کا نتیجہ ہے۔ اس بحث کے دوران یورپ کے اور پاکستان کے ادبی منظرنامے پر بات ہو رہی تھی تو میں نے پاکستان میں مشترکہ ناول نگاری کے آئڈیے کو اپنانے کی حوصلہ افزائی کی اور پہلے تجربے کے طور پر اپنے آپ کو پیش کیا۔ نئے افق کے پہلے مدیر عمران قریشی صاحب نے بھی حوصلہ افزائی کی اور طے پایا کہ عشنا کوثر سردار اور میں مشترکہ اردو ناول کی بنیاد رکھیں گے۔ اس کے بعد دو سال مصروفیات اور ناول کی لوکیشن کے حوالے سے زمینی دوروں کی نظر ہوئے۔ پھر کام شروع ہوا۔ امید ہے اگلے برس تک مکمل ہو جائے گا۔ پات محبت کی ایسی داستان ہے جس مین عشق حقیقی کا عکس پڑتا ہے۔ یہ شاہوں کی حویلی سے شروع ہوتی ہے۔ اس میں یورپ اور پاکستان کا کلچر دکھایا گیا ہے۔

سوال۔ آپ نے ویڈیو پروڈکشن کا بھی کوئی ادارہ بنایا تھا۔ کیا بنا اس کا؟

جواب۔ اس ادارے کے تحت بھی دوست کام کر رہے ہیں۔ میری کوشش رہی ہے کہ نئے ٹیلنٹ کے لئے پلیٹ فارم تشکیل دیتا رہوں۔ کیونکہ ہم لوگ بہت زیادی ٹیلنٹ ہر سال ضائع کر دیتے ہیں۔ جن لوگوں نے کارنامے سرانجام دینا ہوتے ہیں وہ چند ہزار کی ملازمت کی زنجیریں پہن کر قید ہو جاتے ہیں میں یہ سسٹم تبدیل کرنا چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں اکیلا ہر کام نہیں کر سکتا اس لئے۔

سوال۔ آپ نے پاک ٹی ہاؤس کی یاد تازہ کر دی کیفے درویش کو کھول کر اس کا مستقبل کیا ہے؟

جواب۔ مجھے لگتا ہے کسی دن کیفے درویش کو پریس کلب لاہور کی جواں عمر سوتن قرار دے دیا جائے گا جہاں صحافیوں، لکھاریوں، شاعروں، دانشوروں اور سیاستدانوں کے علاوہ چائے، کولڈ ڈرنکس، تکہ کباب، سنیکس، برگر، سینڈوچ اور دیگر خوراک بھی بہ افراط پائی جاتی ہیں، گویا

لذت کام ودہن اور
فرصت کام وذہن ساتھ ساتھ

سوال۔ آپ بہت سی کالمسٹ تنظیموں کے بانی یا صدر وغیرہ ہیں۔ یہ خیال کیسے آیا۔ اس کے فوائد ونقصان کیا ہوئے؟

جواب۔ اتفاق سے اس وقت جتنی کالمسٹ تنظیمیں کام کر رہی ہیں ان مین سب سے پہلی کا آئڈیا بھی میرا ہی تھا۔ اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ دانشوروں کو اکٹھا کریں اور جونیئر وسینئرز کے درمیان جو فاصلے ہیں انہیں ختم کیا جا سکے۔ میں دو سال اس کا صدر بھی منتخب ہوا اور اس دوران ہم نے جو ورکشاپس کروائیں، جس طرح صف اول کے کالم نگاروں کو نئے لکھنے والوں کے ساتھ مکالمے کی میز پر بٹھایا وہ سب آپ بھی جانتے ہیں۔ میرا اختلاف بھی یہی ہوا تھا کہ جس مقصد کے لئے ہم اکٹھے ہوئے تھے وہ مقصد پورا نہیں ہو رہا بلکہ کچھ لوگ پلیٹ فارم کو اپنے مفادات کی بھینٹ چڑھا رہے ہیں۔ انہی اختلافات کی بنیاد پر میں الگ ہو گیا تو میرے ساتھ کئی نوجوان بھی الگ ہو گئے۔ دوستی کا تعلق البتہ ہم نے قائم رکھا۔ میری سوچ یہ تھی کہ اگر ہم ڈلیور نہیں کر پا رہے تو پھر بلا مقصد عہدوں پر نہیں رہنا چاہیئے۔ اس کے بعد مختلف دوستوں نے تنظیمیں بنائیں۔ اتفاق سے سبھی کی بنیاد رکھتے وقت میں ابتدائی مشاورت میں مجھے شامل کیا گیا لیکن پھر مایوسی ہوئی کہ لوگوں نے ان تنظیموں کو ذاتی تعلقات کا ذریعے سمجھ لیا ہے۔ میں اب بھی متعدد تنظیموں کا عہدے دار ہوں۔ ورلڈ کالمسٹ کلب کا وائس چیئرمین ہوں، پاکستان کونسل آف میڈیا رائیٹرز کا صدر ہوں۔ پنجاب یونین آف جرنلسٹ کا الیکشن بھی جیتا



اور جوائنٹ سیکرٹری ہوں ۔ دوستوں کی محبتیں ہیں کہ ہر بار انہوں نے مجھے بھاری اکثریت دلائی لیکن سچی بات یہ ہے کہ کالمسٹ اور صحافتی تنظیمیں وہ کام نہیں کر پا رہیں جو کرنا چاہئے تھا۔ اس کے پیچھے کئی وجوہات ہیں ۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ پیراشوٹرز نے ہر جگہ اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے جس کے خلاف تاحال جنگ لڑ رہے ہیں۔

سوال ۔ آپ نے مائیکرو فنانس پارٹنر شپ کا سلسلہ شروع کیا ہے ۔ یہ کیا ہے ۔ کچھ قارئین کو بتائیں تا کہ وہ زندگی میں تبدیلیاں لاسکیں؟

جواب ۔ مائیکرو فنانس پارٹنر شپ دراصل ایک ایسا سلسلہ ہے جس میں محدود آمدنی والے دو تین یا اس سے زائد لوگ مل کر اپنا بزنس شروع کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ کے پاس برگر کا ایک ٹھیلہ لگانے کے پیسے ہیں لیکن آپ کو معاشرہ اجازت نہیں دیتا کہ آپ ریڑھی یا ٹھیلہ لگائیں تو آپ 3، 4 دوست مل کر کام شروع کر لیں ۔ ایک دکان لیں جس کا کرایہ تقسیم ہو گا ۔ کرسیاں میز بھی کے استعمال میں ہوں گی اور وہاں چار فوڈ آئٹمز لگا کر اس دکان کو فوڈ کارنر کا نام دے دیں ۔ اب اتنے ہی پیسوں سے آپ ٹھیلہ کی بجائے دکان کے مالک ہیں اور وہاں بیٹھتے وقت آپ کو شرمندگی نہیں ہوگی ۔ یہ وہ نظریہ ہے جس پر میں نے نوجوانوں کو ابھارنے کی کوشش کی ہے کہ معمولی ملازمتوں کو محض بھرم رکھنے کے لئے جاری رکھنے سے بہتر ہے اپنا کاروبار شروع کریں ۔ اس میں سکوپ زیادہ ہے ، کاروبار بڑھتا جاتا ہے اور آپ کو باس کی باتیں بھی نہیں سننا پڑتیں ۔ اب ہمارے پاس ایسے کئی نوجوان آ چکے ہیں جو اس نظریہ کے تحت کام کر رہے ہیں ۔ عین ممکن ہے اگلے برس ہم اس سارے نیٹ ورک کو کمپنی میں تبدیل کر دیں ۔ بہرحال اس حوالے سے نوجوانوں کا اچھا رسپانس آ رہا ہے کیونکہ مارکیٹ میں ملازمتیں محدود ہونے کی وجہ سے بے روزگاری میں اضافہ ہو رہا ہے۔

(سوال) میری کافی عرصہ سے خواہش تھی کہ آپ کا انٹرویو کرنے کی ۔ اللہ کا شکر ہے پوری ہوئی ۔ میں آپ کا بے حد مشکور ہوں جو آپ نے اتنا قیمتی وقت نکالا ۔ کڑوے کسیلے سوالات سنے اور ان کے جواب دیئے ۔ آپ کی قدر ہمارے دل میں پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ چکی ہے ۔ اللہ آپ کو خوش رکھے اور مزید کامیابیاں عطا فرمائے ۔ آپ یوں ادب کی خدمت کرتے رہیں ۔ ہمارے انٹرویو پینل (خرم شہزاد ، ایم اکرم میاں ، عدیل عادی ، شبیر علوی ، مجید امجد جائی ، نعمان عظیمی) کی طرف سے آپ کا شکریہ جو اتنا وقت دیا ۔ ہمیں سیکھنے کا موقع ملا ۔ اللہ آپ کو مزید کامیابیاں عطا فرمائے ۔

جواب :۔ آپ سب کا بھی شکریہ اللہ آپ سب کو ایسے ہی متحد اور خوش رکھے ۔ آپ اور سب قارئین کے لیے یہ شعر

فیس بک کے باہر بھی بات کیجئے<br>
کبھی لاہور آیئے تو ملاقات کیجئے

# ناگہانی آفت

**ناظم بخاری**

عام انسان' سرمایہ کار' سیاستدان کیا کیا منصوبے بناتے ہیں لیکن وہ ایک بڑے منصوبہ ساز کو فراموش کر بیٹھے ہیں جو اوپر بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا ہوتا ہے اور اسی کا فیصلہ آخری ہوتا ہے۔

سسپنس سے پر ایک خوب صورت کہانی جس کا اختتام پڑھ کر آپ چونک اٹھیں گے









پوری کوٹھی برقی قمقموں سے منور تھی۔ معلوم نہیں ہو پا رہا تھا کہ وہ دن کا سماں ہے یا رات کا۔ وہ کوٹھی سیکڑوں جانے پہچانے اور اجنبی لوگوں کی اکثریت سے اٹی ہوئی تھی۔ پینے پلانے کا دور چل رہا تھا۔ قہقہے امڈ رہے تھے۔ وہ ہلا گلا رات کے ابتدائی پہر سے جاری تھا اور اب آدھی رات ہونے والی تھی۔ اب لوگ وہاں سے رخصت ہونا شروع ہوگئے تھے۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدم باہر کھڑی ہوئی گاڑیوں کی جانب اٹھنے لگے۔ دھیرے دھیرے محفل کی چمک ماند پڑ گئی' بہت سے لوگ پی کر بدمست ہوچکے تھے۔ جن میں وجاہت بھی تھا۔ گو اس نے ایک گھونٹ بھی نہیں پی تھی مگر وہ بن پیے ہی اپنے آپ میں نہیں پا رہا تھا۔ وہ اس کوٹھی کے مالکان کا تنہا وارث تھا۔ پوری کوٹھی میں ہنگامہ' لوگوں کی آمد و رفت' اس کی شادی کے سلسلے میں تھی۔

آج اس کی سہاگ رات تھی۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالتا اس کمرے میں پہنچا جہاں اس کی جانِ حیات اس کی منتظر تھی۔ اندر پہنچتے ہی اس نے ایک طائرانہ نگاہ پورے کمرے پر ڈالی' پورا کمرہ دل و دماغ کو تسخیر کردینے والی کسی خوشبو سے مہک رہا تھا' کمرے کے دروازے سے لے کر ڈبل بیڈ تک فرش کو گلاب کی پتیوں سے سرخ کردیا گیا تھا۔ یہ سرخی بیڈ کے پورے وجود پر بھی چھائی ہوئی تھی۔ وہ پھولوں کی پتیوں کو نرمی سے اپنے پاؤں تلے روندتا بیڈ کے قریب آ کھڑا ہوا۔ اس سیج کی لڑیوں کو دونوں ہاتھوں سے ہٹایا اور بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اچانک اس کا دل بے طرح دھڑک اٹھا۔ اس کی نگاہ دلہن پر پڑی۔ سرخ آنچل میں سے آدھا چہرہ یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے بادلوں نے آدھے چاند کو اپنی گرفت میں لے کر آزاد نہ کرنے کی قسم کھائی ہو۔ اچانک اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

اسے بے ساختہ وہ محفل یاد آنے لگی جس میں اس نے حنا کو دیکھا تھا۔ وہ بھی شادی کی کوئی ایسی ہی تقریب تھی' جب وہ سنگ مرمر سا وجود اسے نظر آیا تھا۔ اس مجسمے کو دیکھتے ہی اس کی دھڑکنیں تھمنے لگی تھیں۔ یقیناً وہ مورت فرشتوں نے بڑی محنت سے تراشی تھی۔ اسے چاندنی سے نہلایا گیا تھا۔ تبھی تو اس کے ملیح چہرے پر نگاہ نہیں ٹھہر رہی تھی۔ آنکھیں ایسی شفاف تھیں جیسے وہیں کہیں ماہ و انجم مکیں ہوں۔ چہرہ ایسا نفیس تھا جیسے چھونے سے سلوٹ پڑ جانے کا اندیشہ ہو۔ لبوں کی پنکھڑیاں گواہ تھیں کہ ابھی ان پنکھڑیوں کا رس کسی بھنورے کو نصیب نہیں ہوا۔ بات یہ نہیں تھی کہ صرف وجاہت ہی اسے دیکھ رہا تھا' نہیں اس زرق برق محفل میں وہ بہت سی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔

مگر بذاتِ خود اس کی نگاہ کسی پر نہیں پڑ رہی تھی۔ وہ اپنی اہمیت سے بخوبی آگاہ تھی۔ اسے معلوم تھا دیکھو مت' دیکھنے سے اہمیت کم ہوجاتی ہے' وجاہت بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ دیکھتے ہوئے تسلیم کررہا تھا۔ وہ واقعی دیکھنے کے قابل ہے۔ اپنانے' دل میں سما جانے کے قابل ہے' اس نے زندگی میں بہت سے حسین چہرے دیکھے تھے۔ ایسی بہت سی حسین محفلوں میں شرکت کی تھی' مگر وہ تسلیم کررہا تھا' کھلے دل سے تسلیم کررہا تھا کہ اس جیسی صورت پہلے کبھی سامنے نہیں آئی تھی۔ اس کی دھڑکنوں کو یوں اپنی جانب کبھی نہیں کھینچا تھا۔ جیسے وہ اب اس کی طرف کھنچا جارہا تھا۔ اچانک اس کی نگاہ وجاہت کی طرف اٹھی' وجاہت اسے اتنی محویت سے دیکھ رہا تھا کہ اس کے لبوں پر بے ساختہ ایک مسکراہٹ بکھر گئی۔ اچانک پوری محفل ایک غیر مانوس سے اجالے کی دھند میں آگئی۔ وجاہت نے اس کی توجہ اپنی طرف دیکھی تو مسکراتے ہوئے کہا۔

''سنا تھا کہ چاند ہمیشہ فلک پر ہی دکھائی دیتا ہے' مگر آج یہ غلط ثابت ہوگیا۔ آج کسی نے چاند فلک پر نہیں زمیں پر دیکھا ہے۔ آپ بہت خوب صورت ہو۔'' چاند کی مسکراہٹ مزید اجالوں کو دعوت دے گئی۔ وہ گویا ہوئی تو لفظ گویا کھلکھلا پڑے۔ اسے وجاہت کی یہ بے تکلفی اچھی لگی تھی۔ اس نے بھی اسے بے تکلفی سے جواب دیا۔

''چلو تسلیم کہ چاند زمین پر بھی دکھائی دیتا ہے۔ مگر اس چاند کو کبھی تسخیر کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے' کیونکہ ایسی کوششیں اکثر لاحاصل ہی رہتی ہیں۔''

''جن لوگوں کا دعویٰ ہے کہ ایسی کوششیں لاحاصل رہتی ہیں ان کے دعوؤں کو غلط ثابت کرنا میں اپنے بائیں ہاتھ کا کھیل سمجھتا ہوں۔''

لب ایک بار پھر مسکرانے کے سے انداز میں کھنچ گئے۔

''اتنا مان اچھا نہیں ہوتا۔''

''اگر یہ مان بیجا ہو تو غلط بھی نہیں ہوتا۔''

''اچھا!'' ایک کھنکتی ہوئی ہنسی فضا میں بکھر گئی۔ ''دیکھیں

گئے' اچانک کسی نے پیچھے سے اس چاند کو آواز دی۔ ''آؤ حنا! چلیں۔''

''اوکے گڈ بائے'' وہ چاند اسے گڈ بائے کہہ کر نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ اس کے جاتے ہی اس نے ایک گہری سانس لی۔

وہ ماہ جبیں دیکھتے ہی دیکھتے اس کے دل میں' اس کی روح میں آبسی تھی۔ وہ خود کو اس کے بغیر نامکمل محسوس کرنے لگا۔ جیسے وہ اس کے وجود کا کوئی حصہ ہو' جو اس سے کاٹ کر دور کردیا گیا ہو۔ ایک عجیب سی بے چینی رگ جاں میں سرایت کرگئی۔ اس نے سوچ لیا' دل میں ارادہ باندھ لیا کہ وہ اس چاند کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے گا کہ یہ چاند کس گھر کا مکیں ہے اور کب سے مکیں ہے؟ اور یہ چاند آج تک نگاہوں سے اوجھل کیوں تھا۔ وہ نہ صرف اس کے بارے میں معلومات حاصل کرے گا بلکہ اسے ہمیشہ کے لیے حاصل کرکے اپنی کہی ہوئی باتوں کو سچ بھی ثابت کرے گا۔ وہ ابھی سوچ رہا تھا کہ اچانک اسے اپنے کاندھے پر کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا' وہ اس کی خالہ زاد کزن ثمینہ تھی۔

وجاہت ایک پرکشش اور خوب صورت شخصیت کا مالک تھا' ایسا ضرور تھا کہ اس سوسائٹی میں رہنے والی کئی دوشیزائیں اس کے آگے دل ہار گئی تھیں مگر وجاہت کے دل میں کوئی گھر نہ کرسکی تھی۔

وجاہت کی چاہت میں گرفتار ہوجانے والی دوشیزاؤں میں ثمینہ بھی شامل تھی' اس نے بڑی شدت اور چاہت سے اس کی جانب قدم بڑھائے تھے مگر وجاہت کی بے اعتنائی دیکھ کر پیچھے ہٹ گئی تھی' وجاہت کی بے اعتنائی دیکھ کر اس کے لب مسکرانے کے سے انداز میں کھنچ گئے تھے جیسے یہ محبت کوئی محبت نہ ہو' بلکہ کوئی سودا ہو۔ اس ہاتھ دو' اس ہاتھ لو۔ نہیں دیا تو کوئی بات نہیں۔ نہیں لیا تو کوئی بات نہیں' کوئی نفع نہیں کوئی نقصان نہیں۔ جب کسی شے کی شراکت ہی نہیں تو ان باتوں کا سوال ہی کیا؟ (تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی) ثمینہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہاری اس حالت سے لگتا ہے کہ وہ تمہیں اندر باہر سے لوٹ کرلے گئی ہے۔ میری مانو تو اپنی لٹی ہوئی چیزوں پر فاتحہ پڑھ لو۔ وہ جتنی بلندی پر رہتی ہے' تم اتنی بلندی پر پہنچنے کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔'' وجاہت کا دل بے طرح دھڑک اٹھا۔ ''یہ وہ کیا کہہ رہی ہے؟ سچ کہہ رہی ہے؟ کیا وہ واقعی اتنی بلندی پر رہتی ہے کہ وہ اس تک پہنچنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ یعنی وہ' کروڑوں کی جائیداد کا تنہا وارث۔ اس نے بے یقینی سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو یہ بات؟ تم اسے جانتی ہو؟''

''بہت اچھی طرح' سارا بائیوڈیٹا معلوم ہے' مجھے اس کا۔'' وہ اسے ساتھ لے کر ایک ٹیبل کے سامنے آبیٹھا۔

''ذرا تفصیل سے بتاؤ' مجھے اس کے بارے میں۔ کون ہے یہ' کیا نام ہے اور کرتی کیا ہے؟'' اس کی بے تابی دیکھ کر وہ مسکرادی۔

''ایک شرط پر۔''

''مجھے منظور ہے۔''

''تمہیں اپنی کل کی ایک حسین شام میرے نام کرنا ہوگی۔'' یہ کہہ کر وہ اسے دلچسپی سے دیکھنے لگی۔ جیسے اس نے وجاہت کو کسی مشکل میں ڈال دیا ہو۔ وجاہت کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔ وہ اچھی طرح جان گیا تھا کہ بات صرف ایک شام اس کے نام کرنے کی نہیں ہے' بلکہ اس شام اسے اور بھی بہت کچھ اس کے نام کرنا پڑے گا۔ وہ خفا نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے اسے اس بات کی توقع نہیں تھی۔

ثمینہ چند لمحوں تک اس کے خفگی بھرے چہرے کو دیکھتی رہی پھر اچانک کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

''اوکے اوکے' خفا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں مذاق کررہی تھی۔'' اس نے اپنی ہنسی پر قابو پایا۔

''شیخ امین کی بیٹی ہے۔ شیخ صاحب کا نام تو سنا ہوگا تم نے؟ پاکستان میں ان کا مختصر سا بزنس' بس' پچیس ٹیکسٹائل ملز کی صورت میں بکھرا ہوا ہے۔ باقی جتنا بزنس ہے' وہ ترقی یافتہ ممالک میں پھیلا ہوا ہے۔ اسے تم ان کی بدقسمتی کہو یا خوش قسمتی کہ حنا ماں' باپ کی واحد اولاد ہے۔ حنا اور اس کے گھر والوں کی بلندی کا اندازہ تم اس بات سے لگالو کہ ان میں سے کسی بھی فرد کا ذاتی بینک بیلنس دس' گیارہ ہندسوں سے کبھی نیچے نہیں آیا۔ ان باتوں کے بعد اپنی اور ان کی حیثیت کا اندازہ خود لگالو۔'' وجاہت کا دل بیٹھنے لگا۔

''تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہے؟'' وہ ایک بار پھر مسکرادی۔

''تمہیں آم کھانے سے مطلب ہونا چاہیے۔ نہ کہ پیڑ گننے سے۔ اگر میری کہی ہوئی باتوں میں سے کوئی ایک بھی غلط ثابت ہوجائے تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔'' وجاہت کی پیشانی ایک بار پھر شکن آلود ہوگئی۔ اگر یہ تمام باتیں درست تھیں تو پھر واقعی اس گوہر نایاب کا ملنا دشوار ہی نہیں ناممکن تھا۔ گو وہ خود بھی کروڑوں کی جائیداد کا اکیلا وارث تھا۔ شکل وصورت تعلیم وتربیت میں بھی ہزاروں میں ایک تھا' مگر اس ماہ جبیں کی حیثیت اس سے کئی گنا بڑھ کر تھی۔ وہ چاہ کر بھی اپنے آپ کو اس کے برابر نہیں لاسکتا تھا۔ ثمینہ اس کے متفکر چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ دیکھ کر لطف اندوز ہورہی تھی۔ جیسے دل ہی دل میں کہہ رہی ہو''اب آیا ہے اونٹ پہاڑ کے نیچے۔ اب پھنسی ہے مچھلی جال میں۔ اچانک وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اس سرپھرے مگر پرکشش شخصیت کے مالک نوجوان کے لیے اپنا مزید وقت برباد نہیں کرسکتی تھی۔

''اوکے وجی! بائی بائی۔'' وہ مسکراتے ہوئے چل دی۔

اس کے جانے کے چند لمحوں بعد وہ متحرک اجالا اس کے روبرو' اس چیئر پر آکر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے کسی سوچ میں گم تھا۔ اس کا پرتفکر چہرہ بتارہا تھا کہ وہ کسی اہم معاملے میں بہت دور تک سوچ رہا ہے۔ حنا نے پر اعتماد نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ گو وہ اسے نہیں جانتا تھا مگر حنا ایک حد تک اسے جان گئی تھی۔ محفل میں وہ واحد فرد تھا جو اس کے دل کو بھا گیا تھا۔ وہ پیار' محبت کی قائل نہیں تھی۔ اس بھا جانے کو صرف ایک پسند خیال کررہی تھی۔ پہلی نظر میں جیسے وہ وجاہت کے دل میں جا اتری تھی ۔ویسے وجاہت نے بھی اسے ایک حد تک متاثر کیا تھا۔ اسے اپنے گھر والوں کی طرف سے اپنا جیون ساتھی چننے کی مکمل آزادی تھی۔

وہ ایک آزاد خیال گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اندرون اور بیرون ملک اس کی کافی لڑکوں سے دوستی رہی تھی مگر یہ دوستی صرف دوستی ہی رہی۔ ان دوستوں میں اسے ایک بھی کوئی ایسا دوست نہ مل سکا جسے وہ اپنے ہم سفر کے طور پر چن سکتی۔ آج وجاہت کو دیکھ کر اس کے دل نے کہا کہ ہاں یہی وہ شخص ہے جسے وہ اپنے ہم سفر کے طور پر چن سکتی ہے' اپنا بنا سکتی ہے' مگر وہ خود اس کی طرف قدم بڑھا کر اپنی اہمیت کم کرنا نہیں چاہتی تھی۔ منتظر تھی کہ وجاہت اس کی طرف بڑھے۔ اس نے وجاہت کی آنکھوں میں جھانک کر یہ اندازہ کرلیا تھا کہ اب اگر اس کی آنکھوں' اس کی روح میں کوئی ہے تو صرف وہ ہے۔ اب وہ نہیں' وجاہت اس کی طرف آئے گا۔ اس مختصر سے عرصے میں اس نے وجاہت کے بارے میں کچھ حد تک معلومات حاصل کرلی تھیں۔ اس کا اب تک کا وقت دیار غیر میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے گزرا تھا۔ جیسے وجاہت کے لیے وہ اجنبی تھی' ویسے ہی وجاہت بھی اس کے لیے اجنبی تھا۔ یہ جان کر اسے کچھ تسلی ہوئی تھی کہ وہ تعلیم یافتہ' مہذب' باکردار اور ایک خوشحال گھرانے کا واحد چشم وچراغ ہے۔ گو ان کے اسٹیٹس میں بہت فرق تھا مگر یہ فرق مٹایا جاسکتا تھا۔ اگر وہ چاہتی تو...... وہ بھی یہی چاہتی تھی' اس اسٹیٹس کے فرق کی خلیج کو پاٹنا چاہتی تھی مگر کسی طریقے' کسی سلیقے سے...... وہ کھنکاری' اس کے کھنکارنے پر وجاہت نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''میں نے کہا تھا نا کہ زمیں پر دیکھے جانے والے چاند کو پانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے کہ ایسی کوششیں اکثر لاحاصل ہی رہتی ہیں۔ مگر تم نے کہا تھا کہ تم ان دعوؤں کو غلط ثابت کرنا اپنے بائیں ہاتھ کا کھیل سمجھتے ہو۔ ابھی ابھی ثمینہ یہاں سے اٹھ کر گئی ہے' میں نے تم دونوں کی باتیں سنی ہیں۔ یقیناً تم میرے بارے میں ایک حد تک جان گئے ہو اور اتنا جاننے کے بعد میں اندازہ کرسکتی ہوں کہ تم نے اب اس چاند کو تسخیر کرنے کا خیال اپنے دل سے نکال دیا ہوگا؟''

وجاہت نے ایک گہری سانس لی۔''جو ایک بار دل میں آبسے اسے دل سے نہیں نکالا جاسکتا۔ مجھے تسلیم ہے کہ میں نے جذبات کی رو میں بہہ کر ایک ایسی بات کہہ دی تھی جو کہ مجھے تمہیں جاننے کے بعد کہنی چاہیے تھی۔ خیر...... جہاں تک مجھ سے ہوسکے گا' میں اپنے اور تمہارے درمیان اس اسٹیٹس کے فرق کی خلیج کو پاٹنے کی اپنی سی پوری کوشش کروں گا۔''

وہ مسکرائی۔''اگر نہ پاٹ سکے تو......؟''

وہ چپ رہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تمہارے دعوے سب دعوے ہی تھے؟''

"میں جانتا ہوں کہ یہ ایک ناممکن بات ہے مگر......اگر مجھے اس خلیج کی دیوار کو پاٹنے کی کوئی بھی قیمت ادا کرنی پڑی، کوئی بھی راستہ اپنانا پڑا میں ضرور اپناؤں گا۔ بشرطیکہ کوئی قیمت ہو، کوئی راستہ ہو۔" حنا نے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا تم واقعی اس خلیج کو پاٹ سکو گے؟ کسی بھی قیمت پر، کوئی بھی راستہ اپنا کر......؟"

"کاش مجھے اپنی باتوں کو سچ ثابت کرنے کا صرف ایک موقع ملے۔ اس کے بعد میرا ہر عمل میری ہر بات کا گواہ ہوگا۔"

"کیا کر سکتے ہو تم میرے لیے؟"

"سب کچھ، کچھ بھی......" حنا نے ایک گہری سانس لی۔ "میری مما، پاپا نے مجھے اپنا جیون ساتھی چننے کی مکمل آزادی دے رکھی ہے اور میں اپنی مالی حیثیت سے بھی بخوبی واقف ہوں۔ تم یقین کرو، ایسے انگنت خوش شکل اور تعلیم یافتہ فرد ہیں جو صرف میرے ایک اشارے کے منتظر ہیں۔ میرا صرف ایک اشارہ انہیں ارب پتی بنا سکتا ہے۔ اور ایسے کئی ارب پتی بھی میرے صرف ایک اشارے کے منتظر ہیں۔ مگر مجھے دولت کی ہوس نہیں ہے۔ تم مجھے اچھے لگے ہو، اسی لیے میں نے تم سے اتنی باتیں کر لی ہیں۔ تم نے کہا کہ تم میرے لیے کچھ بھی کر سکتے ہو، اگر ایسا ہے تو میری صرف دو شرائط ہیں۔ ان میں سے صرف ایک مان لو۔ میں اپنا وجود تمہارے نام کر دوں گی۔ پہلی، تم اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہمارے ہاں رہنا قبول کر لو۔ دوسری یا پھر اپنی تمام پراپرٹی، بزنس، بینک بیلنس میرے نام کر دو...... میں نے تمہیں رستہ دکھا دیا ہے، قیمت بتا دی ہے۔ اب اگر تم چاہو تو اپنے دعوؤں کو سچ ثابت کر سکتے ہو۔" اس نے اپنے پرس میں سے ایک کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ "اس پر میرا موبائل نمبر درج ہے۔ تم کیا فیصلہ کرتے ہو، یہ تم خود سوچ لو، تمہارے پاس ایک ہفتہ ہے۔ ایک ہفتے میں جو فیصلہ کرنا، مجھے اس سے آگاہ کر دینا۔ میں منتظر رہوں گی۔" اس نے کارڈ وجاہت کو تھمایا، ایک مسکراتی ہوئی نظر اس پر ڈالی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس کی مسکراتی ہوئی نظریں کہہ رہی تھیں۔ "چاند کو تسخیر کرنے کا دعویٰ کرنے والے، تم فقط ایک ستارہ ہو اور ستارے کبھی چاند کو تسخیر نہیں کرتے۔ مگر میں تمہیں خود کو تسخیر کرنے کے دو راستے دکھا کر جا رہی ہوں۔ حوصلہ ہے، دعویٰ ہے تو آؤ، مجھے تسخیر کر لو۔ وہ اٹھ کر اس زرق برق محفل میں گم ہو گئی۔ نہ چاہنے کے باوجود بھی وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ سوچنے لگا۔

"یہ کیسی قیامت سے پالا پڑا ہے۔ ایسی قیامت نہ پہلے کبھی دیکھی، نہ سنی اور نہ ہی کبھی ایسی کوئی سچویشن پیدا ہوئی۔ اب تو وہی بات ہے، نہ جائے ماندن، نہ پائے رفتن، کیا یہ قیامت اس کے حق میں ثابت ہو گی۔ یا اس کے خلاف۔



وہ کراچی کے صف اول کے ایک اخبار کا منجھا ہوا صحافی تھا۔ گو اسے اس فیلڈ میں آئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا مگر اس کے قلم کی کاٹ گواہ تھی کہ اس کا قلم کئی پرانے قلم کاروں سے زیادہ آب دار ہے۔ اس کے لفظوں کے نشتر گواہ تھے کہ وہ اپنے فن میں بے حد طاق اور مخلص ہے۔ ہر ہفتے ملک کی کوئی نہ کوئی سیاسی شخصیت اس کے نوک قلم کی زد پر رہتی تھی۔ وہ اس سیاسی شخصیت کا ایسا قلمی 'پوسٹ مارٹم' کرتا تھا کہ اس شخصیت کا سیاست میں اپنے پیروں پر کھڑا رہنا دوبھر ہو جاتا تھا۔ مگر چاہنے کے باوجود بھی نہ وہ سیاسی شخصیت اس کا کچھ بگاڑ سکتی تھی اور نہ ہی اس کے کالم کو جھٹلا سکتی تھی کیونکہ وہ جو کالم بھی لکھتا تھا تمام تر ثبوت وحقائق کے ساتھ لکھتا تھا۔ اس تند و تیز شعلے سے کئی سیاسی شخصیتیں نالاں تھیں۔ کیونکہ اس نے ان کے کئی ایسے رازوں سے عوام کو متعارف کرایا تھا جن سے عوام پہلے کبھی آشنا نہیں تھے۔ شروع شروع میں اس کے کالم چھوٹے موٹے اخباروں کی زینت بنتے رہے۔

پھر ایک دن اخبار کے چیف ایڈیٹر کی نگاہ اس کے ایک کالم پر پڑی۔ وہ ایک ایسے جوہری تھے جو قلمی ہیرے کی مکمل پہچان رکھتے تھے۔ انہوں نے فوراً ہی اسے نہ صرف اپنے اخبار میں لکھنے کی دعوت دی، بلکہ اسے مناسب معاوضہ بھی ادا کرنے لگے۔ یہ معاوضہ اس کی توقع سے بڑھ کر تھا۔ سو دیکھتے ہی دیکھتے خوشحالی کی دیوی اس پر مہربان ہو گئی۔ فکر معاش سے آزادی نصیب ہوئی تو اس کی اپنے کالموں پر توجہ مزید بڑھ گئی۔ کالموں پر توجہ بڑھی تو اس کے قلم کی کاٹ مزید دو آتشہ ہو گئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ تمام سیاسی

شخصیتوں پر ایسے ایسے کالم لکھنے لگا جو کسی بھی ایک سیاسی شخصیت کے لیے قابل قبول نہیں تھے۔ اسے کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ صرف خدا سے ڈرتا تھا۔ جب بھی قلمی میدان میں وہ تھکاوٹ محسوس کرتا' اے آر مہدی کے توانا بازو اسے اپنے کاندھوں پر محسوس ہوتے۔ وہ پاکستان کی دن بدن گرتی ساکھ کو دیکھ کر اس کا من کڑھتا۔ وہ اس حالت کا ذمہ دار برسر اقتدار پارٹی کو سمجھتا تھا۔ جو پاکستانی عوام کو اس کا حق دینے کی بجائے' دن رات اپنے فائدے کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔

مہنگائی آسمان سے باتیں کرنے لگی تھی۔ بجلی' چینی' اور آٹا عنقا تھے۔ عوام کا شمار ان پریشانیوں کے ہاتھوں ناجینے والوں میں تھا نا مرنے والوں میں۔ ایک دن حکومتی پارٹی کے چند راز اس کے ہاتھ لگے۔ وہ ایسے ہی رازوں کی کھوج میں دن رات متحرک رہتا تھا۔ اس کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ عوام کی طرح وہ بھی اس حکمران پارٹی سے سخت بدظن تھا۔ چند مخصوص راز اس کے ہاتھ لگے تو اس نے سوچا کہ اب ان ''انصاف پرور'' حکمرانوں کو منظر عام سے ہٹانے کا وقت آ گیا ہے۔ وہ خود اتنا طاقتور نہیں تھا کہ ایسا کر سکتا مگر اس کے پاس قلم کی طاقت تھی۔ وہ اسے بروئے کار لا کر اگر اس حکومت کو گرا نہیں سکتا تھا تو کم از کم لڑکھڑانے پر مجبور ضرور کر سکتا تھا۔ اور انہی دنوں حکمرانوں کو بھی محسوس ہو گیا کہ اب اس کا وجود مزید برداشت نہیں ہو سکتا۔ اسے منظر عام سے ہٹا دینا چاہیے۔ منظر عام سے ہٹانے کی ضرورت اس لیے بھی پیش آ رہی تھی کہ باوجود کوشش کے نہ تو اس کے قلم کا رخ موڑا جا سکا تھا' اور نہ ہی اسے خریدا جا سکا تھا۔ وہ اپنے قلم کو اپنے ایمان سے بھی زیادہ عزیز سمجھتا تھا۔ چند دن پہلے اسے اپنے کرائے کے فلیٹ پر دستک سنائی دی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک اجنبی دکھائی دیا تھا اس کے ایک ہاتھ میں ڈائری تھی اور دوسرے ہاتھ میں ایک دستی بیگ تھا۔

شاہد اقبال نے اسے وضاحتی نظروں سے دیکھا۔ ''مجھے اپنا تعارف کروانے کی اجازت نہیں ہے اور ویسے بھی میں اگر یہ حرکت کروں تو وہ فضول ہی ہوگی۔ مجھے اوپر سے آپ کی خدمت کے لیے بھیجا گیا ہے۔ یہ بیگ آپ کے لیے ہے۔'' آنے والے نے بیگ اس کی طرف بڑھایا۔

''کیا ہے اس میں؟'' ''آپ خود دیکھ لیجیے۔'' اس نے زپ کھول کر دیکھا۔ اندر کاغذ کی چند سرخ گڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ کاغذ کا ایک ٹکڑا بھی تھا جس پر لکھا ہوا تھا۔ ''اپنی اصلاح کر لو۔ اپنے قلم کا رخ موڑ دو اور یہ گڈیاں اٹھا لو۔ ہر ماہ تمہیں اتنی رقم مل جایا کرے گی اور اگر تم نے اپنے قلم کو ہمارے حق میں استعمال کیا تو ہر ماہ اس سے ڈبل رقم تمہیں پہنچا دی جائے گی۔''

اس نے ایک گہری سانس لی۔ پرسکون لہجے میں کہا۔ ''اپنے اوپر والوں سے کہنا کہ ابھی وہ کاغذ نہیں بنا جو شاہد اقبال کو خرید سکے۔ یہ کاغذی ٹکڑے' ان کے مالکان تک پہنچا دو۔ میں امید کرتا ہوں کہ تم آئندہ یہاں آنے کی زحمت نہیں کرو گے۔'' آنے والا بنا کچھ کہے مودب انداز میں سر جھکا کر رخصت ہو گیا۔

اگلے دن ایک اور معروف سیاسی شخصیت اس کے نوک قلم کی زد پر تھی۔ شام کو وہ دفتر سے گھر لوٹا تو اس کی چھٹی حس نے کہا کہ کچھ نہ کچھ غیر معمولی ہے۔ اس نے آگے پیچھے اوپر نیچے ارد گرد ہر جگہ بغور دیکھا تمام ماحول تمام مناظر اپنی جگہ ویسے ہی تھے۔ کچھ بھی غیر معمولی نہیں تھا۔ اس کی پیشانی پر چند شکنیں ابھریں۔ پھر وہ فلیٹ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ چھٹی حس کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔ اندر کا منظر ویسا نہیں تھا جیسا وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ فلیٹ میں اکیلا رہتا تھا۔

مگر اب اس فلیٹ میں ایک فرد کا اضافہ ہو چکا تھا۔ اندر ایک بہت ہی حسین دوشیزہ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہی بولی۔ ''ہائے مسٹر شاہد اقبال! آئی ایم شازیہ رائے۔'' دوشیزہ نے مصافحے کے لیے اپنا دایاں ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ ''کل اوپر والوں کی طرف سے ایک فرد آپ کی خدمت کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اوپر والوں کا خیال ہے کہ وہ آپ کی صحیح خدمت نہیں کر سکا ہوگا۔ اس لیے اب یہ اعزاز مجھے سونپ کر بھیجا گیا ہے۔'' وہ پیشانی پر شکنیں لا کر اسے مزید وضاحتی نظروں سے دیکھتا رہا۔ دوشیزہ کا بڑھا ہوا ہاتھ مایوس ہو کر واپس اپنی جگہ چلا گیا۔ ''اوکے مسٹر شاہد! کوئی بات نہیں۔ بیٹھیے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' وہ سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ دوشیزہ نے کل جیسے ایک دستی بیگ کی طرف اشارہ کیا۔

''اس بیگ میں کل سے دس گنا زیادہ رقم موجود ہے۔ یعنی پچاس لاکھ روپے۔ اوپر والوں کا خیال ہے کہ کل آپ کو

پانچ لاکھ روپے دے کر آپ کے ساتھ زیادتی کی گئی تھی۔ آپ کی قیمت پانچ لاکھ نہیں کم از کم پچاس لاکھ ہونی چاہیے۔ اس رقم کے ساتھ ساتھ یہ کنیز بھی آپ کو سونپی گئی ہے۔ آپ کا جس طرح جی چاہے اس کنیز کو اور ان روپوں کو اپنے تصرف میں لائیے۔ شرط اتنی سی ہے کہ آپ اپنے قلم کی جولانیاں اوپر والوں کے نام کردیں۔ اگر آپ نے ہامی بھرلی تو آپ کو آئندہ بھی اسی طرح نوازا جاتا رہے گا۔" یہ کہتے ہی اس نے اپنا آدھا وجود بالائی حصہ اچانک ہی برہنہ کردیا۔ یوں لگا جیسے کوئی بجلی اچانک کوند گئی ہو۔ مگر اس بجلی کا اس پر مطلق کوئی اثر نہ ہوا۔ اگر اس وقت وہاں کوئی زاہد وعابد بھی ہوتا تو بہک سکتا تھا۔ مگر وہ اپنے قلم کی طرح کردار کا بھی پختہ تھا۔ اس کی نگاہیں صرف دوشیزہ کے چہرے پر جمی رہیں۔ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "اپنا وجود ڈھانپو۔"

دوشیزہ کی مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی۔ جیسے اس نے کوئی بچکانہ بات کہہ دی ہو۔ وہ بے حس وحرکت کھڑی رہی۔ "اگر تم چاہتی ہو کہ میں تمہاری باتوں کا کوئی جواب دوں تو پہلے اپنے وجود کو ڈھانپو!"

اس بار اس کے وجود میں جنبش ہوئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنے اتارے ہوئے کپڑے زیب تن کرلیے۔

"مجھے یقین نہیں کہ تم اس پاک سرزمین، مشرق کی بیٹی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم نے کسی طوائف کے وجود سے ہی جنم لیا ہوگا اور مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ اس کا سبب بھی اوپر والوں میں سے ہی کوئی ایک بنا ہوگا۔" دوشیزہ کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہی۔ جیسے یہ کوئی اہم یا خاص باتیں نہ ہوں۔ وہ اس کے اصل مدعے کی منتظر رہی۔ "یہ کاغذی ٹکڑے لے جا کر اپنے اوپر والوں کے منہ پر مارنا۔ ان سے کہنا نہ تو کوئی مجھے آج تک خرید سکا ہے اور نہ ہی کوئی آئندہ خرید سکے گا۔ میرا آج بھی وہی جواب ہے جو کل تھا اور کل بھی وہی جواب ہوگا۔ جو آج ہے۔ اب تم جاسکتی ہو۔" اس نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ دوشیزہ اپنی جگہ بیٹھی رہی۔

اچانک اس کے چہرے کی مسکراہٹ دم توڑ گئی۔ چہرے پر سنجیدگی اتر آئی۔ "مسٹر شاہد اقبال! مجھے آپ کی کوئی بات بھی بری نہیں لگی بلکہ یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ آپ

ایک باایمان انسان اور صحافی ہیں جو کسی قیمت پر بھی نہیں خریدے جاسکتے۔ مجھے یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ جیسے باکردار صحافی اس سرزمین پر بہت کم پیدا ہوئے ہیں مگر ہوئے ضرور ہیں۔ ان میں سے ایک آپ بھی ہیں۔ آپ اس دنیا میں رہ کر اتنا تو ضرور جان گئے ہوں گے کہ دنیا آپ جیسے لوگوں کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کرتی خاص کر جب وہ خود بے ایمان ہو۔ یقین کرو میں جو باتیں کہہ رہی ہوں مجھے ان میں سے ایک بات بھی کہنے کی ہدایت نہیں کی گئی ہے۔ تمہاری شخصیت' تمہاری جوانی کو دیکھتے ہوئے میں یہ باتیں اپنی طرف سے کہہ رہی ہوں۔ خود پراپنی جوانی پر کچھ ترس کھاؤ۔ تم جیسے صحافیوں سے میرا پہلے بھی واسطہ پڑ چکا ہے اور اوپر والوں کا بھی۔ جب انہوں نے کسی طرح بھی جھکنا گوارا نہ کیا' کسی طرح بھی نہ خریدے گئے تو انہیں منظر عام سے ہٹا دیا گیا۔"

"اپنے مخلص مشوروں سے نوازنے کا شکریہ۔ میں تم سے بہتر طور پر جانتا ہوں کہ مجھے کن باتوں پر عمل کرنا چاہیے اور کن باتوں پر نہیں۔ اب تم جاسکتی ہو۔" دوشیزہ کی مسکراہٹ لوٹ آئی۔

وہ رخصت ہوئی تو شاہد ایک گہری سانس لے کر اپنی ورک ٹیبل پر آ بیٹھا۔ اس کے لبوں پر بے ساختہ ایک مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ سوچنے لگا' اس کا مطلب ہے کہ صداقت اپنا اثر دکھا رہی ہے۔ کڑوا سچ لوگوں کے حلق سے اترنا دشوار ہوتا جارہا ہے' اس نے پھر ایک گہری سانس لی۔ "میرے معبود! تو بخوبی جانتا ہے کہ میں نے ہمیشہ جھوٹ اور منافقت کے خلاف حق کے لیے جنگ لڑی ہے۔ اپنے قلم کو کبھی غلط استعمال نہیں کیا' کبھی اس سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ میرے معبود! مجھے ہمیشہ اسی طرح صداقت کے راستے پر قائم ودائم رکھنا۔ ہمیشہ' میرے معبود! ہمیشہ' اس نے اپنا کمپیوٹر آن کیا اور پھر کی بورڈ اٹھا کر اپنے ادھورے کالم کو مکمل کرنے لگا۔ وہ ایک بے حد خصوصی کالم تھا اور اس کے اب تک شائع ہونے والے تمام کالموں میں اہم بھی۔ ابھی یہ کالم نامکمل تھا مگر اگلے دو دنوں میں یہ کالم مکمل ہونے والا تھا۔ اسے امید تھی کہ اس کالم کے ساتھ ہی ایک انقلاب وجود میں آئے گا۔ چاہے یہ انقلاب عارضی ہی کیوں نہ ہو۔

اگلے دن پریس سے لوٹ کر آنے سے قبل ہی اس کا کرائے کا فلیٹ ایک دھماکے سے اڑا دیا گیا۔ فلیٹ میں موجود اس کے واحد کمپیوٹر کے بھی پرخچے اڑ گئے۔ جس کی ہارڈ ڈسک میں اس نے اوپر والوں کی بہت سی قابل گرفت کمزوریاں سیو کی ہوئی تھیں۔ یہ حادثہ ٹھیک اس وقت ہوا جب وہ اپنے فلیٹ کے قریب پہنچنے والا تھا۔ دھماکہ بے حد شدید تھا۔ نہ صرف اس کے فلیٹ کو نقصان پہنچا تھا' بلکہ قریب قریب کے دو چار فلیٹ بھی ایک حد تک اس دھماکے کی زد میں آ گئے تھے۔ وہ مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ اپنے سامنے اتنا بڑا حادثہ دیکھ کر بھی اپنے قدموں پر کھڑا رہا۔ وہ اندازہ کررہا تھا کہ فلیٹ میں موجود ہر شے بیکار ہوگئی ہوگی۔ یہاں تک کہ اس کا واحد کمپیوٹر بھی۔

مگر اسے کچھ خاص پروا نہیں تھی۔ کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک میں جتنا بھی ڈیٹا تھا' اس مکمل ڈیٹا کی ایک کاپی اے آر مہدی کے پاس محفوظ تھی۔ یہ احتیاط اس نے کل دوشیزہ کے جانے کے بعد کی تھی۔ کیونکہ جو شخص اس کی غیر موجودگی میں فلیٹ میں داخل ہوسکتا ہے' وہ یقیناً اس کے کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک چوری یا بیکار بھی کرسکتا ہے۔ اس کا یہ احتیاطی قدم رائیگاں نہیں گیا تھا۔

ابھی اس کی نظریں فلیٹ سے اٹھتے ہوئے دھوئیں پر ہی جمی تھیں کہ ایک چھوٹا سا بچہ اس کے قریب آ رکا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ کا ٹکڑا تھا۔ بچے نے کاغذ کا ٹکڑا اسے تھمادیا۔ اس پر لکھا تھا۔ "اسے وارننگ سمجھو یا کچھ اور...... اب بھی وقت ہے' صحافت چھوڑ دو یا اپنے قلم کا رخ موڑ دو۔ ورنہ اگلی بار......" بچے سے اس تحریر کے بارے میں کچھ پوچھنا بیکار تھا۔ اس نے ایسی کوئی کوشش بھی نہ کی۔ اس تحریر کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ایک سچا مسلمان ہونے کے ناتے وہ جانتا تھا' اسے یقین کامل تھا کہ موت صرف اسی وقت ہی آئے گی جب خدا کو منظور ہوگا۔ جب بھی آئے گی وہ باہیں کھول کر اس کا استقبال کرے گا۔ اس حادثے نے اس کی توجہ ہٹانے کی بجائے مزید توجہ سے اسے اپنے کام میں مگن کردیا۔ چند لمحوں میں ہی آگ بجھانے والی گاڑیاں وہاں آ پہنچیں۔ میڈیا والوں تک بھی خبر پہنچ گئی۔

چند میڈیا والے بھی اپنے کیمروں کے ہمراہ وہاں پہنچ گئے۔ یہ خبر ان کے خبرناموں کا ایک حصہ بن گئی کہ ملک کے

صف اول کے صحافی شاہد اقبال کا فلیٹ کسی ذاتی دشمنی کی بنا پر اڑا دیا گیا۔ البتہ جب شاہد اقبال سے اس سلسلے میں کچھ پوچھا گیا کہ انہیں کسی پر شک ہے یا دہشت گردوں نے کس بنیاد پر اس کے فلیٹ کو اپنا ٹارگٹ بنایا تو اس سلسلے میں شاہد اقبال نے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا۔ وہ وہاں سے سید ھا اے آر مہدی کے گھر پہنچا۔ انہیں مختصراً اس حادثے کے بارے میں بتایا اور ان کے کمپیوٹر پر بیٹھ کر فوراً ہی اپنا ادھورا کالم مکمل کرلیا۔ اس کالم میں صدر مملکت اور وزیر اعظم کے خلاف اس نے ایسے ایسے حقائق اور ثبوت جمع کیے تھے جس سے یہ عوام پہلے کبھی آشنا نہیں تھے۔ اس نے ان کے خلاف اتنے ثبوت اکٹھے کر لیے تھے کہ اگر وہ تمام ثبوت شائع ہو جاتے تو نہ صرف صدر صاحب کو استعفیٰ دینا پڑ جاتا بلکہ عوام انہیں احتساب کے کٹہرے میں بھی کھینچ لاتے۔ وزیر اعظم صاحب کی حالت بھی صدر صاحب سے کچھ مختلف نہ ہوتی۔

کالم مکمل کرنے کے بعد اس نے اے آر مہدی کو دکھایا۔ کالم پڑھتے ہی ان کے لبوں پہ ایک بھرپور مسکراہٹ اتر آئی۔

''شاہد اقبال! میں خدا کا بے حد شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے نہ صرف حق و صداقت کی اشاعت کا شرف بخشا ہے بلکہ تم جیسا باایمان صحافی بھی عطا کیا ہے۔ جس پر میں بجا طور پر فخر کرسکتا ہوں۔ میری دلی دعا صرف اتنی ہے کہ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔''

''نہیں سر! یہ تو آپ کا بڑا پن ہے اور کچھ نہیں۔ ورنہ میں کہاں اور میری اوقات کہاں۔'' اس نے عاجزی سے کہا۔ اے آر مہدی نے دل میں فیصلہ کیا کہ اس کالم کو کل ہی اشاعت کے مراحل سے گزار دیا جائے۔ اگلا دن اس کالم کی اشاعت کا دن تھا۔



وسیم شام کو ڈیوٹی کر کے لوٹا تو بے حد خوش تھا۔ وہ دبئی کی ایک گلاس کمپنی میں آپریٹر تھا۔ اس کی خوشی کی وجہ یہ تھی کہ آج اس نے اپنی کمپنی کے دفتر میں اپنا ایک ماہ کا ریزائن فارم جمع کرایا تھا۔ اسے کمپنی کی طرف سے ملا ہوا ویزا اختتام کو پہنچنے والا تھا اور اس کا آگے مزید کام کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ ریزائن کے دن مکمل ہوتے ہی وہ پھر سے اڑ کر پاکستان پہنچ جاتا جہاں اس کے دوست تھے۔ عزیز تھے احباب تھے اور سب سے بڑھ کر شازیہ تھی۔ اس کی جان' اس کی دھڑکن' اس کی شریک حیات اس کا شمار دنیا کے ان کروڑوں لوگوں میں تھا جنہیں غربت ورثے میں ملتی ہے۔ پیدا ہوا تو گھر میں غربت کی حکمرانی تھی۔ ہوش سنبھالا تو فاقے ہمراہ تھے۔ تین بہنوں کا واحد اکیلا بھائی تھا۔ باپ جیسے تیسے کر کے گھر والوں کو دو وقت کی روٹی مہیا کررہا تھا۔ ابھی اس نے میٹرک کا امتحان بمشکل کلیئر کیا تھا کہ اس کا والد' کارخانے کی ایک مشین میں آ کر اپنے ایک ہاتھ سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ گھر کی ساری ذمہ داری اس کے ناتواں کاندھوں پر آ پڑی۔ کم عمری کے باوجود اس نے ہمت سے اس ذمہ داری کو نبھایا۔ شروع شروع میں چھوٹی موٹی نوکریاں کرتا اور چھوڑتا رہا۔ پھر ایک اسپنگ مل میں ایک دوست کی مدد سے بھرتی ہوگیا۔ اسے بمشکل مل میں ایک برس ہی ہوا تھا کہ اس کے دوست عاصم نے اسے بتایا کہ وہ دبئی جارہا ہے۔ وسیم کے لیے یہ بات ناممکن تھی۔ اس نے اس کے سامنے بے یقینی کا اظہار کیا۔ ''یار! مجھے یقین نہیں آرہا سچ بتا' کیا تو واقعی دبئی جارہا ہے؟'' وہ مسکرایا۔

''ہاں میری جان! میں واقعی دبئی جارہا ہوں اور وہ بھی پندرہ دنوں کے اندر اندر۔''

''مگر یار یہ سب کچھ اتنا اچانک......؟'' عاصم قہقہہ مار کر ہنسا۔ ''سب قسمت کی بات ہے پیارے اور یہ سب کچھ اچانک نہیں ہوا۔ میں پچھلے ایک عرصے سے ایک شخص کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ تھوڑی بہت رقم بھی دے رکھی تھی اسے۔ اپنی جان پہچان کا آدمی تھا' بس کام ہوگیا۔ یہ الگ بات کہ ذرا دیر سے ہوا۔'' وسیم نے اسے پر رشک نظروں سے دیکھا۔

''یار! بڑا خوش قسمت ہے تو۔ تیری تو لاٹری نکل آئی۔ کاش ایسا کوئی ایک موقع مجھے بھی ملتا تو......'' عاصم نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

''فکر نہ کر یار! بس ذرا مجھے وہاں جا کر سیٹ ہو جانے دے۔ اس کے بعد میں تمہارے لیے بھی کچھ سوچوں گا۔'' اور پھر پندرہ دنوں کے اندر اندر وہ دبئی چلا گیا۔ گو اس نے وسیم سے کہا تھا کہ وہ وہاں جا کر اس کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا مگر اسے اس بات پر اعتبار نہیں تھا۔ وہ خوش فہم سوچوں سے اپنا دل بہلانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے جس معاشرے میں آنکھ کھولی تھی' جس ماحول میں پرورش پائی

تھی۔ اس سے اسے لوگوں کو سمجھنے میں بہت مدد ملی تھی۔ وہ اس بات سے بخوبی واقف ہوگیا تھا کہ بغیر کسی لالچ کے کوئی کسی کی کچھ مدد نہیں کرتا۔ کسی کا کوئی فائدہ نہیں سوچتا۔

مگر ایک سال بعد ہی اسے اپنی ان سوچوں کی تردید کرنا پڑی۔ اسے اس بات پر ایمان لانا پڑا کہ دنیا میں ہر جگہ ہی خود غرضی اور مفاد پرستی نہیں ہوتی بلکہ کہیں کہیں اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ جو دوستوں کے بغیر کسی لالچ کے کام آتے ہیں اور جن کے دم قدم سے ہی دنیا میں سچائی' محبت اور دوستی کا وجود قائم ہے۔ اس عرصے میں ضرورت کے تحت وسیم نے اپنا ایک ذاتی کم قیمت موبائل خرید لیا تھا۔ جس کا نمبر اس نے عاصم کے نمبر پر سینڈ کردیا تھا۔ ایک دو ماہ بعد' دونوں دوستوں میں چند منٹوں کے لیے بات چیت ہوجایا کرتی تھی۔ کبھی عاصم کال کرلیتا تو کبھی وسیم۔ اس عرصے میں وسیم نے ایک بار بھی عاصم کو یاددہانی نہیں کرائی کہ پاکستان سے چلنے سے پہلے اس نے اس کے بارے میں دبئی پہنچ کر کچھ کرنے کی بات بھی کی تھی۔ وسیم نہیں چاہتا تھا کہ اپنی غرض کی بات کرکے وہ اپنے ایک اچھے دوست کو کھودے۔ یہ جو وہ کبھی کبھار کال کرتا ہے یا سن لیتا ہے' کہیں یہ بھی بند نہ ہوجائے۔ اسے اپنے اس دوست کی دوستی بہت عزیز تھی۔ جس نے اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں بڑی مدد دی تھی۔

دوسری طرف گو عاصم نے اس سے' اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی تھی' مگر درپردہ وہ اس کے لیے بھاگ دوڑ کررہا تھا۔ پھر ایک دن یہ بھاگ دوڑ رنگ لے آئی۔ عاصم نے اس کے موبائل پر کال کی اور دعا سلام کے بعد کہا۔

''چل جگر! اب جلد از جلد اپنا پاسپورٹ وغیرہ بنوا کر اس کی ایک فوٹو کاپی' فیکس یا ای میل کے ذریعے مجھے کمپنی کے نمبر پر سینڈ کر...... میں نے اپنی کمپنی کے منیجر سے تمہارے لیے بات کرلی ہے۔ چند ماہ بعد ہماری کمپنی کے کچھ ویزے نکلنے والے ہیں۔ ان میں ایک ویزہ تمہارا بھی ہوگا۔'' وسیم کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوگئیں۔

''یار! تو سچ کہہ رہا ہے؟''

''ابے گدھے! مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''میرا مطلب ہے کوئی ایڈوانس رقم وغیرہ؟''

''اگر رقم وغیرہ کا معاملہ ہوتا تو اتنی دیر کیوں لگتی؟ ویزہ کمپنی کی طرف سے فری میں مل رہا ہے۔ رقم وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور تو تو ویسے بھی یار ہے اپنا' اگر کوئی اور ہوتا تو اس سے کچھ ایڈنٹھ بھی لیتے' پر تجھ سے کیا لینا۔ مگر ہاں اپنی ٹکٹ کا ضرور بندوبست کرلینا۔ ٹکٹ کمپنی کی طرف سے نہیں ہے۔'' اگلے ایک ماہ میں وسیم نے اپنا پاسپورٹ بنوا کر اس کی ایک کاپی عاصم کو سینڈ کردی اور کال کرکے عاصم کو بھی اس بات سے آگاہ کردیا۔ چند ہفتوں بعد اس کا ویزہ آ گیا۔ اس نے اس سلسلے میں گھر والوں سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ انہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ جب اس کے ویزے کی کاپی آ گئی' اس نے گھر والوں کو اس بارے میں آگاہ کیا تو وہ اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ پائے۔ نجانے وہ خوشی کے آنسو تھے یا اس سے عارضی طور پر بچھڑنے کے؟ اس خبر سے ہر شخص کی آنکھ بھر آئی۔ بہنیں' بھائی سے لپٹ کر رونے لگیں۔ پھر ماں اور باپ کی باری آئی پھر یہ آنسو اس وقت خشک ہوگئے جب آنے والا خوش حالی کا تصور ان کی آنکھوں میں اتر آیا۔ ماں نے تصور میں دیکھا' بیٹا دبئی پہنچ کر بہت سے روپے بھیج رہا ہے۔ ان روپوں سے گھر کی حالت بدل گئی ہے۔ کچے در و دیوار پختہ کمروں میں بدل گئے ہیں۔ ٹی وی' فریج' واشنگ مشین اور ایسی بہت سی چیزیں آ گئی ہیں۔ جس سے خوش حالی ظاہر ہوتی ہے۔ بیٹیوں کے شکستہ وجود پر بیش قیمت لباس زیب تن ہونے لگے ہیں۔ وہ رشتے دار جو کل تک انہیں دیکھنا گوارہ نہیں کرتے تھے' انہیں جھک جھک کر سلام کررہے ہیں۔ سب بیٹیوں کے خوشحال گھرانوں میں رشتے طے ہوگئے ہیں۔ سب بیٹیاں وداع ہوکر اپنے اپنے گھروں کو چلی گئی ہیں۔ اب وہ گھر میں اکیلی ہے۔ اسے تنہائی ڈسنے لگی ہے۔ وہ سوچتی ہے۔ اس بار بیٹا چھٹیوں پر گھر آئے گا تو وہ اس کے لیے ایک چاند سی دلہن ڈھونڈ لائے گی۔ تصور ٹوٹا تو وہ سپنوں سے حقیقت کی دنیا میں تھی۔ خوش فہم سوچوں میں الجھ کر بیٹے کی وقتی پریشانی کو بھول گئی تھی۔ ویزہ آ گیا تھا مگر ٹکٹ کے پیسے نہیں تھے۔ ماں کا بہت تھوڑا سا زیور رکھا ہوا تھا' اسے بیچ کر ٹکٹ کے روپوں کا بندوبست کرلیا گیا۔

دبئی میں آ کر اسے صحیح معنوں میں اندازہ ہوا کہ یہ وہ دبئی نہیں ہے جس کے وہ اپنے ملک میں خواب دیکھا

کرتا تھا۔ کام مشکل تھا' بے حد سخت' مگر کرنا تھا' وہ کرنے لگا۔ وہ جان گیا کہ اب جو کچھ ہے' یہی ہے' جو کچھ کرنا ہے' یہیں کرنا ہے' اس نے دن رات کا سکون خود پر حرام کرلیا۔ ڈیوٹی کے بعد جس قدر ممکن ہوتا' وہ اوور ٹائم لگانے کی کوشش کرتا۔ پہلے مہینے میں اس نے گھر میں پندرہ ہزار کی رقم روانہ کی۔ دوسرے مہینے سترہ ہزار۔ بعد میں اس سے جس قدر ہوتا رہا وہ زیادہ سے زیادہ رقم بچا کر گھر روانہ کرتا رہا۔ ہر پندرہ دنوں بعد وہ گھر کال کرکے خیر خیریت بھی دریافت کرلیا کرتا تھا۔ چند ماہ بعد ہی اس کی محنت رنگ لے آئی۔ وہ گھر جتنی رقم بھیجتا' گھر والے اس رقم سے ضروری اخراجات کی مختصر سی رقم نکالتے اور باقی رقم جمع کرتے جاتے۔ ایک سال بعد اسے گھر والوں نے آگاہ کیا کہ اس کی بھیجی گئی تمام رقوم میں سے اپنے اخراجات کی مختصری رقم نکالنے کے بعد انہوں نے خاصی تمام رقم محفوظ کرلی ہے۔ یہ جان کر اسے حیرت انگیز خوشی کا جھٹکا لگا۔ وہ سمجھتا رہا تھا کہ اس کی ہر ماہ بھیجی گئی تمام رقم گھر والے ساری کی ساری استعمال میں لے آتے رہے ہوں گے مگر...... اس نے ماں' باپ سے کہہ دیا کہ رقم محفوظ کرنے کی ضرورت نہیں ہے اس رقم سے گھر کے در و دیوار پختہ کرائے جائیں۔ ایک سال کی رقم سے گھر کے در و دیوار کی حالت بدل گئی۔ اگلے دو سالوں کی سخت محنت سے تینوں بہنوں کے جہیز کا سامان خریدا گیا۔ اور پھر اس سے اگلے دو سالوں میں اس کی تینوں بہنیں یکے بعد دیگرے پیا گھر سدھار گئیں۔ ان گزرے سالوں میں' وہ ایک دوبار گھر کا چکر بھی لگا آیا تھا۔

تمام بیٹیوں کے فرائض سے سبکدوش ہونے کے بعد ماں کو اس کی شادی کی فکر ہوئی۔ اگلی بار وہ گھر آیا تو ماں اس کے لاکھ نہیں نہیں کرنے کے باوجود ایک خوب صورت وخوب سیرت لڑکی کا انتخاب کرکے اپنے گھر لے آئی۔ شازیہ اس کی زندگی میں کیا آئی' گویا اسے ہفت اقلیم کی شاہی مل گئی۔ اس کے آنگن میں خوشیوں' مسرتوں اور بہاروں کے بے شمار قافلے اتر آئے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک باشعار' خدمت گزار' نیک اور وفادار بیوی تھی۔ اس نے اسے محبتوں کی ایسی لطافتوں' نزاکتوں سے روشناس کرایا جس سے اس کا وجود پہلے کبھی آشنا نہیں تھا۔

شازیہ کو پاکر' اس کے دل میں کسی اور شے کی کوئی حسرت' کوئی تمنا نہ رہی۔ جس دن اس کی چھٹیاں اختتام پذیر ہوئیں' اس دن وہ بے حد دل گرفتہ تھا۔ شازیہ کی حالت بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھی۔ وہ پچھلے چند ہفتوں میں گویا اس کی عادی ہوگئی تھی۔

ایک بار شازیہ نے تنہائی میں اس کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا تھا۔ "آپ دبئی مت جایئے۔ اوپر والا بڑا رازق ہے۔ جو کچھ ہماری قسمت میں ہوگا وہ یہیں مل جائے گا۔ آپ یہیں محنت کیجئے' اللہ برکت دے گا۔ یہاں جیسی بھی ملے گی' روکھی سوکھی میں کھا کر گزارہ کرلوں گی۔ مگر آپ کے بغیر نہیں رہ پاؤں گی۔" یہ کہتے ہی اس کا گلا بھر آیا۔

وسیم نے نرمی سے اس کے آنسو پونچھ ڈالے۔ کئی آنسو اس کے لبوں نے جذب کرلیے۔ اس نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ "بس صرف تین سالوں کی بات ہے۔ یہ تین سال جیسے تیسے گزار لو۔ تم سے دور ہونا مجھے بھی گوارہ نہیں ہے۔ مگر کیا کروں' مجبوری ہے۔ ان تین سالوں میں' میں چار پیسے بچانے کی کوشش کروں گا۔ پھر میرا وجود ہوگا' تمہاری محبت ہوگی اور محبت بھرے شب و روز ہوں گے۔" اس نے اس کے اداس لبوں کی خوشبو چرالی۔ دل شکستہ' افسردہ وہ دبئی لوٹ آیا۔ دبئی آنے کے چند ہفتوں بعد اسے اطلاع ملی کہ شازیہ امید سے ہے۔ پھر چند ماہ بعد خبر آئی۔ شازیہ نے ایک خوب صورت بیٹے کو جنم دیا ہے۔ اس کی خبر ملتے ہی اس نے فوراً شازیہ سے فون پر بات کی۔

"شازیہ! تھینک یو جان! تھینک یو ویری مچ' آئی لو یو۔ میں بتا نہیں سکتا کہ اس خبر سے مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے آج میں مکمل ہوگیا ہوں۔ جی چاہتا ہے ابھی تمہارے پاس پہنچ جاؤں۔ تمہیں اور اپنے بیٹے کو سینے میں چھپالوں۔"

"تو آجایئے نا۔" شازیہ کے لفظوں میں جانے کتنے ارمان تھے۔ وسیم نے ایک گہری سانس لی۔

"بس صرف دو سالوں کی بات ہے۔ تھوڑا سا انتظار اور پھر اس کے بعد...... اچھا چھوڑو' یہ بتاؤ' میرا بیٹا کیسا ہے۔ کس پر گیا ہے؟" اس کے لہجے میں بچوں کا سا اشتیاق تھا۔ شازیہ بے ساختہ کھل کھلا کر ہنس دی۔

"بالکل ٹھیک ہے' ابھی ایک دن کا تو ہوا ہے' ابھی سے کیسے پتا چل سکتا ہے کہ کس پر گیا ہے۔ چند ہفتے تو گزرنے

دیں۔ کچھ نقش نین بن جائیں تو پھر آپ کو بتاؤں گی۔"
بعد میں وقتاً فوقتاً وہ گھر کال کرتا رہا۔ شازیہ اور ماں باپ سے بات چیت ہوتی رہی۔ کبھی بہنیں میکے آئی ہوئی ہوتیں تو ان سے بھی بات ہو جاتی۔ شازیہ کی محبت میں محبت بھرے تصورات میں وقت گزرتا رہا۔ یہاں تک کہ تین سال پورے ہونے کو آ گئے۔ شازیہ نے اور اس نے اس تین سالہ جدائی کے عذاب کو کیسے جھیلا تھا۔ یہ صرف وہ دونوں ہی جانتے تھے۔ ہجر کی گھڑیاں اختتام پذیر ہونے کو تھیں وصال کے دن لمحہ لمحہ سرکتے ہوئے قریب آ رہے تھے......اس نے نہانے اور فریش ہونے کے بعد گھر کا نمبر ڈائیل کیا۔ چند لمحوں تک بیل جاتی رہی' پھر اس کی دھڑکنوں نے کال ریسیو کر لی۔ شازیہ کی کھنکتی ہوئی آواز اس کی روح میں اتر گئی۔
دعا سلام کے بعد اس نے پوچھا۔ "کیا کر رہی تھیں؟"
"آپ کے لاڈلے کا دل بہلا رہی تھی۔"
"آہا! نٹ کھٹ بھی ساتھ ہے۔ ذرا اس شریر کی آواز تو سناؤ۔" شازیہ نے موبائل زوہیب کے کان سے لگایا۔
"چلو بیٹا پاپا سے بات کرو۔" اس کی ساری توجہ کھلونوں پر تھی۔ اس نے بے اعتنائی برتی۔ شازیہ نے دوبارہ موبائل اپنے کان کے قریب کر لیا۔ "نواب صاحب کا موڈ نہیں ہے بات کرنے کا۔ اپنے کھیل میں مگن ہے۔ بعد میں اس کی آواز سناؤں گی۔ اچھا چھوڑیں یہ بتائیں' ریزائن کب تک دے رہے ہیں؟"
"آج ہی ایک ماہ کا ریزائن فارم جمع کرا آیا ہوں۔"
"سچ؟"
"تمہاری قسم۔" وہ مسرت سے گنگ ہو گئی۔
"پھر کب تک گھر آ جائیں گے آپ؟"
"اگلے ماہ کی تیس تاریخ تک۔"
"پکا؟"
"بالکل پکا۔" دونوں نے خدا حافظ کہہ کر کال منقطع کر دی۔ دونوں ہی آنے والے خوب صورت دنوں کے تصور میں کھونے لگے' ایک دوسرے کی دھڑکنوں میں سما جانے میں صرف تیس دن باقی تھے۔

☆......☆......☆

حاجی بشیر احمد اس علاقے کی سب سے معزز شخصیت تھے۔ ہر دل عزیز' شفیق' ہنس مکھ اور دکھ سکھ میں دوسروں کے کام آنے والے۔ خدا نے انہیں دھن دولت سے بے طرح نوازا تھا۔ دولت پا کر بھی وہ بالکل سادا اور نیک دل انسان تھے۔ تکبر ان میں نام کو نہیں تھا۔ بااخلاق ایسے تھے کہ خود سے کئی درجہ نچلے طبقے کے لوگوں سے آپ' آگے بڑھ کر سلام کرنے میں پہل کرتے تھے۔ سخی ایسے تھے کہ ایک زمانہ ان کی سخاوت کے گن گاتا تھا۔ اگر دشمن بھی ان کی چوکھٹ تک چلا آیا تو کبھی خالی نہ گیا۔ ان کا بہت وسیع وعریض الیکٹرونکس کا کاروبار تھا۔ کاروبار کی کئی شاخیں نہ صرف پاکستان کے ہر بڑے شہر میں پھیلی ہوئی تھیں بلکہ بیرون ملک بھی ان کا کاروبار جما ہوا تھا۔ یہ تمام جما جمایا کاروبار انہیں ورثے میں نہیں ملا تھا' اتنی وسیع وعریض جائیداد اور کاروبار میں سے انہیں بمشکل پانچ فیصد تک کا حصہ انہیں اپنے والد صاحب کی طرف سے ملا تھا۔
انہوں نے اپنی محنت اور دیانت داری سے اتنے وسیع کاروبار تک پھیلا دیا تھا۔ ان کے والد نہایت نیک اور دوسرے وکلا سے ہٹ کر ایک دیانت دار وکیل تھے۔ جو کیس بھی لڑا' حق وصداقت کی خاطر لڑا۔ ہمیشہ سچائی اور صداقت کا ساتھ دیا۔ اپنی پوری زندگی میں ایک کیس بھی ایسا نہیں تھا' جو انہوں نے حق کے خلاف لڑا ہو۔ وہ بہت نام ور اور چوٹی کے وکیل تھے۔ وہ اگر چاہتے' جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنا کر باآسانی عدالت میں ثابت کر سکتے تھے۔ مگر انہوں نے اپنی ساری زندگی میں ایسا کبھی نہیں کیا۔ حالانکہ انہیں' اس سلسلے میں بہت سے کیسز بھی ملے' جنہیں وہ قبول کر لیتے تو راتوں رات امیر ہو سکتے تھے۔ مگر انہیں دولت سے زیادہ اپنی دیانت داری' اپنا ایمان عزیز تھا۔ جنہیں وہ کسی قیمت پر بھی فروخت کرنا نہیں چاہتے تھے۔
انہی دنوں شہر کی ایک معروف ترین شخصیت کا بیٹا' قتل کے الزام میں اندر ہو گیا۔ تمام شواہد اس کے خلاف تھے' مگر وہ بے گناہ تھا۔ کاروباری دشمنی کی بھینٹ چڑھا تھا۔ ایک کامیاب سازش کے تحت اسے پھنسایا گیا تھا۔ معروف شخصیت عباس ملک نے ملک کے تمام نام ور وکلا سے رابطہ کیا۔ ہر وکیل کیس ہسٹری سننے کے بعد کہہ دیتا کہ یہ کیس اس کے بس کا نہیں ہے۔ اس کیس میں کامیابی کے چانسز نہ ہونے کے برابر تھے۔ یہاں عباس ملک کی جگہ اگر کوئی اور

ہوتا تو ہر وکیل بھاگ کر یہ کیس لے لیتا۔ جس کی اسے منہ مانگی قیمت مل رہی تھی۔ کیس میں کامیابی کی اسے کوئی پروانہ ہوتی..... مگر یہ کسی عام فرد کا کیس نہیں تھا' عباس ملک کا تھا' جس سے غلط بیانی کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد وہ کسی کے کہنے پر اپنا یہ کیس لے کر منیر احمد کے پاس پہنچے اور ساری کیس ہسٹری بتانے کے بعد بے ساختہ رونے لگے۔ ہر طرف کی مایوس کن صورت حال نے انہیں شکستہ دل کر دیا تھا۔ انہیں اپنا ایک اکیلا بیٹا' موت کے منہ میں صاف جاتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ منیر احمد کے دل نے گواہی دی کہ سامنے والے کے لفظوں میں صداقت ہے۔ انہوں نے کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یہ کیس ان کے لیے ایک چیلنج تھا۔ جسے انہوں نے کھلے دل سے قبول کر لیا اور اس میں کامیابی کے لیے دن رات ایک کر دیئے۔ ان کی شب و روز کی محنت رنگ لے آئی اور انہوں نے عباس ملک کے بیٹے کو باعزت طور پر عدالت سے بری کرانے میں کامیابی حاصل کر لی۔ عباس ملک ان سے اتنے خوش ہوئے کہ انہوں نے ایک کروڑ کی بڑی رقم انہیں انعام کے طور پر دی بلکہ انہیں کاروباری معاملات کے لیے اپنا وکیل بھی مقرر کر لیا۔ جب تک عباس ملک زندہ رہے' وہ قانونی طور پر ان کے کاروباری معاملات دیکھتے رہے' جب وہ چل بسے تو منیر احمد ان معاملات سے الگ ہوگئے۔ نیو جنریشن کی اپنی سوچ' اپنے نظریات ہوتے ہیں۔ منیر احمد نیو جنریشن کے ان نظریات کے حامی نہ تھے۔ سو انہیں ان معاملات سے الگ ہونا پڑا۔

منیر احمد نے شادی کی' گھر بار بسایا' مگر خدا نے انہیں اولاد کی صرف ایک نعمت عطا کی۔ بشیر احمد کی صورت میں انہوں نے بشیر احمد کو دونوں طرح کی تعلیم سے آراستہ کیا۔ دینی بھی اور دنیاوی بھی۔ انہوں نے انہیں نہ صرف دنیا داری سکھائی' بلکہ دین سے' انسانیت سے بھی آگاہ کیا۔ بشیر احمد کو نیک' سلجھا ہوا اور ہر دل عزیز شخصیت بنانے میں خدا کے کرم کے ساتھ ساتھ منیر احمد کی تربیت کا بھی کافی ہاتھ تھا۔ یہ ان کی تربیت کا کمال تھا کہ وہ اتنے بگڑے ہوئے ماحول میں بھی بشیر احمد کو ایک اچھا انسان بنانے میں کامیاب رہے تھے۔

بشیر احمد جوان ہوئے تو انہوں نے ان کی ایک نہایت شریف گھرانے میں شادی کر دی۔ اس دوران انہوں نے وکالت کو خیر باد کہہ کر عباس ملک کے دیئے ہوئے ایک کروڑ سے کاروبار کا آغاز کر لیا تھا۔ جنہیں اپنی محنت اور دیانت داری کے بل بوتے پر وہ ترقی دیتے رہے تھے۔ کچھ عرصہ بعد ان کا کاروبار بے حد مستحکم ہو چکا تھا۔ ابھی بشیر احمد کی شادی کی خوشیاں پھیکی بھی نہیں پڑی تھیں کہ ایک دن منیر احمد اور ان کی بیوی ایک محفل سے گھر لوٹ رہے تھے کہ ان کی گاڑی ایک بدمست ٹرک سے ٹکرا گئی۔ دونوں میں سے ایک فرد بھی بشیر احمد کو سہارا دینے کے لیے زندہ نہ رہا۔ بشیر احمد پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا مگر انہوں نے جواں مردی سے حالات کا مقابلہ کیا۔ وہ باپ کے زندہ ہوتے ہوئے بھی کاروبار میں دلچسپی لیتے رہے تھے۔ مگر ان کے جانے کے بعد انہوں نے اپنی ساری توجہ کاروبار پر مبذول کر دی۔

کاروبار کو حد سے زیادہ توجہ ملی تو وہ دن دونی' رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ان کی کمپنی ترقی کرتی گئی۔ یہاں تک کہ اس کمپنی کی ترقی کو مدنظر رکھتے ہوئے' کاروباری تقاضوں کے ہاتھوں مجبور ہو کر کمپنی کی ایک شاخ دبئی اور دوسری سنگاپور کھولنا پڑی۔ اسے ان کی بدقسمتی کہیے یا کچھ اور کہ شادی کے کئی برسوں بعد تک بھی ان کے ہاں خدا کی طرف سے اولاد کی نعمت نہ اتر سکی۔ ان کے دل میں کئی برسوں سے اولاد کی تمنا پنپ رہی تھی۔ جو کہ کسی طرح بھی پوری ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ انہیں اپنی بیوی سے بہت محبت تھی' اس محبت کو مدنظر رکھتے ہوئے' اولاد کی خواہش کی تکمیل کے لیے وہ دوسری شادی کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے جسمانی اور روحانی' ہر طرح سے اپنا اور بیوی کا علاج کرایا۔ مگر اولاد کی نعمت نصیب نہ ہو سکی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ اب کسی طرح بھی یہ امید بر نہیں آئے گی تو انہوں نے ایک دن بشیر احمد سے اس سلسلے میں بات کی۔ وہ رات کا وقت تھا۔

''آج میں آپ سے کچھ مانگنا چاہتی ہوں؟'' بشیر احمد نے انہیں غور سے دیکھا۔

شاید وہ اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگے تھے کہ وہ ان سے کیا مانگنا چاہتی ہیں۔ کیونکہ وہ ذاتی طور پر سمجھتے تھے کہ انہوں نے انہیں کسی شے کی کمی نہیں ہونے دی تھی۔ ان کی ہر خواہش پوری کی تھی۔

''مجھے نہیں لگتا کہ آپ کی کوئی ایسی خواہش رہ گئی ہو' جسے میں نے پورا نہ کیا ہو......اس کے باوجود بھی اگر کوئی ایسی خواہش رہ گئی ہو' کوئی ایسی بات رہ گئی ہو جسے میں پورا نہ کرسکا ہوں تو کہو' میں اسے پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔''

''آپ نے تو بغیر کہے میری ہر خواہش پوری کی ہے' ہر بات مانی ہے' بس صرف یہ آخری بات مان لیں۔ اس کے بعد میں آپ سے اور کوئی بات نہیں منواؤں گی۔''

''ہاں کہیں کیا بات ہے؟''

''آپ......آپ دوسری شادی کرلیں۔'' زبیدہ بیگم نے اپنے اندر کے کرب کو دباتے ہوئے کڑوی گولی نگل لی۔

''آپ جانتی ہیں کہ میں آپ سے کتنی محبت کرتا ہوں' اس کے باوجود بھی آپ مجھ سے ایسی بات کہہ رہی ہیں؟''

میں......میں آپ کی محبت کے قابل نہیں ہوں اور نہ ہی میری محبت آپ کے قابل ہے۔ میں آپ کو کیا دوں گی؟ میرا دامن تو خالی ہے' آپ تو اپنے دامن کو اولاد کی نعمت سے بھر سکتے ہیں۔ مجھ سے آپ کی یہ ویرانی' یہ خالی پن دیکھا نہیں جاتا......''

بشیر احمد نے انہیں نرمی سے اپنے قریب کرلیا۔

''دیکھو زبیدہ بیگم! آئندہ کبھی اپنے لبوں پر ایسی بات مت لانا۔ آپ ہی میری پہلی بیوی ہو اور آپ ہی آخری۔ میں آپ کی محبت کو' اپنی محبت کو نہیں بانٹ سکتا۔ اگر میری قسمت میں اولاد کی نعمت ہے تو وہ آپ ہی سے ملے گی۔ ورنہ مجھے کسی اور کے وجود سے یہ نعمت لینا گوارا نہیں۔'' انہوں نے نرمی سے ان کے آنسو پونچھ لیے۔

خدا کو بھی جیسے ان پر ترس آ گیا۔ شاید یہ ان کے صبر کا اجر تھا کہ خدا نے انہیں یکے بعد دیگرے تین بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا تھا۔ بشیر احمد نے انہیں اپنی طرف سے دینی اور دنیاوی دونوں طرح کی تعلیم دلوائی اور ان کی ہر طرح سے اچھی تربیت کی۔ یہاں تک کہ وہ ان کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد ان کی شادی کے فرائض سے بھی سبکدوش ہوگئے۔ اس عرصے میں بیوی' داغ مفارقت دے گئی اور وہ اکیلے ہوکر رہ گئے۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ان کا ہر شے سے جی اچاٹ ہوگیا۔ جتنا بھی وقت ملتا وہ اسے خدا کی عبادت میں صرف کرتے۔ نجانے کیوں انہیں بار بار یہ وہم ہونے لگا تھا کہ اب ان کے جانے کا وقت آ گیا ہے۔ ان کی خواہش تھی کہ مرنے سے پہلے وہ ایک بار اور خدا کے گھر کا دیدار کر آئیں۔ زندگی کا کیا بھروسہ' کب ساتھ چھوڑ دے۔ خدا معلوم پھر مہلت ملے نہ ملے۔ وہ جب بھی حج پر جاتے تھے اپنے خرچ پر کسی غریب مگر مستحق فرد کو بھی اپنے ساتھ ضرور لے جاتے تھے۔ اس بار انہوں نے اپنے ایک دور کے رشتے دار قیوم علی کو اپنے ساتھ لے جانے کا سوچا۔

قیوم علی غریب مگر دین دار انسان تھا۔ وہ صحیح معنوں میں اس بات کا مستحق تھا کہ اسے حج کرایا جائے۔ کسی قسم کے انتظامات سے پہلے قیوم علی سے پوچھنا اور بات کرنا ضروری تھا۔ خدا معلوم' کسی مجبوری کی بناء پر وہ جانے پر تیار ہو بھی یا نہ ہو؟ بشیر احمد اسی سوچ میں غرق اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے موبائل نکالا اور اپنے سب سے بڑے بیٹے کامران احمد کا نمبر ملانے لگے۔ بیل جانے لگی' چند لمحوں بعد کال ریسیو کرلی گئی دعا سلام کے بعد انہوں نے پوچھا۔ ''کہاں ہو بیٹا؟''

''ایک کاروباری میٹنگ میں بزی ہوں ابو۔''

''کب تک فارغ ہوجاؤ گے؟''

''قریباً دو گھنٹے تک۔''

''ٹھیک ہے' میٹنگ ختم ہوتے ہی فوراً مجھ سے ملو۔ تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

دو گھنٹے بعد کامران ان کے روبرو تھا۔ انہوں نے بات شروع کی۔ ''میرا ایک دور دراز کا رشتے دار بھائی قیوم علی تھا' جانتے ہو اسے؟''

''جی کچھ حد تک۔''

''اس بار میں انہیں حج پر لے جانا چاہتا ہوں۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔''

''مگر کسی قسم کے انتظامات سے پہلے' ان سے اس سلسلے میں بات کرنا ضروری ہے۔ کیا تمہارے پاس ان کا کوئی نمبر ہے؟''

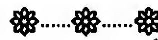
''فی الحال تو نہیں ہے' آپ کہیں تو معلوم کیا جاسکتا ہے۔''

''جس قدر جلد ہوسکے' معلوم کرکے مجھے آگاہ کرو۔''

دو چار دن کی کوشش کے باوجود قیوم علی کا کوئی کونٹیکٹ نمبر نہ مل سکا۔ البتہ انہیں وہاں کا ایڈریس ضرور مل گیا جہاں

وہ اسلام آباد کے قریب کہیں مقیم تھے۔ بشیر احمد نے سوچا کہ پہلے خط وکتابت سے بات چیت کی جائے پھر کچھ سوچ کر انہوں نے یہ خیال رد کردیا۔ ویسے بھی وہ ڈاک کے نظام سے غیر مطمئن تھے۔ انہوں نے سوچا کہ اس نیک کام کی دعوت' خود قیوم علی کے روبرو پہنچ کر انہیں دینی چاہیے۔ اگلے دن انہوں نے کامران کو ہدایت کی۔ "دیکھو بھئی جس قدر جلد سے جلد ہوسکے اسلام آباد کی ایک سیٹ کنفرم کراؤ۔ میں چاہتا ہوں کہ خود قیوم علی کے روبرو ہو کر انہیں اس نیک کام کی دعوت دینی چاہیے۔ اگر انہیں کوئی مجبوری نہ ہوئی اور انہوں نے یہ دعوت قبول کرلی تو پھر آگے کے کچھ انتظامات کے بارے میں سوچیں گے۔"

"جی ابو! میں کوشش کرتا ہوں۔" کامران نے کوشش کرکے اگلے ہی روز تین جولائی کو جانے والی ایک فلائٹ میں سیٹ کنفرم کرلی۔



وجاہت کے اگلے دو چار دن سوچتے ہوئے بسر ہوئے۔ وہ بہت عجیب کشمکش کا شکار تھا۔ وہ اپنے ماں' باپ کی واحد اولاد تھا۔ ان کی آنکھوں کا تارا تھا۔ اسے بھی اپنے والدین اتنے ہی عزیز تھے۔ جتنا وہ انہیں' یہ کسی طور ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنی غرض کی خاطر انہیں چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے۔ وہ بزنس اور جائیداد بھی اس ماہ جبین کے نام نہیں کرسکتا تھا کہ فی الحال سب کچھ اس کے والد کے نام تھا۔ وہ چند ماہ قبل ہی اپنی تعلیم مکمل کرکے اپنے والد کے ساتھ ان کے بزنس میں کچھ سیکھنے کی غرض سے شامل ہوا تھا۔ سو کسی فیصلے پر پہنچنا' کوئی فیصلہ کرنا اس کے لیے دشوار ہورہا تھا۔ دشوار کیا ہورہا تھا اس کے پاس کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ جس پر وہ چل سکے' عمل کرسکے۔ دوسری طرف ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ اس ماہ جبین کو بھلا دے۔ وہ ایسی تھی ہی نہیں کہ بھلائی جاسکے۔ دل سے نکالی جاسکے۔ وہ اسے بھلا بھی نہیں پارہا تھا اور اسے کوئی راستہ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ انہی سوچوں' اسی پریشانی نے اسے کسی حد تک سنجیدہ بنادیا۔ قہقہے کہیں گم ہوگئے۔ لبوں پر کھیلنے والی مسکراہٹ کہیں چھپ گئی۔

جب یہ پریشانی حد سے بڑھ گئی تو اس نے اس سلسلے میں اپنے واحد اور گہرے دوست عابد سے بات کی۔ عابد نے اس کی بات سنی' چند لمحوں تک اس سے ہنسی مذاق کرتا رہا پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

"اب تو صرف ایک ہی راستہ ہے' تو اپنے والدین سے بات کر' وہ تیری ماہ جبیں کے والدین سے بات کریں گے۔ شاید اس بات چیت سے کوئی تیسرا راستہ نکل آئے۔ شاید اس کے والدین اتنی کڑی شرائط نہ رکھیں' جتنی اس نے رکھی ہیں۔" وجاہت کی پیشانی پر متفکر لکیریں برقرار رہیں۔

"اگر اس کے والدین نے بھی یہی شرائط رکھیں اس بات چیت سے کوئی تیسرا راستہ نہ نکلا تو پھر؟"

"یار تو بات کرکے تو دیکھ' قبل از وقت کیوں خود کو الجھا رہا ہے۔" وجاہت نے ایک گہری سانس لی۔

"اچھا ٹھیک ہے کچھ کرتا ہوں میں۔ بلکہ وہی کرتا ہوں جو تم نے کہا ہے۔ خدا معلوم' کوئی راستہ نکل ہی آئے۔"



ثاقب وحید کا پاکستان کی ایک غیر معروف مگر طاقت ور جماعت سے تعلق تھا' بڑے صاحب کے بعد پوری جماعت اس کے انڈر میں تھی۔ اس کی جماعت کے تمام فرد جرات مند اور دلیر تھے۔ ضرورت پڑنے پر وہ ہر ایسا کام کر گزرتے تھے جسے دوسری کوئی جماعت کرنے کا سوچتے ہوئے بھی گھبراتی تھی۔ اس جماعت کا تعلق سیاست سے نہ ہونے کے برابر تھا۔ مگر ہر بار کسی بھی پارٹی کا اقتدار میں آنا ان کی مدد کے بغیر ناممکن ہوتا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھا' ٹی وی کے چینل پر چینل تبدیل کررہا تھا' مگر اسے کوئی چینل پسند ہی نہیں آرہا تھا۔ اچانک اس کے موبائل کا بزر بج اٹھا۔ اس نے موبائل نکالا' اسکرین پر نگاہ کی' سامنے "بڑے صاحب" کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ اس نے کال ریسیو کرتے ہی کہا۔ "گڈ ایوننگ سر! حکم کیجیے' کیسے یاد کیا؟"

"ایوننگ...... اس بار پھر ایک پارٹی کی طرف سے چند ٹارگٹ ملے ہیں۔ انہیں پورا کرنا ہے۔" وہ غور سے سننے لگا۔ "کل لوگوں کا ایک مذہبی تہوار آرہا ہے۔ اس مذہبی تہوار پر وہ اپنے مذہبی عقیدے کے مطابق جلوس نکالنے والے ہیں۔ خودکش حملے کے ذریعے' جلوس کے جتنے لوگوں کو بھی ہوسکے' لقمہ اجل بنانا ہے۔ کیا فوری دھماکے کی تیاریاں مکمل ہیں؟ اگر مکمل نہیں ہیں تو انہیں فوراً مکمل کرو۔"

"ہم ہمیشہ تمام انتظامات کے ہمراہ تیار رہتے ہیں۔

خودکش حملہ آور اور دھماکے کا تمام مواد تیار ہے۔ آپ صرف اتنا بتا دیجیے کہ خودکش حملہ کتنے بڑے پیمانے پر ہونا چاہیے اور کس شہر میں؟ باقی آپ مجھ پر چھوڑ دیجیے۔“

”اس بار صرف دو شہروں کا ٹارگٹ ملا ہے۔ کراچی اور لاہور...... حملے میں کم از کم پچاس اموات کا ہونا لازمی ہے۔ ایک شہر میں زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔“

”آپ نے کہا ہے کہ حملہ خودکش طریقے سے ہونا چاہیے۔ اس بار لگتا ہے کہ سیکورٹی بہت سخت ہوگی۔ اگر خودکش حملہ کامیاب نہ ہو سکا تو......؟“

”سخت سیکورٹی کو نرم کرنا تمہارا کام ہے۔ اگر پھر بھی خودکش حملے میں دشواری ہو حملہ کامیاب نہ ہو سکے تو کسی اور طریقے سے اپنا ہدف مکمل کرنے کی کوشش کرو۔ بس ایک چیز کا خیال رہے ایک شہر میں کم از کم پچاس اموات کا ہونا لازمی ہے۔“

”آپ بے فکر ہو جائیں۔ بالکل ایسا ہی ہوگا سر۔ اور کوئی حکم؟“

”ہمارا کوئی بھی فرد کسی بھی صورت زیرِ حراست نہیں آنا چاہیے۔ ضرورت پڑے تو خریدے گئے دوسرے افراد کو سامنے کر دیا جائے۔“

کال منقطع ہو گئی۔ کال منقطع ہوتے ہی ثاقب وحید نے ایک اور نمبر پنچ کیا۔ رابطہ ہوتے ہی مخصوص ہدایات دہرانے لگا۔ اچانک اس کی پیشانی پر پُرتفکر شکنیں ابھر آئیں۔

”ہوں...... تو یہ دشوار ہے؟ اوکے تو پھر پلان نمبر ٹو پر عمل کرو۔ فوراً ہی جلوس کے قریب کی کسی عمارت کا بندوبست کرو جہاں سے آسانی سے اپنا ہدف مکمل کیا جا سکے جس قدر ”ساز و سامان“ کی ضرورت ہو ساتھ لے لو۔ تمام کام مکمل ہوتے ہی اطلاع کرو۔“ دوسری طرف ”یس سر“ کہہ کر کال منقطع کر دی گئی۔

❁......❁......❁

وسیم کا ریزائن پریڈ ہونے میں ابھی دس دن باقی تھے۔ آج اس کا ارادہ کسی ٹریول ایجنسی میں جا کر اپنے لیے تین جولائی کی ایک سیٹ بک کرانے کا تھا۔ آج اس نے چھٹی کی تھی۔ سب کے جانے کے بعد وہ دیر تک پڑا نیند سے لطف اندوز ہوتا رہا تھا۔ بیدار ہونے کے بعد وہ نہا کر فریش ہو کر ایک ٹریول ایجنسی کی طرف چل دیا۔ ٹریول ایجنسی میں پہنچ کر اس نے اپنا مدعا بیان کیا۔ آپریٹر چند لمحوں تک کی بورڈ پر انگلیاں چلا کر کچھ چیک کرتا رہا۔ پھر معذرت خواہانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔ ”سوری سر! تین جولائی کی کسی بھی ایئر لائین کی کوئی فلائیٹ ڈائریکٹ اسلام آباد کے لیے نہیں ہے۔ البتہ ایک جہاز ہے جو عارضی طور پر کراچی کے ایئر پورٹ پر رکے گا۔ چند منٹوں کے لیے۔ اگر آپ کہیں تو......؟“ وسیم کی پیشانی پر چند شکنیں ابھر کر غائب ہو گئیں۔

”اوکے اس جہاز میں میری ایک سیٹ کنفرم کر دیجیے۔“

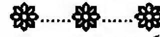
”جی بہتر۔“ آپریٹر ایک بار پھر کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مخصوص کارروائی کے بعد اس نے وسیم سے رقم لی اور اسے ٹکٹ تھما دیا۔ وہ ٹکٹ لے کر ٹریول ایجنسی سے باہر نکل آیا۔ باہر آتے ہی اسے ایک عجیب سی تسکین کا احساس ہوا۔ ہر کام مکمل ہو گیا تھا۔ اب صرف ریزائن کے مکمل ہونے کا انتظار تھا۔ ریزائن مکمل ہوتے ہی وہ اپنی محبت، اپنی جان محبت کے پاس ہوتا۔ جس سے اب ایک پل کے لیے بھی دور رہنا قیامت سے کم نہ تھا۔

❁......❁......❁

ہزاروں کا مجمع دھیرے دھیرے اپنی منزل کی طرف رواں تھا۔ صبح سے دوپہر ہو گئی تھی۔ لوگوں کی تعداد عارضی طور پر کم ہوئی، بہت سے لوگ نماز کے بعد دوبارہ مجمع میں لوٹ آئے۔ لوگ پورے اخلاص کے ساتھ جلوس میں شریک تھے۔ عصر کا وقت آ پہنچا۔ مجمع نڈھال ہو چکا تھا۔ اچانک ہی قریبی عمارت سے یکا یک تڑاتڑ فائرنگ کی آواز آئی۔ فائرنگ جلوس کے شرکا پر کی جا رہی تھی۔ اچانک مجمع میں عارضی طور پر بجلی کی لہر دوڑ گئی۔ لوگ ایک پل کو اس ناگہانی آفت سے وحشت زدہ ہو کر گھبرا گئے۔ ابھی لوگ پہلی فائرنگ سے نہیں سنبھلے تھے کہ اچانک ان پر دوسرا برسٹ چلایا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پچاس ساٹھ افراد کے وجود سے لہو فواروں کی طرح نکلا۔ وہ سب کٹی ہوئی شاخوں کی طرح لہرا کر، تڑپ کر زمین پر آ رہے۔ اچانک جوشِ ایمانی سے مغلوب لوگوں کے چہرے تمتما گئے۔ وہ اپنے زخمی بھائیوں کی مدد کو لپکے۔ یہ سفاکانہ کھیل پہلی بار نہیں کھیلا گیا تھا۔ ماضی میں بھی بارہا وہ ایسے لوگوں کا شکار

بنتے رہے تھے۔ فائرنگ کے پہلے حصے میں ہی سب کے سب تماش بین رفو چکر ہوگئے۔ اب وہاں صرف جلوس کے شرکاء باقی تھے۔ فوراً ہی ایمبولینس وہاں آ پہنچیں۔ پولیس پہلے سے موجود تھی۔ ٹی وی پر خبریں نشر ہونے لگیں۔

پولیس نے خاموش عمارت کی طرف برسٹ مارے اور فوراً ہی پوری عمارت کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ کراچی کی معروف شاہراہ جا بجا خون سے تر ہونے لگی۔ خون اگلتے کئی جسموں سے ارواح نکل کر عالم بالا کی طرف چل دیں۔ کئی لوگ عالم نزع میں تھے۔ اپنے ہی خون میں لت پت کئی زندہ و مردہ وجود ایمبولینس میں لادے جانے لگے۔ گاڑیاں حرکت میں آنے لگیں۔ یہ روح فرسا مناظر دیکھ کر کئی اہل دل لوگوں کی آنکھ نم ہونے لگی۔ انسانیت کے دشمنوں کی ایسی سفاکانہ حرکت پر ان کا دل خون رونے لگا۔ ہر دردمند دل انہیں برا بھلا کہہ رہا تھا اور رخصت ہوجانے والوں کے لیے دعائے خیر کے الفاظ دہرا رہا تھا۔ مگر انہیں اندازہ نہیں تھا کہ اس سفاکانہ کھیل کا ابھی آدھا حصہ باقی ہے۔ ابھی اس سے بھی زیادہ دلدوز واقعات دیکھنے کو ملنے والے ہیں۔



ثاقب وحید اپنے کمرے میں بیٹھا' پاکستان کے نام ور نیوز چینلز پر اس سفاکانہ کھیل میں ہونے والی تباہی کو براہ راست دیکھ رہا تھا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھرک رہی تھی۔ پہلا پلان نہ سہی دوسرا سہی' وہ اپنے مطلوبہ ہدف کو پورا کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ اچانک اس کے موبائل کا بزر بجا' کال ریسیو ہوتے ہی بڑے صاحب کی آواز سنائی دی۔

''گڈ! وری گڈ۔ میرے سامنے پاکستان کے تمام نیوز چینلز متحرک ہیں۔ ہر چینل پر کراچی کے روح فرسا مناظر بار بار دکھائے جارہے ہیں۔ میڈیا کی معلومات کے مطابق اب تک پچاس کے قریب اموات ہوچکی ہیں۔ مزید کئی لوگوں کی حالت نازک ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم اپنا ٹارگٹ مکمل کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔''

''یس سر! بالکل۔''

''خودکش بم دھماکا ہوتا تو مزید اموات متوقع تھیں۔ خیر' خودکش بم دھماکا نہ سہی' ایسے ہی سہی' یہ بھی خوب رہا۔ بلندی سے اپنے ہدف کو نشانہ بنانا کچھ دشوار نہیں ہوتا۔ اچھا یہ بتاؤ' لاہور کے ٹارگٹ میں کتنا وقت ہے......؟'' صرف پانچ منٹ سر! وہاں تباہی خودکش بم دھماکوں کے ذریعے وجود میں لائی جارہی ہے۔ آپ چند لمحوں بعد انہی نیوز چینلز پر کراچی کے واقعات سے بھی زیادہ دلدوز واقعات دیکھ سکیں گے۔ اس بار اموات ہمارے اور آپ کے اندازوں سے زیادہ ہوں گی۔''

''میں ان لمحوں کا بے چینی سے انتظار کررہا ہوں۔'' دوسری طرف بڑے صاحب نے کہہ کر کال منقطع کردی۔ ان کے لبوں پر ایک سفاکانہ مسکراہٹ در آئی۔ انہوں نے اپنا بایاں ہاتھ شراب کے پیالے کی طرف بڑھایا اور دائیں ہاتھ سے سرتاپا برہنہ' دودھ سی سفید مغربی دوشیزہ کو اپنی جانب کھینچ لیا۔ وہ خود بھی مکمل طور پر لباس سے بے نیاز تھے۔



وجاہت کی بدلی بدلی سی کیفیت اس کے والدین سے بھی پوشیدہ نہیں تھی۔ باپ تو خیر بزنس میں مصروف رہتا تھا مگر ماں نے جلد ہی یہ کیفیت محسوس کرلی۔ انہوں نے پہلے تو سوچا کہ وجاہت سے پوچھیں کہ اس کی بدلی بدلی کیفیت کیوں ہے' پھر نجانے کیوں کچھ سوچ کر انہوں نے اپنے شوہر سے یہ بات کہہ دی۔ میاں صاحب بھی کئی دن سے وجاہت کی حالت نوٹ کررہے تھے۔ بیوی نے بھی جب ان کی توجہ اس طرف دلائی تو انہوں نے ایک دن وجاہت سے اس بارے میں پوچھ لیا۔ ''پچھلے کئی دنوں سے' میں نوٹ کررہا ہوں کہ تم کچھ فکرمند سے رہنے لگے ہو۔ تمہیں کوئی پریشانی لاحق ہے۔ اگر ایسی کوئی بات ہے تو اپنا دوست سمجھ کر مجھ سے اس پریشانی کو شیئر کرو۔ میں اپنے بیٹے کی ہر پرابلم دور کرنے کی کوشش کروں گا۔''

باپ کے لفظوں کی نرماہٹ نے اس کا دل دھڑکا دیا۔ وہ خود بھی کئی روز سے سوچ رہا تھا کہ باپ سے اس سلسلے میں بات کرے مگر...... آج باپ نے اسے خود ہی موقع دیا تو اس نے ہمت کرکے باپ سے اپنے من کی بات کہہ دی۔

''پاپا! میں خود کئی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ آپ سے اس سلسلے میں بات کروں' مگر کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بات کا آغاز کس طرح کروں......؟''

''بیٹا جو بات ہے پوری سچائی سے کہہ دو' گھبرانے یا ہچکچانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنے بیٹے کے ساتھ

ہوں۔"

"وہ دراصل میں......شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

میاں جی کے چہرے پر ایک پل کو حیرانی کے آثار پیدا ہوئے جیسے انہیں اس سے اس بات کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ وہ اس سے کسی بہت بڑی پریشانی کی توقع کررہے تھے مگر یہ پریشانی تو کہاں......مسرت کی بات تھی۔ انہوں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے اپنے من کی خوشی کو دبایا۔ "شادی کی بات کررہے ہو تو یقیناً لڑکی بھی پسند کی ہوگی؟"

"جی پاپا! وہ تعلیم یافتہ ہے خوب صورت ہے اچھے خاندان سے تعلق ہے؟"

"تو پھر پرابلم کیا ہے؟"

"جی پاپا وہ ان کا طبقہ......" نہ چاہنے کے باوجود بھی وہ پوری بات نہ کرسکا۔ میاں جی نے ایک اور گہری سانس لی۔ جیسے وہ وجاہت کے ادھورے جملے سے ہی بات کی گہرائی تک پہنچ گئے ہوں۔

"کسی نچلے طبقے سے تعلق ہے اس کا؟"

"ج......جی۔" انہوں نے نرمی سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

"بس اتنی سی بات کے لیے خود کو پریشان کررکھا تھا؟ تم جیسا کہو گے ویسا ہی ہوگا۔ کسی کا نچلے طبقے سے ہونا کوئی جرم نہیں ہے۔ تمہاری پسند ہماری پسند ہوگی۔ بتاؤ کون ہے وہ؟"

"پاپا! آپ جیسا سمجھ رہے ہیں بات ایسی نہیں ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اس کا تعلق ہم سے بھی بالائی طبقے سے ہے۔ آپ نے میری پوری بات سنی ہی نہیں اور ادھوری بات اچک لی۔"

میاں جی کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔

"کون ہے وہ؟"

"وہ شیخ امین کی بیٹی ہے۔ شاید آپ شیخ امین کو جانتے ہوں؟"

"بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ ہم سے کئی گنا زیادہ حیثیت کے لوگ ہیں۔" وجاہت نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ جیسے اصل بات یہی ہو۔ جسے وہ کہنے سے ڈر رہا تھا۔

"تم لڑکی سے ملے ہو؟"

"جی پاپا۔"

"کوئی بات چیت بھی ہوئی ہے اس سے؟"

"جی پاپا!" وجاہت نے حنا سے ہونے والی ہر بات ان سے کہہ دی۔ میاں جی کی پیشانی پر ابھری لکیروں میں مزید اضافہ ہوگیا۔

"وجاہت ہمارا اور ان کا کوئی میل نہیں ہے بہتر یہی ہے کہ تم اسے بھول جاؤ۔"

"میں اچھی سی کوشش کرچکا ہوں اسے بھلانا میرے بس میں نہیں ہے۔" "تو پھر ہمیں بھلادو۔" اس نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔

"یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"تو تمہارا مطلب ہے کہ میں اپنی تمام جائیداد اتنی محنت سے عروج تک لے جانے والا بزنس بینک بیلنس سب کچھ اس لڑکی کے نام کردوں؟"

"میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔"

"تو پھر تم چاہتے کیا ہو؟" وہ ہلکی سی کوفت میں مبتلا ہوگئے۔

"میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ آپ ایک بار شیخ صاحب سے اس سلسلے میں مل لیں۔ شاید وہ یہ رشتہ قبول کرلیں۔ شاید وہ اتنی کڑی شرائط نہ رکھیں جتنی حنا نے رکھی ہیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے اگر تمہاری اسی بات میں خوشی ہے تو میں ان سے مل لیتا ہوں۔ آگے تمہاری قسمت۔ تم حنا سے کسی دن کا وقت لو ہم اس دن ان کے ہاں جائیں گے۔"

وجاہت کے پاس حنا کا موبائل نمبر موجود تھا باپ کے جاتے ہی اس نے اس کا نمبر پنچ کیا۔ دوسری طرف سے کھنکتی ہوئی آواز آئی۔ "ہیلو......ہیلو! اوہ یہ تم ہو میں تو سمجھی تھی کہ بخار عشق ان دو چار دنوں میں اتر گیا ہوگا۔ مگر لگتا ہے کہ ابھی کچھ حرارت باقی ہے۔ اسی لیے تو میرا خیال آ گیا۔"

"تمہارا خیال تو ہر وقت میرے دل میں رہتا ہے۔"

مضرابوں کا رس نچوڑتی ہوئی کھنک ایک بار پھر سماعت میں اتری۔ "اپنے دعوے میں کہاں تک ثابت قدم ثابت ہورہے ہو؟"

"میں نے اسی سلسلے میں تم سے رابطہ کیا ہے۔"

"زہے نصیب جی آیاں نوں کہو!"

"میں نے اپنے گھر والوں سے بات کرلی ہے۔ وہ اس

سلسلے میں تمہاری ممی' ڈیڈی سے ملنا' ان سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم کسی نہ کسی فیصلے پر پہنچ ہی گئے ہو۔تو پھر کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟"

"تمہاری دونوں شرائط ہی بہت کڑی ہیں۔مما' پاپا کا خیال ہے کہ وہ اگر تمہارے گھر والوں سے مل لیں تو شاید ان شرائط میں کچھ لچک' کچھ نرمی لائی جاسکے' بس تم ہمیں اپنے ہاں آنے کا صرف ایک موقع دو۔"

"تم اپنی فیملی کے ہمراہ بڑے شوق سے ہمارے گھر اسی سنڈے کو آسکتے ہو' مگر تمہاری یہ کوشش فضول ہی ہوگی۔ کیونکہ جو میرا فیصلہ ہے وہی میری مما' پاپا کا فیصلہ ہے۔"

"تم ایک موقع تو دو۔"

"اوکے' میں نے کہا نا کہ تم اسی سنڈے کو ہمارے گھر آسکتے ہو۔"

"تھینک یو' تھینک یو ویری مچ۔"

"تمہارا انتظار رہے گا۔"

اسی سنڈے کو میاں جی شیخ صاحب کی پرشکوہ کوٹھی میں بیٹھے ہوئے تھے۔رسمی باتوں اور خاطر مدارات کے بعد وہی موضوع چھڑ گیا' جس کے لیے وہ یہاں جمع ہوئے تھے۔شیخ صاحب نے کہا۔

"میاں صاحب! ہماری ایک ہی بیٹی ہے' میں نے اس کی کبھی کوئی بات نہیں ٹالی' اس کی ہر آرزو پوری کی ہے یہاں تک کہ ہم نے اسے اپنا جیون ساتھی چننے کی بھی مکمل آزادی دے رکھی ہے۔ مجھے حنا نے ہر بات سے آگاہ کردیا ہے۔ہم آپ کی بات مان سکتے ہیں' یہ رشتہ طے ہوسکتا ہے' مگر شرائط وہی دونوں رہیں گی۔جن سے آپ واقف ہیں۔ دونوں شرائط میں سے جو چاہیں آپ ایک مان سکتے ہیں۔ مگر ان میں نرمی اور لچک کا سوال ہی ممکن نہیں۔ فیصلہ خود آپ کے ہاتھ میں ہے جو چاہیں کریں۔"

"تو یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے؟" "بالکل آخری۔"

میاں جی نے وجاہت کی طرف دیکھا۔"بیٹا! ہمارا جو کچھ بھی ہے وہ تمہارا ہے تم کہو تو ہم سب کچھ حنا کے نام کرنے کو تیار ہیں۔ کیونکہ ہمیں بھی تمہاری خوشی سے زیادہ اور کوئی شے عزیز نہیں ہے۔یا تم چاہو تو ہمیشہ کے لیے یہاں رہ جاؤ۔تمہارے یہاں یا وہاں رہنے سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔تم سے ملاقات تو ہوتی ہی رہے گی۔"

وجاہت میاں جی کا ہاتھ تھام کر کھڑا ہوگیا۔

"آپ کی دن رات کی محنت سے بنایا ہوا سب کچھ کسی اور کے پاس چلا جائے یہ مجھے کسی طور گوارا نہیں اور آپ سے دور رہنے کا تو میں تصور بھی نہیں کرسکتا۔ ہم اس لیے یہاں آئے تھے کہ حنا کی بتائی ہوئی شرائط میں شاید کوئی نرمی' کوئی لچک لائی جاسکے۔کوئی اور راستہ نکالا جاسکے' جو ان کے اور ہمارے دونوں کے لیے قابل قبول ہو۔ اگر مجھے ذرا بھی اندازہ ہوتا کہ یہاں آکر بھی دوسرا کوئی راستہ نہیں نکلے گا تو میں آپ کو کبھی یہاں نہیں لاتا۔ چلئے' ممی آپ بھی اٹھیے۔" زرینہ بیگم بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میاں جی نے ایک بار پھر وجاہت کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "دیکھو وجاہت اب بھی وقت ہے جو فیصلہ کرو سوچ سمجھ کر کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہیں بعد میں پچھتانا پڑے۔"

"خدا نے چاہا تو ایسا نہیں ہوگا آپ چلئے۔" میاں جی جہاں سے اٹھے تھے' وہیں بیٹھ گئے۔وجاہت اور بیوی کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر انہوں نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے چند کاغذات نکال کر امین صاحب کی طرف بڑھا دیئے۔"یہ میرے تمام بزنس اور بینک بیلنس کے کاغذات ہیں جو کہ پچیس کروڑ کے لگ بھگ ہیں خدا گواہ ہے' میں نے جو کچھ بھی بنایا' جو کچھ بھی حاصل کیا' وہ اپنی محنت اور خدا کے فضل سے حاصل کیا ہے اور میرا جو کچھ بھی ہے میرے بیٹے کا ہے۔ میرے لیے اس کی خوشی سے بڑھ کر اور کوئی شے عزیز نہیں۔ میں نے ان تمام کاغذات پر دستخط کرکے اپنا سب کچھ حنا بیٹی کے نام کردیا ہے' اب صرف حنا بیٹی کے دستخط ضروری ہیں۔ یہ ہوتے ہی میرا سب کچھ اس کا ہوجائے گا۔"

"پاپا! مجھے یہ سب منظور نہیں......" وجاہت نے کچھ کہنے کی کوشش کی ہی تھی کہ میاں جی نے اس کی بات کاٹ دی۔

"چپ چاپ بیٹھے رہو۔یہ میرا حکم ہے۔" وہ پہلو بدل کر رہ گیا۔شیخ صاحب نے بغور کاغذات دیکھے اور پھر حنا کی طرف بڑھا دیئے۔ حنا نے بھی کاغذات دیکھے سب کچھ پیپروں پر درج تھا۔اچانک باپ بیٹی کی نگاہیں ملیں' اور ان کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ بکھر گئی۔شیخ صاحب نے

مسکراتے ہوئے تمام کاغذات میاں جی کو واپس کر دیے۔
''اب ان کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں ان کے بغیر ہی آپ کی بات منظور ہے۔ آپ جب چاہیں بارات لے کر آسکتے ہیں۔ دراصل یہ سب حنا کی شرارت تھی۔ آپ اسے آزمائش بھی کہہ سکتے ہیں۔ بقول حنا کے اگر وجاہت ان دونوں شرائط میں سے ایک شرط بھی مان لیتا' خاص طور پر یہاں آ کر رہنے کی شرط' تو کسی صورت بھی اس رشتے کا طے ہونا ممکن نہیں تھا۔ مگر آپ نے یہاں آ کر جس طرح ہماری شرط پوری کی' آپ کی یہ ادا مجھے اور حنا کو بہت پسند آئی۔ اب آپ کے ان کاغذات کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو کچھ ہمارا ہے' وہ حنا کا ہے اور جو کچھ حنا کا ہے وہ' وجاہت بیٹے کا اور آپ کا ہے۔'' وجاہت' میاں صاحب اور زرینہ بیگم سب گم صم بیٹھے رہ گئے۔

اچانک دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ وجاہت چونک کر ماضی سے حال میں آ گیا۔ اسے فوراً ہی احساس ہوا کہ دروازے پر دستک ہو رہی ہے۔ اسے اس وقت کسی او رکا یوں مخل ہونا پسند نہیں آیا۔ وہ بادل ناخواستہ اٹھا' دروازے تک آیا' کھول کر دیکھا تو سامنے حنا کی سہیلی کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر خجالت کے آثار تھے۔

''سوری! یہ حنا کا موبائل میرے پاس رہ گیا تھا۔ پلیز اس تک پہنچا دیجیے۔''

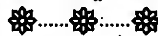
وہ دوبارہ بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا۔ بیڈ پر بیٹھتے ہی اس کا دل بے طرح دھڑک اٹھا۔ وہ آفت جاں جو اس کے من میں آ بسی تھی' آج اس کے روبرو تھی۔ اس نے اپنی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے اپنا ہاتھ گھونگھٹ کی طرف بڑھا دیا۔ ذرا سا گھونگھٹ سرکتے ہی اچانک اس کی آنکھیں مند گئیں۔ پلکوں کو بند کرنا اس کے لیے ناگزیر ہو گیا۔ جیسے بھری دوپہر میں غلطی سے سورج کی طرف نظر چلی گئی ہو۔ وہ قیامت آج دوآتشہ ہو کر اس کے روبرو تھی۔ اسے دیکھتے ہی وجاہت کو سچ مچ قیامت پر ایمان لانا پڑ رہا تھا۔ مزید دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے' مگر دوسرے ہی پل احساس ہوا کہ گویائی بھی چھینی جا چکی ہے۔ اب صرف ایک راستہ بچا تھا۔ محسوس کرنے کا۔

بعض چیزیں دیکھی نہیں جاتیں' محسوس کی جاتی ہیں۔ بعض باتیں کہی نہیں جاتیں محسوس کرائی جاتی ہیں۔ وجاہت نے ہاتھ بڑھا کر لائٹ آف کر دی۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ جیسے دوپہر کا سورج' اچانک رات کی تاریکیوں میں کہیں جا چھپا ہو۔ سورج رات کی تاریکیوں میں چھپ جائے تو چاند طلوع ہو جاتا ہے۔ دھیرے دھیرے نکلتا ہے چڑھتا ہے اور عین فلک کے سینے پر آ کر ہر شے کو اپنی چاندنی سے منور کر دیتا ہے۔ اس کمرے میں بھی ایک چاند تھا' جو کہ طلوع ہونے کو تھا۔ جس کی کرنیں' کسی کے وجود کو تسخیر کرنے کو بے تاب تھیں۔ وجاہت نے ہاتھ بڑھا کر چاند کو اپنے ہاتھوں کے پیالوں میں بھر لیا۔ وہ چاند سا چہرہ' ہاتھوں کے پیالوں میں نہ آ سکا۔ گلاب کی سیکڑوں پتیاں ان پیالوں میں سمٹ آئیں۔ جو احساس دلا رہی تھیں کہ ابھی پورا گلستان ان ہاتھوں کی دسترس میں آنے والا ہے۔ وہ خوب صورت پنکھڑیاں' لبوں کے بے حد قریب سمٹ آئیں۔ ان پنکھڑیوں کی خوشبو اسے مدہوش کرنے لگی۔ ایک لطیف سا احساس اس کے وجود میں سرایت کرتا چلا گیا۔



لاہور کا جلوس بھی اسی عقیدت ذوق وشوق سے جاری تھا۔ جیسے کراچی کا جلوس۔ چند لمحے پہلے تک جلوس کے ہر فرد تک کراچی کے تکلیف دہ سانحے کی خبر پہنچ چکی تھی۔ اس خبر کو سن کر نہ تو کوئی فرد جلوس سے رخصت ہوا تھا اور نہ ہی کسی کے چہرے پر خوف کی کوئی لہر نظر آئی تھی۔ جیسے انہیں معلوم ہو کہ موت ان کی طرف نہیں بڑھے گی اور اگر بڑھے گی بھی تو...... مگر اس خبر نے ہر اہل دل کی آنکھ نم کر دی تھی۔ ابھی ان کی یہ عبادت اختتام کو نہیں پہنچی تھی کہ اچانک ایک قیامت جیسا خوفناک دھماکا ہوا۔ اٹھے ہوئے ہاتھ' بازو نیچے نہ آ سکے۔ اپنے وجود سے الگ ہو کر سیکڑوں ٹکڑوں میں منقسم ہو گئے۔ یہ حال صرف اٹھے ہوئے ہاتھ اور بازوؤں کا ہی نہیں ہوا تھا بلکہ سیکڑوں لوگ اس سانحے کی زد میں آ کر اپنے اعضا کا وجود کھو بیٹھے تھے۔ قریب کی مضبوط دیواریں' ایک ہی جھٹکے میں زمیں بوس ہو کر رہ گئیں۔ زمین کا ایک ذرہ بھی ایسا نہ بچا' جو لہو کی سرخی سے سرخ نہ ہو چکا ہو۔ ابھی اس دھماکے کی گرد تھمی بھی نہیں تھی کہ ایک اور قیامت خیز دھماکا ہوا۔ ابھی اس دھماکے کی گونج مدہم نہیں پڑی تھی کہ کچھ فاصلے پر اسی نوعیت کا ایک اور دھماکا ہوا۔ سیکڑوں' ہزاروں

لوگ لمحوں میں لقمہ اجل بن گئے۔ ایمبولینس، پولیس اور رینجرز کی گاڑیاں فوراً آ پہنچیں۔ مگر یہاں حالت کراچی سے یکسر مختلف تھی۔ یہاں زخمی نہیں تھے۔ صرف لاشیں تھیں۔ لاشوں کے ورثاء، حساس دل لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ اس ظلم پر احتجاج کر رہے تھے۔ میڈیا کی ٹیم اس احتجاج کو ان قیامت ناک مناظر کو عوام تک پہنچا رہی تھی۔ اس بار سچ مچ قیامت صغریٰ کا منظر تھا۔ جاں بحق ہونے والوں میں کوئی وجود بھی ایسا نہیں تھا جو سلامت رہ گیا ہو۔ وہاں کئی جسم بریدہ، کٹے ہوئے سر نظر آ رہے تھے۔ جن کے چہرے کا اطمینان بتا رہا تھا کہ انہوں نے اپنی منزل کو پالیا ہے۔ کئی بازو، ہاتھ، پاؤں اور ٹانگیں ارد گرد بکھری ہوئی تھیں۔ ان بریدہ اعضاء کو دیکھنے والوں کا دل سینے سے بہا جا رہا تھا۔ اپنے گھروں میں بیٹھے لاکھوں لوگوں کی نمی، آنکھوں سے رخساروں تک کا سفر کر رہی تھی۔ لوگ مل جل کر اپنے غم کو سینوں میں دبا کر بریدہ اعضاء کو بریدہ لاشوں کو اکٹھا کرنے لگے۔ اپنی تاریخ میں اپنی نوعیت کا سب سے زیادہ تباہی مچانے والا سانحہ رونما ہو چکا تھا۔ ظلم کی انتہا ہو چکی تھی۔ جانے والے جا چکے تھے۔ قیامت تھم چکی تھی مگر اس تاریخ ساز قیامت کی یاد، اس قیامت کے نشان، کئی مہینوں تک سینوں میں، ذہنوں میں محفوظ رہنے والے تھے۔ اس قیامت کے، جس نے سیکڑوں گھروں کے ورثاء کو ان کے عزیز و اقارب سے چھین لیا تھا۔



اگلے دن وہ کالم شائع ہوا تو گویا پورے ملک میں بھونچال سا آ گیا۔ اس کالم کی اہمیت سے اے آر مہدی بھی بخوبی واقف تھے۔ انہیں اندازہ تھا کہ صبح اخبار کی تعداد دگنی زیادہ رکھنا پڑے گی۔ صرف اسی کالم کی بدولت، اخبار ہاتھوں ہاتھ بکے گا۔ ان کی توقع کے مطابق ایسا ہی ہوا۔ جب تک صدر یا وزیراعظم کے حامی اس خبر کو چھپاتے، دباتے، یہ کالم جنگل کی آگ کی طرح ہر جگہ پھیل چکا تھا۔ اور اس بار عوام نے ''بے حسی'' اور ''نظر اندازی'' کا مظاہرہ نہیں کیا۔ تمام تر ثبوتوں کے باوجود بھی عوام یہ کیسے گوارہ کر سکتے تھے کہ ان کے حکمران اتنی بے حسی سے ان کی گردن پر چھری پھیرتے رہیں اور وہ چپ رہیں۔ یہ ''انصاف پرور'' حکمران اب انہیں ایک پل کے لیے بھی گوارا نہیں تھے۔ جن کی حکومت آتے ہی، بجلی، پانی، چینی، آٹا اور بے روزگاری اپنے عروج پر پہنچ کر سابقہ ریکارڈ توڑ گئی تھی۔ جنہیں عوام کے بارے میں سوچنے کی ایک پل کو بھی فرصت نہیں۔ جو عوام کے ہی خون سے نچوڑی گئی دولت کے بل بوتے پر ''دوروں'' کے نام پر عیاشیاں کرتے پھریں۔ انہیں حکومت کرنے کا ذرا بھی حق حاصل نہیں۔ افراتفری میں شٹر ڈاؤن اور پہیہ جام ہڑتال کا اعلان ہوا۔ اور ہر بڑے شہر کی تمام معروف سڑکوں پر لوگوں کے سیکڑوں جلوس نکل آئے۔ آرمی کی بھی شاید حکومت سے ان بن تھی۔ فوج فوراً ہی حرکت میں آ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے مارشل لا لگ گیا۔ عارضی امن قائم ہوا تو عوام نے سکھ کا سانس لیا۔ وہ سابقہ حکومت کے ہاتھوں بہت ستائے ہوئے تھے۔ مہنگائی اور بے روزگاری کو بام عروج تک پہنچانے میں سابقہ حکومت نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ اس تبدیلی سے ہر فرد مطمئن تھا۔ جیسے اس بار تاریخ ساز حکومت قائم ہوگی۔ جو ان کی تمام محرومیوں، تمام دکھوں کا ازالہ کر دے گی۔ ملک میں ایسی خوش حالی آئے گی، جو صرف خواب میں ہی نظر آتی ہے۔ صحافت کی دنیا میں شاہد اقبال کے اس کالم کو نہ صرف احترام کی نظر سے دیکھا گیا بلکہ اس کی بھرپور تعریف بھی کی گئی۔ یکا یک ہی اس کی شہرت، زمین سے آسمان تک پہنچ گئی۔ صف اول کے ہر اخبار کا ایڈیٹر اس کا ہر کالم منہ مانگے داموں خریدنے کو تیار تھا۔ مگر اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ اس کے کالموں کی اصل جگہ صرف وہی ہے جہاں یہ تہلکہ خیز کالم شائع ہوا ہے۔ وہ سچ مچ اے آر مہدی کا شکر گزار تھا جن کی سپورٹ اس کے ساتھ تھی اور جنہوں نے حقیقی جرأت کا ثبوت دیتے ہوئے اس کالم کی اشاعت کا اہتمام کیا تھا۔ یہ خدا کا فضل تھا کہ اس کے کالم کا مثبت نتیجہ نکلا۔ اگر منفی نتیجہ نکلتا تو نہ صرف وہ فوراً جیل میں ہوتا، بلکہ اے آر مہدی بھی اس کے ساتھ ہوتے اور اس سے بڑھ کر اخبار کی اشاعت ہی بند کر دی جاتی۔ وہ دل ہی دل میں خدا کا بے حد شکر گزار تھا کہ جس نے نہ صرف اس کے قلم کو توانائی بخشی تھی بلکہ اس کے صرف ایک کالم کی بدولت، عوام کو کرپٹ حکومت سے بھی نجات دلائی تھی۔ اس کالم کی کامیابی نے اسے متکبر ہونے کی بجائے مزید توجہ سے اپنا کام کرنے پر مجبور کر دیا۔ وہ اپنے آئندہ شائع ہونے والے کالموں کی تیاری میں مصروف

ہوگیا۔



چند دنوں بعد ثاقب وحید کے نمبر پر اسی نمبر سے کال آئی۔ بڑے صاحب نے کسی قسم کی تمہید کے بغیر کہا۔ ''پچھلی بار جو لاہور میں ہم نے ایک فرقے کے لوگوں پر کامیاب ترین حملہ کیا تھا' جس کی ذمہ داری ہمارے کہنے پر ایک تنظیم کے بڑے لیڈر نے قبول کی تھی۔ ہمارے اس حملے سے ''مہربان دوست'' بہت خوش ہوئے ہیں مگر ابھی ان کا مقصد پورا نہیں ہوا۔ فرقہ پرست لوگوں میں پھوٹ نہیں پڑی۔ اس بار ان کی طرف سے حکم ملا ہے کہ دوسری مذہبی تنظیم کو نشانہ بنایا جائے اور اس بار اموات کی شرح دس' بارہ لوگوں تک ہونی چاہیے۔ ہمارے دوست کو خودکش بم دھماکے زیادہ پسند ہیں۔ ان کی ہدایت ہے کہ ہمیں ان کی طرف سے جتنے بھی ٹارگٹ ملیں' انہیں اسی طریقے سے پایہ تکمیل تک پہنچایا جائے۔''

''آپ بے فکر ہوجائیں۔ یہ کام کل ہی ہوجائے گا اور کوئی حکم؟''

''تم صحافی' شاہد اقبال سے واقف ہو؟''

''بہت اچھی طرح۔ یہ وہی صحافی ہے جس کے صرف ایک کالم نے حکومت کو ایک ہی جھٹکے میں زمیں بوس کردیا ہے۔ بہت ذہین اور لائق صحافی ہے۔''

''چوبیس گھنٹے میں اس کی مکمل ہسٹری معلوم کرکے بتاؤ مجھے۔''

''آپ کے کہنے سے پہلے ہی اس کا مکمل بائیو ڈیٹا معلوم کیا جاچکا ہے۔''

''گڈ ویری گڈ۔ تفصیل بتاؤ۔''

''کوئی لمبی چوڑی کہانی نہیں ہے اس کی۔ ایک اچھے اور شریف خاندان سے تعلق تھا۔ ماں' باپ بچپن میں چل بسے ایک چچا نے پال پوس کر جوان کیا۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد چچا سے مزاج نہ مل سکا تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس سے دور ہوکر کراچی آرہا۔ صحافت میں ڈبل ایم اے کیا ہے۔ پچھلے پانچ برسوں سے صحافت سے وابستہ ہے اور ابھی تک غیر شادی شدہ ہے۔''

''اس شخص کو ہر حال میں خریدنے کی کوشش کرو۔ جتنی قیمت لگے لگادو۔ مگر اس شخص کا ہمارا ہونا بہت ضروری ہے۔ یہ ہمارے بہت کام آسکتا ہے۔''

''سوری سر! آپ کے کہنے سے پہلے ہی ہم اپنی سی کوشش کرچکے ہیں۔ یہ وہ فرد ہی نہیں ہے جسے خریدا یا توڑا جاسکے۔''

''اگر یہ شخص ہمارا نہیں ہوسکتا تو ہم جیسی غیر معروف اور خفیہ تنظیم کی تہہ تک پہنچ کر اس کی حقیقت معلوم کرسکتا ہے۔ یہ ہمارے لیے مستقبل میں خطرہ بن سکتا ہے اس لیے اسے دنیا سے رخصت کرنے کا پروگرام بناؤ۔''

''آپ بے فکر ہوجائیں۔ اس کام کو جلد ہی مکمل کرکے آپ کو رپورٹ پیش کردی جائے گی۔''



وجاہت اور حنا صبح بیدار ہوئے تو رات کا خمار ابھی تک ان کی آنکھوں سے چھلک رہا تھا۔ حنا بستر سے کھڑی ہوئی تو وجاہت نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ اچانک اس کے موبائل فون کا بزر بج اٹھا۔ اس نے اسکرین پر نگاہ کی' سامنے میاں صاحب کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کال ریسیو کرلی۔ ''السلام علیکم پاپا!''

''وعلیکم السلام! خوش رہو جاگ گئے ہو؟ تو پھر فوراً ہماری بہو کے ساتھ نیچے چلے آؤ۔ اس کے ممی' پاپا آئے ہوئے ہیں۔''

''ابھی آئے پاپا۔'' آدھے گھنٹے بعد وہ نیچے پہنچے تو حنا کو اپنے ممی' پاپا کی جھلک دکھائی دی۔ دونوں نے چاروں سے دعائیں لیں اور ناشتے کی طویل ٹیبل کی چیئرز پر بیٹھ گئے۔ ناشتے کے دوران سب میں ہلکی پھلکی بات چیت ہوتی رہی۔ اسی دوران شیخ صاحب نے ایک لفافہ حنا کی طرف بڑھایا۔ لفافہ لیتے ہی اس کی آنکھیں ایک اندرونی مسرت سے چمک اٹھیں۔

''تھینک یو پاپا! تھینک یو ویری مچ۔''

''یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جس پر شکریہ ادا کیا جائے۔ ویسے بھی ہمارے درمیان اس لفظ کی بالکل گنجائش نہیں ہے۔''

''آپ سچ مچ ایک گریٹ پاپا ہیں' وجاہت اور میاں صاحب استفسار طلب نظروں سے شیخ صاحب کو دیکھنے لگے۔ جیسے پوچھ رہے ہوں' اس لفافے میں کیا ہے۔ انہوں نے ان کی نظروں کا مفہوم سمجھ لیا۔ ''بھئی پریشان ہونے کی

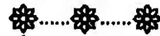
ضرورت نہیں۔ اس میں صرف اسلام آباد کے دو ٹکٹ ہیں اور وہ بھی کل کی تاریخ کے۔ یہ سب کرنے کے لیے مجھے حنا نے کہا تھا کہ وہ اور وجاہت اپنا ہنی مون مری اور آزد کشمیر کی وادی میں منائیں گے۔ وجاہت نے حنا کی طرف دیکھا۔

''تم نے مجھے بتایا بھی نہیں۔ حالانکہ میرا ارادہ تو کہیں باہر جانے کا تھا۔'' وجاہت نے کہا۔ حنا کے چہرے پر پشیمانی در آئی۔

''ایم ویری ویری سوری! میں آپ کو رات کو اس بارے میں نہ بتا سکی۔ ویسے مجھے یقین تھا کہ آپ میری بات ضرور مان لیں گے۔'' وہ پشیمان نظر آتے ہوئے بالکل اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ وجاہت نے اسے مزید کوفت و پشیمانی سے بچانے کی کوشش کی۔

''اوکے نو پرابلم' تمہاری خوشی ہی میں میری خوشی ہے۔ ہم کل کی فلائٹ سے ہی اسلام آباد پہنچیں گے اور پھر وہاں سے مری کی طرف نکل جائیں گے۔'' حنا کے لبوں پر مسکراہٹ لوٹ آئی۔

میاں جی نے گفتگو میں حصہ لیا۔ ''مری اور کشمیر اچھی طرح گھوم پھر آؤ' پھر باہر سے بھی ہو آنا۔ دو چار ماہ خوب تفریح کرو۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔'' گفتگو میں عارضی وقفہ آیا تو سب خاموشی سے ناشتہ کرنے میں مصروف ہو گئے۔ یہ بات کنفرم ہو چکی تھی کہ وہ نیا' شادی شدہ جوڑا کل' یعنی تین جولائی کی فلائٹ سے کراچی سے اسلام آباد پہنچنے والا ہے۔



ثاقب وحید نے اندرون شہر اپنے موبائل فون سے ایک نمبر ڈائل کیا۔ بیل جاتے ہی کال ریسیو کر لی گئی۔ ''یس سر! حکم کیجیے۔ تم تک شاہد اقبال کا مکمل بائیو ڈیٹا پہنچ گیا ہوگا۔ جس قدر جلد ہو سکے' اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچا کر اطلاع دو۔''

''کامیابی کی رپورٹ' شام سے پہلے ہی آپ تک پہنچ جائے گی۔''

''انتظار رہے گا۔''



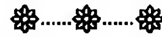
شاہد اقبال اپنے چند دوستوں کے ساتھ ایک حد تک کچھ غیر معروف سڑک کے کنارے کھڑا باتیں کرنے میں مصروف تھا۔ اچانک چار افراد دو موٹر سائیکل پر وہاں آ پہنچے۔ موٹر سائیکل رکتے ہی وہ آرام سے نیچے اتر آئے۔ ان چاروں میں سے دو کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ ان کے اطمینان اور بے خوفی کا یہ عالم تھا کہ ان کے چہرے پر نقاب تک نہیں تھی۔ انہوں نے شاہد اقبال کو ان تینوں صحافیوں سے الگ کر کے ایک طرف کھڑا کر دیا۔ شاہد اقبال کے علاوہ تینوں صحافیوں کے چہرے پر زردی چھا گئی۔ آنے والے چاروں افراد میں سے ایک جو سینئر نظر آ رہا تھا' اس نے اطمینان سے اردگرد کا جائزہ لیا اور پھر اپنے ساتھیوں کی طرف گردن سے ہلکا سا اشارہ کر دیا۔ اشارہ ملتے ہی دونوں کے ریوالور یکے بعد دیگرے تین بار گونجے۔ چھ گولیاں بیک وقت شاہد اقبال کے سینے میں اتر گئیں۔ اپنے قلم سے قوم کی تقدیر بدلنے کا خواب دیکھنے والا قلم کار' کٹی ہوئی شاخ کی طرح لہرا کر زمین بوس ہو گیا' لمحوں میں ہی خون میں لت پت ایک لاش' زمین کے بے اماں سینے پر پڑی ہوئی تھی۔ سینئر شخص چند لمحوں تک لاش کو دیکھتا رہا پھر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف مڑا۔

''چلو۔'' چند لمحوں میں دو موٹر سائیکلیں' اطمینان سے اسی سڑک پر رواں تھیں' جیسے انہیں کہیں پہنچنے کی کوئی جلدی نہ ہو۔



وہ جولائی کی تین تاریخ تھی۔ حاجی بشیر احمد اپنی تمام تیاریاں مکمل کر کے ایئرپورٹ جانے کے لیے اپنی گاڑی میں آ بیٹھے۔ ڈرائیور پہلے سے آگاہ تھا کہ انہیں ایئرپورٹ جانا ہے۔ کامران بھی ان کے ساتھ جانا چاہتا تھا مگر انہوں نے منع کر دیا۔ ان کے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے مستعدی سے گاڑی اسٹارٹ کی اور ایئرپورٹ جانے والی سڑک پر ڈال دی۔ حاجی بشیر احمد کو پچھلے سال حج پر جانے سے پہلے کے ایام یاد آ گئے۔ پچھلے سال بھی وہ اسی تگ و دو میں تھے کہ کسی غریب مگر مستحق فرد کو اپنے خرچے پر حج کرا سکیں۔ پچھلے سال انہوں نے اپنے گھر کے قریب' رہنے والے مسجد کے موذن کو حج پر لے جانے کا سوچا۔ اس سے پہلے کہ ان کی روانگی کا دن آتا' ایک دن عبداللہ بازار گیا اور اپنے قدموں پر چل کر واپس نہیں آیا۔ چند لوگ اس کے بے جان وجود کو اٹھا کر لے آئے۔ کراچی کے روز مرہ کے حالات میں

دو چار قتل ہونا بھی شامل تھا۔ قاتل اور مقتول، دونوں کا کسی مخصوص گروہ سے تعلق ہوتا تھا۔ مگر اس قتل و غارت کی زد میں کبھی کوئی بے گناہ اور لاتعلق شخص بھی آ جاتا تھا۔ جیسے اس بار عبداللہ شاہ آ گیا تھا۔ اچانک گاڑی کے ٹائر پوری قوت سے چرچرائے۔ وہ چونک کر خیالات کی دنیا سے باہر نکل آئے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتے، سنبھلتے اچانک ایک ہلکا سا دھماکہ ہوا ان کی گاڑی نے چند قلابازیاں کھائیں اور پھر ایک جگہ پر الٹے رخ رک گئی۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں سمجھ پائے تھے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھنے کے قابل ہوتے ان کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔



ثاقب وحید کو شام کو شاہد اقبال کے ''کام'' کی رپورٹ ملی تو اس نے اسی وقت ہی اس مخصوص انٹرنیشنل نمبر پر کال کی۔ ''شاہد اقبال کا مسئلہ حل کر دیا گیا ہے سر! ابھی نیوز چینلز پر بھی اس کی خبر آ جائے گی اور کوئی حکم......؟''

''کل بیرون ملک سے تمہارے بینک اکاؤنٹ میں ایک بہت بڑی رقم جمع کرائی گئی ہے۔ ''مستحق'' افراد تک پوری پوری رقم پہنچا دو۔''

''یہ کام بھی ہو جائے گا اور کچھ؟''

''سیف علی کی میرے نمبر پر کال آئی تھی۔ وہ آج کل اسلام آباد میں ہیں۔ وہ مجھ سے مل کر کسی اہم معاملے میں کچھ سمجھوتا کرنا چاہتے ہیں۔ میری جگہ تم اس سے مل کر اسے اپنی طرف جھکاؤ، سمجھوتے کو کامیاب بناؤ۔ ان کا ہماری طرف آنا خوش آئند بات ہے۔ ان کا میرے پاس بھی آنا ممکن نہیں اور نہ ہی کراچی میں آنا ممکن ہے۔ تم خود فوراً سے پیشتر ان سے ملو اور ملاقات کے بعد فوراً واپس کراچی پہنچو۔ تمہاری یہاں زیادہ ضرورت رہے گی۔ فی الحال اپنی جگہ کاشف حسن کو سونپ جاؤ۔''

''میں ابھی اسلام آباد کے لیے کوئی سیٹ بک کراتا ہوں۔''

''پاکستان کے تمام نیوز چینلز ہر وقت میری نظروں کے سامنے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود اگر کوئی اہم خبر ہو تو فوراً اطلاع دو۔''

کال منقطع ہوتے ہی ثاقب وحید نے ایک اور نمبر پنچ کیا۔ کال ریسیو ہوتے ہی کہا۔ ''جتنا جلد ہو سکے، اسلام آباد کے لیے ایک سیٹ کنفرم کراؤ۔''

اوکے سر! میں معلومات حاصل کر کے آپ کو اطلاع دیتا ہوں۔'' دوسری طرف سے کال منقطع کر دی گئی۔ دس منٹ بعد ہی ثاقب وحید کا موبائل فون جگمگا اٹھا۔ اسکرین پر دس منٹ پہلے ڈائل کیا ہوا نمبر جگمگا رہا تھا۔ ''ہاں کہو!''

''صبح، تین جولائی کی پہلی فلائٹ میں آپ کی سیٹ بک ہو گئی ہے۔ آپ کو ٹکٹ اور کاغذات جلد ہی مل جائیں گے۔''

''میں انتظار میں رہوں گا۔''



انہیں ہوش آیا تو وہ ایک پرائیویٹ اسپتال میں موجود تھے۔ ان کے سر پر چوٹ آئی تھی، جس سے ایک حد تک خون بہہ نکلا تھا۔ سر پر مرہم پٹی کر دی گئی تھی اور خون کی کمی کو پورا کرنے کے لیے انہیں خون کی بوتل لگی ہوئی تھی۔ انہیں ہوش میں آتا دیکھ کر کامران لپک کر ان کے قریب پہنچا۔ دور کھڑے ہوئے دوسرے عزیز بھی قریب سمٹ آئے۔ کامران نے بے ساختہ ان کا ایک ہاتھ نرمی سے تھام لیا۔ ''پاپا...... آپ...... آپ کیسے ہیں؟ یہ سب کیسے ہوا؟'' اس کے لہجے سے نمی اور بے قراری صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔

وہ دھیرے سے مسکرائے۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' اچانک انہیں اپنے ڈرائیور کا خیال آیا۔ ''زاہد میاں کیسے......؟''

''وہ...... وہ نہیں رہے۔''

انہوں نے بے ساختہ اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ''انا اللہ وانا......'' ایک پُراذیت لہر ان کے دل میں اتر گئی۔ آنکھیں کھول کر انہوں نے کامران کو دیکھا۔ ''میں خیریت سے ہوں میری فکر مت کرو، تم جاؤ، زاہد کے گھر والوں کو سنبھالو انہیں دلاسہ دو جس چیز کی ضرورت ہو، پوری کرو ان کی۔ تمہارا وہاں ہونا زیادہ ضروری ہے۔''

''اس منحوس حادثے کو بھی آج ہی ہونا تھا۔ آپ کتنی اچھی نیت سے قوم الکل کے پاس جا رہے تھے مگر......'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''نہیں بیٹا، ایسی باتیں نہیں کرتے۔ خدا کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے۔ خوامخواہ شکوہ کر کے خدا کو ناراض نہیں کرنا

چاہیے۔ ہر وقت اس کا شکر ادا کرنا چاہیے اب تم جاؤ۔"
کامران نہ چاہنے کے باوجود بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ حاجی بشیر احمد کا اس بات پر پختہ یقین تھا کہ خدا کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ انہیں جب بھی کوئی مصیبت یا پریشانی لاحق ہوتی تھی تو وہ یہی بات دہرا کر اپنے آپ کو مطمئن کرلیتے تھے۔ مگر اس بار ان کے ان لفظوں میں صداقت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ خدا کی واقعی اس حادثے میں ایک مصلحت پوشیدہ تھی۔ اس حادثے نے انہیں اس سے بھی بڑے حادثے سے بچالیا تھا۔

☆......☆......☆

وجاہت اور حنا' دونوں کے والدین انہیں ائر پورٹ تک آ کر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ بورڈنگ کے تمام مراحل سے گزر کر وہ اب ویٹنگ روم میں ویٹ کررہے تھے۔ نو بجے انہیں وہاں سے آؤٹ ہونا تھا۔ مگر اب نو کی بجائے ساڑھے نو ہونے والے تھے۔ مگر اب بھی پتا نہیں تھا کہ فلائٹ کی روانگی کب تک عمل میں آئے گی۔ حنا' وجاہت سے بھی زیادہ بور بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اکتا کر کہا۔ "جاؤ وجی! پوچھ کر آؤ کہ فلائٹ کب تک روانہ ہوگی۔" وہ اٹھ کر معلوماتی کاؤنٹر پر گیا اور پھر چند لمحوں بعد واپس لوٹ آیا۔ اس نے بیٹھتے ہی ایک گہری سانس لی۔
"لیجیے۔ ایک اور مصیبت پیدا ہوگئی ہے۔ جواب ملا ہے کہ موسم کی خرابی کے باعث فلائٹ لیٹ کی جارہی ہے۔ جونہی موسم ٹھیک ہوگا فلائٹ روانہ ہوجائے گی۔" حنا نے برا سامنہ بنایا۔ "اس موسم کو بھی آج ہی خراب ہونا تھا۔"
اس نے سرسری نظروں سے اردگرد کا جائزہ لیا۔ پورا ہال مختلف ممالک کے لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ سامنے ٹی وی پر "نیوز چینل" کی سرخیاں نظر آرہی تھیں۔ وقت دھیرے دھیرے سرکنے لگا۔ ہال میں وقتاً فوقتاً مختلف ممالک میں جانے والی فلائٹس کا اعلان ہوتا رہا۔ پھر اچانک ان کی باری آ گئی۔ دونوں نے اعلان سنا اور ایک دوسرے کو آسودگی بھری نگاہ سے دیکھ کر مسکرا دیئے۔ تمام مسافر ضروری کارروائی کے بعد جہازی زینے طے کرکے اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھنے لگے۔ پلین فضا میں پہنچتے ہی سیٹ بیلٹ کھول لیے گئے۔ تمام مسافر پرسکون ہوکر بیٹھ گئے۔

اس پلین میں ڈیڑھ سو کے لگ بھگ مسافر تھے اور ہر فرد کے سینے میں ایک کہانی پوشیدہ تھی۔ کچھ لوگوں پر کہانی بیتی تھی اور کچھ پر بیت رہی تھی۔ وہاں ایک خوب صورت عورت اپنے کم سن بیٹے کے ساتھ بیٹھی بہت دور تک سوچ رہی تھی۔ وہ کم سن بچہ اس کی واحد اولاد تھا۔ گھر میں دولت کی ریل پیل تھی مگر اس کے باوجود اس سے اس کا سکون چھن گیا تھا۔ کراچی کے خراب سے خراب تر حالات نے اسے دہلا دیا تھا۔ اسکولز میں بم بلاسٹ ہو رہے تھے۔ معصوم بچیاں اور بے گناہ بچے موت کے گھاٹ اتارے جا رہے تھے۔ اس صورت حال نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔ وہ اس خوف سے رہائی حاصل کرنے کے لیے چند ہفتوں کے لیے کسی پرسکون مقام پر جا کر رہنا چاہتی تھی۔ وہاں ایک کروڑ پتی سیٹھ بھی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ تین بیویوں اور کئی بچوں کا باپ تھا۔ مگر عالم پیری میں بازار حسن کی ایک دیوی پر دل ہار بیٹھا تھا۔ اس بازار میں ہر بار جانا ممکن نہیں تھا (نیک نامی بھی کوئی چیز ہے) اس نے اس حسینہ کی قیمت ادا کر کے اس کا ایک سال اپنے نام کر لیا تھا۔ وہ اسے کراچی نہیں لا سکتا تھا' وہاں جان پہچان کے بہت لوگ تھے' نیک نامی پر حرف آ سکتا تھا۔ سو اس نے اس حسینہ کو اسلام آباد میں ایک پرتعیش گھر کرائے پر لے کر دے رکھا تھا۔ جب بھی اس کی یاد آتی وہ ہفتہ پندرہ دنوں بعد جا کر اپنا دل بہلا آتا تھا۔

دوسری طرف ثاقب وحید بھی اپنی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا اسے اس طرح اپنے بارے میں سوچنے کے بہت کم مواقع میسر آتے تھے مگر جب بھی آتے وہ اپنے بارے میں بہت دیر تک اور بہت دور تک سوچتا تھا۔ بیس سال پہلے وہ ایک خفیہ' مخصوص جماعت میں شامل ہوا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے مختلف 'کارنامے' انجام دے کر بڑے صاحب کی نظروں میں اہم مقام حاصل کر لیا تھا۔ بڑے صاحب کی مہربانیاں بھی اس پر حد سے زیادہ ہونے لگیں۔ وہ اس پر حد سے زیادہ اعتماد کرنے لگے تھے۔ اسی لیے چند برس قبل' دیار غیر جانے کے بعد انہوں نے اپنے تمام اختیارات اسے سونپ دیئے تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں وہ تمام سیاہ و سفید کا مالک تھا۔

حنا اور وجاہت کی آنکھیں بھی مندی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں بھی سوچوں سے بے نیاز نہیں تھے۔

وسیم بھی اسی جہاز میں سوار تھا اور وہ بھی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ ماں باپ کا' بیوی کا' بیٹے کا چہرہ بار بار اس کے تصور میں آ رہا تھا اور آ آ کر اس کی بے چینی کو مزید ہوا دے رہا تھا۔ ہر شخص سوچ رہا تھا۔ آنے والے وقت کے بارے میں' آنے والے دنوں کے بارے میں' سب کے دل مختلف ارادوں سے پر تھے مگر تقدیر کا کچھ اور ارادہ تھا۔ ایسا ارادہ' جو دوسروں کے سب ارادوں پر بھاری ہوتا ہے۔ انسان سوچوں میں ڈوبا ہوا ہو تو کچھ پتا نہیں چلتا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔ کافی وقت گزر گیا تھا مگر بہت کم لوگوں کو اندازہ تھا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔

شاید ان کی منزل قریب تھی۔ بے حد قریب......

اچانک ہوا میں سکون سے تیرتا ہوا جہاز لہرایا۔ جیسے ایک لمحے کے لیے اس کی توانائی سلب کر لی گئی ہو۔ سیٹوں پر بیٹھے ہوئے سب لوگ لہرا گئے۔ چند عورتوں کی چیخیں نکل گئیں۔ سب لوگ خیالوں کی دنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آ گرے۔ جہاز کے سینئر پائلٹ کو کچھ پتا نہ چل سکا کہ جہاز کے لہرانے کی وجہ کیا ہے۔ ابھی وہ کچھ سوچ بھی نہیں پایا تھا کہ جہاز نے ایک اور گہری قلابازی کھائی' اس بار لوگ ایک دوسرے کے اوپر اوندھے منہ آ گرے۔ دہشت نے یک لخت تمام دلوں پر قبضہ کر لیا۔ دھڑکتے ہوئے دل تھمنے لگے۔ تھم تھم کر چلنے لگے۔ کچھ قلوب اپنی مخصوص رفتار سے زیادہ متحرک تھے۔ اس ناگہانی آفت کے پڑتے ہی سب لوگوں کے منہ سے بے اختیار خدا کا نام نکلا۔ انسان کی خود غرضی ثابت ہو چکی تھی کہ مصیبت پڑنے پر وقت آنے پر ہی سب اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ روتے ہیں' گڑگڑاتے ہیں اور خدا ان کی سن لیتا ہے...... مگر جب قیامت ہو' قیامت کا آغاز ہو' تب خدا کو پکارنے کا' معافی مانگنے کا' توبہ کرنے کا وقت نکل چکا ہوتا ہے۔ تب خدا نہیں سنتا' یہ مصیبت نہیں تھی' قیامت تھی' جو کہ ٹوٹنے والی تھی۔ مصیبت دور ہو سکتی ہے مگر قیامت نہیں ٹل سکتی۔ وہ قیامت' جو تقدیر کے اشتراک سے مل کر بپا ہو۔ تقدیر جب وار کرتی ہے' حملہ کرتی ہے تو کبھی کبھار اسے کسی بہانے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ اتنی بات ہی اس کے لیے اطمینان بخش ہوتی ہے کہ کوئی اس کے ساتھ ہے۔

اچانک عقیل عباس نے اپنے تمام تر تجربہ کو بروئے کار

لاتے ہوئے جہاز کو سنبھال لیا۔ جہاز چند لمحوں کے لیے ہوا میں تیرنے لگا۔ ایک سو پچاس کے لگ بھگ افراد کچھ دیر کے لیے موت کے منہ میں جانے سے بچ گئے۔ کوئی ایسا دل نہیں تھا' لب نہیں تھے جو خدا کو یاد نہ کر رہے ہوں کیا بوڑھے کیا جوان' سب کی آنکھوں کی نمی رخساروں تک کا سفر کر رہی تھی۔

"الٰہی! صرف ایک بار...... صرف ایک بار......" مگر اس بار وقت گزر چکا تھا۔ ایک بار کی مہلت بھی نہیں تھی۔ تقدیر کا فیصلہ اٹل تھا۔ آج کے دن ایک قیامت بپا ہونی تھی۔ قیامت صغریٰ' جسے لوگ مہینوں یاد رکھتے۔

پائلٹ کا دل سینے میں دھڑ دھڑا رہا تھا۔ وہ ایک نہایت پختہ کار پائلٹ تھا۔ اپنی پوری زندگی اس کام میں بتا چکا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی سروس پوری ہو چکی تھی۔ یہ اس کی آخری فلائٹ تھی۔ جو اسے سونپی گئی تھی۔ اس کے بعد وہ آرام سے اور سکون سے زندگی بسر کرتا...... اپنی پوری سروس میں اس کے ساتھ اس طرح کا معاملہ کبھی پیش نہیں آیا تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں سمجھ پایا تھا کہ بغیر کسی فنی خرابی کے جہاز لہرایا کیوں اور دوسری بار اتنی گہری قلابازی کیوں کھائی؟ وہ دن کا وقت تھا' ہر طرف اجالا تھا' اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اچانک اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ تقدیر جب کارگر حملہ کرتی ہے تو قیامت کے ساتھ موت بھی اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ موت کو اپنے ٹارگٹ کا پتا تھا' اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی' وہ بہت پرسکون تھی۔ جیسے اب سب اس کی مرضی سے ہونے والا ہے۔ موت نے سب لوگوں کی بجائے صرف ایک فرد پر حملہ کیا۔ وہ بیک وقت جب بھی کئی لوگوں پر اترتی ہے' اسی طریقے سے اترتی ہے۔ وہ فضائی ہو یا زمینی' موت سب سے پہلے صرف 'پائلٹ' کی بینائی چھینتی ہے۔ پھر اسے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس پائلٹ کی بھی اس نے بینائی چھین لی۔ اس نے کئی بار پلکیں جھپکائیں' سر کو دائیں بائیں جھٹکا' مگر اندھیرا بدستور قائم رہا۔ اس نے چیخ کر دوسرے پائلٹ کو اس صورت حال سے آگاہ کرنا چاہا' مگر اندازہ ہوا کہ گویائی بھی چھینی جا چکی ہے۔ اگر وہ بولنے کے قابل ہوتا تو بھی اس کے بولنے کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ جونیئر پائلٹ کی بھی وہی حالت تھی جو اس کی تھی۔

اچانک...... ایک خوفناک دھماکا ہوا...... جس کی گونج کئی میل دور تک سنائی دی۔ لوگوں کے خدشات سے لرزتے دھڑکتے دل ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے۔ فولاد سے بنا ہوا جہاز سیکڑوں ٹکڑوں میں منقسم ہو گیا۔ وہ جہاز ایک پہاڑی سے ٹکرا گیا تھا۔ جہاز کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں میں کہیں کہیں آگ بھڑک رہی تھی۔ جہاز میں سوار بہت سے اجسام کے چیتھڑے اڑ گئے تھے۔ کئی وجود اعضاء بریدہ ہو گئے تھے اور کئی وجود...... موت کی آغوش میں پہنچ گئے تھے۔ وہاں چند ایک کے علاوہ کوئی بھی لاش نظر نہیں آ رہی تھی۔ صرف کٹے پھٹے ہوئے اعضاء ہی نظر آ رہے تھے۔ کئی وجود پھٹ گئے تھے' جن کے لہو سے زمین سرخ ہو گئی تھی۔ ہوتی جا رہی تھی۔ آگ اور دھوئیں سے فضا سیاہ ہو رہی تھی۔ وہ روح فرسا منظر ایسا نہیں تھا' کہ کوئی آنکھ بھی اسے دیکھنے کی متحمل ہو سکتی۔ کسی میں اتنی ہمت' اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ اس منظر کو ان اعضاء بریدہ اجسام کو زیادہ دیر تک دیکھ سکتا۔ اس دھماکے کی گونج سنتے ہی کچھ مردوں کے ساتھ مقامی عورتیں بھی چلی آئیں اور یہ درد بھرا منظر دیکھ کر اپنی آنکھوں میں نمی بھر کو واپس لوٹ گئیں۔

حکومتی اہل کاروں تک خبر پہنچ گئی۔ وقتاً فوقتاً لوگ آنے لگے۔ چند لمحوں میں آگ بجھانے والی ٹیم بھی آ گئی۔ آتے ہی آگ بجھانے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر وہاں اب بچا ہی کیا تھا' بہت کچھ جلا کر آگ نے راکھ کر ڈالا تھا۔ چند لمحوں بعد ہی تمام آگ بجھ گئی۔ اب وہاں صرف دھواں تھا (انسانی خواہشوں کا' محبت کا' جذبوں کا......) سب کچھ ہی ختم ہو گیا۔ بہت سے لوگ ختم ہو گئے۔ جن میں ثاقب وحید بھی تھا اور حنا وجاہت بھی۔ ان میں وسیم بھی تھا' جس کا وجود اب عنقا ہو چکا تھا۔ ہر زندہ وجود کی کہانی' زندہ وجود کے ساتھ ہوتی ہے مگر جب زندہ وجود نہ رہیں ان کی کہانی بھی نہیں رہتی۔ بہت سے وجودوں کے ساتھ وہ تینوں چاروں وجود بھی ختم ہو گئے۔ ان کی کہانی ختم ہو گئی اور جب کہانی ختم ہو جائے' تب پڑھنے کے لیے کچھ نہیں رہتا۔

❖

# ناقابل تسخیر

**ندا حسنین**

ہسپانیہ خوابوں کی سرزمین، جہاں ہوائیں ساز بجاتی ہیں فضا پھولوں کی خوشبو سے معطر رہتی ہے وہی ہسپانیہ دنیا میں بل فائٹنگ جیسے خونی کھیل کے حوالے سے بھی مشہور ہے جہاں کے لوگ بل مقابلے میں مارا جائے تو بھی جشن مناتے ہیں اور فائٹر جان سے جائے تب بھی خوشی کے شادیانے بجائے ہیں۔

ایک خونی دنگل کی روداد جسے پڑھتے ہوئے آپ وقت کا احساس کھو دیں گے

وہ ہسپانیہ کے ایک دور افتادہ قصبے میں موجود میدان تھا جس کے چاروں اطراف سیکڑوں کی تعداد میں تماشائی دم سادھے بے حس وحرکت کھیل شروع ہونے کے منتظر تھے۔ میدان کی سطح پر بچھی ریت نہایت ہموار تھی اور سورج کی تیز کرنوں کے ٹکراؤ کے بعد سونے کے ذرات کی مانند جگمگا رہی تھی۔

یہ میدان کسی گلی ڈنڈا' کبڈی' اکھاڑے یا گیند بلے کے تماشے کے لیے نہیں سجا تھا' یہاں ایک خونی کھیل رچایا جانے والا تھا۔ جیون اور مرن کا کھیل...... ایسا کھیل جس میں موت یقینی تھی' یہ میدان بل فائٹنگ کا میدان تھا۔

''سورج میدان کے نصف حصے میں اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جگمگا رہا تھا۔ ہجوم پر سکتہ طاری تھا' سب کی نگاہیں سایہ دار حصے میں واقع صدر کی کیب پر ٹکی تھیں' صدر جو اس تقریب کا مختار کل تھا' اس نے اپنا خوشبوؤں سے معطر رومال فضا میں بلند کیا۔ یہ کھیل شروع ہونے کا اعلان تھا۔ اس کے ساتھ ہی بل رنگ میں بگل کی آواز گونجی اور ساتھ ہی شاہانہ لباس میں ملبوس ''ال گوسلز'' دو گھوڑوں پر سوار صدر کے کیبن کے نیچے آن کھڑے ہوئے۔ صدر سے موصول ہونے والے تمام احکامات بل فائٹرز تک پہنچانے کی ذمہ داری ال گوسلز کی تھی۔ صدر نے پاسیو (پریڈ) کی اجازت دی' ال گوسلز رنگ سے باہر نکل گئے۔ موسیقاروں کے گروہ نے بل فائٹنگ کی روایتی دھنیں بجانا شروع کردیں۔ جن میں بگل کی دھن سب سے نمایاں تھی۔ ان دھنوں کے فضاء میں رس گھولتے ہی تماشائیوں کی نگاہیں دوسرے سرے پر موجود دروازے پر جا ٹکیں۔ پاسیو کا آغاز ہوا ہی چاہتا تھا۔

پاسیو میں سب سے آگے ال گوسلز تھے۔ ان کے پیچھے اس کھیل کا سب سے اہم کردار بل فائٹر تھوڑی اونچی کیے تماشائیوں کی داد وتحسین پر ہاتھ ہلاتے چلا آ رہا تھا۔

''سنا ہے یہ فائٹر بڑا برارتیو (بہادر) ہے۔'' تماشائیوں کی آگے کی نشستوں پر بیٹھے رافیل نے جوش میں چلا کر کہا۔

''ہوگا برارتیو...... مگر یہ بل بڑا تجربہ کار ہے اور تجربہ کار بل کے آگے بہادر سے بہادر فائٹر بھی نہیں ٹکتا......'' اس کے ہمراہ بیٹھے لوکاس نے پرسوچ نگاہیں بل فائٹر کے مسکراتے ہوئے چہرے پر جماتے ہوئے کہا۔

''تو تم کہنا چاہتے ہو کہ آج بھی ہمیں بل فائٹر کی بلی دینا پڑے گی۔'' رافیل نے حیرانگی وتعجب کے ملے جلے تاثرات کے زیراثر لوکاس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''شاید آج بھی یہ سنہری ریت انسانی خون کے رنگ میں رنگ جائے گی......'' لوکاس اداس تھا' اسے بل فائٹر کو دیکھ کر مایوسی ہوئی تھی۔ وہ کئی سالوں سے سکو دیا کے اس چھوٹے سے قصبے میں منعقد ہونے والے بل فائٹنگ کے



کھیل کو دیکھتا آ رہا تھا۔ تماشے کے دوسرے اہم اور مرکزی کردار کے وحشی پن سے وہ بخوبی واقف تھا۔

بُل فائٹر کے ہمراہ معاون بُل فائٹر شانہ بشانہ چلے آ رہے تھے۔ ان کے عقب میں چپڑاسی' باندرلو اور پھر برچھی بردار گھڑ سوار پکادور چلے آ رہے تھے' سب سے آخر میں بُل رنگ میں کام کرنے والے ملازم ان خچروں کو لیے آتے ہیں جو بُل کو گھسیٹ کر اصطبل میں واپس لے جانے کا کام کرتے ہیں۔ قاتلوں' ہتھیاروں اور میت اٹھانے والوں کا جلوس بڑی شان وشوکت سے پاسیو کی صورت تماشائیوں سے داد وصول کر رہا تھا۔

ہجوم نے بے پناہ شور برپا کر رکھا تھا۔ پاسیو کا اختتام ہوتے ہی بُل فائٹر لکڑی کی گیلری کے پیچھے چلا گیا' باقی سارا عملہ بھی منتشر ہو کر بُل رنگ سے باہر نکل گیا۔

''کنواری مریم' اگر آج میں اس وحشی بُل کا خاتمہ کردوں تو گرجے میں جا کر سو موم بتیاں جلاؤں گا۔'' فلپ نے اپنے اردگرد گلابی کیپ لپیٹتے ہوئے دل ہی دل میں دعا کی' وہ ابھرتا ہوا نوجوان بُل فائٹر تھا۔ اس قصبے کے وحشی بُل کی شہرت اس نے بھی سن رکھی تھی اور وہ بخوبی جانتا تھا کہ اس بُل نے آج تک کسی بُل فائٹر کو رنگ سے زندہ باہر جانے نہ دیا تھا۔

فلپ کامیابی کی سیڑھی تیزی سے سر کرنا چاہتا تھا۔ شہرت' دولت اور رنگینیوں کی کشش اسے بری طرح اپنی جانب کھینچ رہی تھی۔ وہ جلد سے جلد وہ سب کچھ سمیٹ لینا چاہتا تھا جو ایک اعلیٰ پائے کے بُل فائٹر کے نصیب میں ہوتا ہے' اسی لیے اس نے اپنی زندگی کا خطرناک ترین فیصلہ کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ فیصلہ اس کی زندگی کا آخری فیصلہ بھی ثابت ہوسکتا ہے' مگر اسے اپنی ذہانت اور کھیل کے داؤ پیچ میں مہارت پر بھرپور یقین تھا۔ آج اگر وہ اس وحشی بل کو ہرا دیتا تو اس کا شمار راتوں رات شہرت یافتہ بُل فائٹرز میں شامل ہوجاتا۔ یوں اس کی رسائی میڈرڈ تک بھی جا پہنچتی' جہاں بُل فائٹنگ کا دنیا کا سب سے مقبول اور پُرکشش رنگ تھا' وہیں اسے پیشہ ور بُل فائٹر کا خطاب بھی مل سکتا تھا۔ یہی وہ سارے عوامل تھے جس نے اسے اپنی زندگی کے سب سے مشکل ترین فیصلے کا انتخاب کرنے پر اکسایا تھا۔

فلپ کیپ لپیٹے خونی دنگل کے لیے تیار تھا۔ وہ اب بے چینی سے سرخ پھاٹک کی جانب دیکھ رہا تھا۔ جہاں ایک بوڑھا پھاٹک کے سرخ کوارٹر پر ہاتھ دھرے کھڑا تھا' اس کے کپڑوں کے ساتھ ساتھ اس کے ننگے سر پر ٹکا ہیٹ بھی بوسیدہ تھا۔

مجمع پر مکمل سکوت طاری تھا۔ اچانک بگل کی تیز آواز گونج اٹھی۔ بوڑھے نے پوری قوت سے کواڑ کو دھکیلا اور سرعت سے ایک طرف کو ہٹ گیا۔ آناً فاناً ایک برقی لہر کی مانند بھاری بھرکم جسامت کا مالک کالا جنشہ بیل اصطبل سے دوڑتا ہوا میدان میں داخل ہوا۔ اس کے طاقت ور سموں اور بھاری بھرکم وجود سے زمین لرزنے لگی تھی' اس نے دوڑتے ہوئے میدان کا چکر لگایا اور فاتحانہ انداز میں میدان کے عین وسط میں جا کھڑا ہوا۔ اپنی سیاہ تھوتھنی اوپر اٹھائے چمکتی نگاہیں میدان کے چاروں اطراف بیٹھے تماشائیوں پر جمائے وہ جیسے اپنی شان کا خراج طلب کر رہا

تھا۔

''طاقتور' مغرور' برارتیو (بہادر) لیرافنادو (ناقابل تسخیر)''

تماشائی تالیوں کی گونج میں اس کی شان کے قصیدے پڑھ رہے تھے۔

فلپ نے گہری نگاہوں سے اس خونی بل کا جائزہ لیا۔ بلاشبہ وہ اعلیٰ ترین نسل کا بھینسا تھا۔ مضبوط موٹی کھال چمکتی آنکھیں چوڑا ماتھا' سم اور سر چھوٹے' گردن موٹی' جس پر گوشت کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ چوڑے کاندھے' پتلی دم اور سب سے خطرناک اس کی آگے کی طرف مڑی ہوئی نوکیلی سینگیں۔

وہ واقعی ناقابل تسخیر تھا..... لیرافنادو!

فلپ نے ایک بار پھر کنواری مریم کو یاد کیا..... اور بل کا ایک بار پھر سے جائزہ لینے لگا' بل کے انداز و اطوار اسے بہت کچھ سمجھا چکے تھے۔ وہ اس دنگل کا بے تاج بادشاہ تھا۔ کتنے ہی بل فائٹر کو اس نے چیر پھاڑ کر رکھ دیا تھا۔

''ہے تورو..... ہے تورو.....!'' بل کی تکبرانہ چال دیکھ کر مجمع اسے چلا چلا کر اپنی جانب متوجہ کرنے لگا۔

بل فائٹ کے ڈرامے کا مرکزی کردار خم ٹھونکے میدان میں کھڑا تھا۔ دوبارہ بگل کے بجتے ہی بل فائٹنگ شروع ہوگئی۔

خونی دنگل میں پہل معاون بل فائٹر نے کی۔ وہ بل کے آگے کیپ لہرا لہرا کر اس سے چھیڑ خانی کرتے رہے' فلپ اس چھیڑ خانی کے دوران بل کی حرکات و سکنات کا مکمل جائزہ لیتا رہا' کچھ دیر تک یہی سلسلہ جاری رہا پھر معاون بل فائٹر چلے گئے۔

اب اصل دنگل شروع ہونے کو تھا۔

فلپ کے میدان میں قدم رکھتے ہی رنگ تماشائیوں کی تالیوں سے گونج اٹھا۔ فلپ نے اپنے اردگرد لپٹا ہوا کیپ اب کھول کر بل کے سامنے پھیلا لیا تھا' جیسے اسے حملے کی دعوت دے رہا ہو۔ بل اپنی جگہ ساکت کھڑا اسے اپنی چمکیلی نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ فلپ نے دوسری دفعہ کیپ جھٹکا اور زبانی کلامی بل کو اکسانے لگا۔

''ہوہو..... یویو..... ہے..... ہے تورو ہے تورو.....!''

فلپ کے اکساتے ہی مجمع بھی اپنے رومال اور ہیٹ ہلاتے ہوئے شور مچانے لگا۔

''ہے تورو..... ہے تورو۔''

مگر بل اس شور وغل سے بے نیاز تھا' اس کے لیے نہ تو یہ میدان نیا تھا' نہ ہی ہوہو ہاہا کرتے تماشبین' اس کی نگاہوں کا مرکز صرف اور صرف فلپ تھا۔ جو پیلے' گلابی کپڑے کو لہراتے ہوئے نہ جانے کیا کیا الم غلم بکے جا رہا تھا۔ شاید وہ جانتا نہیں تھا وہ اس رنگ برنگے کپڑے کے پیچھے چھپے دھوکے سے بخوبی واقف تھا۔

فلپ نے مزید اشتعال دلانے کی غرض سے ذرا اور نزدیک ہو کر کیپ کو جھٹکا' اور بل کو للکارنے لگا۔

''ہوہو..... ہے آرن کادا (بزدل)''

فلپ کے آرن کادا پکارتے ہی مجمع بھی بل پر ہوٹنگ کرنے لگا۔

''آرن کادا..... آرن کادا.....''

بل کو شاید مجمع کا یوں برا بھلا کہنا سخت برا لگ گیا۔ اس نے ایک غصیلی نگاہ فلپ کے چہرے پر ڈالی اور اپنے پچھلے سموں سے ریت اڑاتے ہوئے ناک سے دھواں چھوڑا اور حملہ آور ہوا..... بل کی تھوتھنی اور سینگوں کو کیپ سے چھوتے ہی فلپ نے پنجوں کے بل گھوم کر کیپ ہوا میں لہرا دی۔ بل کا وار چوک گیا اور وہ آگے دوڑتا ہوا چلا گیا۔

''ویرونیکا.....'' تماشائی فلپ کے اس انداز پر پکار اٹھے۔ سیٹیوں کی شدت میں اضافہ ہوتا چلا گیا تھا۔

''ہے تورو..... ہے تورو.....'' تماشائی ایک بار پھر بل کے ساتھ چھیڑ خانی کرنے لگے۔ بل کے پہلے وار خالی جانے پر فلپ کے اعتماد میں اضافہ ہوا' اس نے دوبارہ کیپ جھٹک کر بل کو حملے کی دعوت دی اور بل کے حملہ کرنے پر ایک بار پھر ویرونیکا' کے داؤ کا استعمال کرتے ہوئے کیپ ہوا میں لہرا گیا۔

مجمع اس بار بھی داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے بناء نہ رہ سکا۔

''میں نے کہا تھا ناں کہ یہ بل فائٹر بے حد بہادر ہے۔'' کھیل کے ابتدائی لمحات دیکھنے کے بعد رافیل نے پُرجوش ہوتے ہوئے لوکاس سے کہا۔

''بہادر تو بہت ہے' مگر بل کے تیور زیادہ خطرناک نظر

آ رہے ہیں۔" لوکاس نے اختلاف کیا۔
"خطرناک......؟ مجھے تو بُل بوڑھا ہوتا نظر آ رہا ہے۔ دیکھو کتنی مشکل سے اپنی جگہ سے ہلا ہے۔" رائیل لوکاس کی بات پر جبڑا پھاڑے ہنستے ہوئے بولا لوکاس خاموش رہا۔
مگر وہ ہنوز اداس تھا۔ وہ اس بل کو آج ہارتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ آج بھی اس میدان میں کسی انسان کا خون بہے۔ ہر ہسپانوی کی طرح وہ بھی بل کو دنیا کی دوسری قوموں کی صورت دیکھتا تھا۔ خاص کر وہ قومیں جو ملک دشمن تھیں اور ہر ہسپانوی رنگ میں بُل فائٹر کی جگہ خود کو ان قوموں سے بھڑتا ہوا دیکھ رہا ہوتا تھا۔ اسی لیے لوکاس کی بھی شدید خواہش تھی کہ آج اس دنگل میں زندگی کی بازی بُل ہارے مگر بُل کے تیور اسے بہت کچھ سمجھائے دے رہے تھے۔
فلپ نے ایک بار پھر کیپ کو جھٹکا اور رویرونیکا کے انداز میں پنجوں کے بل گھومتے ہوئے بُل کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو گیا۔ فلپ کے اعتماد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا مگر کسی بھی دنگل میں شامل حریفوں میں سے ایک کے اعتماد میں اٹھتا ہوا اضافہ دوسرے حریف کو اشتعال میں مبتلا کر ڈالتا ہے بُل بھی اس وقت شدید اشتعال میں مبتلا تھا۔
کچھ دیر مزید یونہی بُل کے ساتھ چھیڑ خانی کرنے اور اسے تھکا دینے کی کوشش کے بعد فلپ نے پیش قدمی کی...... وہ بُل کے مزید نزدیک آ گیا۔ یہ ایک انتہائی خطرناک عمل تھا بُل کے نزدیک ہو کر لڑنا بے حد خطرناک عمل تھا۔ وہ بھی اس بُل سے جو گزشتہ کئی سیزن سے بُل فائٹروں سے لڑ لڑ کر ان کے سارے داؤ پیچ بخوبی جان گیا ہو مجمعے میں لحہ بھر کو سناٹے کی لہر دوڑ گئی۔
"ری بولیرا...... وہ ری بولیرا کا انداز اپنانے والا ہے۔" رائیل بے یقینی سے چلا اٹھا۔
"وہ جلد بازی کر رہا ہے...... وہ بُل کو سمجھنے میں غلطی کر رہا ہے۔" لوکاس نے سر کھجاتے ہوئے پریشانی سے کہا۔ ری بولیرا کے انداز میں ذرا سی بھی غفلت بُل فائٹر کو زخمی کرنے کا باعث بن سکتی ہے۔
"نہیں یہ بُل فائٹر بے حد بہادر ہے۔ میں جانتا ہوں اس بُل کو یہی ہرا سکتا ہے۔" رائیل نے کچھ برا مناتے ہوئے لوکاس کو دیکھتے ہوئے کہا لوکاس نے جواب میں کچھ نہ کہا اور نظریں میدان میں ٹھہرے دونوں حریفوں پر گاڑھ دیں۔
فلپ نے ایک بار پھر بل کو اپنی جانب متوجہ کیا۔
"او...... او...... او......" تماشائی فلپ کا اگلا داؤ بھانپ چکے تھے مخصوص انداز میں داد دینے کی تیاری کرنے لگے۔
بل نے اس بار فلپ پر کوئی توجہ نہ دی۔
"ہوہوہو...... ہے تورو......" فلپ اسے اشتعال دلانے کی غرض سے ذرا مزید نزدیک ہوا۔
لوکاس چونک گیا...... اسے اچھی طرح یاد تھا کہ پچھلے سیزن میں دو بُل فائیٹروں کی موت اسی بولیرا کے انداز کو اپناتے ہوئے ہوئی تھی۔ اس پل اسے یوں لگا کہ کھیل بُل فائٹر نہیں بُل کھیل رہا ہو...... دھوکہ بل نہیں بُل فائٹر کھا رہا ہو۔
"کنواری مریم اس بیچارے بُل فائٹر کی مدد کرنا۔" وہ بے ساختہ دل ہی دل میں دعا مانگ بیٹھا۔
فلپ کے مزید نزدیک ہونے پر بُل نے انتہائی غصے سے اسے دیکھا تھا۔ وہ پچھلے سموں سے ریت اڑانے لگا تھا اور نتھنوں سے گہری سانسیں لے رہا تھا۔ فلپ کو اس لمحے اس بُل سے بے حد خوف محسوس ہوا۔
"یسوع مسیح...... لاج رکھنا......" اس کے دل سے بے اختیار دعا نکلی۔
فلپ نے ہمت کر کے ایک بار پھر کیپ جھٹکی اور جیسے ہی بُل حملہ آور ہوا اس نے کیپ لہرانے کے بجائے اپنے اردگرد سمیٹ لی۔ یہ ری بولیرا کا انداز تھا۔
"او...... او...... او لے (مرحبا)" تماشائیوں نے خاص انداز میں داد دی مگر اگلے ہی ثانیے مجمع پر سکوت طاری ہو گیا ری بولیرا کے داؤ کے نتیجے میں بُل جب دوڑتے ہوئے آتا تو کیپ کے سمت جانے پر وہ بروقت خود کو روکنے کی کوشش میں لڑکھڑا جاتا یا گر جاتا...... بُل کا گرنا یا لڑکھڑا جانا فلپ کے لیے بڑی کامیابی ہوتی...... مگر فلپ بڑی کامیابی سے محروم ہو رہا اس پل رنگ میں جو گھٹنا گھٹی تھی وہ اندوہناک تھی۔
بُل نے دھوکا نہیں کھایا تھا بلکہ وہ بُل فائٹر پر حملہ آور ہوا تھا۔ اس کی نوکیلی سینگیں فلپ کی ران کو چیرتی ہوئی نکلی

تھیں۔

"اوہ خدایا.....!" رافیل یہ منظر دیکھ کر کراہ کر رہ گیا۔

لوکاس نے سیدھے ہاتھ کا مکا بائیں ہاتھ میں مارتے ہوئے غصے و بے بسی کا اظہار کیا۔ آخر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ مجمع میں شامل ہر فرد انتہائی افسوس کے عالم میں تھا۔

فلپ کو لگا جیسے اس کی ران میں کسی نے زہریلا خنجر اتار دیا ہو۔ وہ لڑکھڑا کر گر پڑا.....!

اس کی سماعتوں میں بُل کے سموں کی دھمک گونج رہی تھی۔ یقیناً وہ ایک بار پھر اس پر حملہ آور ہونے کے لیے بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔ وہ اپنی تمام ہمت مجتمع کر کے ایک بار پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر بُل اس کے انتہائی نزدیک آ چکا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے اپنی نوکیلی سینگوں سے اسے اٹھا کر دور پھینک ڈالا۔ مجمع پر ہنوز سکتہ طاری تھا۔

"ایک اور بُل فائٹر.....!"

مددگار بُل فائٹر آ چکے تھے..... اور بُل کو اپنی جانب متوجہ کر رہے تھے مگر بُل وحشیانہ انداز میں فلپ کے اوپر چڑھ دوڑا تھا۔

فلپ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا چلا گیا۔ ایسا اندھیرا جس کے بعد کوئی سویرا نہ تھا۔ اس کا خون تیزی سے سنہری ریت کو سرخ کرتا چلا گیا۔

"میں نے کہا تھا ناں..... بُل فائٹر بُل کو سمجھنے میں غلطی کر رہا ہے۔" لوکاس رندھی ہوئی آواز میں بولا۔ رافیل نے نڈھال سے انداز میں تائیدی نگاہ سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم نے صحیح کہا تھا دوست۔" ان دونوں نے ایک بار پھر نگاہ میدان پر گاڑھ دی' جہاں سے فلپ کی لاش کو اسٹریچر میں ڈال کر لے جایا جا چکا تھا اور اب وہاں بُل فاتحانہ انداز میں میدان کا چکر لگا کر سینہ تانے تھوتھنی اٹھائے ایک شان سے کھڑا بے بس مجمعے کو تمسخرانہ نگاہوں سے تک رہا تھا۔

رنگ کا بے تاج بادشاہ..... لیرا فتادو!

❖.....☆.....❖

آرون سینٹیا گو بُل فائٹنگ کی دنیا کا ابھرتا ہوا روشن ستارہ تھا۔ حال ہی میں اسے سیڈرڈ کے بُل رنگ سے بے مثال پروفیشنل بُل فائٹر کا خطاب ملا تھا۔ بُل فائٹنگ کے پنڈتوں نے اسے "بُل کلر ماسٹر" کے خطابات سے بھی نوازا تھا۔ اس کے ایک ایک داؤ پر ہسپانوی نوجوان دیوانہ وار داد و تحسین کے ڈونگرے برساتے۔ اس کے ہونٹوں سے لگے جام کے مشکیزے سے ایک گھونٹ بھرنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے' مقابلے کے اختتام پر جب وہ تھرتھراتے ہوئے بُل کے نڈھال بھاری جسم پر اپنا بایاں پاؤں رکھ کر دائیں ہاتھ سے نیزہ بلند کرتے ہوئے نگاہ چاروں اطراف بیٹھے تماشائیوں پر ڈالتا تو مجمع جھوم جاتا۔ ہسپانوی دوشیزائیں وارفتہ ہوتی چلی جاتیں۔ یہ وہ لمحات تھے جو آرون کے جوش وجذبات اور ولولے کو مزید ہوا دیتے' اسے مزید طاقت بخشتے' اس اعلیٰ مقام تک پہنچنا تو نہ جانے کتنے ہسپانوی کا خواب تھا مگر اس خواب کو پورا کرنے کی طاقت وصلاحیت ہر کوئی نہیں رکھتا تھا' یہ اس کی خوش بختی تھی کہ اس کے جوش وجذبے' بُل فائٹنگ میں مہارت اور بہادری کو کامیابی ملی.....اور وہ عروج کے اس بلند مقام پر کھڑا عزت' شہرت' دلکشی' دولت کو اپنے دامن میں سمیٹ رہا تھا۔

اپنے کیریئر کے عروج پر پہنچ کر آرون نے ایک انتہائی غیر متوقع فیصلہ کر کے اپنے چاہنے والوں کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کر ڈالا۔ وہ اپنی گرل فرینڈ کیمیلا سے شادی کرنا چاہتا تھا' اس فیصلے کو سن کر جہاں اس کے چاہنے والوں نے خوشی کا اظہار کیا تھا وہیں کچھ لوگوں نے خدشات کا اظہار بھی کیا تھا۔

بُل فائٹرز اپنے نقطۂ عروج پر شادی کرنے کا رسک کم ہی اٹھاتے ہیں۔ اس سے ان کی توجہ بُل فائٹنگ سے بھٹک کر ازدواجی زندگی پر مرکوز ہو جاتی ہے' جس کی بنا پر ان کی کھیل پر گرفت ومہارت متاثر ہوتی جاتی ہے۔ مگر آرون نے ان تمام خدشات واعتراضات کی پروا نہ کی۔ کیمیلا سے اس کی محبت آفاقی تھی اور وہ اس سے ہر صورت شادی کرنا چاہتا تھا۔

❖.....☆.....❖

"اوہ میرے آرون..... تم نہیں جانتے..... تمہاری محبت' تمہاری رفاقت پا کر میں کتنی خوش ہوں۔" شادی کی رسومات مکمل ہونے کے بعد جب وہ کیمیلا کو ساتھ لیے گھر پہنچا تو کیمیلا نے محبت سے سرشار لہجے میں اپنی خوبصورت و نازک بانہیں آرون کے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''تم نہیں جانتے آرون میں کتنی خوف زدہ تھی کہ کہیں تمہاری آنکھیں دولت کی دھوپ، رنگینیوں کی چمک اور شہرت کی دھمک سے اندھی نہ ہو جائیں اور تم میری محبت سے منہ موڑلو۔''

ارون کیمیلا کی شکایت پر مسکرا اٹھا...... اس کے چاہنے والوں کی طرح اس کی محبوبہ کو بھی اس سے خدشات تھے۔

''کیمیلا تم سے میری محبت وقتی یا عارضی نہیں، دائمی محبت ہے۔ شہرت، دولت کی چمک، دھوپ مجھے تم سے دور نہیں کر سکتی۔ تب ہی تو تمہیں میں نے اپنی فیملی کا حصہ بنایا ہے۔'' آرون نے کیمیلا کو اپنی مضبوط بانہوں کے گھیرے میں لیتے ہوئے کہا۔

''میں بہت خوش ہوں آرون......'' کیمیلا خوشی سے سرشار لہجے میں کہتے ہوئے آرون کی بانہوں میں سما گئی۔

شادی کے بعد آرون اور کیمیلا کی زندگی مزید حسین ہوتی چلی گئی۔ وہ دونوں ہی ہنی مون کے لیے ملک سے باہر چلے گئے تھے۔ اسی دوران آرون کے پاس فلپ کی بُل فائٹنگ کے دوران اندوہناک موت کی خبر آئی۔ آرون کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ فلپ آرون کا جونیئر ہونے کے باوجود بہترین دوست تھا۔ آرون اس کی آگے بڑھنے کی، اپنا مقام بنانے کی جدوجہد سے بخوبی آگاہ تھا۔ سیکوویا جانے سے قبل فلپ نے اس سے اپنے ارادے کا اظہار کیا تھا۔ اس خونی بُل کے بارے میں بتایا تھا۔ یہ آرون کا ہی مشورہ تھا کہ فلپ کو اس خونی بل سے مقابلہ کرنا چاہیے اس خونی بُل کو شکست دینے کے بعد وہ دنیائے بُل فائٹنگ کا جانا پہچانا بُل فائٹر بن سکتا ہے اور میڈرڈ تک اس کی رسائی باآسانی ممکن ہو سکتی ہے۔

مگر آرون کے گمان میں بھی نہ تھا کہ فلپ اس مقابلے میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ وہ سخت رنجیدہ تھا، ملک واپس پہنچتے ہی اس نے ایک چونکا دینے والا اعلان کر دیا۔

وہ سیکوویا کے اس خونی بل سے لڑنا چاہتا تھا۔



''شہرہ آفاق بُل فائٹر آرون سینڈیا کو خونی بُل سے مقابلے کے لیے سیکوویا آرہا ہے۔'' سیکوویا میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔

''آرون سینڈیا کو سیکوویا آرہا ہے۔ اس خونی بُل سے لڑنے یعنی اس بار تو خونی بُل کا خاتمہ ہو کر رہے گا۔'' قصبے کے نوجوان گروہ باتوں میں مشغول تھے۔

''ہاں بہت ہو گیا اب یہ خونی سلسلہ ختم ہونا چاہیے۔''

''آرون اس وحشی بُل کا خاتمہ ہی کرنے آرہا ہے۔''

''ہاں وہی ہے جو اس درندے کا خاتمہ کر سکتا ہے۔'' وہ نوجوان اس بات پر متفق تھے کہ بُل کا خاتمہ ہونا چاہیے اور پُرامید تھے کہ آرون سینڈیا کو اس بار بُل کا خاتمہ کر ڈالے گا۔

آرون کے اعلان کی خبر مائیکل تک جا پہنچی۔ مائیکل ہی اس خونی بُل کا مالک تھا اور ہر سیزن میں وہی بُل فائٹنگ کے کھیل کے لیے فراہم کرتا تھا۔ وہ ایک چھوٹے سے ہوٹل کا مالک تھا، کچھ عرصے قبل اس کی لاکھوں پسیتوں کی لاٹری نکل آئی تھی۔ مائیکل کے بچپن کا خواب تھا بُل فائٹر بننا، حالات کی ستم ظریفی کے باعث وہ بُل فائٹر تو نہ بن سکا، مگر جب نیشنل لاٹری نکلی تو ان پیسوں سے اس نے ایک اعلیٰ نسل کا بُل خریدا اور اس کی دیکھ بھال کے لیے ایک رکھوالا بھی رکھا۔ بُل جب مقابلے کے لیے تیار ہو چکا تو سیکوویا کے رنگ میں وہ اپنے بُل کو بھیجتا اور بھاری رقم وصولتا تھا۔

سیکوویا میں مائیکل کے علاوہ کسی اور کے پاس اعلیٰ پائے کا بُل نہ تھا۔ سو مائیکل کے بُل کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ قصبے والوں کی دلچسپی کو دیکھ کر بُل رنگ کی انتظامیہ اور مائیکل کے درمیان ایک معاہدہ طے پا گیا تھا۔ کسی بھی مقابلے کے بعد بُل کو میدان یا فارم میں لے جا کر ہلاک نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ ملک بھر میں قانون رائج تھا کہ ہر بُل کو مقابلے کے بعد یا تو میدان میں یا پھر فارم میں لے جا کر ہلاک کر دیا جائے۔ چنانچہ خوش قسمتی سے اگر بُل جیت بھی جائے تو موت اس کی قسمت میں یقینی ہوتی ہے۔ مگر یہاں یہ معاہدہ طے پا گیا تھا کہ بُل کی ہلاکت فقط بُل فائٹر کے ہاتھوں ہوگی، اگر مقابلے کے درمیان بُل صرف زخمی ہوا اور ہلاک نہ ہو پایا ہو تو اس کا خاتمہ کرنے کے بجائے بھرپور علاج کروایا جائے گا۔ کیونکہ اگر اس بُل کو ہلاک کر دیا گیا تو سیکوویا ایک طویل عرصے تک بُل فائٹنگ کھیل دیکھنے سے محروم ہو جائے گا۔ کیونکہ اس پائے کے بُل کے دوبارہ ملنے کے آثار دور دور تک نہ تھے۔

یوں جب بھی سیکو دیا میں بُل رنگ کا میدان سجتا تو دور دور کے قصبوں سے بھی لوگ اس کھیل کو دیکھنے کے لیے امڈ آتے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اس عظیم ترین کھیل کو دیکھنے کے لیے بڑے شہروں کا رخ کرتے اور اس کھیل کے مہنگے ٹکٹس خریدنے سے قاصر تھے۔ سیکو دیا میں منعقد ہونے والا بُل فائٹنگ کا مقابلہ ان کے دلوں کی مراد بن کر سنانے آیا تھا۔ مقابلے کے دنوں سیکو دیا میں خوب ہلچل رہتی۔ کھانے پینے کی دکانوں میں خوب بکری ہوتی۔ مے خانوں میں مجمع کا رش لگا رہتا۔ سیکو دیا کے باشندے بُل فائٹنگ کے منعقد ہونے والے مقابلوں سے بے انتہا خوش تھے۔ مقابلوں کا سیزن نہ صرف ان سب کی دلچسپیوں کا باعث بنتا بلکہ ان کی خوب کمائی کا بھی باعث ہوتا۔

اب تک سیکو دیا کے بُل سے قصبے کے وہ نوجوان بھڑ چکے تھے جو بُل فائٹر بننے کے شوق میں بُل فائٹنگ کے اسکولوں میں تربیت بھی حاصل کر چکے تھے اور متعدد بار بُل دوڑ میں بھی حصہ لے چکے تھے۔ یہ نوجوان بُل سے بھڑ تو چکے تھے مگر اسے پچھاڑ نہ سکے تھے' جس کے نتیجے میں یا تو وہ بری طرح زخمی ہو کر معذور بن چکے تھے یا پھر ہلاک ہو گئے تھے۔ وہ نوجوان پروفیشنل تو نہ تھے مگر بُل فائٹنگ کے داؤ پیچ کے انداز اپناتے بُل ان داؤ پیچ کے اسرار ورموز سے بخوبی واقف ہوتا چلا گیا۔ وہ ایک تجربہ کار بُل بن چکا تھا' جو کہ ایک بے حد خطرناک بات تھی۔ بُل کو غصیلا' وحشی' بہادر' جھگڑالو اور طاقتور ہونا چاہیے مگر تجربہ کار نہیں ایک تجربہ کار بُل' چوٹی پر پہنچے بُل فائٹر کو مارنے کی بھی طاقت رکھتا ہے' اسی لیے ملک بھر میں قانون رائج تھا کہ بُل رنگ میں کوئی بھی بُل پہلی اور آخری بار اترے۔

سیکو دیا والوں نے چند ذاتی مفاد کے تحت اس قانون کو برخاست بالائے طاق رکھا تھا۔ اور اس برخاست کردہ قانون کے منفی نتائج نے اب سیکو دیا کے باشندوں کی آنکھیں کھولنا شروع کر دی تھیں۔ پے در پے نوجوان بُل فائٹرز کی موت نے قصبے والوں کو بھی ہلا کر رکھ دیا تھا مگر معاہدے اور مفادات کے تحت مجبور تھے۔ اسی لیے ان کی یہ دلی خواہش تھی کہ کوئی ایسا سورما آئے جو اب اس خونی بُل کا خاتمہ کر ڈالے۔ ویسے بھی وہ بخوبی جانتے تھے کہ اس بُل سے ہی مائیکل اتنا کما چکا تھا کہ بُل کا خاتمہ ہونے پر وہ دوسرا بُل بھی باآسانی خرید سکتا تھا۔

اس بار سیکو دیا میں بُل کا مقابلہ بڑے پیمانے پر منعقد ہونے جا رہا تھا۔ بُل رنگ کو انتظامیہ نے تمام انتظامات کی تیاری اعلیٰ پیمانے پر کی تھی۔ مقامی اخباروں میں اشتہار لگوائے گئے تھے' گلی گلی' محلے محلے پوسٹر چسپاں کرا دیئے گئے تھے۔ سردی ختم ہوتے ہی بُل فائٹنگ کا سیزن شروع ہونے والا تھا۔ وقت سے پہلے ہی منادی پورے قصبے میں کرا دی گئی تھی۔



''شہرہ آفاق بُل کلر ماسٹر آرون سینٹیا گو سیکو دیا' کے خونی بُل کو تسخیر کرنے آ رہا ہے۔'' لوکاس نے پوسٹر دیکھ کر احساس مسرت کے زیر تلے کہا۔

''اس بار تو اس گھمنڈی بُل کا ضرور خاتمہ ہوگا' آرون سینٹیا گو نے بڑے سے بڑے گھمنڈی سے گھمنڈی بُل کو میدان میں پچھاڑا ہے۔'' رافیل بھی پُر یقین تھا۔

''میں نے اس کی بُل فائٹنگ ٹی وی پر دیکھ رکھی ہے۔ میرا تو پسندیدہ بُل فائٹر ہے آرون۔ کل ہی اخبار میں' میں نے اس کا انٹرویو پڑھا ہے۔ جانتے ہو آرون نے اس بُل سے مقابلے کا اعلان کیوں کیا ہے؟'' لوکاس جوشیلے انداز میں کہہ رہا تھا۔

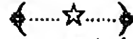
''کیوں کیا ہے بھلا؟'' رافیل نے چونک کر پوچھا۔ وہ دونوں دوست اپنی گلی سے نکل کر قصبے کے چوراہے کی طرف نکل گئے تھے۔ اس چوراہے کی ایک سڑک میدان تک جاتی تھی۔ مائیکل کا گھر بھی اسی راستے پر پڑتا تھا۔ جبکہ اسی سڑک کی مخالف سمت پر قصبے کے مشہور ہوٹل اور ریسٹورینٹ تھے۔

''پچھلے سیزن میں جو بُل فائٹر ہلاک ہوا ہے' وہ آرون کا بہترین دوست تھا۔ فلپ نام تھا اس کا...... اس کی موت کا بدلہ لینے کے لیے آرون نے بُل سے لڑنے کا اعلان کیا ہے۔'' لوکاس نے پوری تفصیل بتائی۔

''پھر تو آرون بُل کو ضرور ہرائے گا۔'' پوری داستان سننے کے بعد رافیل کو بھی مکمل یقین ہو چلا تھا۔

وہ دونوں بُل رنگ کے مخالف سمت پر گامزن تھے۔ سنا تھا ہوٹل میں آرون سینٹیا گو کے قیام کی بکنگ بھی ہو چکی ہے۔ وہ دونوں اسی کی تفصیلات جاننے کے لیے ہوٹل کی

جانب روانہ تھے۔



سنہری کرنیں اس کے خوبصورت چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں مگر وہ بے نیازی سی نیند میں غرق تھی۔

''کیملا......'' آرون نے اس کے سنہری بالوں کو آہستگی سے ایک طرف کرتے ہوئے اس کے کان میں سرگوشی کی وہ کسمسا کر بیدار ہوئی۔

''اوہ آرون......تم اتنی جلدی کیوں بیدار ہو گئے۔'' وہ اپنے بالوں کو سمیٹتی اٹھ کر بیدار ہو گئی۔

''کیمی میرا دل چاہ رہا ہے تم سے جی بھر کر باتیں کرتا رہوں۔ جب تک تمہارے ساتھ ہوں' تمہیں دیکھتا رہوں۔'' آرون گمبیر لہجے میں کہہ رہا تھا' مگر اس کے لہجے میں اداسی کے رنگ بھی گھلے ہوئے تھے۔ کیملا چونک کر اٹھ بیٹھی۔

''آرون ہم اب ہمیشہ کے لیے ساتھ ہیں پھر تم آج اتنے حساس کیوں ہو رہے ہو۔ آخر کیا سوچ رہے ہو تم...... مجھے بتاؤ۔'' کیملا اپنے نرم کومل ہاتھوں سے آرون کا مضبوط ہاتھ سہلاتے ہوئے فکر مند ہوئی۔

''کیمی کتنی غیر یقینی ہے ہماری زندگیوں میں' ایک کھیل کی مار ہیں ہم بُل فائٹرز' اسی ایک کھیل سے آسمان کی بلندیوں پر پہنچ جاتے ہیں' اور اسی کھیل کی بدولت آسمان والے ہمیں اٹھانے زمین پر آ جاتے ہیں۔ زندگی اور موت کا کھیل ہے ہمارا پروفیشن مگر تماش بین اسے صرف تماشا سمجھتے ہیں۔'' جب سے فلپ کی ہلاکت کا اسے علم ہوا ہے تب سے ہی وہ عجیب طرح کی کیفیت کا شکار تھا۔

''تم اس طرح کی باتیں کیوں سوچ رہے ہو۔ مجھے لگتا ہے تم ابھی بھی فلپ کے صدمے سے باہر نہیں نکل پائے۔ دیکھو آرون زندگی کا تو کسی کو بھی بھروسہ نہیں۔ مجھے افسوس ہے فلپ کی موت پر...... مگر دیکھو وہ اتنا تجربہ کار نہ تھا' اسے اس خطرناک بُل سے لڑنا نہیں چاہیے تھا۔'' کیملا اس کے ہاتھوں کو سہلاتی نرمی سے سمجھا رہی تھی۔

''میں نے ہی مشورہ دیا تھا اسے کہ اس بُل سے لڑو' فلپ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ بُل بے حد خطرناک ہے' وہ کئی سالوں سے اس اکھاڑے میں انسانوں سے بھڑ رہا ہے' کسی بھی بُل فائٹر کے داؤ پیچ اس کے لیے نئے نہیں' یہ سب جانتے ہوئے بھی میں نے فلپ کو اس بُل سے مقابلہ کرنے کا مشورہ دیا۔ میں ذمہ دار ہوں فلپ کی موت کا اور تب تک مجھے سکون نہیں ملے گا جب تک میں اس خونخوار بُل کا خاتمہ نہ کر دوں۔'' آرون نے فیصلہ کن انداز میں اپنا عزم دہرایا۔ اس کے چہرے کے تاثرات تن چکے تھے۔ شاید تصور میں وہ خود کو بُل رنگ میں اس بُل کا خاتمہ کرتے دیکھ رہا تھا۔

''آرون وہ بُل ابھی بھی خطرناک ہے' تمہاری باتوں سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ بُل کا ذہن بہت شاطر ہو چکا ہے' تمہیں اس بار حریف بہت چالاک ملا ہے۔'' کیملا اسے باور کرا رہی تھی کہ وہ بُل کو ہلکا نہ سمجھے۔

''میں جانتا ہوں کیملا' میں اب تک بھاری بھرکم' غصیلے' بہادر' پُرجوش بُل سے بھڑا ہوں۔ میں نہ ان کا ہم وزن ہوں' نہ ان جیسا شاندار' نہ ہی ان جیسا خطرناک' مگر میں پھر بھی جیتتا آ رہا ہوں تو اپنی عقل و ذہانت سے' اپنے ارادوں اور تجربوں سے' ان بلوں کے پاس نہ سمجھ تھی نہ تجربہ' مگر اب میں جس سے مقابلہ کرنے جا رہا ہوں وہ نہ صرف طاقتور ہے بلکہ ہوشیار بھی ہے اور تجربہ کار بھی' میرا حریف اس بار میرا ہم پلہ ہے۔'' آرون نے سارا تجزیہ کر رکھا تھا۔ کیملا نے فخر سے اس کی جانب دیکھا۔

''اور میں جانتی ہوں کہ اتنے شاندار حریف کا خاتمہ کرنے کی صلاحیت صرف میرے آرون میں ہے۔'' کیملا نے اس کے شانوں پر سر رکھتے ہوئے محبت سے کہا۔

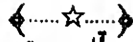
''اوہ کیملا تم اور تمہاری محبت مجھ سے یہ دنیا تسخیر کرا سکتی ہے۔ یہ بُل کیا چیز ہے۔'' اس نے کیملا کے کشادہ ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے کہا اور اسے بانہوں میں سمیٹ لیا۔



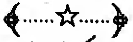
سیکو ویا میں گویا جشن کا سماں تھا۔ وہ راتیں جو سورج ڈھلتے ہی ویرانی اور سناٹے میں ڈوب جاتی تھیں' آج جگمگ جگمگ جگمگا رہی تھیں۔ ہوٹل برقی قمقموں سے سجے ہوئے تھے اور ان کے اردگرد طرح طرح کے اسٹال لگے ہوئے تھے۔ کیفے' مے خانوں میں لوگ جوق در جوق بیٹھے مشروبات سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ خوش گپیاں

کررہے تھے۔
سیکوویا میں آج اردگرد کے قصبوں سے بھی ہجوم در ہجوم لوگوں کی آمد ہوئی تھی۔ ہوٹلوں' مئے خانوں میں رش بھر چکا تھا۔ لہٰذا ہوٹلوں اور مئے خانوں کے باہر بھی میز اور کرسیاں چنوا دی گئی تھیں۔ سردیاں بیتے ایک ماہ گزر چکا تھا۔ موسم گرما کا آغاز ہو چکا تھا۔ دن گرمائش سے بھرپور گزر رہے تھے مگر راتیں پھر بھی خنک آلود تھیں۔
لوکاس اور رافیل بھی باقی قصبے والوں کی طرح مئے خانوں میں اپنے اپنے مشکیزے سے منہ لگائے بیٹھے تھے۔ لوکاس کی نظریں بار بار سڑک کے اس پار تین منزلہ عمارت کی جانب اٹھ رہی تھیں' یوں جیسے شدت سے کسی کی منتظر ہوں۔
''نہیں آئے گا..... آرون نہیں آئے گا..... اس وقت تو وہ اپنے کمرے میں آرام کررہا ہوگا۔ کل دن میں اسے مقابلے کے لیے بُل رنگ میں آنا ہے۔ تو بے کار انتظار کررہا ہے یار.....'' رافیل نشے میں غرق تھا' مگر لوکاس کی بے چینی بھانپتے ہوئے اسے ٹوکنے سے باز نہ آیا۔
''وہ آئے گا..... ضرور آئے گا..... آرون ہر مقابلے سے قبل وہاں کے مقامی لوگوں سے ملنے ضرور آتا ہے' وہ آج بھی آئے گا.....'' لوکاس کو یقین تھا کہ آرون ضرور آئے گا۔ رافیل اس کی بات سن کر نفی میں سر ہلاتا ہوا ایک بار پھر مشکیزے کی جانب متوجہ ہوگیا۔ شور شرابا' غل غپاڑہ اپنے عروج پر تھا۔ تب ہی آرون اپنی بیوی کیملا کے ہمراہ اس تین منزلہ عمارت سے نمودار ہوا۔
''ارے وہ دیکھو..... آرون سینٹیاگو.....'' راہ چلتے نشے میں دھت کسی سر پھرے نے اشارہ کرتے ہوئے چلا کر کہا' وہاں موجود مجمع پل بھر میں آرون اور کیملا کی جانب متوجہ ہوگیا۔
''اولے..... اولے..... اولے'' (مرحبا' مرحبا) لوگ جوق در جوق آرون اور کیملا کے اردگرد جمع ہونے لگے۔
''میں نے کہا تھا ناں' آرون ضرور آئے گا۔ اپنے پرستاروں سے ملنے وہ ضرور آئے گا۔'' مجمع کو چیرتے ہوئے لوکاس نے خوش ہوتے ہوئے رافیل سے کہا۔
''تم نے صحیح کہا تھا' وہ واقعی ملنے آیا ہے۔'' رافیل بھی پُرجوش سا چہکا۔

وہ سب آرون اور کیملا کے اردگرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ آرون اور کیملا ان سب کے پُرجوش استقبال پر بے حد خوش تھے۔
''ہم تمہارے آنے سے بے حد خوش ہیں۔'' ان میں سے ایک نے چلا کر کہا۔
''ہمیں یقین ہے کہ تم اس خونخوار بُل کا خاتمہ ضرور کرو گے۔''
''تم نے یہاں آکر ہمارے سیکوویا کو رونق بخش دی۔'' مجمع سے طرح طرح کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ آرون ان سب کے جذبات کو بغور سن رہا تھا۔ وہ سب یک دم اسے اپنے اپنے لگنے لگے۔
''میں جانتا ہوں اس خونخوار بُل نے بے شمار بُل فائٹروں کی جان لی ہے' اور آپ سب بھی اس خونی بُل کا خاتمہ ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں خود بھی یہی چاہتا ہوں کیونکہ اس بُل نے جس بُل فائٹر کو ہلاک کیا تھا وہ فلپ تھا' میرا بے حد عزیز دوست اور کل سہ پہر میں اپنے دوست کے خون کا بدلہ بُل رنگ میں اس خونی بُل کا خون بہا کر ضرور لوں گا۔ قسم ہے مجھے فلپ کی دوستی کی' اس بُل کا خون' میں بہاؤں گا۔'' آرون نے لفظ ''میں'' پر ضرور دیتے ہوئے اعلان کیا۔ مجمعے کے جوش وخروش کا پارہ یک دم بلند ہوگیا۔ وہ سب آرون کے حق میں نعرے لگانے لگے۔ لوکاس اور رافیل نے آرون کو کاندھے پر اٹھالیا۔
''کیملا..... کل کی ہونے والی جیت ہماری محبت کے نام ہوگی۔'' آرون کاندھے پر سوار جوش کے عالم میں کہہ رہا تھا۔
مجمع سیٹی بجاتا اولے اولے کرتا کیملا اور آرون کی محبت کو داد دینے لگا۔
کئی نوجوانوں نے اپنے مشکیزے آرون کی جانب بڑھائے' آرون نے ایک مشکیزہ تھاما اور اس میں سے جام کا گھونٹ بھرنے لگا۔ مجمع پھر سے شور شرابا کرنے لگا۔
آرون نے گھونٹ بھرنے کے بعد وہ مشکیزہ کیملا کی جانب بڑھا دیا' کیملا نے آگے بڑھ کر وہ مشکیزہ تھاما اور مشکیزے میں بچی بقیہ شراب ایک ہی گھونٹ میں حلق سے اتارنے لگی۔ وہ اپنے شوہر کی خوشی میں خوش تھی۔ وہ آرون کو کل کی جیت کے لیے پُرامید تھی۔

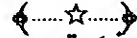


مائیکل گھر جانے سے قبل اپنے چھوٹے سے فارم پر پہنچا تھا۔
خونی بُل کی دیکھ بھال یہیں کی جاتی تھی۔ رکھوالے سے مل کر اس نے ایک نظر اپنے بُل کو دیکھا' بُل ہر بات سے بے خبر چارہ کھانے میں مصروف تھا۔
''شاید یہ تمہاری زندگی کی آخری شب ہو...... کل تمہارا مقابلہ بُل کلر ماسٹر سے ہے' ممکن ہے تم کل ہلاک ہو جاؤ۔ مگر اے خونی دوست تم میرے لیے خوش بختی کا باعث بنے۔ میں جانتا ہوں تمہارے بعد میں جتنے بھی اعلیٰ نسل کے بُل خریدلوں ان میں وہ بات نہ ہوگی جو تم میں ہے۔''
مائیکل بُل پر نگاہ گاڑھے دل ہی دل میں کلام کرتا وہاں سے چلا گیا۔ رات کی سیاہی پھیلتی جارہی تھی۔ قریب تھا کہ اس شفق کی سپیدی سیاہی سے آملے۔



میدان کھچا کھچ بھرا تھا بلکہ تماشائیوں کے لیے چھوٹا پڑ رہا تھا۔ بہت سے لوگ ٹکٹ نہ ملنے کے باعث قریبی درختوں پر چڑھ بیٹھے تھے۔ عجب جوش وجذبہ پایا جاتا تھا۔ کھیل شروع ہونے سے قبل ہی انہیں بُل فائٹر کی جیت کا یقین تھا۔ آج کا مقابلہ سیکوویا میں منعقد ہونے والا اب تک کا سب سے بڑا مقابلہ تھا۔ آج کے انتظامات خاص تھے' آج کا مقابلہ خاص الخاص تھا۔
مجمع بے حس وحرکت اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھا بے چینی سے کھیل شروع ہونے کا انتظار کررہا تھا' جیسے ہی میدان کے نصف حصے تک دھوپ پہنچی صدر نے اپنا رنگین رومال لہرایا۔ بگل کی تیز آواز گونج اٹھی۔ اگلے ہی پل شاہانہ لباس میں ملبوس ال گوسلز بُل رنگ میں داخل ہوئے۔ بُل رنگ تماشائیوں کی تالیوں سے گونج اٹھا۔ روایتی دھن مستقل بجائی جارہی تھی۔ پاسیو شروع کرنے کی اجازت صدر سے موصول ہونے کے بعد ال گوسلز رنگ سے باہر چلے گئے۔
پاسیو شروع ہوئی' حسب مطابق پریڈ کی قیادت کرتے ہوئے ال گوسلز سب سے پہلے بُل رنگ میں داخل ہوئے' ال گوسلز کے عقب میں آرون ایک شان سے تھوڑی اوپر کیے بُل رنگ میں نمودار ہوا' اس نے بروکیڈ کی سنہری وردی' سنہری ہیٹ اور رنگ برنگے شیشوں سے مزین ریشمی پتلون پہن رکھی تھی' اس کے بُل رنگ میں داخل ہوتے ہی مجمع جاگ اٹھا۔ بے تحاشہ تالیوں' سیٹیوں اور واہ واہ کی آوازیں بلند ہوئیں۔ آرون کے ہمراہ معاون بُل فائٹر تھے اور ان کے عقب میں چپڑاسی' باندریلو' پکادو اور ملازم خچروں کو لیے رنگ میں داخل ہوئے۔ صدر کے کیبن کے نیچے پہنچ کر آرون اپنا ہیٹ اتار کر کورنش بجالایا۔ پریڈ کا جلوس منتشر ہوگیا۔
آرون نے اپنا نمائشی لبادہ اتار کر سامنے کی نشستوں پر براجمان کیملا کے حوالے کیا' میدان ایک بار پھر تالیوں سے گونج اٹھا۔ اس بار تالیوں کی حق دار کیملا تھی۔ کیملا نے ایک اڑتا ہوا بوسہ آرون کے حوالے کیا اور اس کے نمائشی لبادے کو گود میں رکھے بیٹھ گئی۔
''اولے...... اولے...... اولے۔'' مجمع وارفتہ ہوا جاتا۔
''آرون کے حوالے اس کی گلابی کیپ کی گئی' آرون کیپ تھامے لکڑی کی گیلری کے پیچھے چلا گیا۔ اب اسے انتظار تھا تو اس خونی بُل کا جس کے آج خاتمے کی قسم اس نے اٹھا رکھی تھی۔
اسی اثنا میں ال گوسلز نے دوبارہ صدر کے کیبن کے نیچے جاکر اصطبل کی چابی طلب کی۔ صدر نے اوپر سے چابی پھینکی جسے ال گوسلز نے اپنے پروں والے ہیٹ میں دبوچ لیا۔ تماشائیوں نے خوب داد دی۔ ال گوسلز نے وہ چابی سرخ پھاٹک پر ہاتھ دھرے کھڑے بوڑھے کی جانب اچھال دی اور بل رنگ سے باہر نکل گئے۔ چابی بوڑھے کے حوالے ہوتے ہی بگل کی تیز آواز گونجی' بوڑھے نے سرعت سے پھاٹک کا کواڑ ایک جانب کو دھکیلا اور پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا۔ چشم زدن میں سیاہ جثہ بھاری بھرکم بُل بجلی کی سی تیزی کے مانند میدان میں داخل ہوا اور چاروں اور چکر لگانے لگا۔ مجمع شوروغل سے گونج اٹھا۔
''ہے تورو...... ہے تورو......'' ہر کوئی اس بل کو اپنی جانب متوجہ کرنا چاہتا تھا۔
''آخری بار دیکھ لو...... شاید اس خونی بُل کا مقابلہ ہم دوبارہ نہیں دیکھ پائیں۔'' رائیل نے کہنی لوکاس کی کمر میں گھسیڑتے ہوئے شرارت سے کہا۔
''شاید نہیں یقیناً'' لوکاس نے اس کی شرارت کا مزہ

لیتے ہوئے آنکھ مارتے ہوئے کہا اور ہے تورو ہے تورو کی صدا بلند کرتے ہوئے بیل کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں مگن ہوگیا۔



آرون نے اس خونی کے قصے تو سن رکھے تھے مگر آج پہلی بار وہ اسے میدان میں یوں اپنے سامنے چکراتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ بُل کی آمد کے کچھ دیر بعد ہی معاون بُل فائٹر میدان میں داخل ہوئے اور بُل سے چھیڑ خانی کرکے اسے مشتعل کرنے لگے۔ آرون نے بُل کی حرکات وسکنات کا بغور جائزہ لینا شروع کردیا۔ بُل ان کی چھیڑ خانی پر زیادہ مشتعل نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے لیے وہ سب کچھ نیا نہیں تھا' چونکا دینے والا نہیں تھا' یہ معاون بُل فائٹر اس کے اصل حریف نہیں تھے' وہ یہ سب کچھ بخوبی جانتا تھا' اس لیے ان کی چھیڑ خانی خاطر میں نہ لاتا' آرون یہ بھی بھانپ چکا تھا کہ بُل حملہ کرنے میں تیزی نہیں دکھاتا تھا۔ وہ صرف تب حملہ آور ہوتا تھا جب اسے یقین ہو کہ اس کا حملہ ناکام نہیں ہوگا' شاید اس طرح وہ اپنی طاقت بچا رہا ہو یا پھر وہ بھی اپنے دشمن کو جانچ رہا ہو۔

مگر اس کا یہ عمل بہت سے بُل فائٹر کو بہکانے میں کامیاب رہا تھا۔ وہ اس بُل کی بہادری کے قصے سن کر آتے تھے اور اس کا یہ طرز عمل دیکھ کر اسے سست اور بزدل بُل سمجھ بیٹھتے یوں وہ بے جا خود اعتمادی کا شکار ہوتے اور بُل کے خطرناک حد تک نزدیک آجاتے اور ان کا یوں نزدیک آنا بُل کے لیے مفید ثابت ہوتا ہے۔ یہ تھا اس بُل کا فریب...... ذرا سی دیر میں ہی آرون نے بُل کے ذہن کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ بُل حملہ کرتے وقت اپنی سینگوں کا استعمال بہترین طور پر کررہا تھا۔ یقیناً وہ اپنے اس ہتھیار کی طاقت سے بخوبی آگاہ تھا۔ بُل کی نگاہیں بے حد تیز تھیں اور وہ اپنے حریف پر برابر نظریں ٹکائے رکھتا تھا۔

آرون اس تجزیے پر پہنچا تھا کہ بُل کے سینگوں سے بھی زیادہ خطرناک ہتھیار بُل کا تجربہ تھا۔ اپنے پچھلے تجربوں کی بنیاد پر ہی وہ بُل فائٹر کو جل دینے میں کامیاب ہوتا آرہا تھا اور اگر آج اس کے تجزیوں کو سرے سے ہلا کر رکھ دیا جائے تو...... یقیناً آج وہ اس میدان میں اپنی ہی موت کا ہولناک نظارہ کرنے والا تھا۔

آرون کی پُرسوچ نگاہیں بُل رنگ کے بے تاج بادشاہ پر جمی ہوئی تھیں اور اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ معاون بُل فائٹر اپنا کام کرکے بُل رنگ سے باہر جاچکے تھے۔

بُل رنگ میں اب اس خونی بُل سے سامنا کرنے کا وقت آن پہنچا تھا۔



آرون نے ایک نگاہ شور وغل کرتے ہجوم پر ڈالی اور اس کی نگاہ کیمیلا پر ٹھہر گئی۔ کیمیلا نے محبت بھرا بوسہ ہوا کے سنگ اس کی جانب اچھالا' آرون نے پہلے میدان کے وسط میں کھڑے خونی بھینسے کی طرف اشارہ کیا اور پھر دونوں ہاتھوں کو کیمیلا کی جانب بلند کرکے اشارہ کیا' جیسے کہنا چاہ رہا ہو۔

''یہ جنگلی خونخوار بھینسا تمہاری محبت میں آج قربان۔''

مجمع دیوانہ وار ان دونوں کی محبت پر سیٹیاں بجانے اور تالیاں پیٹنے لگا۔

اب آرون اور بُل آمنے سامنے تھے۔ بُل نے تھوتھنی اٹھا کر اپنے سامنے کھڑے شکار کو چمکتی نگاہوں سے دیکھا اور جانچنا شروع کردیا۔ آرون نے ایک فاصلہ متعین رکھ کر اسے پہلے مشتعل کرنے کے لیے للکارنا شروع کردیا۔ بُل ٹس سے مس نہ ہوا بلکہ منہ پھیر کر ہجوم کی جانب تکنے لگا۔

''ہے تورو...... ہے تورو......'' مجمع چیخ اٹھا۔

مگر بُل بے نیاز بنا رہا۔

آرون نے تماشائیوں پر اک نگاہ ڈالی اور پہلے سے زیادہ شد ومد سے بُل کو للکارنے لگا۔ اس کے للکارنے پر تماشائیوں نے بھی مزید شدت کے ساتھ بُل کو اپنی جانب متوجہ کرنا شروع کردیا۔ وہ سیٹیاں بجاتے' رومال اور ہیٹ ہلاتے اور خوب شور مچاتے۔

''لگتا ہے آج اس خونی بُل کا لڑنے کا کوئی ارادہ نہیں۔'' رافیل نے پریشانی سے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

''ہاں کچھ عجیب بے زار سا انداز ہے آج بُل کا۔'' لوکاس کو بھی اچنبھا ہوا۔

آرون کو عجب سکی کا احساس ہونے لگا' بُل کسی صورت اسے گھاس ڈالنے پر راضی نہ تھا۔ آج اسے اندازہ ہوا تھا کہ اب تک بُل فائٹر کیوں اس بُل کے نزدیک جانے پر

مجبور ہوتے تھے۔ اگر وہ نزدیک نہیں جاتے تو یہ بُل ان کے کسی بھی داؤ پیچ کو گھاس ہی نہ ڈالتا اور پھر انہیں بے حد سبکی اٹھانی پڑتی۔

''واہ رے بُل تیری تجربہ کاریاں۔''

آرون دل ہی دل میں بُل کی چالاکی کو سراہتے ہوئے ذرا نزدیک ہوا مگر وہ ہوشیار تھا بُل کو للکارا' اس بار بُل نے آرون کو گھور کر دیکھا' جیسے کہہ رہا ہو۔

''میری مرضی سے کھیلو گے تو کھیلوں گا ورنہ یونہی بے زار بنا کھڑا رہوں گا۔''

مجمع ہنوز شور مچا رہا تھا۔ بُل اب مکمل طور پر آرون کی جانب متوجہ تھا۔ آرون نے کیپ بُل کے سامنے لہرانا شروع کیا' بُل پچھلی سموں سے دھول اڑاتے ہوئے حملہ آور ہوا' آرون ویرونیکا کا انداز اپناتے ہوئے نہایت پھرتی سے پنجوں کے بل گھوم گیا۔ ہجوم نے خوب واہ واہ کی' کیمیلا اپنی نشست سے اٹھ کر تالی بجانے لگی۔ اسے دیکھ کر باقی لوگ بھی تالیاں اور سیٹیاں بجانے لگے۔

کچھ دیر مزید بُل کو اشتعال دلانے کی غرض سے آرون ویرونیکا کا انداز اپناتا رہا۔ بُل اب بھرپور مقابلے پر آمادہ نظر آ رہا تھا' اس دوران آرون زبانی طور پر بھی اس سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا۔ بُل نتھنوں سے دھواں اڑاتے ہوئے اسے غصے سے دیکھ رہا تھا' آرون نے ایک بار پھر کیپ سے بُل کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ بُل جونہی حملہ آور ہوا' آرون نے کیپ سمیٹ لیا' اس بار اس نے ری بولیرا کا انداز اپنایا تھا۔ بُل اچانک داؤ بدلے جانے پر لڑکھڑا کر رہ گیا۔ تماشائیوں نے خوب داد دی۔

کھیل کا پہلا ہاف مکمل ہوا' تماشائیوں نے خوب داد وتحسین کے ڈونگرے برسائے۔ آرون نے کمر تک جھک کر شکریہ ادا کیا۔

لوکاس اور رافیل جو سامنے کی نشستوں پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے خوب اولے اولے کے نعرے لگائے' اور کیمیلا کی جانب دیکھ کر تالیاں بجائیں۔ آرون کا نمائشی لبادہ اب تک کیمیلا کی گود میں دھرا ہوا تھا اور اس کے چہرے سے مسرت جھلک رہی تھی۔ یہ روایت تھی کہ بُل فائٹر جس کے حوالے اپنا نمائشی لبادہ کرتا ہے' تماشائی اس کو بھی بے حد اہمیت دیتے ہیں' اور اگر وہ بیوی یا محبوبہ ہو تو بُل فائٹر کے حصے کی داد اسے بھی ملتی ہے اور اگر بُل فائٹر بُل پر حاوی نہ ہو پائے تو طنز وتضحیک بیوی' محبوبہ یا ساتھی کے حصے میں بھی آتی ہے۔

کچھ دیر بعد رنگ میں ایک بار پھر بگل کی آواز گونجی۔ کھیل کا دوسرا حصہ شروع ہوا' آرون ایک بار پھر لکڑی کی گیلری کے پیچھے جا چکا تھا۔ بُل اب تک اسی جگہ پر کھڑا غصے سے تماشائیوں کو گھور رہا تھا۔ شاید اس بار کا حریف اس کی توقعات سے بڑھ کر چالاک نکلا تھا اور اسے مسلسل تھکائے دے رہا تھا۔

میدان میں اب ایک ''پکادور'' (نیزہ بردار) گھوڑے پر سوار داخل ہوا' گھوڑے کا تمام جسم روئی کے گدیلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ماسوائے آنکھ' کان اور ٹانگوں کے' گھوڑا سست روی سے میدان میں داخل ہوا۔ شاید وہ بھی بُل کی دہشت سے خوف زدہ تھا۔

گھڑسوار نے ہاتھ میں پک (نیزہ) تھام رکھا تھا' جس کی انی دھوپ میں شیشے کی مانند چمک رہی تھی۔ بُل کا اب تک کے مقابلوں میں پک آدور سے آمنا سامنا شاذ ونادر ہی ہوا تھا۔ اس لیے اس عجب وخلقت گھوڑا نما مخلوق کو دیکھ کر مشتعل ہو گیا۔ شاید اس کے ذہن میں پک آدور کو لے کر کوئی پرانی بدنما یاد چھپی تھی۔ تب ہی سرپٹ دوڑتا ہوا آیا اور گھوڑے کے پیٹ پر نشانہ باندھے حملہ آور ہوا۔ اس جوشیلے حملے کے نتیجے میں اس کے نوکیلے سینگ روئی کے گدیلے کو چیرتے ہوئے گھوڑے کی پسلیوں میں جا پھنسے۔ اس اچانک پڑنے والی افتاد سے گھوڑا بری طرح لڑکھڑا گیا۔ اسی لمحے ایک پک آدور نے نیزے کی انی بُل کی گردن میں گھونپ دی۔ بُل شدت کرب سے کرلا اٹھا۔ اس کے سینگ ابھی بھی گھوڑے کی پسلیوں میں پیوست تھے۔ وہ اپنی سینگ نکالنے کے چکر میں مزید زخمی ہوتا چلا گیا۔

یہاں تک کہ اس کا خون بہہ کر سنہری ریت کو سرخ کرتا چلا گیا۔

ایک عرصے بعد بُل رنگ اس خونی درندے کے خون سے رنگا تھا۔ مجمع خوشی سے پاگل ہوا تھا۔ سیٹیاں' تالیاں' خوب بجیں' بُل کو بھی چھیڑا جانے لگا۔

''ہے تورو...... ہے تورو......'' بُل مزید وحشی پن میں

مبتلا ہوگیا۔ اسے کرلاتے زخم اسے مزید مشتعل بنا گئے۔ وہ ایک بار پھر جوش کے عالم میں دوڑتا ہوا آیا اور پھر سے گھوڑے پر حملہ آور ہوا۔ سینگ ایک بار پھر گھوڑے کے پیٹ میں جا گھسے...... پک ادور نے اپنا خون آلود نیزہ بُل کی گردن میں دوبارہ گھونپ دیا...... بُل شدید تکلیف میں مبتلا گھوڑے پر حملہ کرتا' نیزہ اتنی ہی گہرائی میں گھستا چلا جاتا۔

تکلیف کی شدت میں ہوتا اضافہ حملے کی شدت میں بھی اضافہ کیے دے رہا تھا۔ بُل کا زخم مزید گہرا ہوتا جارہا تھا۔ گھوڑا بے چارہ تکلیف کی شدت سے دھرا ہوا جارہا تھا۔ بالآخروہ حملوں اورزخموں کی تاب نہ لاسکا اور بے جان ہوکر گر پڑا اور گھوڑے کی تو تاریخ ہی یہی تھی' پرائی جنگ میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھنا...... انسان نے ہمیشہ اس جانور کو استعمال کیا تھا' کبھی انسانی جنگ میں تو کبھی حیوان سے جنگ میں اور استعمال ہوئی شے ہو' انسان ہو یا جانور' اس کی اہمیت نہیں رہتی۔ گھوڑے کے ہلاک ہونے پر بھی مجمع کو کوئی فرق نہ پڑا تھا۔ کسی کو چنداں افسوس نہ ہوا تھا۔

گھوڑے کے گرتے ہی پک آدور رنگ سے بھاگ لیا۔ بُل گھوڑے کو مار کر فاتحانہ انداز میں رنگ کے چکر کاٹنے لگا۔ اس کے جسم سے خون تیزی سے رس رہا تھا۔ مگر بُل کو پروا نہ تھی۔ اس نے خونی دنگل میں ایک عجیب الخلقت گھوڑے کو ہرایا تھا۔ وہ مسرت سے پُر تھا اس بات سے بے خبر کہ اس جیت کے عقب میں چھپی موت نے اس کے چمکتے مضبوط جسم پر اپنے پنجے گاڑھ دیئے تھے اور اب رنگ کے ایک کونے میں کھڑی اسے خوشی کے مارے یوں اچھلتا کودتا دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

مجمع متحیر سا بُل کی جرات کا نظارہ کررہا تھا۔ بالآخر بُل کے اس کارنامے پر مجمع بُل کو داد دیئے بنا نہ رہ سکا۔ تمام لوگ اپنی اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور خوب تالیاں بجائیں۔ سیکو دیا کے بُل نے آج جرأت مندی کے ساتھ موت کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی تھی۔

اسی دوران ایک اور پک آدور گھڑ سوار کی رنگ میں آمد ہوئی' بُل نے جیسے ہی پک آدور کو دیکھا' بنا کوئی مہلت دیئے اس پر حملہ آور ہوا' گھوڑا پہلے ہی اپنے ساتھی گھوڑے کی لاش کو دیکھ کر رک چکا تھا۔ بُل کے حملہ کرتے ہی وہ لڑکھڑا کر گر پڑا' پک آدور جان بچا کر بھاگا' گھوڑا ڈھیر ہوگیا۔ بُل مزید شیر ہوگیا' اس بار اس نے واقعی کمال کر دکھایا تھا' اپنی دوسری فتح کا جشن مناتے ہوئے وہ ایک بار پھر دیوانہ وار رنگ کا چکر کاٹنے لگا۔

سکندر اعظم نے بھی شاید یونہی دنیا کے چکر کاٹتے ہوئے فتح کا جشن منایا ہوگا۔ بلکہ شاید ہرنا قابل تسخیر تسخیر ہونے سے قبل یونہی خوشیاں مناتا ہوگا' دیوانہ وار روندتا ہوا' طاقت کے نشے میں چور...... اور موت ایک کونے میں کھڑی مسکراتے ہوئے اسے خوب دھینگا مشتی کرتے دیکھ رہی ہوتی ہوگی' جیسے ابھی اس وقت بُل کو دیکھ رہی تھی۔

میدان میں تیسرے پک آدور کی آمد ہوئی۔

''میں نے اپنی پوری زندگی میں اس سے بہادر بُل نہیں دیکھا۔'' رائیل نے یک ٹک نظر باندھے میدان کے چکر کاٹتے بُل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں نے بھی...... بے شک یہ بُل ناقابل تسخیر ہے۔'' لوکاس کی نظریں بھی رنگ کے بے تاج بادشاہ پر گڑیں تھیں جو زخمی ہونے کے باوجود جرأت مندی سے سینہ تانے میدان میں کھڑا تھا۔

میدان میں تیسرے پک آدور کی آمد ہوئی...... خوب شور مچا' بُل پھر سے گھوڑے کی جانب متوجہ ہوا' نیا شکار' اگلے ہی پل وہ پوری قوت سے بھاگتے ہوئے گھوڑے پر حملہ آور ہوا' مگر اس بار پکادور کافی چوکس تھا۔ حملہ ہونے سے قبل ہی نیزہ اس نے بُل کے کوہان میں اتار دیا۔ بُل تکلیف سے بلبلا اٹھا اور پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے کوہان سے بھل بھل خون رس رہا تھا۔ اس کی بے پناہ طاقت میں کمی آرہی تھی۔ پک آدور اپنے کام کا مقصد پورا ہونے کے بعد جا چکا تھا۔

☆

بگل کی آواز ایک بار پھر رنگ میں گونجی اور آرون بُل رنگ میں داخل ہوا۔ کچھ دیر قبل بُل کی جرأت مندی کا مظاہرہ بخوبی کرچکا تھا۔ اس بار وہ بُل رنگ میں داخل ہوا تو اس کے ہاتھوں میں کیپ کی بجائے دو باندریلو تھیں (رنگ برنگے کاغذوں میں لپٹی گز بھر لمبی چھڑی جس کے سرے پر چھ انچ لمبی برچھی لگی ہوتی ہے)

آرون بُل سے چند گز کے فاصلے پر بازو لٹکائے کھڑا

ہوگیا.....اس انداز سے وہ نہتا نظر آ رہا تھا۔
''ہے تورو.....!'' آرون نے بُل کو للکارا.....غیض وغضب میں مبتلا بُل نے سر اٹھا کر آرون کو دیکھا اور تیزی سے اسے سینگوں سے اچھالنے کے لیے لپکا' آرون بخوبی جانتا تھا کہ ہتھیار سے زخمی ہونے کے بعد فطرت کے عین مطابق بُل اپنے ہتھیار کا استعمال ضرور کرے گا' جیسے ہی بُل اس کے نزدیک پہنچا آرُون نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کیے اور دونوں باندریلو بیک وقت گردن کے زخم کے قریب گاڑھ دیں۔ بُل تلملایا اور اس کی سینگیں آرون کے جسم کو چھوتی آگے نکل گئیں۔ دونوں باندریلو بُل کی گردن سے نیچے لٹک رہی تھیں۔
''براوُو..... براوُو.....'' مجمع بے تحاشہ داد دیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔
آرون نے مزید چار برچھیاں اسی طرز عمل سے بُل کی گردن میں گھونپیں' اس احتیاط کے ساتھ کہ ایک بھی برچھی بُل کے زخموں میں نہ پیوست ہو' اگر ایسا ہوتا تو یہ بے حد معیوب بات ہوتی۔
بُل جو ایک عرصے سے اس رنگ کا بے تاج بادشاہ تھا' آج بے بسی کے عالم میں اسی رنگ میں ملنے والے گھاؤ سے بلبلاتا اپنی زندگی کا دفاع کر رہا تھا۔ لاکھ نفرت کے باوجود ہجوم کو اس بے حد بہادر اور جرأت مند بُل سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔
وہ بُل جو آج تک نا قابل تسخیر تھا' آج بے دردی سے تسخیر ہونے جا رہا تھا۔ صدر کی کیبن میں بیٹھے مائیکل کی آنکھوں میں نمی گھل گئی۔ وہ جانتا تھا آج مرنے کے باوجود اس کے بُل کی بہادری و جرأت مندی مدتوں یاد رکھی جائے گی۔
بُل رنگ کا میدان کوئی کھیل کا میدان نہ تھا۔ موت کا میدان تھا' یہاں گھوڑے کی موت عام بات' بُل کی موت یقینی اور بُل فائٹر کی موت کبھی کبھی ہوتی تھی' سکو دیا کے اس بُل نے ایک عرصے تک موت کے اصل اصول تبدیل کیے رکھے تھے۔ گھوڑوں کی موت کی نوبت نہ آتی تھی' بُل زندہ رہتا تھا اور بُل فائٹر کی موت یقینی ہوتی تھی۔ مگر بُل کی قائم کی گئی روایت اب تبدیل ہو رہی تھی' گھوڑوں کی موت واقع ہو چکی تھی' بُل کی موت سامنے ڈکارتی نظر آ رہی تھی اور بُل فائٹر اپنی بہادری اور دلیری کے جھنڈے میدان میں گاڑھ رہا تھا۔
بگل پھر بجتا ہے۔ ترسیلو (موت کا کھیل) بس شروع ہی ہوا چاہتا ہے۔ آرون صدر کے کیبن کے نیچے جاتا ہے اور بُل کے خاتمے کی اجازت طلب کرتا ہے' صدر نے رومال اٹھا کر گرا دیا.....اجازت کا پروانہ مل گیا۔
''یہ بُل تمہارے نام کیملا.....!'' آرون نے اجازت ملنے پر ہجوم کی جانب پلٹ کر اپنا ہاتھ کیملا کی جانب بلند کرتے ہوئے اعلان کیا۔
''اولے..... اولے.....'' میدان تالیوں اور سیٹیوں سے لرز اٹھا۔ کیملا مسرت کے عالم میں اٹھ کھڑی ہوئی اور آرون کے لیے بوسہ فضاء کے سنگ اچھال دیا۔ یہ ساری کارروائی رنگ کے ایک کونے میں زخموں سے چور بُل نم آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے جسم پر کپکپی طاری تھی۔ کچھ دیر قبل ہی وہ اس رنگ میں ایک طاقتور کبھی نہ ہارنے والے بھینسے کے روپ میں اترا تھا اور اب وہ اپنا دردناک زوال دیکھ رہا تھا۔ وہ زوال جو ہر عروج کو ہے' جو ہر طاقتور کو ہے' اور یہ تھالی کے بینگن کی طرح ڈولتی دنیا کسی کی نہیں' کل تک وہ اس کی لازوال جیت پر خوب واہ واہ کرتی تھی' اور آج جب اس کی جیت دردناک زوال کی جانب گامزن ہے تو بھی خوب خوشی سے تالیاں پیٹ رہی ہے۔
آرون ایک ہاتھ میں مولیتا تھامے اور دوسرے میں تلوار تھامے میدان کے عین وسط میں جا کھڑا ہوا۔ اس دوران معاون بُل فائٹرز اور ایک پک آدور بھی رنگ میں داخل ہو گئے' ترسیلو کا آغاز ہو چکا تھا۔ بُل چاروں اطراف سے انسانوں میں گھر چکا تھا' اس کا طنطنہ' غرور تکبر اس کے لہو کی طرح مٹی میں مل چکا تھا۔ وہ رنگ کا بادشاہ تھا' مگر آج ڈھلتے سورج کی طرح غروب ہونے کو تھا۔ وہ جو نا قابل تسخیر تھا آج تسخیر ہونے جا رہا تھا۔ اس نے عجیب سی نظروں سے شور و غل کرتے ہجوم کو دیکھا' وہ سب اس کی موت کے منتظر تھے' انتہائی تکلیف دہ کرب ناک موت۔
''ہو.....ہو..... ہے..... ہے تورو.....!'' آرون نے مولیتا تھام کر بُل کے سامنے کھڑا ہو کر اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ مولیتا ایک لمبی چھڑی تھی' جس پر گز بھر سرخ کپڑا لپٹا ہوا تھا' تلوار آرون نے مولیتا کے نیچے چھپا رکھی تھی' اس

کے متوجہ کرنے پر ٹل نے انتہائی وحشت بھری نظروں سے آرون کو دیکھا۔ اس کی چمکتی وحشیانہ نگاہوں سے آرون کو لمحے بھر کے لیے خوف محسوس ہوا' مگر پل بھر میں ہی اس نے اس خوف پر قابو پالیا۔ ٹل پر کپکپی طاری تھی' اس کا فضلہ اس کے لہو کے ساتھ ریت میں رل چکا تھا' ان تمام کیفیت کے باوجود ٹل اس وقت بے حد خطرناک حالت میں تھا' اب وہ تب ہی حملہ آور ہوتا جب اسے اپنے حملے کی کامیابی کا یقین ہوتا۔

آرون نے مولیتا اس کے آگے بچھایا اور حملے کی ترغیب دی۔ پک آدور اور معاون ٹل فائٹر اسے گھیرے میں لیے قریب آرہے تھے۔ تن تنہا حیوان' ہتھیاروں سے لیس انسانوں کے چنگل میں پھنس چکا تھا۔ موت یقینی تھی...... دردناک عبرت ناک موت' ٹل نے تمام ہمت مجتمع کی اور حملہ آور ہوا...... مولیتا کا دھوکا کامیاب رہا...... ٹل کا حملہ خالی گیا' رنگ تالیوں سے گونج اٹھا آرون اب مزید قریب آچکا تھا...... وہ اب بڑی مہارت سے مولیتا کے دھوکے میں ٹل سے کھیل رہا تھا...... ٹل بدلے کی آگ میں جھلستا آرون پر حملے کی کوشش میں نڈھال ہوا جارہا تھا۔ مجمعے کے جوش وخروش میں اضافہ ہوا چلا جارہا تھا۔ ترسیلو کا کھیل اپنی انتہا پر تھا۔

پک آدور اور معاون ٹل فائٹر بھی اب ٹل کو مزید تھکانے کی غرض سے اس سے چھیڑ خانی کرنے لگے تھے...... جب ٹل نڈھال ہوکر ہانپنے لگا تب آرون نے مولیتا کے نیچے سے تلوار نکالی...... ہجوم کی جانب رخ کرکے تلوار بلند کی...... کمیلا جوش کے عالم میں تالیاں پیٹنے لگی۔

بالآخر آج اس وحشی ٹل کا خاتمہ ہونے جارہا ہے' میں برسوں سے چاہتا تھا کہ اس کا انجام دردناک ہو مگر آج اسے یوں بے بس ولہولہو دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔'' لوکاس نے رافیل کے کان میں سرگوشی کی۔

''شاید اس لیے کہ اتنے عرصے سے ہم اس ٹل کو جیتتے ہوئے دیکھتے آرہے تھے۔'' رافیل نے توجیہہ پیش کی۔

''نہیں شاید اس لیے کہ اس جانور کو میدان میں کھڑا کرکے وحشی بنانے والے ہم ہی ہیں۔ موت کے منہ میں انسانوں کو بھی اور جانوروں کو بھی دھکیلنے والے ہم ہی ہیں۔'' لوکاس رنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

''اوہو لوکاس یہ تم آج کس طرح کی باتیں کررہے ہو۔ خاموش رہو اور کھیل دیکھو...... آرون اس ٹل کا خاتمہ کرنے ہی والا ہے۔'' رافیل نے ناگواری سے اسے ٹوکا' لوکاس بھی سر جھٹک کر کھیل کی جانب متوجہ ہوگیا۔

آرون اب ٹل کے سامنے تلوار تانے کھڑا اس کی وحشت ناک نگاہوں سے نگاہیں ملائے اسے گھور رہا تھا۔ اس نے تلوار کے دستے کو بوسہ دیا اور تلوار ٹھیک ٹل کی سیدھ میں تان لی' بس چند پل بچے تھے ٹل کی زندگی کے' اس کی تھمتی سانسوں میں......!

آرون کو ایک آخری بار ٹل کو حملے کی ترغیب دینی تھی۔ جیسے ہی ٹل حملہ آور ہوتا اس نے آگے کی طرف جھک کر ٹل کے دونوں سینگوں کے درمیان گردن کی جگہ پر تلوار اندر تک اتار دینی تھی۔ یوں کہ تلوار سینہ چیر دے اور ٹل کے زندہ رہنے کی کوئی آس نہ بچے۔

ٹل نے تلوار کی شیشے کے مانند چمکتی نوک کو دیکھا' اس پر عجیب وحشت طاری ہوتی چلی گئی۔ وہ بخوبی جان چکا تھا کہ موت یقینی ہے مگر اتنی آسانی سے تو وہ بھی اپنے دشمن کو بخشنے والا نہ تھا۔ آخر وہ اس رنگ کا ایک عرصے تک بازی گر ثابت ہوا تھا۔ ناقابل تسخیر بازی گر۔

آرون نے مولیتا پھیلا کر ریت پر گھسیٹنا شروع کیا۔ ٹل مولیتا کے پیچھے پیچھے سست روی سے آنے لگا...... آرون نے ٹل کو دم میں پھنستے دیکھ کر مولیتا ایک جھٹکے سے گھمایا' ٹل حملہ آور ہوا' آرون نے تلوار بلند کی اور ذرا آگے کو جھکا' ٹل کے نزدیک آتے ہی اس نے گردن کی عین وسط پر تلوار اتارنا چاہا' مگر اسی پل وہ ایک جھٹکے سے فضاء میں بلند ہوا اور ریتیلی زمین پر جاگرا۔ ٹل نے اس بار چھلانگ مولیتا پر نہیں آرون پر لگائی تھی۔ اس کی نوکیلی سینگ آرون کی دائیں آنکھ کو پھوڑ چکی تھی۔ ہجوم پر سکتہ طاری ہوگیا۔ آرون اپنی دائیں آنکھ پر ہاتھ رکھے تڑپ رہا تھا۔ اس کا چہرہ خون میں لت پت تھا' آن کی آن میں منظر تبدیل ہوچکا تھا۔ معاون ٹل فائٹر تیزی سے ٹل کی جانب لپکے اور اسے اپنی جانب متوجہ کرنے لگے' ملازمین اسٹریچر اٹھائے رنگ میں داخل ہوئے اور آرون کو اسٹریچر میں ڈال کر رنگ سے باہر لے گئے' ٹل کے معاون ٹل فائٹر کی

جانب متوجہ ہوتے ہی پک آدور نے نیزہ بُل کی گردن کے عین وسط میں اتار دیا...... خون کا ایک فوارہ پھوٹ پڑا' بُل لڑکھڑانے لگا۔

بُل رنگ میں عجب بربریت کا عالم تھا۔ انسان حیوان کے خونی دنگل میں مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ ترسیلو کا اختتام خوبصورتی کے بجائے انتہائی بدصورتی کے ساتھ وقوع پذیر تھا۔ آرون جس نے سارا کھیل انتہائی مہارت کے ساتھ کھیلا تھا' عین وقت پر جلد بازی کرنے کے باعث بُل کو تسخیر کرتے کرتے خود تسخیر ہو گیا۔

پک آدور نے ایک بار پھر نیزہ بُل کی گردن میں گھسیڑا اور بُل کرب سے کرلاتا نڈھال سا ریت پر گر گیا۔ اب اس میں تڑپنے کی بھی ہمت باقی نہ بچی تھی۔ معاون بُل فائٹر تیزی سے اس کی جانب بڑھے اور نیزے کی تیز دھار سے اس کی شہ رگ کاٹ دی۔ ترسیلو اختتام پذیر ہوا مگر انتہائی بدصورتی کے ساتھ۔ بُل کو ہلاک تمام اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بُل فائٹر کرے تو اسے بُل کی ہار اور ترسیلو کا خوبصورت اختتام سمجھا جاتا ہے' بُل کو آخری وقت میں اس طرح ہلاک کرنا انتہائی برا فعل اور بدصورت عمل سمجھا جاتا ہے۔

بُل کا لاشہ ملازمین رسی سے لٹکا چکے تھے اور وہ رسی خچروں کا ٹولہ گھسیٹتے ہوئے رنگ سے باہر لیے جا رہا تھا۔ مائیکل جو صدر کی کیبن میں بیٹھا اپنے بُل کا دردناک انجام دیکھ رہا تھا' وہ بے ساختہ اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''لیرافنادو (ناقابل تسخیر) کا نعرہ لگاتے ہوئے زور زور سے تالیاں پیٹنے لگا۔ اس کی دیکھا دیکھی مجمع میں سے کچھ لوگ مزید اٹھ کھڑے ہوئے اور بُل کی بہادری کی شان میں نم آنکھوں سے تالیاں پیٹنے لگے۔ کچھ بھی ہو بُل رنگ کا اصل بہادر بُل کہلایا تھا۔ جس نے ہزار زخم سہہ کر بھی اپنے ناقابل تسخیر ہونے کے خطاب کا بھرپور دفاع کیا تھا۔ بُل کے رنگ سے مکمل طور پر نکل جانے تک پورا مجمع کھڑا بُل کی بہادری کو داد دے رہا تھا۔ فضا میں مخصوص دھن ایک بار پھر چھڑ گئی۔ وہاں موجود تمام تماشائی بے حد سوگوار تھے۔

رنگ سے باہر ایک ٹرک میں بُل کے بھاری بھرکم مردہ جسم کو ڈالا جا رہا تھا' تو دوسری جانب آرون کو ایمبولینس میں...... کیمیلا آرون کے اسٹریچر کے ساتھ ایمبولینس میں بیٹھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں رو رو کر سرخ ہو چکی تھیں اور وہ انگارے بھری نگاہوں سے مردہ بُل کو دیکھ رہی تھی' بُل کی مردہ نیم وا آنکھیں آرون کے اسٹریچر کی جانب اٹھیں ہوئی تھیں یوں جیسے کہہ رہی ہوں۔

''اے انسان...... میں تو میدان میں اپنے دفاع کی غرض سے اترتا تھا' یہ مقابلہ تو تو نے خود ہم دونوں پر مسلط کر رکھا تھا' تو نے خود ہی مجھے دنیا بھر کا ظالم بنا کر مجھ سے لڑنا شروع کر دیا۔ خود ہی بتا آج مجھے ہرا کر تجھے کیا ملا یا پھر مجھے کیا ملا...... ماسوائے زخم اور موت۔

خونی دنگل کے دونوں اہم اور مرکزی کردار اپنی اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔ ایک اسپتال تو دوسرا مذبحہ خانہ...... مذبحہ خانے میں بُل کو ذبح کر کے اس کا گوشت پورے قصبے بھر میں تقسیم کیا جاتا...... کچھ بھی تھا...... بالآخر آج خونی بُل ہلاک ہو چکا تھا۔



آرون اپنی ایک آنکھ گنوانے کے بعد کا نائل فائٹر کے نام سے مشہور ہو چکا تھا' اس کی شہرت کو ایک بدنما داغ لگ چکا تھا' البتہ ہسپانیہ کے کونے کونے میں بُل کو پہلی اور آخری مرتبہ بُل رنگ میں اتارنے کا قانون رائج ہو چکا تھا۔

سیگو دیا کے بُل رنگ میں آج بھی اعلیٰ پیمانے کے مقابلے کرائے جاتے تھے' مقابلے میں حصہ لینے والے بُل آج بھی مائیکل کے فارم سے تعلق رکھتے تھے' اس فارم کی شہرت قصبوں سے نکل کر شہروں تک جا پہنچی تھی۔

فارم کے داخلی دروازے پر ایک سیاہ جثہ' خونخوار بُل کا بلند قامت مجسمہ ایستادہ تھا' جس کے ساتھ ہی بڑی سی تختی کھمبے میں نصب تھی جس پر سیاہ جلی حروفوں میں فارم کا نام درج تھا۔

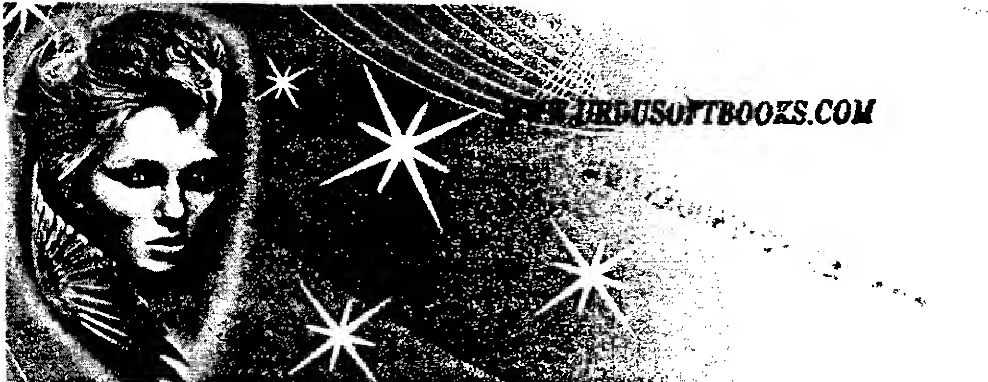
''لیرافنادو'' (ناقابل تسخیر)

# سوز عشق

**ناظم بخاری**

علامہ راشد الخیری کے فرزند ایک قدیم علمی و ادبی گھرانے کے چشم و چراغ صادق الخیری 1915ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ 1989ء میں کراچی میں وفات پائی۔ "نشیمن" صادق الخیری کا شاہکار ہے۔ اس میں ان کا کمال فن نظر آتا ہے۔

یہ طویل رومان.......... اپنی انفرادیت کی وجہ سے آرٹ کا اچھوتا نمونہ ہے۔ یہ ایک خوش آئند نغمہ ہے جو زندگی کے ساز سے ایک خاص سوز کے ساتھ بلند ہوا ہے۔ اس نغمے میں راگ کی جملہ نزاکتیں اور باریکیاں نمایاں ہیں۔ مگر یہ راگ دیپک ہے جس کے سروں سے شعلے لپکتے ہیں اور موسیقار کو جلا کر بھسم کر دیتے ہیں۔ یہ افسانہ سوز عشق کا ہے جس نے عشق کے ساتھ حسن کو بھی جلا کر خاکستر کر دیا۔ مگر یہ جلی ہوئی خاک، غبار راہ نہیں بنتی۔ سرمہ چشم بنتی ہے اور بصارت کے ساتھ بصیرت کو بھی نور بخشتی ہے۔صادق الخیری نے کئی ناول اور متعدد افسانے بھی تخلیق کئے، اور ایک جاپانی ناول کا ترجمہ بھی کیا، اس ناول کو بھی بے حد سراہا گیا۔





علامہ راشد الخیری کے فرزند ایک قدیم علمی و ادبی گھرانے کے چشم و چراغ صادق الخیری 1915ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ 1989ء میں کراچی میں وفات پائی۔ ''نشیمن'' صادق الخیری کا شاہکار ہے۔ اس میں ان کا کمال فن نظر آتا ہے۔

یہ طویل رومان...... اپنی انفرادیت کی وجہ سے آرٹ کا اچھوتا نمونہ ہے۔ یہ ایک خوش آئند نغمہ ہے جو زندگی کے ساز سے ایک خاص سوز کے ساتھ بلند ہوا ہے۔ اس نغمے میں راگ کی جملہ نزاکتیں اور باریکیاں نمایاں ہیں۔ مگر یہ راگ دیپک ہے جس کے سروں سے شعلے لپکتے ہیں اور موسیقار کو جلا کر بھسم کر دیتے ہیں۔ یہ افسانہ سوز عشق کا ہے جس نے عشق کے ساتھ حسن کو بھی جلا کر خاکستر کر دیا۔ مگر یہ جلی ہوئی خاک، غبار راہ نہیں بنتی۔ سرمہ چشم بنتی ہے اور بصارت کے ساتھ بصیرت کو بھی نور بخشتی ہے۔ صادق الخیری نے کئی ناول اور متعدد افسانے بھی تخلیق کئے، اور ایک جاپانی ناول کا ترجمہ بھی کیا، اس ناول کو بھی بے حد سراہا گیا۔

صادق الخیری کی دیگر تصانیف:

گنجینہ گوہر کھلا' نایاب ہیں ہم' آسماں کیسے کیسے؟

بہترین افسانے:

انکشاف حقیقت' دھنک' شمع انجمن' لب پہ آ سکتا نہیں' اے عشق کہیں لے چل (ترجمہ)

صادق الخیری کے شاہکار ناول ''نشیمن'' کی تلخیص

☆......☆☆☆......☆

ایک فنا کا جھونکا آیا اور وہ شمع شبستان حیات جھلملا کر گل ہوگئی۔ پرویز چپ چاپ دیکھتا رہ گیا۔ سب کچھ سہنا پڑا اور سوائے ہاتھ مل کر رہ جانے کے کچھ نہ کر سکا۔ وہ اس کی ہمدم و غمگسار تھی۔ صحیح معنوں میں شریک زندگی اور رفیق حیات تھی۔ اس نے اس کے آرام کی خاطر اپنے سکھ کو ہمیشہ قربان کیا اور پرویز کو اعتراف تھا کہ اس کی نیک نامی و عزت، اس دولت و عظمت کا باعث اس کی مرحوم بیوی ہی تھی جو اس کی ناکامیوں اور مایوسیوں کے لئے فتح و نصرت کا پیام لائی، جس نے اسے بارہا گرتے ہوئے سنبھالا اور جس نے اپنی سعی پیہم سے اسے بام عروج پر پہنچایا۔ لیکن یہ جلوہ مختصر کیوں؟ کیوں وہ اس قدر جلد رخصت ہوگئی؟

اس کا کوئی کیا جواب دے! ساری دوڑ دھوپ بیکار ثابت ہوئی۔ یہاں تک کہ موت اس کے سر پر رقص کرنے لگی۔ پرویز کو یقین ہوگیا کہ اب ڈاکٹر اسے نہیں بچا سکتے۔ اور کوئی دم میں وہ لحد کی آغوش میں جا سوئے گی۔ یہی ہونا بھی تھا۔ وہ دھان پان، نازک سی دلہن، وفا کیش و جانثار، جس کی پالکی ایک دن بڑی دھوم دھام سے اس کے ہاں آئی تھی، اس کی میت بصد حسرت و رنج اس روز اس کے گھر سے نکلی۔

پرویز ہنس کی طرح زخم کھا کر خاموش ہوگیا۔ اسے اس کا بڑا ملال تھا کہ جاتے جاتے رعنا نے مجھ سے کوئی بات چیت نہیں کی۔ کوئی خواہش ظاہر نہیں کی۔ کوئی وعدہ نہیں لیا۔ وہ صرف اسے تکتی رہی، ٹکر ٹکر دیکھتی رہی۔ شاید وہ زبان خموش سے کچھ کہہ رہی تھی لیکن وہ ان نظروں کو نہ پہچان سکا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ دم واپسیں زبان کا کام نگاہ دیتی ہے۔ اسی لئے وہ اس کا پیغام سمجھنے سے قاصر رہا، حالانکہ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں بہت کچھ کہتی رہی۔ وہ اب بھی اسے دلاسا دے رہی تھی۔ کہہ رہی تھی ''میرے غم میں یوں آنسو نہ بہانا...... میری روح کو یوں رنج نہ پہنچانا'' لیکن پرویز نے کچھ نہیں سنا۔ کچھ نہیں سمجھا بلکہ اس کی طرف اشکبار نگاہوں سے یوں دیکھے گیا، جیسے وہ انسانی بے بسی بیان کر رہا ہو کہ ہم اب تمہیں نہیں روک سکتے۔ نہیں ٹھہرا سکتے اور تم ہم سے بچھڑ کر موت کے اندھیرے میں چلی جاؤ گی۔ تن تنہا۔ اکیلی! لیکن وہ بالکل خوف زدہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار قطعی نہیں تھے۔ البتہ اس کی نظروں میں ترس اُمڈ آیا تھا اور وہ گویا بیچارگی سے کہہ رہی تھی ''پرویز...... میرے پرویز! تم اپنا دل یوں میلا نہ کرو۔ مرد یوں نہیں روتے...... تمہیں میری جان کی قسم! میرے بعد تم ہمیشہ خوش و خرم رہنا......'' اشارے اور کنائے تو خود شراروں کی طرح آن واحد میں گم ہو جاتے ہیں۔ اس پر جانکنی طاری ہوگئی۔ اس کا تعلق دنیا اور دنیا والوں سے قطع ہوگیا۔ جانے دو، جانے دو اسے، بلند، اور بلند، تاریکی اور نور...... نور اور تاریکی...... نہ جانے کہاں؟...... اور یہاں پہنچ کر تخیل بھی عاجز ہے۔

☆......☆☆☆......☆

رعنا کی موت سے پرویز کی زندگی نے ایک نئی کروٹ

لے لی تھی۔ اس کی جدائی سے اس کے دل پر ایک گہرا داغ لگا تھا اور دنیا اس کی نظروں میں اندھیر ہوگئی تھی۔ لیکن وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ ہرے ہرے زخم مندمل ہو جاتے ہیں۔ ابتدائی کیفیت اس کی بھی جاتی رہی۔ البتہ کبھی کبھی مرحومہ کا خیال اسے بری طرح ستانے لگتا تھا۔ جیسے اس کی عزیز ترین شے اس سے چھن گئی ہے، اور وہ پہروں اس کی یاد میں کھو جاتا۔

ایک دفعہ اس کے دل میں آئی کہ اگر کسی طرح مجھ پر خود فراموشی طاری ہو جائے تو بہت اچھا ہو۔ یہ دکھ کا احساس تو نہ رہے گا۔ یہ روح کی خلش تو نہ رہے گی۔ پر یہ خود فراموشی کیسے ہو؟ کیونکر وہ اپنے آپ کو بھول جائے؟ اور یہ سوچتے سوچتے اسے او ہنری کے افسانے (A ramble in aphasia) کا خیال آ گیا۔ الوین بلفورڈ پر بھی تو بھول کی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ اسے تو اپنا نام تک یاد نہ رہا۔ اپنے آپ کو ایڈورڈ، پنک ہیمر کہا کرتا تھا۔ لیکن نہیں۔ وہ تو بنتا تھا۔ اس نے تو خود فراموشی کا ڈھونگ رچایا تھا۔ مگر اس کے دل نے کہا کہ "کاش مجھے سچ سچ نسیان ہو جائے! میں اپنے وجود تک کو بھول جاؤں۔ اپنی ہستی سے منکر ہو جاؤں۔ مجھے اپنے بیتے ہوئے حالات اور نام تک یاد نہ رہے....." پھر اس نے توبہ کر لی، نہیں، نہیں، مجھے خود فراموشی نہیں چاہیے مجھے (aphasia) نہیں چاہیے۔

کم از کم ایک بات کا اسے بڑا اطمینان تھا، اور وہ یہ کہ دانستہ اس سے مرنے والی کو کبھی کوئی رنج نہیں پہنچا۔ اس کی کبھی کوئی حق تلفی نہیں ہوئی۔ بلکہ وہ ہمیشہ اس کی قربانیوں کو سراہتا رہا، اس کی خوبیوں کی داد دیتا رہا اور اس کی والہانہ محبت کی قدر کرتا رہا۔ وہ بھی یہ سب کچھ جانتی تھی۔ پرویز کی محبت اور قدر شناسی کا اسے اچھی طرح علم تھا۔ چنانچہ وہ اس سے خوش گئی۔ شاید اسی لئے وہ اسے خواب میں پریشان نہیں دکھائی دی اور نہ اس کے کسی خواب نے پرویز کو آزردہ خاطر کیا بلکہ وہ ہمیشہ مطمئن نظر آتی اور اس کا خواب ایک حکایت شیریں کی مانند دل پسند اور تشفی آمیز ہوتا۔

پرویز کو اس سے جو قلبی تعلق تھا اس کی بناء پر اس پر اب بھی کبھی کبھی اداسی طاری ہو جاتی تھی اور وہ ایسا محسوس کرتا کہ اس کے بغیر وہ اس بھری پری محفل میں بے سہارا اور تن تنہا ہے۔ ایک دن جب وہ پھر اس کی یاد میں اچانک بے قرار ہوگیا تو وہ اس سے ملنے چلی آئی۔ اس نے دیکھا کہ وہ سپید اور نازک کپڑوں میں سر تا پا ملبوس اس کے قریب مسہری پر بیٹھی ہوئی مسکرا رہی ہے۔ پرویز متحیر رہ گیا۔ یہ خواب ہے یا اصلیت؟ بیداری اور روز روشن میں خواب تو نہیں دکھائی دیتے۔ ضرور میری وارفتگی اور کشش اسے بہشت سے کھینچ لائی ہے اور اس خوف سے کہ کہیں اس کی ذرا سی حرکت یہ طلسم درہم برہم نہ کر دے، وہ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ یہ خواب بھی تھا تو اصلیت سے بہتر تھا کیونکہ اس کے اس وجود میں زندگی کے تمام آثار تھے، اور وہ اس سپنے کو کسی طرح ٹھیس لگانا نہیں چاہتا تھا۔

رعنا کے مسکراتے ہوئے لب غنچہ ناشگفتہ کی طرح بند ہوگئے اور اس نے ایسی آواز میں جو بہت دور سے آ رہی ہو، آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا "پرویز...... تمہارا نالہ فراق مجھے ہمیشہ تڑپاتا رہا۔ تمہاری خاموش محبت مجھے رلاتی رہی۔ آخر آج میں تم سے ایک بات کہنے چلی آئی....." یہاں اس کا لہجہ غمناک ہوگیا..... "تمہیں یوں بے حال دیکھ کر میں ہر وقت کڑھتی ہوں...... مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا کہ تم میری یاد میں یوں ہلکان ہوتے رہو۔ اچھے پرویز! اپنی طبیعت کو سنبھالو! وہ تمہارا واکمن کہاں ہے؟ اور تمہیں سیر و سیاحت کا جو شوق تھا، تم اسے پورا کیوں نہیں کرتے.....؟" یہ کہتے کہتے اس کے نقوش، اس کی آواز کی طرح، دھندلے ہوتے گئے۔ گویا اسے جو بات کہنی تھی، وہ ختم ہوگئی ہے اور دروازے کے پاس پہنچ کر وہ سفید لباس اور نورانی شکل نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

پرویز تڑپ کر کھڑا ہوگیا۔ "ذرا ٹھہرو۔ ذرا ٹھہرو۔ ٹھہرو رعنا...... رعنا"۔ وہ دروازے کی طرف لپکا مگر طلسم خیال ٹوٹ چکا تھا۔ خواب کی تاثیر ختم ہوگئی تھی۔ البتہ اس کی نگاہیں ابھی تک دروازے میں لٹکے ہوئے ریشمی پردے پر جمی ہوئی تھیں جو اس طرح ہل کر ساکت ہوگیا تھا جیسے کوئی وہاں سے گزرا ہو۔ "نہیں" وہ از خود کہنے لگا۔ "مجھے دھوکا نہیں ہوا۔ میری آنکھوں نے فریب نہیں کھایا۔ رعنا بذات خود میرے پاس آئی تھی، خود، بہ نفس نفیس۔ یہ اسی کی مخصوص خوشبو ہے جو اس کے اجلے بدن اور اس کی دل پسند خوشبوؤں سے مل جل کر پیدا ہوتی تھی، ہاں، یہ ساری فضاء

اسی خوشبو سے مہک رہی ہے" اور وہ فضاء میں اس طرح سانس لیتے ہوئے ٹہلنے لگا جیسے وہ ساری خوشبو اپنے آپ میں جذب کر لے گا۔

"میری رعنا مجھے تسلی دینے آئی تھی۔ وہ اب بھی مجھے بچوں کی طرح سمجھاتی ہے۔ اس نے مجھے سیاحت اور وائلن کی یاد دلائی ہے۔ واقعی مجھے وائلن بجائے ایک عرصہ گزر گیا ہے......" اور بہت دیر تک اسے ایسا معلوم ہوتا رہا کہ رعنا ابھی ابھی اس کمرے سے گئی ہے، بلکہ اس کی آواز ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہی ہے۔ پھر، آہستہ آہستہ اس کی بے چینیاں اور بے قراریاں ماضی کے دھندلکے میں تحلیل ہو گئیں اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی طبیعت ہلکی ہو گئی ہے اور اس کا دل اس ہلال نو کی مانند ہو گیا ہے جس میں ابھی ابھی تابانی اور درخشندگی آنے والی ہے اور جو ایک دن بدر کامل بن کر چمکے گا۔

☆......☆☆......☆

پرویز نے سیاحت کے لئے بمبئی کو منتخب کیا جس کی تفریحوں اور سیر گاہوں کی اس نے بارہا تعریف سنی تھی۔ چنانچہ ضروری سامان کے ساتھ وہ ایک دن ہندوستان کے اس مشہور اور عظیم الشان شہر میں آوارد ہوا جس کی ادائیں عروسانہ اور جلوے بے حجابانہ ہیں۔

کولابے میں جو خاصے امیر لوگوں کا علاقہ ہے، اس نے ایک چھ منزلہ عمارت میں خوبصورت سا فلیٹ کرایہ پر لیا اور دن رات کا بیشتر حصہ وہ سیر و تفریح میں گزارنے لگا۔ وہاں کی ریت کے مطابق وہ کھانا عموماً ہوٹلوں میں کھایا کرتا تھا اور چونکہ بمبئی فاصلوں کا شہر ہے اس لئے کبھی ٹیکسی اور بجلی کی ریلوں میں اور کبھی بسوں اور وکٹوریہ میں آیا جایا کرتا تھا۔ کیا ملکی اور کیا غیر ملکی، بلکہ خود ملکیوں میں بیسیوں مقاموں اور صوبوں کے لوگ بکثرت یہاں نظر آتے ہیں۔ اسی لئے کئی زبانیں اور کئی لباس رائج ہیں۔ البتہ ایک چیز مشترک ہے۔ وہ یہ کہ ایک کا مافی الضمیر دوسرا کسی نہ کسی طرح ضرور سمجھ لیتا ہے، نیز یہ کہ ننگا کوئی نہیں پھرتا۔ یہاں کے رہنے والوں کی اس نے ایک خصوصیت یہ دیکھی کہ وہ بہت تیز چلتے ہیں، اور اکثر کاروباری ذہنیت کے مالک ہیں۔ کہیں کا راستہ پوچھیے تو بجائے فاصلے کے، وقت کے پیمانے میں ناپ کر بتائیں گے۔ علاوہ ازیں یہاں ہر شخص دوسرے سے بے نیاز ہے۔ کسی کا پڑوسی کروڑپتی ہے تو کسی کو حسد یا جلن نہیں۔ اور اگر کوئی حاجت مند ہے تو کسی کو اس سے ہمدردی نہیں۔

اس نے وہاں کی مشہور تفریح گاہوں اور خیال افروز مقامات کی خوب سیر کی۔ چوڑے چوڑے کھلے بازاروں کے ساتھ ساتھ تنگ و تاریک گلیوں کا بھی مشاہدہ کیا۔ امیروں کے قہقہوں میں غریبوں کی آہوں کو بھی ڈوبتے ہوئے دیکھا۔ نور کی کرنوں میں ظلمات کی پھنکنیں بھی چھپتی دیکھیں۔ ان علاقوں میں بھی پھرا جہاں دولت مندوں نے سر بفلک اور بیش قیمت محل کھڑے کر رکھے ہیں، اور ان مقامات پر بھی نظر کی جہاں غرباء نے مل کر اپنی گندی اور تاریک بستیاں بنا رکھی تھیں۔

سہ پہر کے قریب پرویز اپنی قیام گاہ پر واپس آیا تو زینے پر چڑھتے ہوئے اس فلیٹ کے سامنے سے گزرا جس میں وہ گجرات کی دوشیزہ رہا کرتی تھی۔ اس نے دیکھا کہ دروازے کا ایک پٹ کھلا ہوا ہے، اور وہ رہزن تمکین و ہوش، لوہے کے اسپرنگ دار پلنگ پر عجیب انداز دلربائی سے لیٹی ہوئی ہے۔ اور عین اس لمحے جب پرویز کی نظریں بلا کسی قصد کے اس کی تکیوں کے سہارے ٹکی ہوئی نیم عریاں کمر پر پڑیں، اس گجراتن نے اسے دیکھ لیا۔ اور پھر جب ایک ثانیہ کے لئے ان دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں تو وہ پارۂ برق کی مانند اس انداز سے اٹھ کر بیٹھ گئی گویا اسے اندر آنے کی دعوت دے رہی ہے۔ اور ایکا ایکی اس نے اپنے رس بھرے ہونٹوں کو جو جوانی کی دمک سے گلنار ہو رہے تھے، اس طرح جنبش دی جیسے شباب سے لبریز لب اس وقت حرکت کرتے ہیں، جب ان پر نہایت جوشیلے اور والہانہ طور پر مہر محبت ثبت کی جائے...... لیکن پرویز نے یہ سب کچھ نظر انداز کر دیا، اور ان اشاروں کے متعلق جو وقت کے کم سے کم حصے میں کئے گئے تھے، کوئی خیال آرائی کے بغیر، وہ چشم زدن میں اپنے فلیٹ کی سیڑھیوں کی طرف مڑ گیا۔ اور جونہی وہ اوپر چڑھا اس نے نچلی منزل میں دروازے کے بہت زور سے بند ہونے کی آواز سنی۔

یہ وہی گجراتن تھی جس نے جھنجلا کر دروازہ بند کیا تھا۔ دراصل پرویز کے اس طرح چلے جانے سے اس کے پندار شباب کو ٹھیس لگی تھی اور اس کی اس بے رخی نے اسے ضد اور

خلجان میں مبتلا کر دیا تھا۔ ویسے بھی اسے اس بات کی بڑی خلش تھی کہ اس نووارد نے، اس بانکے نوجوان نے، آج تک اس کی بارگاہ حسن میں اپنا خراج بے قراری ادا نہیں کیا۔ اس سے اس درجہ بے نیازی! اور آج اس کی دعوت شوق کی اس قدر بے قدری! اس کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ مگر وہ کیا کر لیتی؟ کیا کر سکتی تھی؟ اس نووارد اور اجنبی نوجوان پر اس کا بس ہی کیا تھا؟ آپ ہی آپ پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔

آہستہ آہستہ اس کا شعلہ غضب سرد پڑ گیا اور اس نے اپنے دل میں سوچا شاید یہ نوجوان بمبئی میں بالکل نیا ہے۔ کہیں باہر سے آیا ہے۔ اس میں ہمت نہیں ہوئی...... اور اس خیال کے آتے ہی اس نے رسوئی میں جا کر اپنے خدمت گار کو آواز دی۔

دروازے پر دستک سن کر پرویز نے اسے اندر بلا لیا۔ یہ گجراتن کا ملازم تھا۔ کہنے لگا ”سیٹھانی جی آپ کو بلاتی ہیں“۔

”کون سیٹھانی؟“ پرویز نے اسے تعجب سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

ملازم بولا۔ ”وہ جو نیچے کی منزل میں رہتی ہیں۔ زینے کے سامنے والے فلیٹ میں“۔

معاً پرویز کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر آ گیا، جو کچھ دیر ہوئی اس نے نچلی منزل میں دیکھا تھا۔ اس گجراتن کے معنی خیز تبسم، اور لبوں کی جنبش، نقش تازہ بن کر اس کے ذہن میں واضح ہو گئے، اور اس نے حیرت سے کہا ”میں تو انہیں نہیں جانتا۔ انہوں نے مجھے کیوں بلایا ہے؟“

ملازم مسکرایا ”یہ آپ ان سے چل کر پوچھ لیجئے نا!“

”نہیں......“ پرویز نے بے پروائی سے جواب دیا ”میں یہاں کسی سے واقف نہیں اور نہ کسی سے ملنا چاہتا ہوں“۔ یہ کہہ کر اس نے اپنا وائلن اٹھا لیا اور تاروں کو ہم آہنگ کرنے کے لئے ان کے پیچوں کو کسنے لگا۔

ملازم کو گئے ہوئے کوئی آدھا گھنٹہ گزرا ہو گا کہ پھر کسی نے دروازے پر دستک دی۔ پرویز نے کھٹکا کھول دیا اور اس دفعہ اس نے دیکھا کہ وہی گجراتن سولہ سنگھار کئے اپنے جلو میں حسن و شباب کی بے شمار ادائیں لئے، بے جھجک اور اس انداز سے آ گئی ہے جیسے اسے یہاں کوئی تکلف نہیں۔ کوئی اجنبیت نہیں۔

پرویز چند لمحات اسے استعجاب سے دیکھتا رہا اور پھر اخلاقاً اسے اپنے مقابل والے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور جب وہ بصد ناز و انداز وہاں تشریف فرما ہو گئی تو وہ خود، وائلن اور اس کے گز کو کیس میں رکھنے لگا۔

گجراتن نے محسوس کر لیا کہ یہ شخص، جس کا رواں رواں شباب اور صحت سے دمک رہا ہے، میری طرف متوجہ نہیں۔ شاید وہ وائلن کے بہانے وقت ضائع کر رہا ہے۔ آخر اس نے مسکرا کر کہا۔

”ذرا میری طرف دیکھئے“ اور یہ اس نے اس لب و لہجے میں کہا، جس میں نرمی اور شگفتگی کے علاوہ مخاطب کو اپنی طرف مائل کرنے کی قوت پوشیدہ تھی۔ پرویز نے نظر اونچی کی اور دیکھا کہ گجراتن کی سیاہ اور چمکیلی آنکھیں اس پر اس طرح جمی ہوئی ہیں جیسے وہ کوئی جادوگرنی ہے اور اس کی بے پناہ نظر اسے آناً فاناً مسحور کر لے گی، اپنے قابو میں کر لے گی، اور وہ کسی معمول سحر کی مانند بالکل اس کے بس میں ہو جائے گا۔

پرویز نے اس کا سر تا پا جائزہ لیا۔ وہ خوبصورت ہے، جوان ہے اور اس قدر، گویا جوانی کا سورج حسن کی انتہائی لطافتوں کے ساتھ نصف النہار پر پہنچا ہوا ہے۔ اس نے اس کی کشادہ پیشانی کو دیکھا جس پر سرخ چندن کی بندی لگی ہوئی تھی جیسے کسی عاشق کا دل خون ہو کر اس ایک قطرے میں سمٹ گیا ہو۔ پھر اس نے اس کے چمپئی بازوؤں اور بانہوں کو دیکھا جن میں جذبات کی شعاعیں ابھرتے ہوئے آفتاب کی طرح مچل رہی تھیں۔ اس کی ساڑھی گجرات کی مخصوص بندش کے مطابق اس طرح بندھی ہوئی تھی کہ اس کی پنڈلیوں کا بالائی حصہ برہنہ نظر آ رہا تھا، اور ان پنڈلیوں پر خفیف سنہری روئیدگی اس طرح دمک رہی تھی جیسے کسی منور جسم میں سے ہلکی ہلکی شعاعیں نکل رہی ہوں۔

گجراتن بولی ”میرا نام نشی ہے۔ میں تیسرے مالے میں رہتی ہوں“ یہ کہہ کر وہ ذرا آگے جھکی اور اس نے پرویز کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا گویا وہ مصافحہ کرنا چاہتی ہے۔ مگر اس نے اس کا ہاتھ پھر نہیں چھوڑا، اور بولی۔

”میں آپ کو کئی دن سے دیکھ رہی ہوں...... آپ نے مجھے رام کر لیا ہے“۔

نشی نے اپنے دوسرے ہاتھ کی بھی مٹھی بنالی اور اپنے دونوں ہاتھوں میں پرویز کا ہاتھ اس مضبوطی سے پکڑلیا جیسے کسی نوآموز شکاری کو ڈر ہو کہ اس کا نو گرفتہ پنچھی ذرا ڈھیل ملنے پر اڑ جائے گا۔ اس کے ہاتھ جل رہے تھے اور اس کی آنکھوں کی سیاہ چمک سے اس کی جوشیلی طبیعت کا اظہار ہو رہا تھا۔ اور عین اس لمحے ابلیس پرویز کے کانوں میں اپنا نغمہ شباب سنانے لگا کہ اس میں کوئی حرج نہیں، کوئی مضائقہ نہیں! آخرتم مرد ہو...... جوان ہو! بمبئی کے عشرت کدے میں جہاں حسن و شباب کی شمعیں ازخود فروزاں ہوتی ہیں، ایک بار، صرف ایک بار، عیش وطرب کا لطف اٹھانے میں ایسا کون سا نقصان ہو جائے گا؟ ایسا کون سا ستم ہو جائے گا؟

......اور جونہی وہ نشی کے کھینچنے پر اس کے پاس صوفے پر جا کر بیٹھنے والا تھا اس کی نظر نشی کے پاؤں پر پڑی جو بے دھیانی میں چپل سے نکل کر دوسرے پاؤں پر آ ٹکا تھا۔ اور اسے دیکھ کر اسے اپنی مرحومہ بیوی کا پاؤں یاد آ گیا جس کی ساخت اور رنگت اس سے بہت ملتی جلتی تھی، اور اچانک کسی نے اس نغمہ شیطانی کو منتشر کرتے ہوئے، ٹھہر ٹھہر کر کہا ”سنبھل، اے دل! سنبھل! یہاں جبیں نہ جھکانا۔ یوں سرنیاز خم نہ کرنا۔ یہ سجدۂ شوق روا نہیں“۔

پرویز نے ایکاایکی اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور فیصلہ کن آواز میں بولا ”جی نہیں! مجھے معاف کیجئے......“ اور یہ کہتے کہتے وہ رُک گیا، کیونکہ نشی غصے میں کھڑی ہوگئی تھی۔ اس کا غیض و غضب شعلے کی طرح بھڑک اٹھا تھا اور اس وقت وہ اس بوالہوس سلومی کی مانند معلوم ہوتی تھی جو یوحنا کے انکار پر برا فروختہ ہوگئی تھی۔ اس کی جان کے درپے ہوگئی تھی۔ اور صرف اس لئے...... اس لئے کہ اس پرہیزگار پیغمبر نے اسے اپنے لب چومنے کی اجازت نہیں دی، وہ اس کا سر کٹوا کر رہی۔

پرویز اپنے پریشان خیالات کو یکسو کرنے کے لئے باہر نکل آیا اور میرین ڈرائیو کی اس طویل اور چکنی دیوار پر آ کر بیٹھ گیا۔ پھر پرویز ایک عزم مستقل کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ نشی کی زد، اور بمبئی کی زہد شکن فضاء سے بچنے کے لئے کل ہی یہاں سے چلا جائے گا اور ان جزیروں میں سکون تلاش کرے گا جو اس کے آس پاس ہیں مگر بمبئی کی آلودگیوں سے یقیناً محفوظ ہوں گے۔

☆......☆☆......☆

پہلے اس نے ان جزیروں کی سیاحت کی جو زیادہ معروف تھے اور جہاں مسافروں کو اسٹیمر لے جاتا تھا۔ ایلی فینٹا، مروڈ، ارن اور حبشان کے پرفضاء جنگلوں، لہلہاتی گھاٹیوں اور ہرے بھرے میدانوں سے وہ بے حد محظوظ ہوا۔ یہاں کی خوبصورتی واقعی روح کی تروتازگی کا باعث تھی۔ ان کی سیر کے بعد اس نے ان چھوٹے چھوٹے جزیروں کا رخ کیا جن کے لئے بادبانی کشتی میں بھی سفر کیا جا سکتا تھا اور اس طرح عرصہ دراز تک وہ ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے میں، ایک وادی سے دوسری وادی میں پہنچتا رہا۔ لیکن اس کی طبیعت سیراب نہیں ہوئی اور ہر نئی جگہ پہنچ کر اس کا دل چاہا کہ یہ سفر جاری رہے۔ صبح سے شام تک، زندگی کے اختتام تک، یونہی چلتا رہوں۔ قدرت مجھے بھی اپنا ایک حقیر سا ذرہ سمجھ لے اور مجھے وہ سرمدی اور انوکھی مسرت عطا کردے جو شہروں اور ان کے شوروغل سے کوسوں دور، دوشیزۂ قدرت کے ملکوتی لبوں پر ہمیشہ رقصاں رہتی ہے۔

حبشان سے وہ ایک چھوٹی سی بادبانی کشتی میں روانہ ہوا۔ اس کشتی میں وہ پہلے بھی کسی جزیرے کی سیر کر چکا تھا اور اس کے باتونی ملاح سے اس کی خاصی جان پہچان ہوگئی تھی۔ اس حریص ملاح نے اپنی جانب سے اس سے ایک بہت بڑی رقم طلب کی تھی جس کے عوض اس نے وعدہ کیا تھا کہ ایک ماہ تک، جہاں آپ کہیں گے، لے جاؤں گا۔ نیز آپ کے ملازم کا کام بھی کروں گا۔ پرویز نے یہ رقم بخوشی منظور کر لی اور ایک سفری خیمہ، والکن، بستر اور کچھ مزید سامان لے کر اس نے اپنا بحری سفر شروع کر دیا، جیسے خانہ بدوش منزل بہ منزل اپنی مسافت طے کیا کرتے ہیں۔

سورج اب اپنے عروج پر پہنچ گیا تھا اور اس کی درخشاں کرنیں سمندر کے بے چین سینے پر اس طرح ناچ رہی تھیں جیسے اتھاہ گہرائیوں میں رہنے والی ننھی ننھی جل پریاں سیم وزر کا کوئی البیلا کھیل دیکھنے اپنے عقیق و زبرجد کے محلوں سے نکل آئی ہوں۔ دور دور سے بڑی بڑی موجیں آہستہ خرامی سے آ کر کشتی سے ٹکراتی تھیں اور باتونی ملاح ازراہ تفنن ان کو اپنے چپوؤں سے ہوا میں اچھال دیتا

تھا۔

پرویز کو اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ جبیرے کے شمال مغرب اور جزیرہ شبنم کے مشرق میں ایک وادی ہے۔ خوبصورت اور ساز فطرت سے ہم آہنگ۔ وہاں طلوع و غروب کی سنہری ور و پہلی جھلکیاں دیدہ حیراں کو اپنا انوپ روپ دکھاتی ہیں، اور وہاں پھولوں اور پھلوں کی اس قدر کثرت ہے کہ ہوائیں ہزار ہا قسم کی خوشبوؤں میں بسی ہوئی چلتی ہیں۔ اس کی زمین نرم و نازک اور زرخیز ہے جس پر سبزہ و گل کا ایسا دبیز اور دلکش فرش بچھا ہوا ہے کہ راہگیر کو یہ احساس نہیں رہتا کہ وہ پیدل چل رہا ہے یا کسی نامعلوم فرشتے نے اس کے بازوؤں کو قوت پرواز عطا کر دی ہے...... اور اس سرزمین جمال، اس کرۂ خواب، اس محراب طلسم کا نام وادی نشیمن ہے۔

پرویز نے پراشتیاق لہجے میں کہا "بس تو ملاح! ناؤ کا رخ ادھر ہی پھیر دو۔ میں وادی نشیمن جاؤں گا"

بادبان ذرا ترچھے کر دیئے گئے اور کشتی منزل مقصود کی جانب تیزی سے چلنے لگی۔ دن ڈھلتے وہ ایک تنگنائے میں سے گزرے جس کے تھوڑے فاصلے پر کائی سے ڈھکی ہوئی چٹانوں اور بادامی پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور دور سے وہ ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے یہ ساحل کی حفاظت کرنے والی رفیع و مستحکم دیواریں ہیں جو مونگے اور مرجان کی بنی ہوئی ہیں۔ ایک جگہ پہنچ کر ملاح کھڑا ہو گیا اور اس نے لالہ فام ڈھلانوں کی طرف منہ کر کے، ہوا میں ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا "یہی وہ وادی ہے سیٹھ...... جہاں کہیے کشتی ٹھہرا دوں"۔

پرویز نے تاحد نظر پھیلے ہوئے علاقے پر ایک نگاہ رندانہ ڈالی اور یہاں کی محیر کن اور نشہ آور شادابیوں سے متاثر ہوتے ہوئے بولا "بس یہیں، ملاح یہیں!"

کشتی کو رسیوں سے باندھنے کے بعد ملاح اور پرویز نے مل کر خیمے کو صنوبر کے سدابہار درختوں کے سائے میں نصب کر دیا۔ اور پھر اندر سب ٹھیک ٹھاک کر کے پرویز باہر آ گیا۔ دور و نزدیک طلسم کی سی کیفیت طاری تھی اور سمندر کا وہ ٹکڑا جو تنگنائے میں سے ہوتا ہوا اس وادی کے پہلو میں آ نکلا تھا اپنی موجوں کے ترنم سے اس کیف سرمدی میں اضافہ کر رہا تھا۔ خیمے سے کافی فاصلے پر، وادی کے نشیب میں آبادی کے آثار ہویدا تھے۔ اور پہاڑیوں کی چوٹی کی طرف وہ خاموشی مسلط تھی جس میں انسان کے لطیف احساسات اجاگر ہوتے ہیں۔ قریبی ڈھلانوں پر سبز رنگ کے پس منظر میں سرخی سی پھیلی ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر میں ملاح بستی سے کھانے پینے کی چیزیں لے آیا اور پرویز اسے وہاں بٹھا کر چہل قدمی کے لئے پہاڑیوں کی بلندیوں کی طرف نکل کھڑا ہو گیا۔ چلتے چلتے اس کا راستہ مختلف شکلیں اختیار کرتا جاتا تھا۔ کبھی تنگ، اور بھی تنگ، جیسے کسی درے میں سے گزر رہا ہو۔ کبھی چوڑا کہ دو آدمی ساتھ ساتھ نکل سکیں اور کبھی کافی کشادہ۔ کوئی نصف فرلانگ چلنے کے بعد وہ ایسی جگہ آیا جہاں کھلا میدان تھا اور رہگوار کے دونوں جانب چھوٹے چھوٹے کھیت لہلہا رہے تھے۔ کہیں کہیں کسان اپنے کاموں میں مگن نظر آتے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی عورتیں اور بچے بھی شامل تھے اور وہ سب مل کر زمین کے خزینے سے اپنا اپنا حصہ سمیٹنے میں مصروف تھے۔ ان سے آگے پھر چڑھائی شروع ہو گئی تھی۔ بائیں جانب تھوڑے فاصلے پر نیلی نیلی پہاڑیوں کی بلند چوٹیاں فردوسی محلوں کے حسین میناروں کی طرح مالک ارض و سما کی طرف منہ اٹھائے کھڑی تھیں۔ ان کی ڈھلانوں میں لمبی لمبی پہاڑی گھاس اور خودرو کاسنی، اودے، سنہری اور سفید پھول باد جنوب کے جھونکوں سے لہرا رہے تھے اور وادی کی نازک اندام دوشیزائیں انہیں درانتیوں اور قینچیوں سے اپنی بھیڑ بکریوں کے لئے کاٹنے میں محو تھیں۔ پرویز ان اوزاروں سے پیدا شدہ سرسر سرسر کی موسیقانہ آواز کو سنتا ہوا آگے بڑھ گیا اور سوچنے لگا، اس جلوہ زار قدرت کو دیکھنے کی کس کو تمنا نہ ہوتی ہو گی۔

...... اور دفعتاً اسے یوں محسوس ہوا کہ کوئی اس کے پاس سے تیر کی طرح نکل کر برابر کے گھنے درخت کے پیچھے غائب ہو گیا ہے۔ یہ درخت اس قدر کہن سال تھا کہ اس کے بڑے بڑے تنوں سے موٹی موٹی لٹیں نکل کر زمین سے اس طرح آ ملی تھیں جیسے وہ ایک درخت کی موٹی لٹیں نہیں بلکہ وہ درخت، کئی درختوں کا مجموعہ ہو۔ اس کے تکونے پتے بنگلہ پانوں کی مانند چوڑے چوڑے تھے اور اردگرد سے چڑھنے اور پھیلنے والی بیلیں کثرت سے اس کی جڑ پر رینگتی ہوئی اس کی ڈالوں تک چھا گئی تھیں۔ اس

درخت کے پاس راستہ نہایت دشوار گزار تھا اور پرویز کو یقین ہوگیا کہ جو شخص اس کے قریب سے بچ کر اس درخت کے پیچھے غائب ہوگیا ہے وہ کہیں اور نہیں جا سکتا ضرور وہیں چھپا ہوا ہے، اور اس کے دل میں تجسس پیدا ہوگیا۔ ایسا کیوں؟ آخر کیوں یہ مجھ سے بچ کر اس کے پیچھے چھپا ہے۔ اور جب وہ اسی سمت سے درخت کے جھنڈ میں گھس گیا جہاں سے وہ نادیدہ ہستی غائب ہوئی تھی تو اس نے دیکھا کہ وہ...... عورت...... آزاد ہرنی کی طرح، جس کا کوئی شکاری تعاقب کر رہا ہو، ایک سالوں پرانی شاخ کے سہارے، غوطہ دے کر درخت کی دوسری طرف سے نکل بھاگی ہے...... اور پرویز ششدر و حیران، وہیں کے وہیں کھڑا رہ گیا، کیا یہ واہمہ ہے؟ کیا میں چلتے چلتے خواب دیکھنے لگا ہوں؟ اور اس نے درخت کو چھو کر دیکھا۔ اپنے آپ پر غائر نظر ڈالی۔ یہ سب حقیقت ہے اور وہ جاگ رہا ہے! پھر وہ...... عورت بھی حقیقت ہوگی لیکن یہ کیا؟ یہ کیا؟ وہ رعنا نہیں ہو سکتی۔ مگر اس کی شکل و شباہت رعنا جیسی ہے۔ ہو بہو وہی! اور معاً وہ اس کی جستجو میں اسی رہگزار پر آ گیا جو کھیت میں بل کھائی ہوئی پگڈنڈی کی طرح پہاڑیوں کی آغوش میں گم ہو جاتی تھی۔ وہ تیزی سے چلا جا رہا تھا کہ دفعتاً اسے کسی نے آواز دی۔ پرویز نے مڑ کر دیکھا کہ ایک گڈریا اپنی بھیڑوں میں گھرا ہوا اسے حیرت سے تک رہا تھا اور جب پرویز متوجہ ہوا تو اس نے کہا ''آپ کو کہاں جانا ہے؟ اس طرف مت جایئے۔ بستی کی راہ تو پیچھے رہ گئی''۔

پرویز اپنا اشتیاق چھپاتے ہوئے بولا ''نہیں میں ادھر ہی جاؤں گا۔ اسی راستے پر''۔

گڈریا کھڑا ہوگیا اور اس کے نزدیک آ کر کہنے لگا ''نہیں سیٹھ۔ اس دورا ہے کے آگے کوئی نہیں جاتا۔ وہ راستہ بڑا خطرناک ہے اور وہاں آدمی اسی وقت جاتا ہے جب اسے خودکشی کرنی ہو''۔

یہ سن کر وہ اور بھی مضطرب ہوگیا اور گڈریئے سے مزید کچھ کہے سنے بغیر، اپنی پوری طاقت سے پھر اسی راہ ممنوعہ پر گامزن ہوگیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس مفرور راہی کو پھر اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔ اس کے روپ میں رعنا کا درشن کر لے اور جان لے کہ وہ کیوں اپنے آپ کو ہلاک کرنا چاہتی ہے؟

یکا یک وہ راستہ اسے ایک کشادہ اور مربع نما میدان میں لے آیا جسے دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ زلزلے کے جھٹکوں نے ٹیڑھا کر دیا ہے۔ اس کے ایک طرف چپٹی اور دیوآ سا چٹانیں تھیں جن کے دامن میں مہیب غار تھے اور دوسری طرف ایسی پرخطر ڈھلان کہ دیکھنے سے خوف آئے۔ اس نے چاروں طرف بے تابانہ نظریں دوڑائیں اور یک لخت دیکھا کہ وہی عورت ڈھلان تک پہنچ گئی ہے اور کوئی دم میں شاید اس اتھاہ گہرائی میں جا گرے گی جہاں گم ہو کر کوئی نہیں ابھر سکتا۔ اور جیسے بجلی سی چمک جائے۔ وہ انتہائی پھرتی اور سرعت کے ساتھ اس طرف لپکا۔ اور عین اس لمحے جب وہ بلبل ناشاد کی مانند شاخ حیات سے پرواز کرنے والی تھی۔ پرویز نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا ''ٹھہریئے''۔

دختر کوہسار نے اسے مڑ کر دیکھا اور کچھ نہیں بولی۔ وہ خود ہی وہاں سے ہٹ گئی اور ایک خاموش راہب کی طرح سنگ خارا کے اس چبوترے پر آ کر بیٹھ گئی جو وسطی غار کے دہانے پر بنا ہوا تھا۔ پرویز بھی اس کے پاس آ گیا اور غور سے اسے دیکھنے لگا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اگر میرے عقیدے کے مطابق تدفین کے بعد حیات و حرکات ناممکن نہ ہو جاتیں تو مجھے یقین آ جاتا کہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ رعنا یہاں دوبارہ نمودار ہوئی ہے۔ اس روز خواب میں جو اس نے مجھے سیر و سیاحت کی ترغیب دلائی، اس کا مطلب یہی ہوگا کہ میں اس کو تلاش کر لوں۔ شاید وہ یہ کہنا چاہتی تھی کہ میں موت کے جزیرے سے واپس آ جاؤں گی مگر میری واپسی اب کے اس وادی میں ہوگی اور تم اس سرخاب کی مانند جو اپنی منزل اور راہ سے بھٹک کر ہراساں و افسردہ ہو جاتا ہے مگر ہمت نہیں ہارتا، مجھے وادی نشیمن میں ڈھونڈ نکالنا۔ اور پھر، یکا یک وہ اپنے خیالات سے چونکا اور اس نے دیکھا کہ وہ سیاہ پوش عورت سسکیاں لے رہی ہے۔

پرویز نے پوچھا ''کیا آپ خودکشی کر رہی تھیں؟''

اس نے اپنی آنکھیں پونچھیں، اور قدرے توقف کے بعد گردن اٹھا کر پرویز کو دیکھتے ہوئے بولی...... ''ہاں، آپ نے مجھے روک لیا''۔

پرویز کو اب معلوم ہوا کہ اس کا اندازہ غلط تھا۔ وہ پوری عورت نہیں تھی۔ اس کے مکھڑے کے بھولپن اور کمسنی سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ ابھی غنچہ نورس ہے، ورنا سفتہ ہے۔ اٹھان اور صحت کی وجہ سے وہ ذرا زیادہ عمر کی ضرور معلوم ہوتی تھی، لیکن درحقیقت وہ ایسا پھول ہے، جو ابھی پوری طرح نہیں کھلا۔ اس کا شباب دوشیزگی کا امین اور اس کا حسن معصومیت کا نقیب ہے۔

پرویز نے سوال کیا ''آپ خودکشی کیوں کرنا چاہتی تھیں؟''

دختر کوہسار نے اسے نظر بھر کر دیکھا اور رازدارانہ انداز میں بولی ''پہلے یہ بتا دیجئے کہ آپ کون ہیں؟ کیا آپ یہاں نو وارد ہیں؟''

پرویز نے پہلی بار اس کی شفاف اور نرگسی آنکھیں دیکھیں اور وہ ان سے بڑا متاثر ہوا۔ خصوصاً ان کی سبز پتلیاں اسے بڑی پرکشش معلوم ہوئیں۔ اس نے جواب دیا ''میں سیاح ہوں اور میرا نام پرویز ہے۔ اس پہاڑ کے جنوب میں، آبادی کی مخالف سمت جو راستہ چٹانوں کی طرف جاتا ہے، وہیں ساحل کے قریب میرا خیمہ ہے اور میں آج ہی یہاں آیا ہوں''

سبز چشم، سروقد کھڑی ہوگئی اور ڈھلان کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی ''وہاں نیچے سمندر بہتا ہے اور اس کا بہاؤ آبادی کی جانب ہے۔ ابھی چند دن ہوئے ایک چرواہے نے یہاں آ کر خودکشی کی تھی۔ اس کی لاش بہتی ہوئی آبادی میں پہنچ گئی اور لوگ سمجھ گئے کہ یہ کیسے ہلاک ہوا۔ اس وادی میں یہ ریت چلی آتی ہے کہ جسے خود دنیا سے جانا ہو، وہ یہاں آ کر جان دیتا ہے...... کبھی کبھی یہ بھی ہوا ہے کہ کوئی نوجوان یا دوشیزہ اپنی جان دینے یہاں آئی مگر کسی اجنبی اشارے نے اسے روک دیا اور وہ آبادی میں واپس آ گئی...... آپ نہ آتے تو اب تک میری لاش سمندر میں تیرتی ہوتی''

پرویز نے اسے خوابناک آنکھوں سے دیکھا اور یہ خیال کیا کہ شاید یہ مایوس محبت ہے لیکن اس کے مزید پوچھنے سے پہلے وہ بولی ''آپ نے میرا پیچھا کیوں کیا تھا؟ میں نے تو کوشش کی تھی کہ آپ سے بچ کر نکل جاؤں؟''

پرویز نے جواب دیا ''اس کی ایک وجہ ہے...... لیکن آپ یہی سمجھ لیجئے کہ آپ کے چھپنے سے میرا تجسس بڑھ گیا تھا۔ اور پھر اس دوراہے پر مجھے ایک گڈریئے نے ادھر آنے سے منع کیا تو میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ میں آپ کو ضرور اس اقدام سے روکوں گا''۔

سبز آنکھوں والی بے بسی کے لہجے میں بولی ''آپ کی آمد میرے لئے غیبی اشارہ ہے۔ میں نے چاہا تھا کہ زندگی سے چھٹکارا مل جائے مگر شاید یہ خدا کو منظور نہیں۔ میں اب واپس چلی جاؤں گی۔ اسی ظالم کے پاس چلی جاؤں گی''۔

وہ آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ پرویز نے اس کا راستہ روک لیا اور عاجزی سے کہنے لگا ''ذرا ٹھہر جایئے'' وہ رُک گئی اس نے اس کی طرف اشتیاق اور حیرت سے ملی جلی نگاہوں سے دیکھا اور بھولپن سے بولی ''آپ مجھے یوں کیوں دیکھ رہے ہیں؟ آپ نے مجھے کیوں روکا ہے؟''

پرویز سے ضبط نہ ہو سکا۔ اس کی اداس آنکھیں پرنم ہو گئیں اور اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا ''آپ کو دیکھ کر مجھے کوئی یاد آ رہا ہے...... خیر، آپ مجھے اپنا نام بتائیں گی؟''

سبز چشم نے اسے ایسی نظر سے دیکھا جس میں تسلی اور دلاسہ تھا۔ اور ہمدردانہ لہجے میں کہنے لگی ''میرا نام نغمانہ ہے۔ کیا میں کسی کی ہم شکل ہوں؟''

پرویز اسے ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا۔ جیسے اس وقت رعنا اس کے سامنے کھڑی ہے۔

نغمانہ نے کہا ''آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟''

وہ بولا ''جی ہاں۔ مگر آپ جس کی ہم شکل ہیں وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے، اور اسی لئے میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کو جی بھر کے دیکھے جاؤں۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟ آپ زیادہ دیر تو نہیں ٹھہر سکتیں! اچھا...... معاف کیجئے میں نے آپ کو ناحق روکا''۔

اور جب وہ راستے سے ہٹ گیا تو سورج تھکے ہارے جواری کی طرح، جو جیت کی امید پر اپنا سب کچھ لٹا چکا ہو، چپکے چپکے غروب ہونے لگا اور چاروں طرف افسردگی سی چھا گئی۔ ڈھلان کے دامن میں بہتے ہوئے سمندر کی سائیں سائیں سے دور تک پھیلے ہوئے سکوت کا احساس دم بہ دم زیادہ ہو رہا تھا اور جگہ جگہ چھالیہ اور دارچینی کے طویل

قامت درخت اپنی ہلکی ہلکی جنبشوں سے روز روشن کے انجام کو اور بھی حسرت فزا بنا رہے تھے۔ پرویز بولا ''اب آپ جائیے ایسا نہ ہو اندھیرا چھا جائے''

نغمانہ دو قدم چل کر رُک گئی اور اس نے مڑ کر پوچھا ''آپ یہاں کیا کریں گے؟ چاند نکلنے سے پہلے یہاں بڑی خوفناک تاریکی ہوگی۔ آپ نو وارد ہیں، ایسا نہ ہو آپ راستہ بھول جائیں'' اور اس کے چلنے کا اشارہ کرنے پر وہ اس کے ساتھ ہولیا۔

ان دونوں کو چلتے ہوئے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ آفتاب نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اور ستارہ شام کے نمودار ہوتے ہی چمگادڑیں وحشت زدہ درختوں سے اڑ اڑ کر فضاء میں منڈلانے لگیں۔ اب وہ دشوار گزار راستے پر چل رہے تھے۔ کہیں کہیں گھاٹیاں اور ڈھلانیں بھی آ جاتی تھیں، جن کی وجہ سے اندیشہ تھا کہ کہیں پاؤں نہ پھسل جائے۔ دفعتاً نغمانہ نے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا ''یہ بڑا خطرناک راستہ ہے۔ آپ میرا ہاتھ پکڑ لیجئے۔ یہ زمین میرے پاؤں کو لگی ہوئی ہے''۔ پرویز نے فوراً اس کے ہاتھ کا سہارا لے لیا اور اس اتصال سے، جیسے ان دونوں کے جسم ایک دوسرے کے ہمراز بن گئے۔ ان کی زبانیں خاموش تھیں مگر ان کے دل ایک دوسرے کی دھڑکن کو بخوبی سن رہے تھے۔

موڑ پر پرویز کو ٹھوکر لگی مگر نغمانہ نے اپنے قوی ہاتھ سے اسے سنبھال لیا اور ذرا شگفتہ آواز میں بولی ''دیکھا آپ نے!''

اس کو اس وقت احساس ہوا کہ اس کی ہم سفر طاقتور ہے، اور باوجود حزن و ملال کے اس کے لب و لہجہ میں شیرینی اور دلنوازی ہے۔ وہ جواباً بولا ''آپ نے مجھے بچا لیا، ورنہ میں شاید کھڈ میں جا گرتا''۔

کچھ دیر دونوں خاموش چلتے رہے، اور جب پرویز سے نہ رہا گیا تو اس نے سکوت توڑا ''میں نے آپ سے ایک بات پوچھی تھی، اس کا آپ نے جواب نہیں دیا''

''کون سی بات؟'' نغمانہ نے اندھیرے میں اس کی طرف مڑتے ہوئے پوچھا۔

''آپ وہاں کیوں گئی تھیں؟ آپ کو ایسا کون سا صدمہ پہنچا ہے؟''

اس نے آہ سرد بھر کر جواب دیا ''اس پر آپ اصرار نہ کیجئے تو بہتر ہے''۔

وہ دونوں پھر خاموش ہو گئے اور چپ چاپ اپنا راستہ طے کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ملکہ شب کا نور فگن آویزہ گوش، آسمان کے آنچل پر پوری تابانی سے جگمگانے لگا اور ظلمات کی بلائیں غول بیابانی کی طرح وادی نشیمن سے روپوش ہو گئیں۔ آخر وہ پہاڑی کے جنوب میں اس مقام پر آ کر رُک گئے جہاں سے ایک راستہ آبادی کو جاتا تھا اور دوسرا اس کی مخالف سمت میں، ان چٹانوں کی طرف جہاں پرویز کا خیمہ نصب تھا۔

پرویز نے ساحل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''وہ دیکھئے...... وہاں سفید سفید! وہی میرا خیمہ ہے......''

نغمانہ نے بصد شوق ادھر دیکھا۔ چاندنی رات میں خیمے کی سفیدی الگ نظر آ رہی تھی۔ پھر اس نے اپنی صراحی دار گردن کو نزاکت سے جنبش دی، جیسے وہ رخصت ہونا چاہتی ہے، اور پرویز اس کا عندیہ پا کر بولا ''میں کل صبح آبادی میں آؤں گا، آپ کہاں رہتی ہیں؟ کیا آپ سے ملنا ہو سکے گا؟''

جیسے وہ اب تک کچھ بھولی ہوئی تھی، یہ سن کر اسے سب کچھ یاد آ گیا اور ایسا معلوم ہوا کہ کسی خیال نے اسے ڈرا دیا ہے۔ پریشان کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ جلدی جلدی یہ کہتی ہوئی ''میں...... میں باغ والے سرخ مکان میں رہتی ہوں'' نشیب کی طرف روانہ ہو گئی۔ پرویز اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا، اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو وہ اس کے خیالات میں کھویا ہوا، آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا، اپنے خیمے میں داخل ہوا اور سونے کیلئے لیٹ گیا۔

☆......☆☆......☆

ساحلی گلستانوں میں طائران خوش گلو کے شیریں نغمات نے حسینہ سحر کا خیر مقدم کیا اور پرویز نے کروٹ لے کر آنکھیں کھول دیں۔ کہیں دور، کسی مؤذن کی پرتاثیر دعوت نماز وادی کی پہاڑیوں سے ٹکرا ٹکرا کر فضائے بسیط میں ایک عالم سرمدی پیدا کر رہی تھی۔ اور ''الصلوٰۃ خیر من النوم'' کا نعرۂ مقدس صدائے بازگشت بن کر قلب کی پہنائیوں میں جذب ہو رہا تھا۔ پرویز کو ایسا معلوم ہونے لگا جیسے اس کا دل، عرصہ دراز بعد خدائے عزوجل کے آگے سربسجود ہونے کی طرف مائل ہے۔ اس کا باطن اس گوشہ

تنہائی میں، مالک دوجہاں سے لولگانے کے لئے بے قرار ہے۔اس کی روح منبع انوار کے حضور، سرعبودیت خم کرنے کے لئے بیتاب ہے۔ چنانچہ جب وہ قادر حیات و ممات کے دربار میں اس خلوص قلب سے حاضری دے چکا، جو اپنے معبود کی بارگاہ میں، عابد نیک نفس کے لئے ضروری ہے، تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ فرحت واطمینان کی دولت سمیٹ لایا ہے۔اس کا بارغم ہلکا ہوگیا ہے اوراس کی طبیعت میں بشاشت آ گئی ہے۔

☆......☆☆......☆☆

ناشتے سے فارغ ہوکر وہ آبادی کی طرف چلنے لگا کہ اچانک ایک اودبلاؤ اس کے پاس سے سرسے نکلا اورغڑپ سے سمندر میں کود گیا۔اس کی چال اسے بے حد دلچسپ معلوم ہوئی جو خرگوش کے پھدکنے اور کنگرو کے پھلانگنے سے ملتی جلتی تھی اور وہ تفریح طبع کے لئے اس کے پیچھے پیچھے ساحل تک چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ ہرے بھرے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں اور چٹانوں کی اوٹ میں بے شمار بطخیں، مرغابیاں، قاز اور دیگر آبی پرندے برات کی طرح قطار اندر قطار بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس کا جی چاہا کہ کاش میرے پاس اس وقت بندوق ہوتی تو میں نہایت شوق سے ان کا شکار کرتا۔لیکن فوراً ہی اس کے اشتیاق پرغبار سا چھا گیا۔شکار کوئی ایسی مردانگی تو نہیں جس سے خوشی حاصل کی جائے۔بے زبان جانوروں پر بندوق چلانا اور ان کے گلے پر چھری پھیرنا ایسے بہادری کے کارنامے تو نہیں جن پر جی جائز طور پر خوش ہوا۔اس شوق خونریزی پر موپساں نے بھی تو ایک جگہ تنقید کی ہے۔مگر کہاں کی ہے؟ کیا کی ہے؟ اور اسے یاد آیا کہ اپنے افسانے جنونی میں جو انسانیت اور تہذیب پر نہایت لطیف طنز ہے، وہ کہتا ہے کہ نہ صرف جانور دوسروں کو پھاڑ کھاتے ہیں بلکہ انسان بھی دوسرے کو بے رحمی سے قتل کر دینے کا دلدادہ ہے۔ اس میں یہ عادت ابتدا ہی سے پڑی ہوئی ہے۔البتہ تہذیب اور سماجی پابندیوں کی وجہ سے اس ازلی عادت میں تھوڑی سی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ اب ایک انسان دوسرے انسان کو قانون کے ڈر سے جان سے نہیں مارتا مگر دیویوں اور دیوتاؤں کے نام پر بھینٹ تو چڑھا دیتا ہے۔

ناگہاں اس کی نظر سمندر کے اس پار، خورشید خاور پر پڑی جو سطح آب سے آہستہ آہستہ ابھر رہا تھا، اس کی درخشانی اس وقت اس بت سیمیں کی نورانی پیشانی کی مانند معلوم ہوتی تھی جس کے لبوں سے مئے گلگوں سے لبریز جام لگا ہوا ہو۔اوراس کی زرنگار کرنیں کرہ ارض کی جانب اس طرح آمادہ سفر تھیں، جیسے کسی کے رخ آتشیں سے حسن کی چمکتی ہوئی شعاعیں چھوٹ رہی ہوں۔ پرویز کا دھیان بٹ گیا۔قطاروں میں بیٹھے ہوئے بے ضرر اور خوبصورت پرندوں پر اس نے ایک پُررحم نگاہ ڈالی، جیسے وہ ان سے کہہ رہا ہو”مجھ سے نہ ڈرو، میں تمہیں ذبح نہیں کروں گا۔ مجھے تو شکار سے نفرت ہے“۔اور وہ انہیں اپنے ہم جلیسوں میں خوش وخرم دیکھتا ہوا، وہاں سے مڑا اورآبادی کی جانب روانہ ہوگیا۔

پرویز جلدی راہ طے کرنا چاہتا تھا مگر اس گل وعنبر فشاں ماحول میں اس قدر کشش تھی کہ اس کے قدم سست رفتار ہو گئے تھے۔اس نے اپنی آنکھیں اوران کے ساتھ اپنا دیدۂ دل پوری طرح وا کردیا۔گویا وہ اس ساری فضاء میں جذب ہوجانا چاہتا ہے یا خود اس سارے گردونواح کو اپنے اندر سمو لینے کا متمنی ہو۔

اب پگڈنڈی میدان میں اتر آئی تھی جہاں کہیں کہیں کوئی مصفا ندی یا نالہ لاابالی نوجوان کی طرح اٹھلاتا چلا جاتا تھا۔تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر کھپریلوں اور چھپروں سے ڈھکے ہوئے مکان نظر آجاتے تھے اور پرویز کی نگاہیں ان گھروں کا بے چینی سے جائزہ لے رہی تھیں۔حتیٰ کہ عام رہگزر سے ہٹ کر اسے مغربی سمت میں ایک وسیع وعریض باغ کے بیچوں بیچ سرخ رنگ کا خوبصورت مکان دکھائی دیا اور وہ بے محابا اس راستے پر آ گیا۔صدر دروازے پر پہنچ کر وہ ذرا دیر کے لئے رکا۔ پھاٹک سے عمارت تک ایک چھوٹا سا سرسبز قطعہ زمرد کے نگینے کی مانند آراستہ وپیراستہ تھا جس کے گرداگرد گل اشرفی، شاخ شبو اور گلاب کے پھولوں کی گوٹ لگی ہوئی تھی اور اس کے سروں پر سرو وشمشاد کے گھنیرے درخت سنتریوں کی طرح سر اٹھائے کھڑے تھے۔اس قطعے کے دونوں جانب گھریلو کھیت اور کیاریاں تھیں جن میں تخم ریحان، کوکنار اور کپاس کے علاوہ متفرق پھلوں کے پودے اور درخت لگے ہوئے تھے۔ ان کی

آبیاری کے لئے چھوٹے پیمانے پر ندیاں سی بنی ہوئی تھیں جن میں قریب کے مترنم جھرنے سے پانی کو کاٹ کر لایا گیا تھا۔

ہر طرف خاموشی مسلط تھی اور پرویز منتظر تھا کہ کہیں سے اس کے مکینوں کا نشان ملے۔ آخر تھوڑی دیر بعد باد مشرق کا ایک جھونکا آیا اور اس کے جلو میں وہ آواز سنائی دی جو دودھ دوہنے اور تھنوں کی نکلی ہوئی دھاروں کے بالٹی سے ٹکرانے میں پیدا ہوتی ہے۔ وہ اندر داخل ہو گیا اور دائیں ہاتھ کی روش پر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ سامنے ساون بھادوں میں وہی دختر کوہسار، وہی دوشیزہ بہار، وہی سبز پتلیوں والی نغمانہ ایک موٹی تازی گائے کا دودھ دوہ رہی تھی۔ اس کے آس پاس پلی ہوئی بھیڑ بکریاں جگالی کر رہی تھیں، اور وہ گاہے گاہے ان کی آوازوں کے جواب میں محبت بھرے جملے کہہ دیتی تھی۔ جانے ایک بھیڑ کے بچے کے جی میں کیا آیا کہ وہ پیچھے سے آ کر اس کا پیٹ اپنے سر سے سہلانے لگا۔ نغمانہ اس گدگدی سے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کے اس قہقہے میں حسن داؤدی کی شیرینی تھی۔ نغمہ بربط کی دلنوازی تھی، اور رقص ناپید کی بے ساختگی تھی۔ پرویز نے اس کے حسن معصوم سے متاثر ہو کر اسے ہولے سے پکارا۔ وہ ایک دم مڑ گئی اور اسے اپنی نگاہوں کے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئی پھر اس کے پتلے پتلے یاقوتی لبوں پر تبسم آ گیا اور وہ سب کچھ بھول کر کہنے لگی "آپ یہاں؟...... آیئے"

اس کے اشارہ کرنے پر، پرویز وہیں گھاس کے مخملیں فرش پر بیٹھ گیا۔ نغمانہ ڈونگے میں دودھ بھر کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی "یہ میری نرگس کا دودھ ہے۔ اسے پیجئے"

پرویز نے دودھ کا پیالہ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور نغمانہ، اس کی تشکرانہ نگاہوں سے نظر بچا کر اپنی گائے کی گردن پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی "مجھے اس سے بڑی محبت ہے، اور یہ بھی مجھے بے حد چاہتی ہے۔ چکھیئے نا...... یہ دودھ بڑا لذیذ ہے۔ اس ساری وادی میں کوئی بھی گائے اس کی برابری نہیں کر سکتی"

پرویز نے نہایت شوق سے پیالہ منہ کو لگا لیا اور نغمانہ اسے پر اشتیاق نظروں سے دیکھنے لگی۔ اس کا دل اس خوبصورت اجنبی کو دیکھ کر خود بخود کوئی نامعلوم سی خوشی، کوئی انجان سی تسلی اور کوئی ان دیکھی امید محسوس کر رہا تھا لیکن وہ ابھی دودھ ختم کرنے نہیں پایا تھا کہ کسی نے پیچھے سے نہایت کرخت لہجے میں نغمانہ کو پکارا۔ وہ طائر نو گرفتہ کی طرح افسردہ و خائف ہو گئی، اور پرویز کو یوں محسوس ہوا کہ کسی نے شیش محل پر پتھر کھینچ مارا ہے۔ اس نے پیالہ منہ سے ہٹا کر الگ رکھ دیا اور اس کریہہ آواز کو غور سے سننے لگا۔

وہ شخص تیز گامی سے قریب آ گیا اور اس نے اس لہجے میں جس میں "ایک ہی راستہ" کا ولن شیخ مختار کسی سے مخاطب ہو، درشتی سے پوچھا "کون مردود ہے یہ؟"

پرویز کو ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے گلے پر طمانچہ مارا ہے۔ غصہ سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور جب تک وہ شخص اس کے سامنے آیا، وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو بغور دیکھا۔ سر سے پاؤں تک معائنہ کیا۔ اور اپنے اپنے پیمانے میں وہ ایک دوسرے کو تولنے لگے۔ اور اس فسانے کا مصنف اپنے تصور میں ان کو اس طرح آمنے سامنے دیکھنے لگا جیسے وہ الگ الگ انسان نہیں بلکہ ڈاکٹر جیکل اور مسٹر ہائڈ کی طرح ایک ہی کردار کی دو شخصیتیں ہیں۔ پرویز نے ایک نظر میں اس کے بشرے اور جسمانی حالت سے اندازہ لگا لیا کہ یہ شخص بدزبان اور کمینہ ہے۔ اسے ہر شے میں برائی اور ہر جذبے میں بدی نظر آتی ہے۔ یہ حسن اور نیکی سے محروم ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ شائستگی اور اخلاق کسے کہتے ہیں۔ اس کی عمر تیس پینتیس سال کے لگ بھگ تھی مگر اس کی صورت سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ اپنی صحت کھو چکا ہے۔ اس میں خون کی کمی ہے اور شاید آپ ہی آپ سلگنے کی عادت نے اس میں ضبط اور استقلال زائل کر کے اسے چڑچڑا اور بدتمیز بنا دیا ہے۔ یا پھر یہ مغرور ہے۔ سینے میں جھکاؤ اور ٹانگوں میں خم ہونے کے باوجود اس کے سر میں تکبر اور برتری کا سودا سمایا ہوا ہے۔

مسٹر ہائڈ نے نغمانہ کی طرف مڑ کر کہا "تو اس سے کیا باتیں کر رہی تھی؟......کون ہے یہ؟"

نغمانہ نے پرویز کو گھبرائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولی "یہ......یہ......"

پرویز اپنے آپ کو سنبھالے رہا اور اس نے بمشکل، نرم لہجے میں کہا "آپ کی گفتگو کا یہ انداز کیا ہے؟ کیا شرفا اسی طرح باتیں کرتے ہیں؟"

"تم اس بنگلے میں کس کی اجازت سے گھسے؟ تمہیں ایک غیر عورت سے دودھ لے کر پیتے ہوئے شرم نہیں آئی؟......اور مجھ سے پوچھتے ہو کہ گفتگو کا یہ انداز کیا ہے؟"

پرویز کے جواب دینے سے پہلے وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا اور احساس برتری نے اس کی آواز میں اور بھی بلندی پیدا کر دی" چلے جاؤ یہاں سے۔ میں لفنگوں سے ہمکلام نہیں ہوتا۔ تم شاید اس لئے آئے تھے کہ مجھ سے چیکو اور موسمیوں کا سودا کرو۔ جاؤ، مجھے کچھ منظور نہیں۔ میں آوارہ لوگوں سے تجارت کرنا بھی اپنی توہین سمجھتا ہوں"

پرویز آگ بگولا ہو گیا مگر اس کا شعور اسے بے قابو ہو جانے سے برابر روکے رہا کیونکہ...... کیونکہ اس سے چند ہی قدم کے فاصلے پر نغمانہ یوں کھڑی تھی جیسے وہ اس سے شرمسار اور مسٹر ہائنڈ سے خوفزدہ ہے۔ چنانچہ اس کی خاطر وہ اپنی زبان بند رکھنے پر مجبور تھا۔ آخر جاتے جاتے اس نے اسے رحم آلود نظروں سے دیکھا اور خاموشی سے وہ اس باغ والے سرخ مکان کے احاطے سے باہر نکل گیا۔

اندر سے ابھی آواز آ رہی تھی "یہ مجھے اس طرح گھور رہا تھا جیسے مجھے جان سے مار دے گا اور تجھ پر اس کی نگاہیں اس طرح پڑ رہی تھیں گویا وہ تیرا عاشق ہے۔ ادھر آ، بتا تو نے اسے اندر کیوں آنے دیا......؟"

☆......☆☆......☆

پرویز اپنے خیالات میں غلطاں و پیچاں آہستہ آہستہ چڑھائی کی طرف جا رہا تھا۔ جب وہ خیمے کے پاس پہنچا تو اس نے باغ والے سرخ مکان کو مڑ کر دیکھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ آسمان پر چاند نکل آیا اور پروردۂ ماہتاب پھول بصد ناز و انداز ہوا کے جھونکوں سے اٹھلانے لگے۔ خیمے کے بالائی جالی دار دریچے سے نکہت بیز چاندنی، دریا کے دھارے کی طرح اندر آ رہی تھی اور پرویز وائلن کے زیریں حصے پر اپنا رخسار لگائے اس کو بجانے میں محو تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں سفید نرم بالوں کا گز ماہرانہ انداز میں چل رہا تھا، اور بائیں ہاتھ کی انگلیاں وائلن کے چاروں تاروں پر اس قدر چابکدستی سے ناچ رہی تھیں گویا وہ موسیقی کی دیوی کو مشخص کر کے روئے زمین پر بلا لینا چاہتا ہے۔ اس ساز سے جو نغمے نکل رہے تھے ان میں سحر کا سا اثر تھا اور وہ اس میں اس قدر مدہوش تھا کہ اسے خبر بھی نہیں ہوئی کہ ایک لڑکی کب خیمے کے اندر آئی اور کب سے وہ اس کی موسیقی سے متاثر و متحیر ایک کونے میں ساکت کھڑی ہے۔ اچانک وائلن کا باریک تار، ایک مہین سی چیخ کے ساتھ ٹوٹ گیا۔ وہ خواب موسیقی سے چونکا، اور اس شعلہ رو کو خیمے میں دیکھ کر بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا "نغمانہ!"

نغمانہ نے چند لمحات اسے خمار آلود نگاہوں سے دیکھا۔ پھر جیسے جاگ کر، وہ اس کے قریب آ گئی اور عاجزی سے کہنے لگی" مجھے معاف کر دیجئے۔ میری وجہ سے صبح آپ کی بھی توہین ہوئی"

پرویز نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی پر اشتیاق نگاہیں نغمانہ کی سبز اور خوبصورت آنکھوں پر جم گئیں۔

اسے یوں خاموش دیکھ کر وہ پھر بولی" میں جانتی ہوں کہ توہین کا زخم کس قدر گہرا ہوتا ہے۔ اس لئے مجھے احساس ہے کہ دل میری کی سخت کلامی سے آپ کو کس قدر تکلیف ہوئی ہوگی......اور آپ کی یہ توہین میری وجہ سے ہوئی، میں آپ سے اسی کی معافی مانگنے آئی ہوں"

پرویز نے اس کا ہاتھ آہستہ سے پکڑ کر، اسے اسٹریچر پر بٹھا دیا اور خود فرش پر بیٹھا رہا۔ نغمانہ کی نظروں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ پرویز کا جواب سننے کی منتظر ہے۔ وہ جاننا چاہتی ہے کہ آیا وہ درگزر کر سکتا ہے یا نہیں۔ اسے اس قدر حساس اور منتظر دیکھ کر پرویز نے آہستگی سے کہا" مجھے واقعی صبح اذیت ہوئی"۔

"آپ سیاح ہیں" نغمانہ نے یہ اس طور سے کہا جیسے وہ اسے سمجھا رہی ہو۔

"چند روز بعد آپ تو یہاں سے چلے جائیں گے۔ لیکن میرے دل میں ہمیشہ یہ خلش رہے گی کہ میری وجہ سے آپ کی توہین ہوئی۔ یقین مانیے مجھے اس کا بے حد رنج ہے۔ اسی لئے شام کو جب وہ اپنی کشتی میں کہیں چلا گیا تو میں آپ کے پاس معذرت کرنے چلی آئی۔ آپ اس کا کچھ خیال نہ کیجئے۔ وہ تو اپنی عادت سے مجبور ہے"

پرویز اسے یوں گویا دیکھ کر بے قرار ہو گیا اور اس کے

دل میں یہ خیال اچھی طرح بس گیا کہ اس معصوم چڑیا کو کسی صیاد نے قفس میں بند کر رکھا ہے۔ اسے پر پھڑ پھڑانے کی بھی اجازت نہیں، اور یکا یک اس نے سوال کیا "مجھے بتا دیجئے کہ وہ شخص کون ہے..... کیا وہ آپ کا شوہر ہے؟"

نغمانہ نے گردن جھکا لی اور آہستگی سے بولی "میری اس سے ابھی تک شادی نہیں ہوئی...... مگر وہ کہتا ہے کہ بچپن میں اس سے میری منگنی ہو چکی ہے"

پرویز تھوڑا سا آگے سرک آیا "لیکن وہ گھر تو شاید اسی کا ہے۔ آپ اپنے والدین کے ساتھ نہیں رہتیں؟"

نغمانہ کی آواز میں اداسی جھلک آئی اور وہ اس طرح باتیں کرنے لگی گویا آج عمر میں پہلی بار کسی نے اس سے دلی ہمدردی ظاہر کی ہے اور وہ اس کو سب کچھ بتا دینے میں بالکل نہیں جھجکی۔ اس نے کہا "میرے ماں باپ کا انتقال ہو گیا ہے۔ باپ کی شکل میں نے نہیں دیکھی اور ماں اس وقت اللہ کو پیاری ہوئی جب میں سات آٹھ سال کی تھی۔ یہ باغ والا سرخ مکان ہمارا ہی ہے لیکن میری ماں کے مرنے کے بعد دل میر کے باپ نے اس پر اور ہمارے کھیتوں پر قبضہ کر لیا۔ میری ماں کے پاس جواہرات کے بڑے خوبصورت زیور تھے، وہ بھی اس نے لے لئے۔ مگر وہ مجھے بے حد چاہتا تھا۔ اپنی بیٹی کی طرح اس نے میری پرورش کی اور جب تک وہ زندہ رہا مجھے کوئی دکھ نہیں پہنچا۔ ابھی چند مہینے ہوئے کالی پہاڑی پر سے گر کر وہ مر گیا اور اس وقت سے اس کا بیٹا دل میر مجھے دق کیا کرتا ہے۔ اس کے لچھن اچھے نہیں ہیں۔ تجارت کے لئے وہ آئے دن جزیروں میں جایا کرتا ہے۔ مگر لوگ کہتے ہیں وہاں یہ آوارگی کرتا ہے"

پرویز نے نیم وا آنکھوں سے خیمے کے باہر دیکھتے ہوئے نہایت رسان سے پوچھا "تو آپ اس سے شادی کریں گی؟"

نغمانہ نے ٹھنڈا سانس بھرا اور اس لہجے میں جس سے مجبوری ظاہر ہوتی تھی، جواب دیا "شاید اور کوئی چارہ بھی نہیں۔ لیکن مجھے اس سے نفرت ہے، جب تک اس کا باپ زندہ تھا اس میں پھر بھی کبھی کبھی آدمیت آ جاتی تھی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ کبھی کبھی کشتی کی سیر کرانے لے جاتا تھا۔ اس نے مجھے ناؤ کھینچنی بھی سکھائی۔

پرویز بولا "صبح وہ آپ کے ساتھ جس بدتمیزی سے پیش آیا اسے تو کسی کی محبت برداشت نہیں کر سکتی"

نغمانہ غمناک آواز میں کہنے لگی "اس کی انہی باتوں سے تو مجھے اس سے نفرت ہو گئی ہے۔ وہ مجھے اپنی زرخرید لونڈی تصور کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میری تمام جائیداد اپنے قبضے میں کر کے اس نے مجھے بالکل محتاج کر دیا ہے۔ مجھے سر چھپانے کا بھی کہیں آسرا نہیں۔ ایک دن وہ اُرن سے واپس آیا تو نشے میں تھا۔ اس نے مجھے کھینچ کر زبردستی اپنے سینے سے لگا لیا اور میں نے اس کی نظروں سے ڈر کر جب مدافعت کی تو اس نے میرے بازو کو پیار کیا اور جوش میں اپنے دانت اس میں پیوست کر دیئے۔ اس وقت سے میں اس سے ہمیشہ بچنے کی کوشش کرتی ہوں جس کی مجھے طرح طرح کی سزا دی جاتی ہے۔ کبھی وہ مجھے سخت سست کہتا ہے۔ کبھی خواہ مخواہ گالیاں دیتا ہے۔ کبھی کھانے پینے کی بھی پابندی عائد کر دیتا ہے"۔

پرویز نے نغمانہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور ہولے ہولے اسے اپنا فسانہ حیات سنانے لگا۔ رعنا کی محبت اور جدائی کا ذکر کرتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔ پھر اس نے اسے خوش کرنے کے لئے ان جزیروں اور وادیوں کا حال، جن کی اس نے پچھلے دنوں سیاحت کی تھی، اسے ایسے دلکش پیرائے میں سنایا جیسے واشنگٹن، رونگ، الحمرا کے دلفریب افسانے بیان کر رہا ہو یا وارک ڈیپنگ حسن و رومان کی کوئی محیر کن داستان سنائے۔

نغمانہ اس کی باتیں نہایت غور سے سنتی رہی اور اس کے تخیل پر رعنا کا ان دیکھا سراپا چھا گیا۔ اچانک پرویز بولا "آپ رعنا کی ہم شکل ہیں اور مجھے آپ میں ان کی بہت سی خوبیاں نظر آتی ہیں"

...... یکا یک کشتی میں ملاح نے اپنی پرزور آواز میں لہک لہک کر گانا شروع کر دیا، اور نغمانہ چونک کر کھڑی ہو گئی "اب میں جاتی ہوں" اور خیمے میں سے نکلتے ہوئے وہ بولی "میں بیان نہیں کر سکتی کہ آپ سے مل کر مجھے کس قدر مسرت ہوئی ہے، اس کے علاوہ آپ نے مجھے ایک اور چیز عطا کی ہے، اور وہ ہے عزم! میں اب زندگی کی آندھیوں سے بچ نکلنے کی سعی کروں گی۔ رنج و غم بگولے کے ذروں کی طرح میرے لئے حقیر ہو جائیں گے"۔

پرویز اسے دور تک پہنچانے گیا۔ راستے میں اس نے پوچھا "دل میر کب واپس آئے گا؟"

نغمانہ نے جواب دیا "کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ عام طور پر آٹھ دس روز تو لگ جاتے ہیں...... اچھا، اب آپ بہت دور آ گئے ہیں۔ میں یہاں سے اکیلی جاؤں گی خداحافظ"۔

پرویز اسے الوداع کہنے سے پہلے پھر بولا "آپ نے میرے پاس آنے کی تکلیف اٹھائی ہے اس کا شکر گزار ہوں، اور...... میری جسارت کو معاف کیجئے۔ میں آپ کے پاس کل صبح آؤں گا۔ آپ ملیں گی؟"

نغمانہ ایکا ایکی خاموش ہو گئی اور کچھ سوچ کر بولی "انکار کرنے کو میرا دل نہیں چاہتا، لیکن آپ وہاں نہ آیئے میں خود ہی آپ کے پاس آؤں گی"۔

☆......☆☆......☆

علی الصبح وہ بیدار ہو گیا۔ تمام وادی میں جیسے کسی نے جلوے اور سائے، تنویر اور ظلمات، روشنی اور تاریکی کو آپس میں حل کر کے بکھیر دیا تھا۔ اور اس سمت میں، جہاں اگلے وقتوں کی ایک ٹوٹی پھوٹی خانقاہ تھی۔ خانقاہ کی شکستہ دیواروں اور بوسیدہ محرابوں کو دیکھ کر اس کے بحر تخیل میں گرداب پڑنے لگے اور وہ سوچنے لگا، یہاں کیسے کیسے بوریا نشین زہد و عبادت میں مصروف رہے ہوں گے۔ انہوں نے دنیا اور اس کی رنگینیوں سے منہ موڑ لیا ہوگا۔ تمام آرام و آسائش کو تج دیا ہوگا۔ ہاتھ کے تکیے اور خاک کے بستر میں مگن رہتے ہوں گے۔ انہیں کسی بات کا رنج نہ ہوگا۔ کسی چیز کا غم نہ ہوگا۔ بس ان کے دل میں ایک ہی لگن ہوگی کہ اپنے مالک سے لو لگائے رہیں اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ساری عمر پرہیز گاری میں گزار دیں۔

پرویز سیر سے واپس آیا تو نغمانہ اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ ان دونوں کے لبوں پر ایک دوسرے کو دیکھ کر تبسم آ گیا۔ وہ تبسم جو سچی خوشی کا مظہر ہوتا ہے۔ تصنع اور دنیاداری کا عکاس نہیں۔ نغمانہ اس کے لئے چسٹ نٹ اور لال کیلے لائی تھی۔ پرویز نے اس تحفے کی بڑی قدر کی، خصوصاً چسٹ نٹ اور لال کیلے نہایت شوق سے کھائے۔ اس کے جانے سے پہلے اس نے اسٹو جلایا اور بڑی احتیاط اور جلدی سے اس کے لئے سبز چائے بنائی۔ نغمانہ نے اسے بیکولائٹ کی پیالی میں پیا اور اس کے مزے سے بے حد خوش ہوئی۔

پھر، وہ اس کے پاس روزانہ آنے لگی، صبح، دوپہر یا شام۔ ایک آدھ دفعہ رات کو بھی وہ اس کے پاس آئی اور اس نے دیکھا کہ پرویز ہمیشہ اس کا منتظر رہتا تھا۔ راستے میں کسی ٹیلے پر بیٹھ کر یا کسی درخت کا سہارا لئے اس کا انتظار کیا کرتا ہے۔ اور جب دیکھ لیتا ہے تو گویا اسے کوئی نعمت مل جاتی ہے۔ اس کے چہرے سے بشاشت ٹپکنے لگتی ہے اور وہ اس سے اس طرح ملتا ہے جیسے وہ اسے عرصہ دراز سے جانتا ہے۔ اسے اچھی طرح پہچانتا ہے۔ پھر ان دونوں میں گھنٹوں باتیں ہوتی رہتیں اور وہ دور دور تک سرگوشیاں کرتے ہوئے چلے جاتے۔

ایک روز صبح وہ خانقاہ والی ڈھلان کے دامن میں ساحل پر آ گئے۔ سمندر کی چمکیلی سطح پر موجیں ناچ رہی تھیں۔ نغمانہ نے ایک پتھر پر بیٹھ کر اپنے پاؤں پانی میں ڈال دیئے اور رنگ برنگی چکنی مچھلیاں، نازک ادا جل پریوں کی مانند کبھی اس کی خوبصورت ہلتی ہوئی پنڈلیوں سے ڈر کر بھاگ جاتیں اور کبھی ان کو ساکت دیکھ کر اور ان کو اپنے ہی جیسے دو ماہ پارے سمجھ کر ان سے آ لپٹتی تھیں۔ پرویز بہت دیر تک مچھلیوں کے اس خواب آور مشغلے اور نغمانہ کی سراپا جمال پنڈلیوں کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ ان پنڈلیوں کی نازک اور سفید جلد میں سے خون کی لالی اس طرح لہراتی ہے، جیسے مینائے بلوریں میں چھلکتی ہوئی شراب ناب۔

یکا یک نغمانہ بولی "آیئے تیریں"

پرویز کی طبیعت سمندر کے شور یلے پانی میں غسل کرنے کو اکثر چاہتی تھی مگر وہ تیرنا نہیں جانتا تھا۔ نغمانہ کو پانی میں اترتے ہوئے دیکھ کر اس نے فوراً کہا "مجھے تیرنا نہیں آتا...... آپ تیریئے"

نغمانہ واپس آ گئی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی "تو ہم یہیں کنارے پر رہیں گے، آیئے تو سہی، موجوں کے ہلکوروں میں بہت لطف آتا ہے"

نغمانہ کے اصرار سے وہ راضی ہو گیا۔ اس نے اپنی خاکی قمیض اتار دی اور نکر پہنے پہنے، اس کے سہارے سمندر میں اتر گیا۔ اسے اس پر اس قدر بھروسہ تھا کہ بے دھڑک اس جگہ تک پہنچ گیا جہاں گھٹنوں سے اوپر پانی تھا، اور جب

از راہ مذاق نغمانہ نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تو پرویز کو ایسا معلوم ہوا کہ پانی کے زور نے اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین سرکا دی ہے، اور وہ بے سہارا ہو کر گرنے لگا...... مگر نغمانہ نے ہنستے ہوئے اسے تھام لیا اور کہنے لگی "قدم جمائے رکھیے، یوں! آیئے ذرا اور آگے چلیں۔ وہاں موجوں کا خوب زور ہے"

پرویز کچھ ڈرتا، کچھ نغمانہ کی معیت میں ایک نیا کیف محسوس کرتا کمر کمر تک پانی میں چلا گیا۔ ایک بڑی اونچی موج آئی۔ پرویز خوفزدہ ہو گیا اور جب موج کا شامیانہ اس کے اوپر چھانے لگا تو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی مگر دفعتاً نغمانہ نے اس کی کمر میں حلقہ ڈال کر اسے تھوڑا سا اچھال دیا۔ موج اوپر سے گزر گئی اور اس اچھلنے میں اسے بے حد لطف آیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ تو یہ ہیں موجوں کے ہلکورے! ایک اور موج آئی اور پھر نغمانہ نے اس کی کمر تھام کر اشارہ کیا۔ اس دفعہ اس کی مدد سے کم اور اپنی قوت سے زیادہ وہ خود اچھلا۔ موجیں لگاتار آتی رہیں۔ نغمانہ ہر بار اسے سہارا دے دیتی اور وہ دونوں شوریدہ سر موجوں کی گود میں اچھلتے کودتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد پرویز کو تھکن سی محسوس ہونے لگی اور نغمانہ کا ہاتھ پکڑ کر کنارے کی طرف واپس آیا اور جب پانی گھٹنوں تک رہ گیا تو نغمانہ نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر اس پر پانی اچھالنا شروع کر دیا۔ وہ کبھی بچنے کی کوشش کرتا، کبھی خود پانی ہاتھوں میں لے کر اس پر پھینکنے لگتا، اور اس کش مکش میں وہ لڑکھڑا گیا۔ نغمانہ نے فوراً اسے سنبھالا اور اب کے اس کے ہاتھ اس طرح اس کے گرد حمائل ہوئے کہ پرویز اس کی آغوش میں آ گیا۔ اس کے گورے گورے بازو، اس کے اجلے بدن سے چمٹ گئے۔

نغمانہ اس سے علیحدہ ہو گئی اور جلدی جلدی اسے سہارا دے کر پانی سے باہر نکل آئی۔ پھر وہ دونوں سمندری ریت پر بیٹھ گئے اور نغمانہ اپنے بھیگے ہوئے بالوں کو درست کرنے لگی۔ نغمانہ رات کو آنے کا وعدہ کر کے صبح ساحل سے رخصت ہو گئی تھی۔

☆......☆☆......☆

پرویز اسی کے انتظار میں خیمے کے اندر بے چین بیٹھا ہوا تھا۔ وقت گزارنے کے لئے اس نے وائلن کا کیس کھولا اور چوکور لفافے میں سے ایک نیا باریک تار نکال کر اس کا ٹوٹا ہوا تار بدلا۔ پھر وہ گز کو بروزے پر ملنے لگا کہ اچانک نغمانہ اندر داخل ہوئی۔ اس کے گھنے دراز بال دو سیاہ چوٹیوں میں گندھے ہوئے اس کے شانوں پر مچل رہے تھے۔ اس کی صراحی دار گردن میں لٹکی ہوئی ایک ننھی سی الماس نما سیب ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے ماہتاب کے قریں ستارہ ثریا چمک رہا ہو۔ اور اس کا سرخ پوش جسم یاقوت تراشیدہ کی طرح دنیائے حسن و جمال کا انمول رتن معلوم ہوتا تھا۔

پرویز چند لمحات کچھ نہ بول سکا۔ چپ چاپ اسے تکتا رہا۔ کوئی پراسرار آواز کہہ رہی تھی "ہاں اے دل! اے دل! یہ بارگاہ حسن ہے۔ یہ آستان عصمت ہے۔ یہاں سجدہ عشق جائز ہے۔ یہاں نذر عقیدت روا ہے"۔

نغمانہ آگے بڑھتی آئی اور مسکراتے ہوئے کہنے لگی "آیئے باہر چلیں، وائلن بھی لے چلیے"۔

خیمے سے نکل کر اس نے بھولپن سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا اور وہ ایک گوشہ تنہائی کی طرف مڑ گئے۔ تھوڑی دور جا کر وہ ٹھہرے اور پرویز الائچی کے ایک شگوفہ بار درخت کا سہارا لے کر بولا "آپ میری ایک درخواست منظور کریں گی"

نغمانہ نے بیٹھتے ہوئے جواب دیا "نہایت خوشی سے...... فرمایئے!"

"وہ ناچ! جو آپ نے خانہ بدوش رقاصہ سے سیکھا تھا" جس کے بارے میں آپ نے بتایا تھا۔

نغمانہ کے لبوں پر ایک دلکش تبسم آ گیا اور وہ ذرا شرما کر بولی "پہلے آپ ہمیں وائلن پر کوئی گانا سنایئے" اور جب اس نے زیادہ ضد کی تو پرویز مجبور ہو گیا اور اس نے بغیر گز کے، وائلن کے تاروں کو دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے چھیڑنا شروع کیا۔ کچھ دیر میں فضاء مدھ بھری ہو گئی۔

نغمانہ اپنے خیالات میں غرق تھی اور پرویز کی موسیقی ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ لیکن جب اس نے پرویز کو آنکھوں ہی آنکھوں میں مصر دیکھا تو وہ راضی ہو گئی۔ پہلے اس نے دھیمی آواز میں گنگنا کر اسے لے بتائی اور جب پرویز چند ضربات کے بعد، خانہ بدوش ناچ کی

گت صفائی سے بجانے لگا تو نغمانہ ایک دم یوں کھڑی ہو گئی جیسے آسمان سے کوئی تارا ابھی ابھی ٹوٹا ہے اور ایک خواب ناک فرش پا کر مائل بہ رقص ہو۔ پھر ہولے ہولے اس نے باکمال رقاصہ کی طرح ناچنا شروع کیا اور نغمہ و نور کے اس پر کیف ماحول میں وہ ایک اٹھلاتے ہوئے پھول اور اڑتی ہوئی تیتری کی مانند فضاء میں لہریں پیدا کرنے لگی۔ وائلن کی چڑھتی اترتی گت پر وہ کبھی بید مجنوں کی طرح لچکتی، کبھی مرغ آب کی طرح ابھرتی، اور کبھی دھوپ چھاؤں کی طرح پھسل سی جاتی تھی۔

وہ بہت دیر تک رقص کرتی رہی اور پرویز اس کے سحر آگیں رقص میں محو، وائلن بجاتا رہا۔ آخرکار وہ تھک گئی اور مسکراتی ہوئی اس کے پاس آ بیٹھی۔ اس کی جبیں پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے نمودار ہو گئے تھے۔ پرویز نے اپنا چہرہ اس کے زانو پر رکھ دیا اور شکستہ سانسوں میں وہ مبہم الفاظ کہے جو بے ریائی، سچے پرستار سے کہلواتی ہے۔ نغمانہ نے اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کے رخساروں کو تھام کر اوپر اٹھایا اور اس کی آنکھوں میں وہ چمک پیدا ہو گئی جو صدق دل سے محبت کا اعتراف کرتی ہے، وفا کا پیمان باندھتی ہے اور جو شعلہ دائم کی طرح زندگی بھر قائم رہتی ہے۔ پرویز کو متمنی دیکھ کر اس نے اس کا سر اپنی آغوش میں لے لیا، جیسے کوئی ہنس رانی، اپنے مدتوں سے بچھڑے ہوئے، زخمی محبوب کو سمیٹ کر اپنے پروں میں لے لے اور زبان بے زبانی سے کہتی رہے ''تم فکر نہ کرو۔ تمہارے جو زخم لگا ہے، وہ میری آغوش میں جلد مندمل ہو جائے گا۔ اور جب تک میں جیتی ہوں تمہیں اس کی زیادہ تکلیف نہ ہونے دوں گی''۔

نغمانہ زیر لب کہنے لگی ''میں شروع ہی سے تم سے متاثر ہوں۔ میں ابتدائی ملاقاتوں ہی میں سمجھ گئی تھی کہ تم بڑے اچھے آدمی ہو۔ تمہاری پرخلوص باتوں اور ہمدردی سے میں نے یہی جانا کہ گویا ہم تم پرانے واقف کار ہیں۔ جیسے تم مجھے نغمہ حیات سناتے آئے ہو۔ اور تمہاری بدولت میں نے زندگی کی وہ سرخوشی حاصل کی ہے۔ جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی''۔

پرویز نے اس کے دست گلابی پر اپنے لب رکھ دیئے اور نیچی نظر کیے ہوئے بولا ''یہ میری بڑی خوش قسمتی ہے۔ لیکن اتنا مجھے بھی کہنے دو کہ تمہیں دیکھ کر میں نے زندگی کا خواب دوبارہ دیکھا ہے۔ تم سے مل کر مجھے کھوئی ہوئی مسرت از سر نو نصیب ہوئی ہے..... مگر اس کا انجام؟ انجام کیا ہو گا نغمانہ؟'' یہ کہہ کر اس نے نغمانہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

وہ اسے کوئی جواب دینا چاہتی تھی کہ دفعتاً جنوب سے ہوا چلنے لگی اور اس کے ساتھ ساتھ بہت دور سے وائلن کے بجانے کی صدا سنائی دی۔

نغمانہ کے پراشتیاق بشرے کا رنگ بدل گیا اور وہ جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ ''دل میر آ گیا۔ یہ وہی وائلن بجا رہا ہے..... میں پھر آؤں گی'' اور اس کی گھبراہٹ دیکھ کر پرویز جیسے سینہ سپر ہو گیا۔ ''تم نہ ڈرو۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا''

''نہیں، نہیں'' نغمانہ اسے سمجھاتے ہوئے کہنے لگی ''تم میرے ساتھ نہ چلو۔ وہ بڑا ظالم ہے۔ تمہیں دیکھ کر وہ آپے سے باہر ہو جائے گا''

''لیکن میں تم پر اب اس کا ظلم برداشت نہیں کر سکتا۔ تم مجھے اپنے ساتھ چلنے دو.....''

''نہیں پرویز! نہیں'' وہ التجا کرتے ہوئے بولی ''تم ضد نہ کرو۔ میں خود تمہارے پاس جلد سے جلد آؤں گی''

......اور جب وہ خوفزدہ ہرنی کی طرح طرارے بھرتی ہوئی خمدار رہگوار میں نظروں سے اوجھل ہو گئی تو پرویز کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ ''اب کیا ہو گا؟ اب کیا ہو گا؟''

نغمانہ کو دیکھ کر دل میر نے وائلن بجانا بند کر دیا اور نرمی سے بولا ''تم مجھ سے بچتی ہو؟ شاید اب کے تم مجھ سے زیادہ ناراض ہو گئیں۔ اس قدر خفگی سے فائدہ؟''

وہ سمجھتی تھی کہ دل میر مغلوب الغضب ہو گا اور اسے دیکھ کر بے قابو ہو جائے گا غالباً اسے گھر میں نہ پا کر وہ جھنجلا گیا ہو گا اور اس پر اپنا غصہ اتارے گا لیکن اسے یوں نرمی سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر اسے بڑی حیرت ہوئی۔

دل میر پھر بولا ''میں نے تمہیں ہر جگہ تلاش کیا لیکن تم نہیں ملیں تو میں سمجھ گیا کہ اپنی خفگی کا اظہار کرنے کے لئے تم کہیں چھپ گئی ہو۔ چنانچہ میں وائلن بجانے لگا کہ اسے سن کر تم جہاں بھی ہو گی فوراً چلی آؤ گی''

نغمانہ اس کے کہنے سے اس کے پاس بیٹھ گئی اور دل

میر عاجزانہ لہجے میں کہنے لگا ''میں نے تم پر پچھلے دنوں بڑی سختیاں کی ہیں۔ مجھے اس کا بڑا افسوس ہے۔ مجھے معاف کر دو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ تم سے کبھی بری طرح پیش نہیں آؤں گا''

وہ اسے اس طرح بدلا ہوا دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ زبان سے کچھ نہیں بولی، مگر اس کی نظروں سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے دل میر کی بدسلوکی کا نہایت گہرا اثر لیا ہے اور جب اس نے اس کی ٹھوڑی آہستہ سے اوپر اٹھائی تو دیکھا کہ نغمانہ کی آنکھیں پرنم ہو گئی ہیں۔ دل میر نے پھر اسی لجاجت سے کہا ''نغمانہ! گئی گزری باتوں کو بھول جاؤ۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ مجھے اپنے طرز عمل پر ندامت ہے...... بتاؤ تم نے مجھے معاف کر دیا''

اس کی اس قدر منت سماجت سے اس نیک دل نے اسے معاف کر دیا۔ تو دل میر اس شمع رو کے حسن و جمال اور اس کے لباس کے پھبن کو مسرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا ''خوب! خوب! اس لباس میں تو تم غضب کی حسین معلوم ہوتی ہو'' پھر وہ رازداری کے لہجے میں بولا ''نغمانہ! ایک خوشخبری سناتا ہوں۔ تمہیں میری جان کی قسم، ذرا مسکرا کر سنو۔ حبشیاں کے بہترین جوہری کو میں نے سات سچے سرخ موتی دیئے ہیں کہ وہ اس ہفتے کے اندر اندر تمہارے لئے ایک خوبصورت ہار تیار کر دے...... میں اب زیادہ عرصہ تک تم سے علیحدہ نہیں رہ سکتا۔ بس اگلے ہفتے ہم دونوں شادی کر لیں گے۔ اور اس ہار کو جب تم دلہن بن کر پہنو گی تو تمہارے بے مثل حسن میں اور بھی اضافہ ہو جائے گا......''

نغمانہ کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے اسے آسمان اور زمین کے درمیان معلق کر دیا ہے۔ شادی کی کنٹھی (ہار) اس کے تصور میں آویزاں ہو گئی اور اس کے سرخ موتی خوفناک اژدھوں کی سرخ سرخ خونی آنکھوں کی طرح اس کی نظروں کے سامنے چمکنے لگے۔

''کیا کہا تم نے؟...... شادی'' نغمانہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور دل میر یہ سمجھتا ہوا کہ اس نے بیاہ کا ناقابل یقین مژدہ سنا کر اسے فرط حیرت میں مبتلا کر دیا ہے، اندر سونے چلا گیا۔

دل میر دن بھر کام کاج میں مصروف رہا۔ البتہ جب اس نے کئی بار نغمانہ کو بلایا اور وہ نہیں آئی تو اس نے بے حد برا مانا۔ شام ہوتے ہی یکایک دل میر کا دماغی توازن جاتا رہا، اور اس نے غضبناک آواز میں کہا ''مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ بدمعاش ابھی تک یہیں ہے۔ اور وہ نمک حرام نغمانہ......''

نغمانہ کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ، جو کئی بار اس کی محبت بھری پکار سن کر بھی اسے دیکھنے کی روادار نہیں ہوئی، فوراً برآمدے والی کھڑکی کے پاس آ گئی۔ وہیں سے اس نے جھانک کر دیکھا کہ دل میر کے سامنے دو ماہی گیر کھڑے ہیں، جنہیں اس نے کل صبح پرویز کے ساتھ ساحل سمندر پر جاتے ہوئے اپنی طرف متوجہ دیکھا تھا۔ اس پر سناٹا چھا گیا اور جیسے اسے بجلی کے کرنٹ نے جھٹکا دیا ہو، وہ پیچھے ہٹ گئی۔

دل میر کا اشتعال بڑھتا چلا گیا...... ''کارخانس! تم ابھی اس ملعون کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ اگر وہ اپنی خیریت چاہتا ہے تو اسی وقت یہاں سے چلا جائے، ورنہ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر وہ اب ایک منٹ بھی یہاں رہا تو اسے جان سے مار ڈالوں گا...... کیا وہ یہاں اس لئے آیا ہے کہ نغمانہ کو مجھ سے جدا کر لے......''

اس کی آواز گلوگیر ہو گئی ''کارخانس! میری طرف دیکھو! کیا میں بہت برا ہوں؟ کیا مجھے دیکھ کر گھن آتی ہے؟ کیا میں نے کسی کا کچھ بگاڑا ہے؟ پھر وہ مجھ سے الجھنے کیوں آیا ہے؟ اس نے کیوں مجھے تباہ کرنے کی ٹھانی ہے؟ کارخانس! جلدی جاؤ اور جس طرح بھی ہو سکے اسے یہاں سے بھیج دو''

کارخانس اور دوسرے ماہی گیر کے جانے کے بعد دل میر وہاں اکیلا رہ گیا۔ وہ بہت دیر تک برآمدے کے باہر صحن میں آ کر ٹہلتا رہا اور کوشش کرتا رہا کہ اس کا غصہ فرو ہو جائے تاکہ وہ جا کر نغمانہ سے اس بارے میں گفتگو کرے۔ آخر وہ مضطربانہ، نغمانہ کے کمرے تک آ گیا اور دروازے پر دستک دے کر اس کو بار بار پکارا۔ وہ اندر بت بنی ہوئی بیٹھی تھی۔ دل میر کی آوازوں سے اور بھی پریشان ہو گئی۔

دل میر نے وہیں کھڑے کھڑے کہا ''مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ تم اس شخص کے ساتھ، جسے میں نے اس

دن تمہیں دودھ پیش کرتے ہوئے دیکھا تھا، میری عدم موجودگی میں دن رات مزے اڑاتی پھر رہی ہو...... میں نہیں جانتا تھا کہ وہ آوارہ غیر ملکی ہماری وادی کی بھولی اور کنواری لڑکیوں کو اپنے دام فریب میں گرفتار کرنے آیا ہے۔ میں تو یہی سمجھتا تھا کہ وہ تجارت کرنے آیا ہے اور میرے انکار پر واپس چلا گیا ہوگا لیکن میں نے آج اس کے سب کرتوت سن لئے۔ اس کی جسارت کی ذمہ دار تم ہی ہو...... مگر میں اب بھی تمہیں معاف کرسکتا ہوں بشرطیکہ تم اپنے جرموں کا اقرار کرلو“

اندر سے کوئی جواب نہیں آیا تو وہ پیچ و تاب کھانے لگا ”بولتی کیوں نہیں؟ کیا تمہیں سانپ سونگھ گیا ہے؟“ اور جب وہ اس پر بھی نہیں بولی تو اسے ضبط کا یارا نہیں رہا۔ پھر بھی اس نے ایک اور آخری کوشش کی لیکن اس کی آواز میں جھنجلاہٹ اور طیش پیدا ہو چکا تھا۔ ”میں تم سے آخری بار سوال کرتا ہوں۔ اگر تم نے اس کا بھی جواب نہ دیا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا، بتاؤ تم مجھ سے شادی کروگی؟“

اور نغمانہ نے ہمت کر کے جواب دیا ”نہیں......“

جیسے کسی نے اس کے سر پر ہتھوڑا مارا ہو، دل میر آپے سے باہر ہوگیا ”ہوں...... اچھا میں تجھے سمجھوں گا۔ کمینی ہے نا آخر......؟“ اور یکا یک کارخانس کے بیرونی دروازہ کھولنے سے اس کی توجہ اس طرف مبذول ہوگئی۔

وہ جلدی سے باہر آ گیا۔ کارخانس نے اسے بتایا کہ وہ اجنبی کہیں گیا ہوا ہے۔ اور خیمے میں صرف اس کا ملاح اکیلا بیٹھا ہے۔ کچھ سوچ کر دل میر اپنی بھاری اور بلند آواز میں بولا ”تم یہیں دروازے پر بیٹھے رہو اور جب تک میں نہ آؤں یہاں سے نہ ہلنا۔ نغمانہ یہاں سے کہیں جانے نہ پائے۔ میں تھوڑی دیر میں واپس آتا ہوں“

اس کے دروازے سے نکلتے ہی نغمانہ نے ڈر کر اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔ اگرچہ اسے یقین تھا کہ دل میر بزدل ہے اور وہ پرویز پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا مگر اس کی رقابت اور حاسدانہ خصلت سے اسے اندیشہ ہوگیا کہ کہیں کسی اور ترکیب سے وہ......! اور پرویز کا خوبصورت چہرہ، زخمی اور بھیانک ہو کر اس کے تصور میں آ گیا۔ وہ کانپ اٹھی اور بھاگ کر پیچھے کے دروازے سے نکل آئی اور...... پائیں باغ میں اس نے دیکھا کہ اس کا محبوب دیوار پر چڑھ رہا ہے۔

اس کا سانس جیسے ایک سیکنڈ کے لئے رک گیا۔ پھر جب اس میں آمد ورفت شروع ہوئی تو جوار بھاٹے کی طرح اس کے سفید پوش سینے میں بڑی تیزی سے زیر و بم ہونے لگا اور بے اختیار دبی آواز میں اس کے منہ سے نکلا ”پرویز!“

پرویز خاموشی سے کود کر اندر آ گیا اور جب وہ دونوں چاندنی کی روشنی سے بچنے کے لئے ایک اونچے بار آور درخت کی آڑ میں آ گئے تو اس نے سرگوشی کے لہجے میں کہا ”خدا بہتر جانتا ہے، میں نے کل کی رات اور آج کا دن کس حال میں گزارا۔ میں اگرچہ وہاں تھا مگر میرا دل یہیں پڑا رہا اور اس وقت مجھ سے نہ رہا گیا تو میں تمہیں دیکھنے چلا آیا...... بتاؤ تم پر کیا گزری؟“

نغمانہ نے آہستہ آہستہ کہا ”پرویز! میری ایک درخواست ہے، نہیں التجا ہے۔ میں تم سے یہ منت کرتی ہوں کہ جس قدر جلد ہو سکے تم یہاں سے چلے جاؤ“ اور اس نے یہ درخواست جس قدر رُک رُک کر کی تھی اس سے اس کا دلی رنج ظاہر ہوتا تھا۔

پرویز خاموشی سے سنتا رہا اور جب وہ ختم کر چکی تو اس نے پوچھا ”لیکن کیوں؟ کیا میرے چلے جانے سے تمہیں مسرت ہوگی؟“

نغمانہ ساکت و جامد اسے دیکھتی رہی اور جیسے کوئی مستحکم لہجے میں کہے، اس نے جواب دیا ”ہاں“

”نہیں، مجھے یقین نہیں آتا“ پرویز اس کی سبز آنکھوں میں حقیقت کو پہچانتا ہوا بولا ”تم یہ ہاں دل سے نہیں کہہ رہیں بلکہ تم مجھ سے کوئی بات چھپا رہی ہو۔ دل میر نے ضرور تمہارے ساتھ زبان درازی کی ہوگی اور اسی کا تم پر اثر ہے۔ غالباً اس کو سب کچھ معلوم ہوگیا ہے اور اس کی دھمکیوں سے تم ڈر گئی ہو“

”پرویز! میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں، میرا کہا مانو، اور میری خاطر اس وادی سے فوراً چلے جاؤ“ اور اس کی جدائی کے خیال سے نغمانہ کی آنکھوں میں آنسو جھلک آئے ”تمہاری جان یہاں خطرے میں ہے۔ تم دل میر کو نہیں جانتے، وہ اپنی غرض کے لئے بری سے بری حرکت کرگزرے گا“

''تم میری فکر نہ کرو'' اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دوسرے ہاتھ سے اس طرح تھپکا جیسے وہ اسے یقین دلا رہا ہو کہ میں تمہاری حفاظت کروں گا۔ میں تمہیں پناہ دوں گا۔ ''میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہیں کسی طرح اس ظالم اور اُجڈ کے چنگل سے نکال لوں۔ تم مجھ پر اعتماد کرو اور میرے ساتھ......''

''پرویز!'' اس نے آہستگی سے کہا ''وقت گزرا جا رہا ہے۔ خدا کے واسطے تم چلے جاؤ اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ دنیا میں عورت تو ہمیشہ محروم و محزوں ہی رہتی ہے۔ لیکن میری خاطر تم اپنی جان بچاؤ۔ میں اب تم سے اور کچھ نہیں سنوں گی۔ وعدہ کرو کہ ابھی ابھی یہاں سے روانہ ہو جاؤ گے۔ ہاں میں تم سے اتنا عہد کرتی ہوں کہ جب تک میری زندگی باقی ہے، میں ہمیشہ تمہیں یاد رکھوں گی۔ بس پرویز! بس، اب اور کچھ نہ کہو۔ وقت نہیں ہے۔ اس دروازے پر پہرا لگا ہوا ہے اور دل میر تمہاری ہی تلاش میں گیا ہے..... وہ دیکھو، اس کی آواز آئی۔ اب میں رخصت ہوتی ہوں۔ الوداع! پرویز الوداع! اللہ تمہیں صحیح سلامت واپس لے جائے'' اور وہ اپنے آنسوؤں کو چھپاتی ہوئی مڑ گئی۔ جاتے جاتے پرویز نے اس کے سفید لباس کو جوش محبت میں بوسہ دیا اور جب وہ بہ حسرت و یاس اور بہ چشم گریاں وہاں سے چلی گئی تو خاموشی سے اس نے دیوار پھلانگی اور اپنے دل میں ہزاروں ویرانیاں لئے ہوئے وہاں سے چلا آیا۔

اس کے دماغ میں کش مکش جاری تھی اور مختلف قسم کے خیالات گردش کر رہے تھے۔ آخر خیمے تک پہنچ کر اس نے فیصلہ کر لیا کہ میں ہرگز یہاں سے نہیں جاؤں گا اور نغمانہ کو عذاب سے بچانے کے لئے ہر ممکن کوشش بروئے کار لاؤں گا۔

☆......☆☆......☆

دل میر جھینک کر اپنے خاص کمرے میں چلا گیا جہاں اس کا روپیہ اور قیمتی اشیاء محفوظ رہتی تھیں۔ تھوڑی دیر میں وہ وہاں سے نکل آیا اور باہر آ کر صدر دروازے کے پاس مضطربانہ ٹہلنے لگا۔ گھڑی گھڑی وہ پھاٹک سے اُچک کر ادھر ادھر دیکھ لیتا تھا، جیسے وہ کسی کا سخت بے چینی سے انتظار کر رہا ہو۔ جب رات کافی ہو چکی تو اس نے اپنے مکان کو آنے والی راہگوار پر کسی کے محتاط قدموں کی چاپ سنی اور نہایت سرعت سے وہ پھاٹک کے باہر چلا گیا۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد وہ واپس آیا۔ چاندنی رات میں اس کے چہرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے کوئی بہت بڑی فتح پائی ہے۔ کسی کار عظیم میں اسے کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ اور وہ ہشاش بشاش اندر داخل ہوا۔

نغمانہ برآمدے والی کھڑکی سے لگی ہوئی اس کی تمام حرکات و سکنات دیکھ رہی تھی۔ اسے یوں خوش خوش گھر میں گھستے دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ اس نے کوئی گل کھلایا ہے۔ اس کے دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے دل میر نے طنزیہ قہقہہ لگایا، اور یہ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا ''اری سو رہی ہے؟ تیرا عاشق تو تجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ اب دیکھ تجھ کیسا سیدھا کرتا ہوں''

پرویز کے جانے کی خبر سن کر نغمانہ کو بیک وقت صدمہ بھی ہوا اور خوشی بھی۔ اچھا ہی ہوا کہ وہ یہاں سے چلا گیا ورنہ یہ وحشی اسے گزند پہنچائے بغیر نہ رہتا لیکن پھر اس خیال کے آتے ہی کہ وہ اس سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی ہے، اس پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔

رات اپنے سفر کی تین منزلیں طے کر چکی تو نغمانہ اپنے کمرے سے دبے پاؤں نکلی۔ اس نے دل میر کی خوابگاہ کے دروازے سے کان لگا دیئے۔ اندر سے خراٹوں کی آوازیں آ رہی تھیں اور وہ بے خبر و مطمئن سو رہا تھا۔ نغمانہ چوروں کی طرح باہر نکل آئی اور راہگوار پر گامزن ہو گئی۔ دن بھر کے کسل اور دو راتوں کی بے خوابی کا اثر اس کے تمام جسم پر تھا۔ مگر دل کی لگی بری ہوتی ہے۔ وہ برہنہ پا بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ اور کوئی اس کے کانوں میں لگاتار کہہ رہا تھا ''ہاں، اور تیز! اور تیز!''

بالآخر وہ منزل مقصود پر پہنچ گئی...... خیمہ اٹھ چکا تھا۔ کشتی جا چکی تھی۔ اور اب صرف گزری ہوئی دلچسپیوں اور مٹی ہوئی خلوتوں کی یادگاروں کی وہ غیر مرئی فضاء رہ گئی تھی جس میں ان دونوں نے بارہا محبت کے سہانے خواب دیکھے تھے۔ وہ وہیں صنوبر کے درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور سمندر کی موجوں کو چپ چاپ دیکھنے لگی جو اس کے محبوب کی کشتی کو دور، بہت دور، نہ جانے کہاں پہنچا کر لوٹی ہوں گی اور اس عالم تنہائی میں، اس کے دل و دماغ میں فراق محبوب کا احساس اپنی پوری شدت کے ساتھ اجاگر ہو

گیا اور اس کی آنکھوں سے...... ان آنکھوں سے جن کا والہ شیدا اب اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بے یار و مددگار چھوڑ کر چلا گیا تھا...... ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اس کے دل میں دفعتاً ایک ہوک سی اٹھی ''کاش! وہ مجھے اپنے ہمراہ لے جاتا! کاش، میں اس کے ساتھ چلی جاتی! میں کیا جانتی تھی کہ وہ میری رگ رگ میں سما گیا ہے اور میں اس کے بغیر ایک لمحہ بھی یہاں نہیں رہ سکتی''

ایک چھوٹی سی لہر تنکنائے میں سے ہوتی ہوئی ساحل سے آ ٹکرائی اور نغمانہ کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ کہہ رہی ہے ''اری دیوانی! اب کیا پچھتاتی ہے؟ تو نے ایک بھٹکے ہوئے پکھیرو کو نشیمن کی امید دلا کر پھر نا امید کر دیا۔ یہ برا کیا'' اور اس کے دل نے بے اختیار چاہا کہ اس سطح سمندر کا سینہ چیر کر، جس پر سے پرویز مایوس و ملول، بار بار ادھر دیکھتا ہوا گزرا ہوگا، ایک پرسوز شرارہ نکلے اور صورت آتش اسے جلا کر خاکستر کر دے۔ اسے اپنی کم ہمتی اور اس بات پر بے حد غصہ آیا کہ دل میر کے خوف سے اس نے پرویز کی بات پوری نہ ہونے دی، اور اس کی عقل نے کہا ''اب اس پشیمانی سے کیا فائدہ؟ تم ہی نے تو مصر ہو کر اسے یہاں سے بھیج دیا ہے۔ پھر اس کے چلے جانے سے کیوں رنجیدہ ہو؟''

☆......☆☆......☆

آسمان پر تارے ماند ہو چلے تھے اور چاندنی بے نور ہونے لگی تھی۔ اس نے ایک ٹھنڈا سانس لیا جیسے آہ بھر کر اپنے غم واندوہ کو ہلکا کرنا چاہتی ہے، پھر وہ خالی الذہن ہو کر کھڑی ہو گئی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ میں اب کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟

اور جب وہ ایک شکست خوردہ کھلاڑی کی طرح مضمحل اور افسردہ، رہگوار پر آئی تو خانقاہ کی سمت سے ہوا کا جھونکا آیا اور اس کے ساتھ ساتھ...... اس نے کہیں دور پرویز کے کراہنے اور اپنا نام پکارنے کی آوازیں سنیں۔

...... جیسے کوئی یکا یک خواب سے چونک اٹھے، نغمانہ بیتاب ہو گئی اور انتہائی پھرتی سے خانقاہ کی جانب روانہ ہوئی۔ وہاں پہنچ کر اس نے ڈھلان کی طرف جھانکا تو یہ دیکھ کر دم بخود رہ گئی کہ پہاڑی کے دامن میں پرویز بے حس و حرکت پڑا ہوا ہے؟

☆......☆☆......☆

......اور میلوں پرے، پرویز کا ملاح خوش و خرم اپنی کشتی جلدی جلدی چلا رہا تھا۔ گاہے گاہے اس کی نظر اس مال و متاع پر پڑ جاتی تھی جسے وہ مال غنیمت کی طرح وادی نشیمن سے لوٹ کر لایا تھا۔ اس کے سامنے موٹے موٹے رسوں کے اوپر لپٹا لپٹایا خیمہ پڑا ہوا تھا اور دوسری طرف پرویز کا باقی ساز و سامان، جس میں روپوں سے بھرا ہوا اٹیچی کیس بھی شامل تھا۔ اسے دیکھ کر اس نے اپنی آنٹی پر ہاتھ پھیرا، جس میں دل میر کے دیئے ہوئے پچاس روپے بندھے ہوئے تھے۔ انہیں محسوس کر کے وہ ہنسنے لگا۔ دل ہی دل میں خوش ہونے لگا۔ اس کی ہنسی بلند آواز قہقہے میں تبدیل ہونے لگی، اور اس کے ساتھ ساتھ وہ تمام واقعات تصویروں کی مانند اس کی آنکھوں میں پھر گئے جن کے نتیجے کے طور پر وہ اس کشتی میں سوار، ایک دولت مند قزاق کی طرح، راتوں رات اس وادی سے یہاں تک میلوں مسافت طے کر کے آیا تھا......

☆......☆☆......☆

کارخانس نے جب آ کر بتایا کہ وہ اجنبی کہیں گیا ہوا ہے اور خیمے میں صرف اس کا ملاح اکیلا بیٹھا ہوا ہے تو معاً دل میر کے سازشی دماغ نے ایک ترکیب سوچی اور وہ کارخانس کو وہیں گھر پر پہریدار بنا کر خیمے کی طرف دوڑا چلا آیا۔ موقع پا کر اس نے ملاح کو اشارے سے بلایا اور تنہائی میں لے جا کر اس نے اس سے پرویز کی موت کا سودا کیا۔ ملاح سو روپے نقد اور اس شرط پر کہ پرویز کے کل ساز و سامان کا مالک میں ہوں گا، دل میر کی تجویز پر راضی ہو گیا۔ چنانچہ جب پرویز کو خیمے میں واپس آئے ہوئے کوئی گھنٹہ بھر ہو گیا ہوگا تو ملاح اس کے پاس بھاگا ہوا آیا اور ہانپتا ہوا بولا ''سیٹھ! میرے ساتھ جلدی چلو۔ خانقاہ والی ڈھلان پر وہ لڑکی آپ کو بلا رہی ہے......''

پرویز گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور فوراً اس کے ساتھ ہو لیا۔ خانقاہ کی ٹوٹی ہوئی فصیل کے پاس پہنچ کر اس نے کہا کہ ''وہ دیکھو، سیٹھ۔ وہ! جہاں ایک چھوٹی سی کشتی بندھی ہوئی ہے، وہیں وہ لڑکی آپ کا انتظار کر رہی ہے۔ ذرا آگے بڑھ کر دیکھو''

پرویز نے بے صبری سے آگے بڑھ کر جھانکا تو ملاح

نے پیچھے آ کر پوری طاقت سے اسے دھکا دے دیا۔ وہ ایک خوفناک چیخ کے ساتھ نیچے جا پڑا۔ چند لمحات بعد چاروں طرف بھیانک خاموشی چھا گئی جسے کبھی کبھی سمندر کی لہریں اپنی مخصوص صداؤں سے توڑ دیتی تھیں۔ ملاح پھر نہایت سرعت سے دل میر کے پاس آیا اور اس نے اسے اپنی کارگزاری نہایت مبالغے کے ساتھ سنائی کہ میں نے اسے سمندر میں ڈبو دیا ہے۔ دل میر نے اطمینان کا سانس لیا اور اسے طے شدہ رقم دے کر سختی سے ہدایت کی کہ فوراً خیمہ اٹھا کر یہاں سے چلے جاؤ۔ نیز انہوں نے آپس میں وعدہ کرلیا کہ وہ ہمیشہ اخفاء راز کریں گے۔ گویا وہ پرویز کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔

......اور اب وہ مالدار ملاح، اپنے تصورات میں مگن، کشتی کو تیز تیز چلا رہا تھا۔

☆......☆☆......☆

نغمانہ ہانپتی کانپتی ڈھلان پر سے بھاگتی آئی۔ بغیر دیکھے بھالے اور تیزی سے بھاگنے کے سبب اس کے پاؤں سے خون نکل رہا تھا، مگر وہ بے جگری سے بھاگتی رہی اور اس نے نیچے ساحل پر آ کر ہی دم لیا...... پرویز پتھروں کی رگڑ سے زخمی اور نڈھال ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے اور بدن پر چوٹوں کے نشان تھے اور بلندی سے گرنے کی وجہ سے وہ نیم بے ہوش تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر نغمانہ سکتے میں رہ گئی اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ کسی نے اس کے دل پر زور سے گھونسہ مارا ہے، جس کی وہ تاب نہیں لاسکتی۔ تھوڑی دیر بعد اس کے خیالات جب آہستہ آہستہ مجتمع ہو گئے تو دو زانو ہو کر اس نے جلدی سے پرویز کا لہولہان سر اپنی گود میں رکھ لیا اور اس کی آنکھیں آپ ہی آپ ڈبڈبا آئیں۔

پرویز درد و کرب سے کراہ رہا تھا۔ چوٹوں کی تکلیف نے اس کی جان پر بنادی تھی۔ اس کے منہ سے اپنا نام سن کر نغمانہ نے سرگوشی میں کہا ''پرویز! میں تمہارے پاس آ گئی ہوں''

یکا یک اس کا کراہنا بند ہو گیا جیسے اس کے زخموں پر کسی نے مرہم لگا دیا ہو اور اس جان لیوا تکلیف کو برداشت کی اس میں سہار پیدا ہو گئی ہو۔ اس کے چہرے کی سلوٹوں اور تیوری کے بلوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے جسمانی آلام انگیز نے کی کوشش کر رہا ہے اور نہیں چاہتا کہ اس کے منہ سے ذرا بھی اف نکلے۔ نغمانہ چپ چاپ اس کے چہرے سے رستا ہوا خون پونچھے جا رہی تھی لیکن خون برابر اس کے سر، ماتھے اور نتھنوں سے نکلا چلا آ رہا تھا۔

نغمانہ ڈر گئی۔ لیکن اس نے ضبط سے کام لیا اور حوصلہ افزا لہجے میں بولی ''پرویز! تم مجھے پکار رہے تھے۔ میں آ گئی ہوں، مگر یہ تمہیں کیا ہوا؟''

پرویز کو ہوش آیا تو وہ بچوں کی طرح رونے لگا اور اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا ''مجھے ملاح تمہارے نام سے دھوکہ دے کر بلا لایا تھا اور اس نے مجھے اوپر سے دھکا دیا ہے۔ اف تکلیف برداشت نہیں ہوتی...... نغمانہ! میں چلا''

''ایسا نہ کہو پرویز!'' وہ اس شمع پر نثار ہوتی ہوئی بولی ''تکلیف جلد رفع ہو جائے گی'' اور ملاح کی فریب دہی کا حال سن کر اسے دل میر کا رات کو مضطرب و منتظر ٹہلنا اور کسی کے دبے پاؤں آتے ہی اس کا احاطے سے باہر چلا جانا۔ پھر وہاں سے ظفر مند و مسرور آنا...... اسے یہ سب باتیں یاد آ گئیں اور وہ معاملے کی تہہ کو پہنچ گئی۔

پرویز نے ٹٹول کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا ...... ''ہائے میری آنکھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے شیشے کی کرچیاں ان میں بھر دی ہیں'' اور یہ کہہ کر اس نے آنکھیں کھولیں تو ان میں سے جیتا جیتا خون بہہ نکلا۔ ''یہ لال لال کیا ہے؟ مجھے اس سرخی کے علاوہ کچھ اور نظر نہیں آتا''

نغمانہ نے جلدی سے اس کی آنکھیں پونچھ دیں اور تسلی دیتے ہوئے کہنے لگی ''کچھ نہیں ہے، رونے سے تمہارے آنسو نکل آئے ہیں۔ آنکھیں بند کرلو ابھی آرام آ جائے گا''

اس نے آنکھیں بند کرلیں اور آہستہ آہستہ کہنے لگا ''نغمانہ! میں اب نہیں بچوں گا۔ میرا آخری وقت آ پہنچا ہے۔ تم میری قبر......''

نغمانہ نے بے اختیار اس کے لبوں پر اپنا رخسار رکھ کر اسے آگے کہنے سے روک دیا۔ صبح کاذب نمودار ہو گئی تھی اور کوئی دم میں اجالا پھیلنے والا تھا۔ اس نے چاروں طرف سہمی ہوئی نظریں دوڑائیں اور ساحل پر دل میر کی کشتی بندھی ہوئی دیکھ کر اس کے جزیرہ تخیل میں ایک شاہراہ بنتی چلی گئی۔

''پرویز!'' اس نے اسے محبت سے لبریز لہجے میں آواز دی ''تم ذرا ہمت کرلو۔ ایک دو قدم۔ وہ سامنے کشتی بندھی ہوئی ہے۔ اس میں......''

''اور...... میری ٹانگیں رہ گئی ہیں نغمانہ! میں چل نہیں سکتا۔ اور یہ کشتی کیا اسی ملاح کی ہے؟''

''نہیں...... یہ کشتی کسی اور کی ہے۔ تم اپنے دل کو مضبوط کرو تو اجالا ہونے سے پہلے ہی......''

''نہیں نغمانہ میری زندگی کا چراغ گل ہوا چاہتا ہے۔ مجھے اپنے سے جدا نہ کرو۔ میری تربت......''

''نہیں، نہیں پرویز'' وہ آنسو ضبط کرتے ہوئے بولی، میں تمہارے ساتھ چلوں گی''

''میرے ساتھ'' پرویز نے ایسے لہجے میں کہا جیسے اسے یہ سن کر بے انتہا خوشی ہوئی ہے مگر اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا ''کیا تم سچ مچ میرے ساتھ چلو گی؟''

''ہاں، ہاں، پرویز! تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ اٹھو، میں تمہیں سہارا دیتی ہوں''

پرویز میں سوائے سانس کی ہلکی جنبشوں کے کوئی حرکت نہ ہو سکی اور...... سپیدہ سحر دم بدم بڑھتا جا رہا تھا۔

پرویز نے شکستہ دل ہو کر کہا ''مجھ میں سکت نہیں ہے۔ شاید میں اب چند لمحوں کا مہمان ہوں''

نغمانہ نے ایکا ایکی اپنا ایک ہاتھ اس کی گردن اور دوسرا اس کی ٹانگوں میں ڈال کر اسے پوری طاقت سے اٹھا لیا...... اور صبح طلوع ہونے لگی۔

جب وہ آہستگی سے اسے کشتی میں لٹا چکی تو اس نے رسیاں کھول دیں، پھر اس نے ایک پاؤں کشتی کے اندر اور دوسرا ساحل کے قدیم پتھر پر لٹکا کر، چپو کی مدد سے پیچھے کی طرف زور لگایا۔ کشتی سرک گئی اور ہولے ہولے سطح آب پر رواں ہو گئی۔ پھر اس نے مستول پر لپٹے ہوئے بادبانوں کو کھولا اور جب ان میں ہوا بھر گئی تو پرویز کے سرہانے بیٹھ کر اس نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔

...... صبح ہو گئی اور نیر اعظم بادلوں کی زنجیروں کو جھٹک کر اس طرح نکل آیا جیسے کوئی محکوم ملک یک لخت غلامی کی بیڑیوں کو کاٹ کر آزاد ہو جائے۔

کشتی تیزی سے بہی چلی جا رہی تھی اور نغمانہ اپنے محبوب کے زخمی مکھڑے کو بار بار صاف کر رہی تھی۔ یکا یک پرویز کے جسد بیمار میں جنبش پیدا ہوئی اور اس نے نہایت نحیف آواز میں کہا ''نغمانہ!...... میری رعنا! میری رعنا! مجھے اپنی آغوش میں لے لو۔ مجھے اچھی طرح سنبھال لو۔ میرا دل گھبرا رہا ہے''

نغمانہ نے دیکھا کہ نیچے کا تختہ خون کے دھبوں سے سرخ ہو گیا ہے، اور اس کا چہرہ ست جانے کی وجہ سے بھیانک ہوتا جا رہا ہے۔ پھر یکبارگی کسی اندیشے سے وہ اس سے لپٹ کر رونے لگی''۔ میں اکیلی ہوں، بالکل اکیلی...... تم مجھے یوں چھوڑ کر نہ چلے جانا، پرویز! میں نے تم پر بھروسہ کیا ہے''

پرویز کے زرد چہرے پر سکون طلوع ہونے لگا گویا اس نے نغمانہ کی التجا سن لی ہے۔ سمجھ لی ہے اور وہ دردناک آواز میں رک رک کر، بصد مشکل بولا ''تم میرے ساتھ کہاں تک چلو گی؟ جانے مجھے کس دیس جانا ہے''

نغمانہ نے بغیر سمجھے، اس کے بالوں کو آہستہ آہستہ سہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے نہیں معلوم یہ کشتی ہمیں کہاں لے جائے گی! ہماری منزل نامعلوم ہے۔ ہماری سمت غیر معین ہے۔ میں یہ بھی نہیں جانتی کہ ہمارا سفر کہاں ختم ہوگا۔ ہمیں خشکی کب نظر آئے گی...... شاید شام تک، شاید کل تک۔ ہم یوں ہی چلتے رہیں۔ آگے بڑھتے رہیں۔ اس وادی سے دور جہاں ایک ظالم نے تمہیں''

یکا یک کشتی کا سفید بادبان، جو اب تک محبت کا حسین و جمیل پرچم بن کر ہوا میں اڑ رہا تھا، سرنگوں ہو گیا اور نغمانہ نے دیکھا کہ اس کا حبیب جو اس کی آغوش میں محو استراحت تھا اس کی سرگوشیوں کو حسرت و یاس کے ساتھ سنتا ہوا، اس سے غافل ہوئے جا رہا ہے۔

نغمانہ کلیجہ تھام کر رہ گئی اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے خود اس کا دل کسی نامعلوم اندھیرے میں ڈوبا جا رہا ہے۔



# ٹوٹی چوڑیاں

ریاض بٹ



**اس کی کسی سے دشمنی نہیں تھی وہ اپنا گھر بسانے اور نئی زندگی کی شروعات کرنے گاؤں آیا تھا کہ قتل ہوگیا۔**

**معروف انسپکٹر خالد کی ڈائری کا ایک ورق**

قارئین یہ نئے تھانے کی کہانی ہے' ذرا پہلے آپ کو تھانے کے محل وقوع سے آگاہ کردوں' اور ساتھ یہ بھی بتادوں کہ اس تھانے میں کون کون میرا معاون تھا۔ یہاں پر دو اے ایس آئی شہاب الدین اور جاوید خان' ہیڈ کانسٹیبل نذر محمد اور محمد اشرف...... کانسٹیبل شیراز' محمد اعظم' آفتاب اور شمروز خان سپاہیوں میں سکندر' قاسم' دلبر' ولایت خان' طوفان خان' اور قمر شامل تھے...... باقی سپاہیوں کے نام وقتاً فوقتاً آتے رہیں گے۔

تھانے کی حدود میں پانچ گاؤں' دو ڈھوکیں' شہر کا کچھ حصہ' جس میں دو اور آڑھت کی منڈی شامل تھی۔ علاوہ ازیں ہمارے تھانے کی حدود میں ریلوے اسٹیشن بھی تھا۔

جرائم کے متعلق ایک بات کہنا چاہوں گا...... کہ ایک وقت تھا جب کبوتر پیغام رسانی کا کام دیتے تھے' پھر ڈاکخانے بنے' اب تو بہت تیز رفتاری آگئی ہے' کسی بھی نیٹ ورک پر بیلنس ڈلوالیں' یا پیکج کروالیں' اور گھنٹوں باتیں کریں' لیکن جرائم اسی طرح ہورہے ہیں' نیکی اور بدی اسی طرح ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ اب جرائم میں جدت آگئی ہے۔

بہرحال یہ جس دور کی کہانی ہے اس دور میں ابھی موبائل کا نزول نہیں ہوا تھا۔ بعض واقعات تھانے تک نہیں پہنچتے' ان میں کچھ مصلحتیں ہوتی ہیں' رسوائی کا خوف ہوتا ہے لیکن پھر ایسے واقعات تھانے تک پہنچ ہی جاتے ہیں' ان کا سبب بعض اوقات ایسے ہی واقعات ہوتے ہیں جن کا ذکر میں کرنے لگا ہوں۔

وہ ایک ٹھنڈی ٹھار صبح تھی...... حالانکہ صبح کے دس بج چکے تھے' لیکن دھند نے سورج کا ابھی تک راستہ روکا ہوا تھا۔

مگر......!

تھانے کے کام تو چلتے رہتے ہیں۔ بلکہ ان کو چلانا پڑتا ہے' مجھے سپاہی سکندر نے آکر بتایا۔

''سر...... ادھر ڈھوک شمس میں قتل کی ایک واردات ہوگئی ہے' دو بندے اطلاع لے کر آئے ہیں۔''

میں نے بندوں کو بلالیا۔

ایک گورکن تھا' اور ایک مقتول کا پڑوسی تھا...... دونوں کے چہروں پر غم اور خوفزدگی کے اثرات ثبت ہوکر رہ گئے تھے۔

پڑوسی جس کا نام صفدر معلوم ہوا...... ٹھہر ٹھہر کر بتانے لگا۔ تھانے دار صاحب صابر کی لاش قبرستان کے اندر پڑی ہوئی ہے...... نہ جانے کس نے اس کو رات کو قتل کردیا ہے۔''

تو گویا...... مقتول کا نام صابر تھا۔

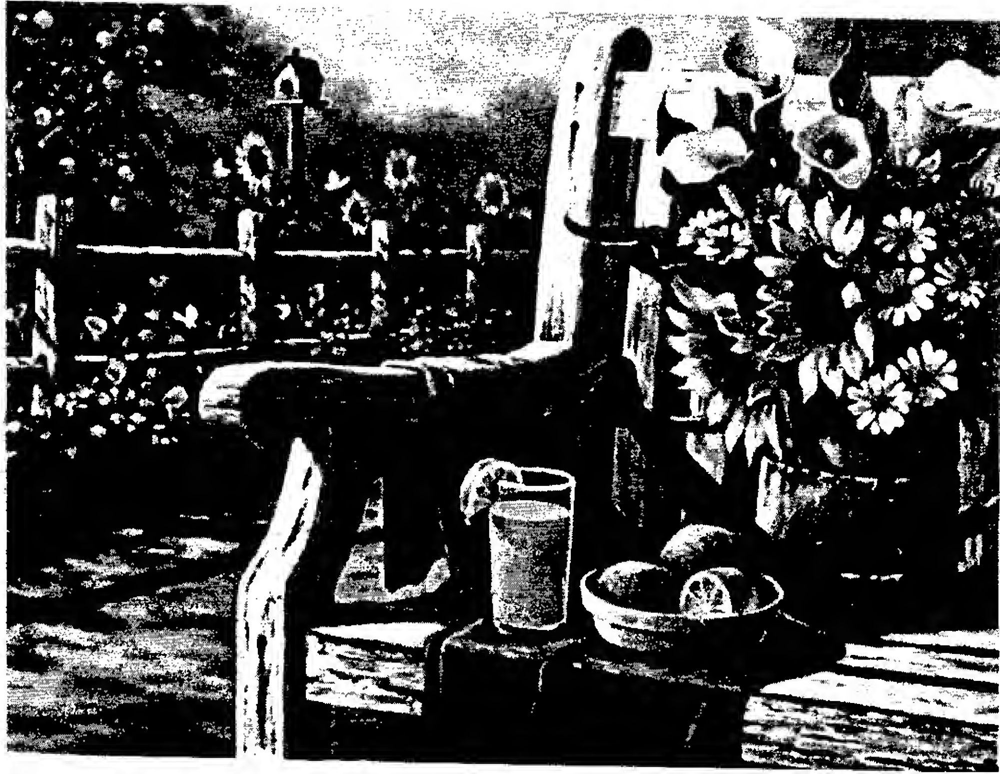
میں نے دونوں کو باری باری دیکھتے ہوئے کہا۔

''لاش کس نے دریافت کی ہے۔''

''جناب...... میں نے......'' گورکن نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ''میں جب حسب معمول اپنی کوٹھڑی سے قبروں کی طرف گیا تو......'' اس نے ایک جھرجھری سی لی۔ پھر بولا۔

''میں نے صابر کی لاش دیکھی...... میرے خدا' اتنا بھیانک منظر میں نے کم دیکھا ہے جناب۔''

''خیر...... وہ تو میں دیکھ ہی لوں گا' کیا تم صابر کو جانتے



تھے؟“

”بالکل‘ جناب صابر کے دادا اور دادی اسی قبرستان میں دفن ہیں۔ صابر جب بھی چھٹی کرتا تھا تو قبرستان میں فاتحہ خوانی کے لیے ضرور آتا تھا۔ بڑا کڑیل جوان تھا...... اب تو......“

”تم لوگ جاؤ...... ہم تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔“ ان کو رخصت کرنے کے بعد میں نے ہیڈ کانسٹیبل نذر محمد کو بلا کر ضروری تیاری کا حکم دے دیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم جائے وقوع پر موجود تھے۔

میرے ساتھ ہیڈ کانسٹیبل نذر محمد اور سپاہی طوفان خان بھی تھے۔ لاش اوندھے منہ پڑی تھی...... اس کا سر پچھلی طرف سے بالکل صحیح حالت میں تھا...... جب میں نے لاش کو سیدھا کروایا تو یہ انکشاف ہوا کہ اس کا ماتھا بری طرح کچلا ہوا ہے‘ بلکہ اس میں تقریباً تین انچ سوراخ ہے۔ جس سے خون بہہ بہہ کر جم گیا ہے۔ زمین یہ کہانی سنا رہی تھی کہ یہاں لڑائی ہوئی ہے۔ قدموں کے نشان گڈمڈ تھے...... ان میں کچھ ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے بھی تھے۔ اور لاش سے چار فٹ دور ایک نوکیلا پتھر زمین میں دبا ہوا تھا...... اس پر یعنی اس کی نوک پر خون جما ہوا تھا۔ میرا تجربہ یہ کہتا تھا کہ پتھر کی یہی نوک اس کی موت کا سبب بنی ہے۔ اب یہ تو خدا ہی بہتر جانتا تھا کہ کسی ٹھوکر کی وجہ سے صابر خود ہی پتھر پر گرا تھا...... یا اسے کسی نے گرایا تھا...... ویسے نوکیلے پتھر کی سیدھ میں ایک بڑا سا پتھر زمین پر پڑا ہوا تھا...... میں نے نیچے جھک کر اس پتھر کا جائزہ لیا...... وہ دو تین انچ اپنی جگہ سے کھسکا ہوا تھا۔

ویسے ظاہری طور پر کہانی تو یہ بن رہی تھی کہ زمین پر پڑے ہوئے پتھر سے صابر نے ٹھوکر کھائی‘ اور اس کا سر نوکیلے پتھر پر جا لگا۔ اور...... پھر گورکن اور صفدر نے اسے قتل کیا تھا۔

لیکن...... یہاں کچھ سوال منہ اٹھائے میرے سامنے

کھڑے تھے' زمین چونکہ کچی اور دھول والی تھی (کیونکہ کافی عرصہ سے بارش نہیں ہوئی تھی) اس لیے قدموں کے نشان' بلکہ کھوجی کی زبان اور ہماری اصطلاح میں کھرے کوئی اور کہانی سنا رہے تھے۔ پھر چوڑیوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے بھی کوئی اور ہی گل کھلا رہے تھے۔علاوہ ازیں صابر رات کو یہاں کیا کر رہا تھا اس کے علاوہ ایک بات اور مجھے غیر فطری لگ رہی تھی...... آگے بڑھنے سے پہلے ایک بات کی اور وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ جب ہم سرکاری گاڑی میں یہاں پہنچے تھے تو تیس کے قریب مرد و زن یہاں جمع تھے' جن میں زیادہ تعداد عورتوں کی تھی' کیونکہ یہ ایسا وقت تھا جب مرد اپنے اپنے کاموں پر گئے ہوئے تھے' دو تین عورتیں باقاعدہ بین کر رہی تھیں' جن کے متعلق میرا اندازہ تھا کہ صابر کی قریبی رشتے دار ہوں گی بعد میں مجھے پتہ چلا تھا کہ ایک صابر کی ماں زینب بیگم' ایک بہن اور ایک خالہ تھیں۔

میں نے گورکن جو قریب ہی تھا...... کو بلایا اور اسے گھورنے لگا۔

وہ میرے انداز سے سٹپٹا گیا۔اور بولا...... جناب مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے؟ میں نے تو تھانیدار صاحب' لاش کے پاس کسی کو نہ آنے کا بندوبست کر کے تھانے کی طرف سفر کا آغاز کیا تھا۔

'یہ تو تم نے بہت اچھا کیا تھا...... میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا مگر...... پھر لاش کو اپنی جگہ سے کس نے ہٹایا تھا......؟''

''اپنی جگہ سے......'' اس نے زیر لب دہرایا۔

''بالکل...... اپنی جگہ سے...... میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''جناب یہ غلطی مجھ سے ہوئی تھی۔ میں اس کو سیدھا کر کے دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ ہے کون؟ تھانیدار صاحب' مجھے معاف کر دیں۔ میں نے یہ جان بوجھ کر نہیں کیا تھا...... بلکہ غیر ارادی طور پر مجھ سے ہو گیا تھا۔''

''چلو اس بات پر مٹی ڈالو...... تم نے کیا دیکھا؟''

''جناب لاش کے ماتھے میں نوک والا پتھر کھبا ہوا تھا۔ ماتھے کا سوراخ دیکھ کر میں دہشت زدہ ہو گیا تھا اور میں لاش کو دوبارہ اس حالت میں نہ رکھ سکا تھا۔ اسی لیے میں نے تھانے میں آپ سے یہ کہا تھا کہ بھیانک منظر تھا۔''

''رات کو تم نے کوئی غیر معمولی آوازیں سنی تھیں؟ یہاں یہ بتا دوں کہ لاش سے اس کی کوٹھڑی کا فاصلہ کم از کم سو گز تو ضرور رہا ہوگا۔

''نہیں تھانے دار صاحب...... میں کوٹھڑی میں اکیلا ہی رہتا ہوں...... کل میری طبیعت خراب تھی' میں ڈاکٹر سے دوائی لے کر آیا تھا' اس نے شاید اس میں کوئی سکون آور گولی بھی دے دی تھی...... میں معمول سے ذرا دیر سے اٹھا تھا...... یہ موسم ہی ایسا ہے' بارش ہو نہیں رہی' دھند نے اور سونے پہ سہاگے کا کام کیا ہے۔''

بہرحال اس کے بعد میں نے ضروری کاغذی کارروائی کے بعد لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے ہیڈ کانسٹیبل کی نگرانی میں ڈسٹرکٹ اسپتال بھجوا دیا تھا اور سپاہی طوفان کو لے کر ڈھوک میں چلا گیا۔

یہ ڈھوک زیادہ سے زیادہ ساٹھ ستر گھروں پر مشتمل ہوگی۔

صابر کا گھر وسط میں پتھروں اور گارے سے بنا ہوا گھر تھا...... دو کمرے اور چھوٹا سا صحن تھا...... اس کی ماں زینت بیگم کی حالت بہت بری تھی۔اس لیے اس سے کسی قسم کی بات چیت نہیں ہو سکتی تھی۔ ڈھوک کی کافی عورتیں ان کے گھر میں آئی ہوئی تھیں۔

مجھے ایک کمرے میں ان کا رش نظر آیا...... صحن میں بھی عورتیں اور بچے تھے۔اس لیے میں نے ان کے پڑوس کے گھر میں بیٹھنے کو ترجیح دی۔ جیسا ماحول صابر کے گھر میں بن گیا تھا' وہاں تفتیش ممکن نہیں تھی۔ میرے ساتھ صابر کا باپ تھا۔

اس کا باپ بھی ڈھے سا گیا تھا لیکن کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھا۔نام اس کا فضل دین تھا۔اس کا وجود دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔

میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔

''بھائی فضل دین...... جو اللہ کو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے میں اپنے فرض سے مجبور ہوں...... میں تمہارے بیٹے کو تو واپس نہیں لا سکتا' لیکن اس کے ساتھ پیش آنے والے

حادثے کی تحقیقات کر کے دودھ کا دودھ پانی کا پانی ضرور کروں گا۔ اس سلسلے میں مجھے تم سے کچھ سوال جواب کرنے ہیں۔'' میں نے دانستہ حادثے والا لفظ استعمال کیا تھا۔

''تھانے دار صاحب...... سب کچھ ختم ہوگیا...... اس کی شادی تیار تھی۔ ویسے تو وہ ہر پندرہ دن بعد گھر چکر لگاتا تھا' لیکن اس بار وہ چھٹی لے کر آ رہا تھا' دو دن پہلے مجھے اس کا خط ملا تھا کہ جونہی اسے چھٹی ملتی ہے وہ آ جائے گا...... آپ تیاری مکمل کریں...... ابھی تہاڑے (دن) نہ رکھیں۔''

اوہ...... فضل بھائی...... یہ تو بہت افسوس والی بات ہے' لیکن......؟'' میں نے چند لمحے توقف کیا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''صابر کہاں ملازمت کرتا تھا۔''

''جناب...... سیالکوٹ میں' کھیلوں کا سامان بنانے والے ایک کارخانے میں ملازم تھا۔''

''اچھا...... کیا اس کی شادی اس کی پسند سے کر رہے تھے یا......؟''

زینب' میری (پلے) ہونے والی بہو...... کا تعلق ساتھ والے گاؤں اختر آباد سے ہے' دراصل صابر کو کرکٹ کھیلنے کا بہت شوق ہے۔ اس گاؤں کی ٹیم کے ساتھ وہ کرکٹ کھیلنے گیا۔ وہاں ہی اس نے زینب کو پسند کرلیا۔ جب بات مجھ تک پہنچی تو میں نے زینب کے باپ کے ساتھ بات کی' اور اسے کہا۔

''بھائی' شکر دین' بہتر یہی ہے کہ ہم عشق کی اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے صابر اور زینب کو ایک کردیں۔'' پہلی ملاقات میں ہی مجھے شکر دین بھلا مانس اور معاملہ فہم شخص لگا...... اس نے دو بیٹیوں کی شادی کردی تھی...... صرف زینب باقی تھی' بیٹا کوئی نہیں تھا...... بیوی فوت ہوگئی تھی۔

اس نے کہا۔ فضل دین تم نے بہت اچھا کیا کہ میرے پاس آ گئے' زندگی بچوں نے گزارنی ہے' پھر دونوں بالغ و عاقل ہیں' زبانی کلامی ہوسکتا ہے انہوں نے ایجاب و قبول کرلیا ہو' اس لیے اگر ہم ان کی راہ کی رکاوٹ بنے تو حالات خراب بھی ہوسکتے ہیں۔ پھر ہمارے ہاتھ سوائے بدنامیوں اور رسوائیوں کے کچھ نہیں آئے گا۔ تم لوگ باقاعدہ رشتہ مانگنے آؤ...... میں انکار نہیں کروں گا...... اس طرح دو دن بعد میں اور میری گھر والی اس کے گھر چلے گئے......اور رشتہ پکا ہوگیا۔''

''دیکھو فضل دین میں تمہارے فیصلے کو سراہتا ہوں لیکن......'' میں نے چند لمحے اس کے سوگوار چہرے کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد کہا۔

''تمہاری گھر والی نے تو کوئی ہنگامہ برپا نہیں کیا تھا؟''

''کیسا ہنگامہ؟ تھانیدار صاحب......'' اس کے لہجے میں حیرانگی تھی' شاید میری بات اس کے پلے نہیں پڑی تھی۔

'میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''میرا مطلب ہے ہوسکتا ہے اس نے کوئی لڑکی ذہن میں رکھی ہوئی ہو۔''

''ایسی کوئی بات نہیں تھی...... تھانیدار صاحب' ابھی وہ ارد گرد خیالی گھوڑے ہی دوڑا رہی تھی کہ صابر نے یہ کہہ دیا کہ وہ شادی زینب سے کرے گا ورنہ ساری عمر کنوارہ ہی رہے گا۔ البتہ......؟''

'البتہ کیا فضل دین؟'' میرے کان کھڑے ہوگئے۔

''اب میرا بیٹا اس دنیا میں نہیں رہا' اس لیے میں چھوٹی سے چھوٹی بات بھی آپ کے گوش گزار کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔''

اس کی ذہانت بھری باتیں مجھے حیران کر رہی تھیں۔ وہ مجھے دانا و بینا لگتا تھا۔ میں پوری توجہ اور دل جمعی کے ساتھ اس کی باتیں سن رہا تھا جو کہہ رہا تھا۔

''زینب کے سلسلے میں دو امیدوار اور بھی تھے...... ایک تو زمیندار سرفراز کا بیٹا عدیل تھا اور دوسرا ساجد تھا...... دکاندار مجید کا بیٹا۔''

''ٹھیک ہے...... فضل دین اب تم گھر جاؤ...... تمہارے ساتھ باقی باتیں میں کچھ دن بعد کروں گا۔'' اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ دونوں کا تعلق اختر آباد سے ہے۔ باہر نکل کر میں نے دیکھا کہ سپاہی طوفان خان جس کو میں نے مکان کے باہر کھڑا کیا تھا' وہ اب وہاں نہیں تھا۔

میں نے قبرستان سے اس طرف آتے ہوئے اس سے کہا تھا کہ کھوجی ادھر آئے گا' کیونکہ میں نے ہیڈ کانسٹیبل (جو لاش لے کر گیا تھا) کو تاکید کی تھی کہ وہ جاتے ہوئے

کھوجی کو ادھر بھیج دے۔
یقیناً سپاہی کھوجی کو لے کر جائے وقوعہ کی طرف ہی گیا تھا۔
جب میں وہاں پہنچا تو وہاں کھوجی اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔طوفان خان بھی وہیں تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ میرے قریب آ گیا۔اور ماتھے تک ہاتھ لے جا کر مجھے سلام کیا' اس کا نام علم دین تھا۔اس کی عمر پچاس کا ہندسہ عبور کر چکی تھی۔اس عمر میں بھی اس کی آنکھوں کی چمک ماند نہیں پڑی تھی۔
میں نے مسکرا کر اس کے سلام کا جواب دیا اور بولا۔
''چاچا......آپ کا علم کیا کہتا ہے؟''
''اللہ آپ کو ترقی دے...... جناب ادھر گاؤں اختر آباد سے ایک عورت کا کھرا آ رہا ہے......یہ دیکھیں......وہ مجھے اس جگہ لے گیا' اور ادھر ایک مرد کا کھرا گاؤں بیری کی طرف سے آ رہا ہے......دونوں کا ملاپ ادھر قبرستان سے دو تین گز دور ہوا...... یہاں دونوں نے قبرستان کے اندر قدم بڑھائے......وہ ان قبروں کے پاس گئے......میں اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا......اور اس کے تجربے اور کام کا دل ہی دل میں قائل ہو رہا تھا......علم دین واقعی ایک ماہر کھوجی لگ رہا تھا' اور میرا پالا اس سے پہلی بار پڑا تھا۔
وہ کہہ رہا تھا یہاں ایک اور جوان کا بھی کھرا ہے جو اس قبر کے پاس ہے' یہ شمال کی طرف سے آیا ہے' پھر وہ مجھے جائے وقوعہ پر لے گیا...... یہاں ان کی لڑائی ہوئی ہے۔''
میں نے کھوجی کو شاباش دی اور اس کو کچھ روپے دیئے' وہ میری ترقی کی دعائیں کرتا ہوا چلا گیا۔
اب یہاں کچھ باتیں میں آپ سے کرنا چاہوں گا' گاؤں بیری مشرق کی طرف تھا' جبکہ گاؤں اختر آباد مغرب کی طرف واقع تھا۔ان دونوں کے درمیان ڈھوک شمش تھی......شمال کی طرف شہر کا وہ حصہ تھا جہاں ہمارا تھانہ اور ریلوے اسٹیشن تھا۔
سپاہی طوفان خان کے پاس کھروں کے مولڈ بنانے کا سامان موجود تھا' اس نے کھروں کے مولڈ بنائے اور ہم تھانے میں واپس آ گئے۔
ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے میں نے پہلے ہی سنبھال لیے تھے۔
میں اپنی اب تک کی تفتیش سے خاصا مطمئن تھا۔
اے ایس آئی شہاب الدین تھانے میں موجود تھا...... میں نے اپنی سیٹ سنبھالتے ہی اسے اپنے پاس بلا لیا۔
''حکم سر......'' اس نے میرے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔
''تمہارے ہاتھ میں کتنے مخبر ہیں؟''
''سر دو عورتیں اور دو مرد ہیں۔ ان کا نام بالترتیب آپا شاہین' باجی نزاکت' سلیمان اور رفعت ہے۔''
''دیکھو......بھئی یہ اب تمہاری مرضی اور تجربے پر منحصر ہے کہ تم کس سے کام لیتے ہو......پھر میں نے اسے کام بتایا تھا' اور وہ ٹھیک ہے سر کہہ کر چلا گیا تھا۔
ابھی میں اس کام کے متعلق آپ کو نہیں بتاؤں گا' جو میں نے اس کے سپرد کیا تھا۔ مجھے صابر کے پڑوسی صفدر نے میرے منع کرنے کے باوجود کھانا کھلا دیا تھا۔
اگلے دن لاش اور پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ ساتھ ساتھ آ گئیں۔ پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ نے میرے اندازوں کی تصدیق کر دی۔ ماتھے کے زخم کے علاوہ صابر (لاش) کے جسم پر کوئی زخم کا نشان نہیں تھا۔
ضروری کاغذی کارروائی کے بعد میں نے لاش ورثاء کے حوالے کر دی۔ اور......! خود تھانے کے دوسرے کاموں میں الجھ گیا۔
معاملہ کافی الجھا ہوا لگتا تھا اگر صابر کی محبت کی صرف کہانی سامنے آتی تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ رات کے اندھیرے میں خاموشی سے اس لیے آیا تھا کہ اپنی محبت کو لے کر نکل جاتا......لیکن یہاں تو ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا...... اس کا رشتہ طے پا گیا تھا' کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔
پھر......مجھے جائے وقوع پر ایک اور مرد اور عورت کی موجودگی الجھا رہی تھی...... یہ سوال بھی اہم تھا کہ عورت یا لڑکی کی چوڑیاں کیسے ٹوٹیں؟ میرے ذہن میں زینب کے دو امیدوار بھی تھے۔
دو دن میں سوچوں کے گھوڑے سرپٹ دوڑاتا رہا۔
میں زینب سے چھوٹا سا انٹرویو کرنا چاہتا تھا۔
پتہ کروانے پر میرے علم میں یہ بات آئی کہ زینب ابھی ڈھوک میں ہی ہے۔
شام کو میں سپاہی قمر کو لے کر فضل دین کے گھر پہنچ گیا۔

اس نے مجھے اپنے گھر میں بٹھایا...... بیٹے کو مٹی کے حوالے کرنے کے بعد صابر کی ماں تو چار پائی کی ہو کر رہ گئی تھی...... ہمیں دلوں پر پتھر رکھنا پڑتا ہے' وہاں ایسے گھروں میں جا کر سوال و جواب کرنا بڑے دل گردے کا کام ہوتا ہے۔

بہرحال میرے کہنے پر فضل دین زینب کو میرے پاس چھوڑ کر چلا گیا۔

میں نے بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیا...... وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ موٹی موٹی آنکھوں پر جھکی پلکیں' جو بھیگی بھیگی لگتی تھیں' اس کے حسن کو عجیب سی سوگواریت سے ہمکنار کر رہی تھیں...... اس نے گرم چادر سے اپنے آپ کو لپیٹا ہوا تھا۔

''زینب مجھے افسوس ہے۔ کہ تمہیں اتنے بڑے سانحے سے دوچار ہونا پڑا ہے۔''

''تھانیدار صاحب' تقدیر اس طرح بھی وار کرتی ہے...... میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا......'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''اب صبر کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ میں تم سے چند سوال کرنے آیا ہوں۔''

''تھانے دار صاحب' اب سوال و جواب سے کیا فائدہ؟ میرا تو سب کچھ لٹ گیا ہے...... شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

ازل سے محبت کی دشمن ہے دنیا...... کہیں دو دلوں کو یہ ملنے نہ دے گی''

''زینب...... میں نے اپنا فرض ادا کرنا ہے' کسی نتیجے پر پہنچنا ہے۔''

''ٹھیک ہے تھانیدار صاحب' لیکن اگر آپ ناراض نہ ہوں تو میں ایک بات آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں۔''

''پوچھو...... تم میری بہنوں کی طرح ہو...... کھل کر بات کرو...... میں اسے اس اسٹیج پر لانا چاہتا تھا جہاں وہ ہر بات مجھے بتا سکے۔

''کیا صابر کو قتل کیا گیا ہے؟ یہاں تو کچھ لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ تو کیلے پتھر پر گرنے کی وجہ سے مرا ہے۔''

''دیکھو...... ابھی میں کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوں' تم یہ بتاؤ کیا اس نے تمہیں کوئی خط وغیرہ بھیجا تھا کہ وہ آ رہا ہے۔''

''مجھے تو اس بدنصیب نے کوئی خط نہیں لکھا تھا...... البتہ چاچا جی کو خط لکھا تھا کہ جونہی اسے چھٹی ملی وہ آ جائے گا۔''

اب میں جو سوال کرنے لگا ہوں' اس کا سوچ کر اور کھرا جواب دینا۔''

اس نے حیران نگاہوں سے میرے چہرے کو دیکھا......اور بولی۔

''تھانیدار صاحب' میرے خیال میں' میں نے ابھی تک کسی سوال کا جواب غلط نہیں دیا۔

''تم محسوس نہ کرو...... دراصل یہ سوال ہی ایسا ہے تم یہ بتاؤ کہ کبھی عدیل یا ساجد نے تمہارے ساتھ کوئی زور زبردستی بھی کی تھی یا وہ تمہیں بس دور دور سے دیکھتے تھے؟''

''پہلے تو وہ دور دور سے دیکھتے تھے...... پھر انہوں نے ہمارے گھر رشتہ بھیج دیا۔ جب رشتے سے انکار ہو گیا تو ساجد تو چپ چاپ بیٹھ گیا...... لیکن عدیل نے ایک دن میرا رستہ روک کر کہا تمہارے باپ نے رشتے سے انکار کر کے اچھا نہیں کیا' ہم جو چیز حاصل کرنا چاہتے ہیں حاصل کر کے رہتے ہیں۔''

''اوہ...... یہ تو کھلی ہوئی دھمکی تھی۔ تم نے صابر کو یا اپنے باپ کو بتایا تھا؟''

''نہیں...... میں اسے ایک کھوکھلی دھمکی سمجھی تھی...... میں نے سوچا خواہ مخواہ دشمنی کی بنیاد پڑ جائے گی۔ پھر مجھے پتہ تھا کہ عدیل صرف ریت کا رستم ہی ہے۔''

''کیا ابھی تک تم نے اس دھمکی کا کسی سے ذکر نہیں کیا؟'' میں نے سوال کیا۔

''نہیں تھانے دار صاحب میں نے اس واقعے کو ذہن سے محو ہی کر دیا تھا۔''

''ٹھیک ہے تم جاؤ' اگر میں نے ضرورت محسوس کی تو دوبارہ تم سے بات کر لوں گا...... ہاں اب اس دھمکی کا کسی سے ذکر نہ کرنا۔'' وہ چلی گئی۔

چند ہی لمحوں بعد فضل دین ایک بار پھر میرے سامنے تھا...... اس کے ہاتھ میں چائے کی ٹرے تھی...... ٹرے میں ابلے ہوئے انڈے بھی رکھے تھے۔

''فضل دین تم نے یہ تکلف کیوں کیا؟''

"جناب تکلف کیسا؟ باہر سردی بہت ہے۔"
میں نے سپاہی کو بھی برآمدے سے اندر بلالیا۔
چائے پی کر ہم وہاں سے تھانے میں آ گئے تھے۔
اگلے دن میں نے سپاہی طوفان خان کو بھیجا کہ وہ عدیل اور گورکن کو لے آئے۔
گورکن تو خود ہی آ گیا۔
میں نے وقت ضائع کیے بغیر اسے اپنے پاس بلالیا۔
میں نے اس دن دیکھ لیا تھا کہ قبرستان کافی بڑا ہے' کم از کم پچاس کنال پر ہوگا۔
میں نے گورکن کو اپنے سامنے بٹھا کر پہلا سوال یہ کیا۔
"تم یہ بتاؤ کہ کیا اس قبرستان میں صرف ڈھوک شمس کے مرحومین کو دفن کیا گیا ہے؟"
"نہیں جناب یہ زمین کسی وقت اختر آباد کے موجودہ چوہدری اکبر حسین کے دادا مرحوم اختر حسین کی ملکیت تھی۔ انہوں نے یہ زمین قبرستان کے لیے وقف کردی تھی۔ یہاں اختر آباد' گاؤں بیری ڈھوک شمس وغیرہ کے مرحومین دفن ہیں۔"
"یہ تو بھئی...... چوہدری اختر حسین مرحوم کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔" میں نے گورکن کے دل سے مزید باتیں نکالنے کے لیے کہا۔
"تھانیدار صاحب' میں نے سنا تھا کہ چوہدری اختر حسین بڑا دردمند دل رکھتے تھے۔ غریبوں اور اپنے مزارعوں کا بڑا خیال رکھتے تھے۔"
"چوہدری اکبر حسین کے متعلق کیا خیال ہے؟"
"یہ تو جناب پکے چوہدری ہیں۔"
"میں تمہارا مطلب سمجھ گیا ہوں...... کیا مجھے گاؤں اختر آباد اور بیری کے تمہارے قبرستان میں دفن مرحومین کی فہرست مل سکتی ہے؟"
"بالکل جناب مل سکتی ہے' کل آپ کو فہرست مل جائے گی' اس کے بعد میں نے اسے یہ ہدایات دے کر رخصت کردیا کہ اگر اسے کوئی نئی بات معلوم ہو تو فوراً مجھے آ کر بتائے۔
میں قدم قدم آگے بڑھ رہا تھا۔
تقریباً دو گھنٹے بعد سپاہی کی شکل نظر آئی وہ یہ پیغام لے کر آیا تھا کہ عدیل نہیں ملا...... وہ اس کے باپ کا ایک رقعہ لے کر آیا تھا۔
میں نے رقعہ کھول کر پڑھا لکھا تھا۔
قابل صد احترام...... ایس ایچ او صاحب' تھانہ......
السلام علیکم! آپ کے بھیجے ہوئے سپاہی کی زبانی پیغام ملا' کہ آپ نے میرے بیٹے عدیل کو یاد کیا ہے تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ وہ میرے ہاتھوں سے نکل چکا ہے' کئی کئی دن اس کی شکل گھر میں نظر نہیں آتی' میں ان دنوں بیمار ہوں' چارپائی سے نیچے نہیں اتر سکتا...... ورنہ خود حاضر ہو جاتا' اگر آپ میری حویلی میں آ جائیں تو میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ آپ اکیلے اور سفید کپڑوں میں آئیں تو بہتر ہے۔ مخلص...... سرفراز۔
زیلدار نے کچھ کو ذرا موٹا کر کے لکھا تھا۔
میں نے ویسے بھی گاؤں اختر آباد جانا تھا۔ اس لیے شام سے ذرا پہلے وہاں پہنچ گیا۔ سپاہی نے مجھے اچھی طرح سرفراز کی حویلی کا محل وقوع سمجھا دیا تھا۔
میں نے حویلی کے دروازے پر ایک پٹھان چوکیدار کو دیکھا...... میں نے اپنا تعارف کروانے کے بعد اپنے آنے کا مدعا بیان کیا۔
بہرحال کچھ دیر بعد مجھے سرفراز کے بیڈروم میں پہنچادیا گیا۔
وہ دھان پان سا ایک پینتالیس سالہ شخص تھا...... ماتھا چوڑا تھا...... رنگ نہ زیادہ کالا تھا اور نہ زیادہ سفید' البتہ چہرے کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ نقاہت بھی ظاہر ہو رہی تھی۔
اس نے اٹھ کر گرمجوشی سے میرے ساتھ مصافحہ کیا اور بیڈ کے پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا۔
میں بیٹھ چکا تو اس کے لب ہلے۔
"تھانیدار صاحب بڑی مہربانی...... آپ کو زحمت ہوئی۔"
"سرفراز صاحب کوئی بات نہیں۔ مجھے ویسے بھی آپ سے ملاقات کرنی تھی۔ جی فرمایئے۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔"
میں نے مختصراً اسے بتایا کہ مجھے عدیل کی کیوں تلاش ہے؟
"جناب...... ان ماں بیٹے نے میری مت مار دی

ہے۔عدیل صاحب نے کہیں شکر دین کی بیٹی زینب کو دیکھ لیا اور...... ضد کرنے لگا کہ اسی سے شادی کروں گا۔شکر دین ایک چھوٹا زمیندار ہے...... میں آپ کو حقیقت بتاتا ہوں' کہ میں نے اس اونچ نیچ کو کبھی زیادہ اہمیت نہیں دی...... لیکن شکر دین کی طبیعت سے واقف ہوں...... اس نے اپنی پہلی دو بیٹیوں کی شادی بھی اپنی حیثیت کے گھروں میں کی تھی۔اور اب وہ زینب کے متعلق بھی یہی سوچ رکھتا تھا۔عدیل کی ماں رشتہ لے کر گئی تھی...... لیکن میری توقع کے عین مطابق رشتے سے انکار ہو گیا۔''

''پھر کیا ہوا......؟''

''ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ دونوں ماں بیٹا آرام سے بیٹھ جاتے لیکن انہوں نے اسے انا کا مسئلہ بنالیا ہے۔''

''میں آپ کو یہ بتادوں کہ عدیل نے زینب کو دھمکی دی تھی کہ ہم جو چیز حاصل کرنا چاہتے ہیں حاصل کر کے رہتے ہیں۔'' میں نے اسے دھمکی کے متعلق بتانا ضروری سمجھا۔

''تھانے دار صاحب مجھے صابر کے متعلق سب کچھ پتہ چل چکا ہے۔اگر عدیل کسی طرح اس معاملے میں ملوث ہے تو میں بے جا اس کی حمایت نہیں کروں گا...... سیانے صحیح کہتے ہیں کہ جو آگ سے کھیلتے ہیں ان کا دامن ضرور جلتا ہے۔''

''وہ واقعے والی رات حویلی میں ہی تھا......یا؟''

''اس نے حویلی کے آخر والا کمرہ منتخب کیا ہے...... اس لیے میں اس سلسلے میں کچھ وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔''

میں نے دیکھا...... کہ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا ہے لیکن زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی...... اس کے ماتھے پر ذہنی کشمکش کے آثار نمایاں تھے۔

''آپ شاید کچھ اور بھی کہنا چاہتے ہیں؟'' میں نے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا۔

''دراصل...... تھانیدار صاحب بات ایسی ہے کہ......''

''دیکھیں...... کھل کر بات کریں...... اس وقت آپ کی جو حالت ہے وہ اس بات کی متقاضی ہے کہ آپ دل میں کوئی بات نہ رکھیں ورنہ آپ کے لیے خطرناک ہوگا۔''

میں نے نفسیاتی حربہ استعمال کرتے ہوئے کہا۔

''دراصل نہ جانے مجھے یہ کیوں محسوس ہو رہا ہے کہ گھر میں میرے خلاف کوئی سازش ہو رہی ہے۔اور میری زندگی خطرے میں ہے۔''

میں چونک اٹھا۔اور اس کے چہرے کی طرف دیکھا' اس وقت ان دیکھے خوف نے اس کے چہرے پر ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔

''آپ کو یہ شک کیوں اور کس پر ہے؟'' میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

''دراصل کافی دنوں سے میرا بیٹا اور بیوی یہ کہہ رہے ہیں کہ زمینوں کا انتظام وانصرام ان کے حوالے کیا جائے۔''

''سرفراز بھائی یہ بات وہ شاید اس لیے کہہ رہے ہیں کہ آج کل آپ کی صحت اس بات کی اجازت نہیں دیتی...... کہ......''

میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''خیر...... جو بات میرے دل ودماغ میں ہلچل مچائے ہوئے تھی...... وہ میں نے آپ کو بتادی ہے' اگر میرے ساتھ کوئی حرج مرج ہو گیا تو......؟''

''ٹھیک ہے اب مجھے اجازت دیجیے...... تھانے میں اور بھی بہت سے کام ہیں۔''

''ارے جناب باتیں ہی ایسی چھڑ گئی تھیں کہ مجھے آپ کی خاطر تواضع کا خیال ہی نہیں رہا۔''

''یہ دعوت ادھار رہی...... پھر کبھی سہی۔''

واپسی پر میں سوچ رہا تھا کہ میں کس سلسلے میں گیا تھا درمیان میں کوئی اور بات بھی نکل آئی تھی۔

عدیل کی ماں کو میں ابھی چھیڑنا نہیں چاہتا تھا' اس سلسلے میں مجھے کسی مناسب موقع کا انتظار کرنا تھا۔

اگلے دن مجھے گورکن کی طرف سے قبرستان میں دفن مرحومین کی فہرست مل گئی۔

میں نے چند ناموں پر گول دائرہ لگا دیا۔

اسی دن اے ایس آئی نے اطلاع دی کہ میں مخبر آپا شاہین کو لے آیا ہوں...... اس کو آپ کے کوارٹر میں بٹھا آیا ہوں۔

''ٹھیک ہے' شہاب الدین تم نے بڑا دانشمندانہ کام کیا ہے...... میں ابھی جاتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ اس نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔''

اب میں آپ کو وہ بات بتا دیتا ہو جو پہلے نہیں بتائی تھی۔ میں نے اے ایس آئی کے ذمے یہ کام لگایا تھا کہ وہ مخبروں کے ذریعے یہ کھوج لگائے کہ گاؤں اختر آباد سے کوئی لڑکی اور گاؤں بیری سے کوئی لڑکا تو غائب نہیں ہے؟

آپا شاہین ایک چالیس سالہ گوری چٹی خاتون ثابت ہوئی' اس کی آنکھوں کی چمک سے ایک ہوشیار اور محنتی عورت کا روپ پیش کر رہی تھی۔

اس نے مجھے اٹھ کر سلام کیا۔

''وعلیکم السلام! بیٹھو......'' وہ چارپائی پر بیٹھ گئی۔

میں نے کمرے میں پڑی ہوئی کرسی کو کھسکا کر چارپائی کے قریب کر لیا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''تھانیدار صاحب' جو کام چھوٹے تھانیدار صاحب نے مجھے کہا تھا' وہ میں نے کر دیا ہے۔''

''اچھا...... پھر کیا رپورٹ ہے؟''

''گاؤں اختر آباد سے شادو گھر میں نہیں ہے۔''

''کیا مطلب......؟''

''تھانیدار صاحب' آپ کہیں گے کہ میں اپنے منہ میاں مٹھو بن رہی ہوں' لیکن یہ کہے بنا رہ نہیں سکتی کہ میں اڑتی چڑیا کے پر گن سکتی ہوں۔ حالانکہ شادو کے گھر والوں نے اس بات کو چھپایا ہوا ہے کہ ان کی لڑکی بھاگ گئی ہے' وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ اپنی ماسی کے گھر گئی ہے۔''

''اچھا...... تم تو واقعی کام کی بندی ہو...... تمہارے خیال میں وہ کس کے لیے یا دوسرے لفظوں میں کس کے ساتھ نکل گئی ہے؟''

''تھانے دار صاحب میری آپ سے ایک گزارش ہے میں لڑکے کا نام بھی بتا دوں گی' لیکن اس عورت کا نام بتانے کے لیے مجھے مجبور نہ کیجیے گا جس سے یہ ساری معلومات مجھ تک پہنچی ہیں۔''

''دیکھو شاہین مجھے فی الحال آم کھانے سے مطلب ہے' پیڑ گننے سے نہیں۔ تم یہ بتاؤ کہ شادو کس کے ساتھ گئی ہے۔''

''وہ گاؤں بیری کے فیروز کے ساتھ گئی ہے۔''

''ٹھیک ہے...... تمہاری کارکردگی ٹھیک ہے...... تمہیں تمہارا انعام جلد ہی مل جائے گا۔''

اس کو رخصت کر کے میں نے کوارٹر کو تالا لگایا...... اور تھانے میں آ گیا۔ دونوں گھروں کا ایڈریس اور محل وقوع میں نے ذہن میں بٹھا لیا تھا۔ میرے کمرے میں اے ایس آئی شہاب الدین بیٹھا ہوا تھا۔

میں اپنی سیٹ پر بیٹھ چکا تو اے ایس آئی بولا۔

''سر...... شاہین نے تسلی بخش کام کیا ہے یا نہیں؟''

''بالکل تسلی بخش کام کیا ہے۔ اب آگے تمہارا کام شروع ہوتا ہے۔''

''حکم سر......'' اس نے مودبانہ لہجے میں کہا۔

''تم کسی کانسٹیبل کو ساتھ لے جاؤ' اور لیاقت اور شمروز کو ساتھ لے آؤ۔''

''یعنی...... آپکا مطلب ہے...... شادو اور فیروز کے باپوں کو......'' میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

شام کے سائے دھرتی پر آہستہ آہستہ اتر رہے تھے...... جب اے ایس آئی شادو کے باپ لیاقت کو لے کر آ گیا۔

وہ باون ترپن سال کا ایک بھلا مانس سا بندہ لگتا تھا۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔

میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا تو وہ یوں میری طرف دیکھنے لگا جیسے میں نے کسی ایسی زبان میں بات کی ہو جو اس کے لیے اجنبی ہو۔ میں نے جب دوبارہ اپنے الفاظ دہرائے تو وہ بیٹھا۔

''لیاقت...... میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''تم نے بیٹی کی گمشدگی کی رپورٹ تھانے میں کیوں درج نہیں کروائی؟''

''تھانے دار صاحب...... کیا فائدہ تھا...... جبکہ ہمیں معلوم تھا کہ وہ اپنی مرضی سے گئی ہے پھر میرے بیٹوں نے مجھے منع کر دیا تھا۔ وہ کہتے تھے ہم دونوں کو ڈھونڈ کر قتل کر دیں گے۔''

''اوہ...... میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا...... یہ تو اور بھی خطرناک بات ہے لیاقت بھائی وہ تو جذباتی ہیں۔ ان کا خون جوان ہے' تم تو عقل سے کام لیتے۔''

''جناب...... تھانیدار صاحب میں مجبور ہو گیا تھا۔

انہوں نے مجھے یہ بات کہہ کر خاموش بیٹھنے پر مجبور کردیا تھا کہ اگر میں نے تھانے میں رپورٹ درج کروانے یا کسی سے ذکر کرنے کی کوشش کی تو وہ اپنے آپ کو ختم کرلیں گے۔"

میں اس مجبور باپ کی مجبوری سمجھ گیا تھا۔ میں نے اسے یہ کہہ کر رخصت کردیا کہ وہ اپنے بیٹوں کو بھیج دے۔

اس نے جاتے جاتے یہ بتایا تھا کہ وہ اب بری الذمہ ہوگیا ہے کیونکہ ان کے علم میں یہ بات آچکی ہے کہ مجھے تھانے میں بلایا گیا ہے۔" یہ کیس تو کسی اور طرف چل پڑا تھا۔

شمروز کے متعلق اے ایس آئی نے بتایا تھا کہ وہ منڈی بہاؤ الدین گیا ہوا ہے۔ وہ اس کے گھر والوں کو کہہ آیا تھا کہ جونہی وہ آئے اسے تھانے میں بھیج دیں۔

نئے حالات کی روشنی میں میں چاہتا تھا کہ لیاقت کے دونوں بیٹے اور شمروز اکٹھے تھانے نہ آئیں...... میں آگ اور بارود کو اکٹھا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اگلے دن صبح صبح دونوں جوان آگئے ...... دونوں گھبرو تھے...... وہ اگر قانون کو ہاتھ میں لے کر قاتل بن جاتے تو مجھے بہت افسوس ہوتا' وہ میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی بولے۔

"تھانے دار صاحب ہم خود ہی حاضر ہوجاتے' آپ نے ہمیں بلا کر......"

میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے سپاہی طوفان خان (جو انہیں میرے کمرے میں لے کر آیا تھا) سے کہا۔

"انہیں حوالات میں بند کردو...... ان کے دماغ کو گرمی چڑھی ہوئی ہے۔ حوالات کا ٹھنڈا فرش ان کے دماغ کے لیے مفید ہوگا۔"

"تھانے دار صاحب' آپ یہ کیا ظلم کررہے ہیں؟ ہم نے کونسا جرم کیا ہے" دونوں بوکھلا کر بولے۔ ان کے دماغ کی گرمی میرے ایک ہی جملے سے ہوا ہوگئی تھی۔

"جرم اگر کیا نہیں تو کرنے کا ارادہ تو رکھتے ہو......" میں نے انہیں گھورتے ہوئے کہا۔

"تھانے دار صاحب' ہماری ناک کٹ گئی ہے۔"

"دیکھو...... ٹھنڈے دل اور دماغ سے میری بات سمجھنے کی کوشش کرو...... ان کو ڈھونڈنے اور قرار واقعی سزا

دلوانے کا فرض مجھے ادا کرنے دو...... انہوں نے قتل بھی کیا ہے۔"
"بحق...... دونوں نے یک زبان ہوکر کہا۔
"بالکل...... پھر میں نے انہیں سارے حالات سے آگاہ کرنا بہتر سمجھا۔
اچانک ان کے چہروں پر غم کے سائے سایہ فگن ہوگئے۔
"تھانیدار صاحب صابر ہمارا دوست بھی تھا اور ہماری کرکٹ ٹیم کا ایک اہم کھلاڑی بھی...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں کہ اسے فیروز نے قتل کیا ہے؟"
"مجھے ایسے ثبوت ملے ہیں جنہوں نے مجھے یہ بات کہنے پر مجبور کیا ہے۔"
پھر اچانک میں نے جائے وقوع پر ملنے والی چوڑیوں کے ٹکڑے ان کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔
"کیا غائب ہونے والے دن تمہاری بہن نے یہی چوڑیاں پہنی ہوئی تھیں۔" حالانکہ مجھے پتہ تھا کہ بھائی بہنوں کے ہاتھوں کو اتنی غور سے نہیں دیکھتے۔ بس ایک موہوم سی امید کے سہارے پوچھ لیا تھا۔
"تھانیدار صاحب...... یہ چوڑیاں میری بیوی نے اسے لاکر دی تھیں......"
"اوہ...... تو تم دونوں بال بچے دار ہو......" میرے ہاتھ ان کو ٹھنڈے کرنے کا ایک نفسیاتی نقطہ آ گیا تھا۔ میں نے نرم لہجے میں کہا۔
"دیکھو...... تم میرے چھوٹے بھائیوں کی طرح ہو...... تم اپنی اپنی ذمے داریوں کا احساس کرو...... اور جذبات کی رو میں نہ بہو...... آخر تم پر تمہارے بیوی بچوں کا بھی حق ہے۔"
میں نے دیکھا کہ ان کے سر جھک گئے ہیں اور وہ میری باتوں کی گہرائی تک پہنچ چکے ہیں...... یہی میرا مقصد تھا ویسے یہ میرے فرائض میں شامل نہیں تھا...... اور نہ یہ میری ڈیوٹی کا حصہ تھا۔
لیکن......!
میں تھانیدار ہونے کے علاوہ ایک انسان بھی تھا......
ویسے ایک بات کا میں یہاں برملا اظہار کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ابھی میرے ذہن میں یہ بات فائنل اسٹیج تک نہیں پہنچی تھی کہ واقعی صابر والے معاملے میں فیروز ہی ملوث تھا۔ سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ آیا جن کے گھرے ملے تھے وہ فیروز اور شادو ہی تھے یا؟
دونوں بھائیوں کے سامنے میں نے اس لیے اسے یعنی فیروز کو ملوث کیا تھا تاکہ ان کے بھڑکے ہوئے جذبات ٹھنڈے ہوجائیں۔
اور یہ بات بھی کوئی حتمی نہیں تھی کہ جن چوڑیوں کا ذکر آیا ہے وہ صرف شادو نے ہی پہنی ہوں...... بازار میں ایک جیسی چوڑیوں کا ملنا ناممکن نہیں ہے۔
میں نے دونوں بھائیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"میری باتوں کا تم پر کوئی اثر ہوا ہے یا تمہارے دماغ کی سوئی ایک ہی نقطے پر اٹکی ہوئی ہے۔"
"تھانے دار صاحب ہم قانون کو ہاتھ میں نہیں لیں گے۔"
"ٹھیک ہے...... اب تم جاسکتے ہو...... لیکن مجھے شادو کی ایک تصویر چاہیے۔"
"میں صبح آپ کو دے جاؤں گا...... ایک ہی کاپی بہت ہوگی یا......"
"تم ایک ہی کاپی دے جاؤ۔"
پھر...... میں نے انہیں رخصت کردیا تھا۔
اس دن قدرت میرے اوپر خاص طور پر مہربان تھی...... کیونکہ میری خواہش کے عین مطابق شمروز اس وقت آیا جب میں اور اے ایس آئی شہاب الدین کھانا وغیرہ کھا کر فارغ ہوچکے تھے اور دونوں بھائی جاچکے تھے۔
شمروز ایک طویل قامت گوری چٹی رنگت کا بندہ تھا...... مردانہ وجاہت کا پیکر تھا...... اسے دیکھ کر میں ذہن میں اس کے بیٹے کا تصور لاسکتا تھا...... شادو کا اس کے بیٹے پر مرمٹنا کوئی ایسی انہونی بات نہیں تھی۔ میں نے اسے عزت سے بٹھایا...... وہ مجھ سے نظریں چرا رہا تھا۔
"شمروز بھائی...... کیسے ہو؟"
"اللہ کا فضل ہے...... جناب مجھے پتہ ہے کہ آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے؟"
"آپ کا بیٹا کہاں ہے؟" میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔
"جناب...... وہ تو اسی دن سے غائب ہے جس دن

صابر والا واقعہ ہوا تھا۔

''شمروز بھائی وہ واقعہ تو کہیں رات کو ہوا تھا...... پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق موت رات آٹھ اور نو بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی اور ہمیں اطلاع اگلی صبح ملی تھی۔

قارئین یہ ذہن میں رکھیں کہ وہ سردیوں کی رات کے آٹھ نو تھے اس وقت دسمبر ابھی شروع ہی ہوا تھا۔

''اوہ ...... جناب میرا مطلب یہ ہے کہ آپ تک اطلاع آٹھ دسمبر کو پہنچی ہوگی' فیروز سات دسمبر کی سہ پہر کو نکل گیا تھا۔''

''وہ کیا بتا کر گیا تھا کہ کہاں جا رہا ہے؟''

''وہ چپ چاپ نکل گیا تھا' ہم سمجھ رہے تھے بازار تک گیا ہوگا......شام تک آ جائے گا۔''

لیکن آج تک اس کی شکل نظر نہیں آئی' بعد میں ہمیں پتہ چلا تھا کہ اس کے کپڑوں اور دوسرے سامان والا بیگ غائب ہے' سات دسمبر کو وہ خالی ہاتھ گیا تھا۔ پتہ نہیں کب وہ بیگ لے گیا تھا......اور کہاں رکھا آیا تھا۔''

اس نے اپنی طرف سے ساری صورت حال میرے سامنے رکھ دی تھی۔

''بیگ والی بات یا کہانی اتنی اہم نہیں ہے جتنی یہ بات اہم ہے کہ وہ اپنے ساتھ شادو کو بھی بھگا لے گیا ہے۔ کیا آپ کے علم میں کوئی ایسی بات تھی کہ ان کی آپس میں کوئی کھچڑی پک رہی ہے؟''

''تھانے دار صاحب' آج کل اولاد ذرا جوان ہوتی ہے تو پیار محبت کے چکر میں پڑ جاتی ہے......اس نے ہمیں بتایا تھا کہ وہ شادو سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن ہم مجبور تھے' میں اپنے بھائی کرم دین سے بات چیت کر بیٹھا تھا۔

''اس دوران اس نے آپ لوگوں کے ساتھ کبھی رابطہ نہیں کیا۔''

''بالکل نہیں' تھانیدار صاحب...... وہ ہمارے لیے مر گیا ہے۔''

''آپ ایک کام کریں۔'' میں نے اسے کہا۔

''حکم کریں......''

''مجھے فیروز کی ایک تصویر چاہیے کیا گھر میں کوئی تصویر پڑی ہے؟''

''نیگیٹیو میں نے دیکھا تھا' گھر میں......'' شمروز نے بتایا۔

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے' ویسے بھی مجھے پانچ چھ کاپیاں چاہئیں۔''

''ٹھیک ہے تھانیدار صاحب میں کسی کے ہاتھ نیگیٹیو بھیج دیتا ہوں۔''

میں نے اسے رخصت کر دیا اس کو روکنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

قارئین آج کل فوٹو گرافر نیگیٹیو نہیں دے سکتے......جدید دور جو ہے لیکن جس دور کی یہ کہانی ہے' اس دور میں نیگیٹیو ساتھ دیتے تھے۔

اسی دن مجھے دونوں طرف سے نیگیٹیو مل گئے۔ شادو کے بھائی بھی نیگیٹیو ہی دے گئے تھے۔

میں نے سپاہی قمر کو بھیج کر دونوں کی چھ چھ کاپیاں کروالیں' پھر ہم نے ایک ایک کاپی اپنے پاس رکھ کر باقی کاپیاں قریبی تھانوں میں بھجوا دیں......اسے ہم شور وغوغا کہتے تھے...... یہ گمشدہ مرد وزن کو ڈھونڈنے کا ہمارا اپنا ایک طریقہ تھا۔

شادو اور فیروز ہمارے ہتھے چڑھتے تو صورت حال واضح ہوتی۔

ہم نے مخبروں کا بھی ارد گرد جال بچھا دیا تھا اب اتنے دن بعد ریلوے اسٹیشن یا لاری اڈے جا کر پوچھ گچھ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

اس طرح تقریباً پندرہ دن گزر گئے......لیکن کسی طرف سے کوئی حوصلہ افزا رپورٹ نہیں ملی۔

لیکن...... میں مایوس نہیں تھا......اور نہ میں نے ہمت ہی ہاری تھی۔ تھانے میں اور بھی چھوٹے موٹے کیس آتے رہتے ہیں ان کی طرف بھی ہمیں توجہ دینی ہوتی ہے۔

میری ڈائری میں لکھی تاریخ کے مطابق وہ نئے سال جنوری کی دس تاریخ تھی۔

پچھلے دن اور رات بارش ہوئی تھی۔ آسمان نکھر کر بڑا خوبصورت اور دلفریب منظر پیش کر رہا تھا...... ہر طرف بکھری چمکیلی چمکیلی دھوپ آنکھوں کو بھلی لگ رہی تھی۔

سردیوں میں یہ سہولت تو حاصل کرنی پڑتی تھی...... دفتر میرے کمرے کے پچھواڑے لگا ہوا تھا میں میز پر بکھرے

کاغذوں میں الجھا ہوا تھا کہ میری سماعت سے سپاہی قمر کی آواز ٹکرائی۔

''سر...... ایک خاتون آئی ہیں' کہہ رہی ہیں مجھے تھانیدار صاحب سے بہت ضروری کام ہے۔''

میرے ذہن میں ایک دم زینب کا نام گونج اٹھا۔

لیکن جب خاتون میرے سامنے آئی تو مجھے مایوسی ہوئی...... کیونکہ یہ تو کوئی اور تھی۔

کسی امیر گھرانے کی لگتی تھی ......عمر تیس سال کے اریب قریب ہوگی' نین نقش جاذب نظر اور رنگ گندمی تھا...... گلے میں سونے کا ہار تھا۔

میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا...... اور پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''تھانیدار صاحب میں ایک درخواست لے کر آئی ہوں۔''

''کدھر ہے درخواست......؟''میں نے جان بوجھ کر یہ فقرہ بولا تا کہ وہ بلاجھجک اور جلدی اپنے آنے کا مقصد بیان کردے۔

اس کے چہرے پرخجل سی مسکراہٹ آ گئی پھر وہ بولی۔

''تھانے دار صاحب...... دراصل میں زبانی کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں۔''

''دیکھیں خاتون آپ دیکھ رہی ہیں کہ میں کتنا مصروف ہوں' آپ کم سے کم لفظوں میں جو کچھ کہنا ہے کہہ دیں۔''

''میرے شوہر سیٹھ جاوید کے ساتھ ہاتھ ہوگیا ہے۔''

قارئین اس کی کہانی میں اپنے الفاظ میں بیان کردیتا ہوں۔

اس کے شوہر سیٹھ جاوید کی شہر میں گھی بنانے والی فیکٹری تھی۔ وہ اکثر خام مال لینے دوسرے شہر جاتا رہتا تھا۔ جو یہاں سے پچاس میل دور تھا۔ کہتے ہیں جب جوان مرد کو تنہائی میں جوان عورت مل جائے تو اس کے ساتھ لگا ہوا شیطان اسے ورغلا لیتا ہے۔ سیٹھ جاوید بھی بھٹک گیا۔ اس شہر میں اس وقت ایک بڑا ہوٹل تھا...... وہ اکثر وہاں رات بسر کرتا تھا' جب بھی اسے خام مال لیتے ہوئے اور بک کراتے ہوئے دیر ہوجاتی تھی وہ وہیں قیام کرتا تھا۔

آج سے (یعنی خاتون کے میرے پاس آنے سے) چھ دن پہلے وہ ایک ایسی ہی رات تھی۔ باہر سرد ہوائیں چل رہی تھیں لیکن کمرہ گرم تھا' کیونکہ بجلی کے ہیٹر لگے ہوئے تھے۔ سیٹھ جاوید کے سر میں ہلکا ہلکا درد تھا اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔

اس نے کمرے میں لگی گھنٹی بجائی اور تھوڑی دیر بعد ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

''آ جاؤ بھئی۔''

ویٹر رفیق دروازہ کھول کر اندر آ گیا...... یہ ویٹر اس کی بہت خدمت کرتا تھا۔ کیونکہ اسے بھاری ٹپ ملتی تھی۔

''رفیق...... میرے سر میں درد ہے...... ذرا بلیک کافی تو لے آؤ۔''

''ابھی لایا...... سر ڈسپرین بھی لے آؤں۔''

''نہیں...... وہ میرے پاس ہے' تم تازہ پانی بھی ساتھ لے آنا۔'' تقریباً بیس منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی۔

''آ جاؤ۔''

لیکن...... آنے والا رفیق تو نہیں تھا...... ایک انتہائی خوبصورت لڑکی تھی...... جس کے ہاتھوں میں ٹرے تھی...... اس نے ٹرے کو میز پر رکھ دیا اور مترنم ہنسی ہنستے ہوئے اس کے لب ہلے۔

''سر رفیق کے پیٹ میں اکثر درد اٹھتا ہے' اس وقت بھی وہ نیچے درد سے کراہ رہا ہے...... میں اس کے کہنے پر آ گئی ہوں' اس نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

پھر...... اس نے شیشے کے خوبصورت گلاس میں پانی ڈال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔''آپ گولی کھالیں' میں آپ کے لیے کافی بناتی ہوں۔''

سیٹھ جاوید کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی جادو کے زیر اثر ہو...... لڑکی کے کپڑوں سے بھینی بھینی خوشبو اٹھ رہی تھی۔

گولیاں کھا کر اس نے کافی پی...... لڑکی نے اسے کہا۔

''آپ لیٹ جائیں میں آپ کا سر دبا دیتی ہوں۔''

پھر ان کے درمیان شیطان نے آ کر اپنا کام کرنا شروع کردیا۔

اس کے بعد سیٹھ جاوید کو کوئی ہوش نہیں رہا...... اس نے ڈسپرین کے ساتھ ایک سکون آور گولی بھی کھالی تھی۔
صبح جب وہ سوکر اٹھا تو کمرہ خالی تھا...... رات کو اس نے اپنا پرس سرہانے کے نیچے رکھا تھا...... پرس وہیں تھا...... لیکن اس میں صرف پانچ سو روپے تھے جبکہ رات کو اس کے پرس میں تقریباً دس ہزار روپیہ تھا۔
اس دور کے حساب سے یہ ایک بہت بڑی رقم تھی۔ اتنی رقم کے لیے کوئی کسی کو قتل بھی کرسکتا تھا۔
اس نے سوچا...... یہ سب سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہوا ہے' اس نے پہلے شور شرابا کرنے کے متعلق سوچا...... پھرارادہ ملتوی کردیا' اس میں اپنی ہی رسوائی تھی' خواہ مخواہ جگ ہنسائی والی بات تھی۔
وہ ہوٹل کا بل ادا کرکے چپ چاپ آ گیا...... ویسے رات جو کچھ ہوا تھا اس میں اس کے ارادے کو دخل نہیں تھا' وہ اپنی بیوی سے محبت کرتا تھا...... وہ ایسے کسی کام کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا...... اس کے دل میں چور نہیں تھا' اس لیے گھر آ کر اس نے اپنی بیوی کو سب کچھ بتادیا۔
''خاتون آپ بہت دل گردے والی ہیں...... ایسی باتیں بیویاں برداشت نہیں کرتیں۔''
''تھانیدار صاحب...... میں ماشاء اللہ پڑھی لکھی ہوں...... میں بھی جاوید سے محبت کرتی ہوں' انسان' انسان ہے فرشتہ نہیں بن سکتا...... ان کے ایک لمحے کی کمزوری کو بہانہ بنا کر میں اپنی ہنستی کھیلتی زندگی کو جہنم نہیں بنا سکتی تھی۔ سچ پوچھیں تھانیدار صاحب' میں جاوید کی اجازت سے اسی لیے آپ کے پاس آئی ہوں کہ آپ ایسے واقعات کا سدباب کریں...... وہ خود آتے ہوئے شرمندگی محسوس کررہے تھے۔''
''خاتون وہ ہوٹل بے شک پچاس میل دور شہر میں واقع ہے لیکن میں متعلقہ تھانے میں اپنا بندہ بھیج دیتا ہوں۔''
''بڑی مہربانی تھانیدار صاحب...... اگر آپ جیسے فرض شناس افسر موجود ہوں تو جرائم کی ماں خود بخود مرجاتی ہے۔''
اس کے جانے کے بعد میں اس کے متعلق سوچنے لگا...... اس کے کردار نے مجھے متاثر کیا تھا۔

جب کوئی کام ہونا ہوتا ہے تو سبب خود بخود بن جاتا ہے۔

میں نے اسی وقت اے ایس آئی شہاب الدین کو بلالیا اور ساری صورت حال اس کے سامنے رکھ دی۔

''سر...... ایسے کیس عموماً تھانے تک نہیں پہنچتے...... بہرحال آپ حکم کریں کہ کیا کرنا ہے؟''

''تم متعلقہ تھانے میں جاؤ اور وہاں کے تھانیدار کو سارے حالات سے آگاہ کردو۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ ناسور ختم ہوجائے۔''

''ٹھیک ہے سر میں انشاء اللہ دو تین گھنٹوں میں روانہ ہوجاتا ہوں۔ تاکہ شام سے پہلے پہلے وہاں پہنچ جاؤں۔''

اس کے جانے کے بعد میں پھر صابر والے واقعے کے متعلق سوچنے لگا' ابھی تک عدیل نہیں آیا تھا...... وہ اپنے گھر والوں خاص طور پر اپنے باپ کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا...... اس کے اوپر اتنا پکا شک نہیں تھا کہ ہم ہاتھ دھو کر صرف اس کے پیچھے ہی پڑ جاتے۔

اگلے دن صبح دس بجے کے قریب اے ایس آئی کا فون آیا...... وہ کہہ رہا تھا۔

''سر...... متعلقہ تھانے دار صاحب مجھ سے سارے حالات سن کر طیش میں آگئے تھے' کہنے لگے میری ناک کے نیچے اتنا گھناؤنا دھندہ ہو رہا ہے۔''

''پھر تو انہوں نے فوراً ایکشن لیا ہوگا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''بالکل سر...... ہوٹل سے سات لڑکیاں برآمد ہوئی ہیں...... سارا عملہ گرفتار ہوگیا ہے...... ان میں دو نگ ایسے ہیں کہ آپ خوش ہوجائیں گے۔''

پھر اس نے تفصیل بتا کر فون بند کردیا...... ابھی اسے دو دن اور لگنے تھے۔

تیسرے دن وہ آ گیا...... دونوں کو دیکھ کر میرا جی واقعی خوش ہوگیا۔ وہ فیروز اور شادو تھے۔

فیروز ابھی تک ویٹر کی وردی میں تھا۔ سب سے پہلے اسے ہی میرے سامنے لایا گیا۔

اس نے اپنے بال بڑھا لیے تھے...... اور مونچھیں بالکل صاف کروالی تھیں۔

''تم نے بھیس بدلنے کی بھونڈی کوشش کی ہے۔'' میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اور ہونٹ خشک ہوگئے تھے۔

''تم خود ہی سب کچھ بک دو...... ورنہ تمہارے ہونٹوں کا تالا کھلوانے کے لیے مجھے تمہیں الٹا لٹکا کر نیچے مرچوں کی دھونی دینی پڑے گی۔''

''تھانے دار صاحب میں سب کچھ آپ کو بتا دیتا ہوں۔''

پھر......!

وہ شروع ہوگیا۔

تھانے دار صاحب...... میں شادو سے واقعی محبت کرتا ہوں...... جب مجھے اس سے شادی کی کوئی سبیل نظر نہیں آئی تو ہم نے گھر سے بھاگ جانے کا فیصلہ کرلیا۔ ہم نے قبرستان میں اکٹھے ہونا تھا...... وہاں پر میں نے اپنے دادا کی قبر پر اور شادو نے اپنی دادی اور نانی کی قبر پر فاتحہ پڑھنا تھی...... وہاں ہمیں صابر مل گیا...... وہ بھی اپنے دادا کی قبر پر کھڑا فاتحہ پڑھ رہا تھا...... ہم دونوں اسے دیکھ کر بوکھلا گئے...... ہم نے یہ سمجھا کہ اس نے ہمیں دیکھا نہیں ہے...... لیکن جونہی ہم نے قدم آگے بڑھائے وہ بولا۔

''ٹھہر جاؤ...... وہ ایک چاندنی رات تھی...... ہر چیز واضح نظر آرہی تھی۔ اس نے ہمیں بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ تم دونوں اس وقت یہاں......؟''

ہم سے کوئی جواب نہیں بن پڑ رہا تھا...... میں بھی صابر کو جانتا تھا...... اور میرے علم میں یہ بات بھی تھی کہ صابر' شادو کے بھائیوں کا دوست ہے۔ مجھے اس بات کا ڈر نہیں تھا کہ صابر کی وجہ سے سب کو پتہ چل جائے گا کہ میں شادو کو لے جارہا ہوں' کیونکہ میرے اور شادو کے اکٹھے غائب ہوجانے سے سب کو ویسے ہی پتہ چل جانا تھا...... کہ میں شادو کو بھگا لے گیا ہوں...... میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ صابر ہم سے کسی قسم کے سوال وجواب نہ کرے اور ہمیں جانے دے۔''

لیکن...... وہ ہماری راہ کی دیوار بن گیا' اس نے مضبوط لہجے میں کہا مجھے سب سمجھ آ گئی ہے۔'' اس نے میری طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

''تم میرے دوستوں کی بہن کو بھگا کر لے جارہے ہو...... شرم کرو...... میں یہ نہیں ہونے دوں گا...... پھر اس

نے شادو کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا تم کو کیا ہو گیا ہے' شادو' کیوں اپنے ماں باپ کی عزت اور بھائیوں کی غیرت کا جنازہ نکالنے پر تل گئی ہو۔ آؤ میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔"

شادو نے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑایا تو اس کی کچھ چوڑیاں ٹوٹ کر بکھر گئیں۔

وہ ایک دفعہ پھر ہمارے درمیان آ گیا...... مجھے غصہ آ گیا...... میں نے زور سے اسے دھکا دیا تو وہ گر گیا...... اس کی بھیانک چیخ میرے کانوں سے ٹکرائی...... لیکن میں وہاں رکا نہیں' شادو کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے نکل آیا۔" وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے غصے سے اس کے منہ پر تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔

"صابر مر گیا ہے...... اور اس کے قاتل تم ہو...... تمہارے دھکے سے اس کا ماتھا ایک نوکیلے پتھر پر جا لگا تھا...... جو اس کے دماغ میں گھس گیا تھا۔"

وہ تھر تھر کانپنے لگا...... پھر ایسی آواز میں بولا جیسے اسے جاڑے والا بخار چڑھ گیا ہو۔

"تھانیدار صاحب...... خدا گواہ ہے' میرا صابر کو مارنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔"

"یہ سب تو تم عدالت میں بتانا...... تمہارے اوپر شادو کے اغواء کا مقدمہ بھی بنے گا...... ویسے شادو کے بھائی تمہارے خون کے پیاسے ہیں۔"

"خدارا مجھے ان سے بچالیں...... میں نے شادو کو اغوا نہیں کیا تھا اور نہ اسے زبردستی لے گیا تھا وہ اپنی مرضی سے گئی تھی...... بے شک اسے بلا کر پوچھ لیں۔"

"اس سے تو میں پوچھ لوں گا ہی...... پہلے آج کے فرہاد صاحب تم یہ بتاؤ کہ کسی مجسٹریٹ کی عدالت میں تم نے اس کا بیان ریکارڈ کروایا ہے' اس سے نکاح کیا ہے؟"

وہ بغلیں جھانکنے لگا۔

میں نے اس کے منہ پر ایک اور تھپڑ مارتے ہوئے خوفناک لہجے میں کہا۔

"تم ہوٹل میں اس سے پیشہ کرواتے تھے۔"

"تھانیدار صاحب...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں' شادو میری محبت ہے۔ میں اس سے نکاح کرنا چاہتا ہوں...... ہوٹل میں' میں نے اسے ہوٹل کے مالک سے ایک کمرہ لے کر رکھا ہوا تھا...... میں وہاں صرف ویٹر کا کام کرتا تھا...... وہاں ہونے والے دھندے سے ہمارا کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا...... ہوٹل کا مالک باقاعدہ میری تنخواہ سے کمرے کا کرایہ کاٹتا تھا...... میں چار پیسے جمع ہونے کے انتظار میں تھا۔"

"اب یہ انتظار تم جیل کی کال کوٹھڑی میں کرنا۔"

اس کے بعد میں نے اسے حوالات میں بند کروا کے شادو کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

اس نے بتایا...... کہ وہ اپنی مرضی سے فیروز کے ساتھ گئی تھی۔ لیکن اب پچھتا رہی ہے کہ اس نے کیوں اپنے ماں باپ اور بھائیوں کی غیرت کو نیلام کیا تھا...... اس نے یہ بتایا کہ ابھی تک انہوں نے میاں بیوی والا کھیل نہیں کھیلا تھا...... میں نے جب اسے یہ بتایا کہ ان کے ہاتھوں صابر کا قتل ہو چکا ہے تو وہ تھر تھر کانپنے لگی...... پھر رونے لگ گئی ...... اب وہ اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتی تھی۔

صابر کافی باتیں اپنے ساتھ ہی لے گیا تھا...... یہ معمہ حل نہ ہو سکا کہ وہ اس وقت قبرستان میں فاتحہ خوانی کے لیے کیوں گیا تھا؟ اس کے لیٹ آنے کے متعلق مجھے پتہ چل چکا تھا' کیونکہ اس دن گاڑی پانچ گھنٹے لیٹ آئی تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں اس کے مرنے کا وقت رات آٹھ اور نو کے درمیان لکھا تھا' اس کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے۔

پھر...... قارئین میرے خیال میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ صابر کو موت اس وقت وہاں لے گئی تھی۔



# تقدیر

**سلیم اختر**

شک اک ایسا پودا ہے جس کی جڑیں انتہائی گہری اور دور تک پھیلتی ہیں اس کی خاصیت ایسی ہوتی ہے کہ یہ محبت کی کونپلوں کو جلا کر خاک کردیتی ہیں اور دل کی زمین کو بنجر کردیتی ہیں۔ شک کے مارے اک شخص کی روداد، جس نے کئی زندگیوں کو تباہ کردیا تھا



میں نے دہلی کے نواح میں واقع ایک گاؤں کھنگر پور میں جنم لیا۔ ہمارے گاؤں میں مسلمانوں کا ایک بھی گھر نہ تھا۔ میرے باپو گنیش کمار گاؤں کے سب سے بڑے آدمی سمجھے جاتے تھے کیوں کہ ہمارا گھرانا مالی طور پر سب سے زیادہ مضبوط اور بہت سی زمین کا مالک تھا۔ نوکروں کی فوج تھی۔ ہر کوئی ہماری عزت کرتا تھا اور بہت سے لوگ ہمارے قرض دار تھے۔ ہمارے گاؤں سے ایک میل کے فاصلے پر دوسرا گاؤں رام گڑھ تھا۔ رام گڑھ کا زمیندار ٹھاکر بلدیورام تھا۔ وہ بدمعاشی میں اپنی مثال آپ تھا۔ اس کے ہاتھ لمبے تھے۔ پولیس والوں سے اس کی ہمیشہ دوستی رہتی تھی۔ چھوٹے موٹے جرم کرنا اس کے نزدیک محض ایک کھیل تھا۔ علاقے کے لوگ اس کی اصلیت جانتے تھے مگر کسی میں اتنا دم نہ تھا کہ وہ بلدیورام کے خلاف ایک لفظ بھی کہے۔ اس کے باوجود دونوں خاندانوں میں برسوں سے دوستی اور بھائی چارہ چلا آرہا تھا۔ ہم دونوں خاندانوں کے افراد کا ایک دوسرے کے گھروں میں آزادانہ آنا جانا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے تھے۔ جب کہ رام گڑھ اور ہمارے گاؤں کے درمیان بھی مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا گاؤں آباد تھا۔ ان لوگوں کے ساتھ نہ تو ہماری دوستی تھی اور نہ دشمنی۔ گھریلو استعمال کی اشیاء کے لئے تو وہ لوگ ہمارے گاؤں آتے تھے یا پھر رام گڑھ چلے جاتے تھے۔

مجھ سے بڑے بھائی راکیش کمار، ممبئی میں ملازمت کرتے تھے۔ وہ وہاں وہ کسی اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ ہماری ایک بہن شکنتلا تھی جو مجھ سے بڑی اور راکیش بھائی سے چھوٹی تھی۔ ہم بہن بھائیوں میں بے حد پیار تھا۔ راکھی کا تہوار ہم نہایت جوش و خروش سے مناتے تھے۔ رام گڑھ ٹھاکر بلدیورام کی صرف دو بیٹیاں تھیں۔ ارچنا بڑی اور کملا چھوٹی تھی۔ میں چونکہ رام گڑھ کے صرف ایک ہی بار گیا تھا اس لئے میں ٹھاکر کے خاندان کے بارے میں کم ہی جانتا تھا لیکن سن رکھا تھا کہ بلدیورام کی دونوں بیٹیاں نہایت ہی خوبصورت ہیں۔ علاقے میں ان جیسی حسین کوئی اور لڑکی نہیں ہے۔ ٹھاکر بلدیورام کو بیٹے کی شدید خواہش تھی۔ اس نے بہت منتیں مانیں، چڑھاوے چڑھائے مگر اس کی مراد بر نہ آئی۔

پتا جی اور راکیش بھیا عموماً رام گڑھ جاتے رہتے تھے۔ ٹھاکر بلدیورام بھی اکثر ہمارے گھر آتا رہتا تھا پھر بھی نہ جانے کیوں وہ مجھے اچھا نہ لگتا تھا۔ میں اس سے دور ہی رہتا تھا۔ وہ جب بھی ہمارے گھر آتا، ہم تینوں بہن بھائیوں کے لئے تحفے ضرور لاتا تھا۔ پتا جی بھی جب رام گڑھ جاتے تو وہ ارچنا اور کملا کے لئے کچھ نہ کچھ لے کر ہی جاتے تھے۔

......☆☆☆......

میں نے میٹرک کا امتحان اپنے گاؤں کے اسکول سے پاس کیا تو مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے دہلی چلا آیا۔ میں نے قیام کے لئے ہاسٹل کو پسند کیا تھا۔ شہری ماحول مجھے بے حد پسند تھا اور اس سے بڑھ کر کالج لائف بے فکری اور کیف بھی اور بے چین و پرسکون بھی۔ مجھے یہ زندگی اس قدر راس آئی کہ میں نے گاؤں جانا بہت ہی کم کردیا جس کی شکایت گھر کا ہر فرد کرنے لگا مگر میں اپنی ہی دھن میں مگن



تھا۔ راکیش بھائی بھی گاؤں سے دور ہی بھاگتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ بمبئی میں ملازمت کررہے تھے۔ میں اب گاؤں جاتا بھی تو محض شکنتلا کی وجہ سے کیوں کہ وہ میری اکلوتی اور لاڈلی بہن تھی۔ خود شکنتلا بھی ہم دونوں بھائیوں کو بہت چاہتی تھی۔

میں ان دنوں سیکنڈ ایئر میں تھا کہ انجنا نامی ایک لڑکی بمبئی سے آئی اور اس نے تھرڈ ایئر میں داخلہ لیا۔ انجنا کو جس نے بھی دیکھا، دیکھتا ہی رہ گیا کیونکہ وہ بلا کی حسین تھی۔ میں خود بھی اسے پسند کرنے لگا تھا مگر اب تک تعارف سے بات آگے نہیں بڑھی تھی کہ انہی دنوں کالج میں چھٹیاں ہو گئیں۔ مجبوراً مجھے گاؤں آنا پڑا۔ اتفاق سے راکیش بھیا بھی کچھ دنوں کے لئے گاؤں آگئے تھے۔ میں بہت خوش تھا کہ اب چھٹیاں اچھی گزر جائیں گی۔

جس دن میں گاؤں پہنچا اس کے دوسرے ہی دن میرے ماتا اور پتا جی نے رام گڑھ جانے کا پروگرام بنالیا۔ انہوں نے کچھ تحفے بھی خرید لیے تھے۔ میری ماتا جی کم ہی رام گڑھ جاتی تھیں لیکن اس بار انہوں نے پہل کی تھی۔ ان کی تیاری دیکھ کر مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ ایسا جوش و خروش میں نے اس سے قبل کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان دونوں کے رام گڑھ جانے کے بعد میں نے راکیش بھیا سے پوچھا تو وہ کہنے لگا۔

''ہاں راجیش! تمہارا تجسس درست ہے۔ تم رام گڑھ ایک ہی بار گئے ہو اور وہ بھی کئی سال قبل جب تم بچے تھے مگر میں تو عموماً رام گڑھ جاتا رہتا ہوں جس کی اہم وجہ ٹھاکر کی بیٹی ارچنا ہے۔ میں ارچنا سے پریم کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بھی مجھے پسند کرتی ہوگی۔ راجیش! تم نے اسے جوانی کے روپ میں نہیں دیکھا۔ اگر تم بھی اسے دیکھ لو تو اپنا دل ہار بیٹھو۔ ارچنا خوبصورتی کا مجسمہ ہے۔ وہ کسی شاعر کا خواب ہے۔ میں نے ماتا اور پتا جی کو اپنے دل کی بات بتا دی ہے کیونکہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ خود بھی ارچنا کو

پسند کرتے ہیں اور اسے بہو بنا کر ٹھاکر سے اپنے تعلقات مضبوط بنانا چاہتے ہیں تاکہ علاقے میں ہماری آن اور شان میں مزید اضافہ ہو جائے۔ آج وہ اسی مقصد کے لئے رام گڑھ گئے ہیں۔ بھگوان کرے، ٹھاکر ہاں کہہ دے۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر تمہاری شادی بھی ارچنا کی چھوٹی بہن کملا سے کر دیں گے جو ارچنا کی طرح خوبصورت ہے۔ میں نے اسے کم ہی دیکھا ہے اور اس سے ملاقات بھی کم ہی ہوتی ہے کیونکہ وہ دہلی میں تعلیم حاصل کر رہی ہے اور ہاسٹل میں رہتی ہے۔''

راکیش بھائی کی زبانی ان کی محبت کی کہانی سن کر میں نے کہا۔ ''میری دعا ہے کہ آپ کے من کی مراد پوری ہو جائے مگر میں باز آیا گڑھ والوں اور ٹھاکر بلدیو رام سے۔ ویسے بھی میں دیہاتی لڑکی کی بجائے کسی شہری لڑکی سے شادی کرلوں گا اور تمام عمر شہر میں ہی گزاروں گا کیونکہ مجھے دیہاتی زندگی پسند نہیں ہے اس لئے آپ اپنے بارے میں سوچیں۔ میرے اور کملا کے بارے میں نہیں۔''

''تم نے شہر میں کوئی لڑکی پسند کر لی ہوگی اسی لئے ایسی باتیں کر رہے ہو۔'' راکیش بھائی نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کی تردید کر دی اور کہا۔ ''فی الحال مجھے صرف اپنی پڑھائی سے غرض ہے۔ اس بارے میں سوچوں گا۔''

ہمیں یقین تھا کہ ماتا اور پتاجی کامیاب لوٹیں گے مگر خلاف توقع وہ لوگ دوپہر ہی کو واپس آ گئے۔ ان کے افسردہ چہرے دیکھ کر ہم پریشان ہو گئے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ٹھاکر جی نے ارچنا کا رشتہ دینے سے انکار کر دیا ہے۔ وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ ارچنا کی پہلے سے منگنی ہو چکی ہے۔ بلدیو رام نے ماتا اور پتاجی سے معذرت کی اور کہا کہ اگر ارچنا کی منگنی نہ ہوئی ہوتی تو مجھے یہ رشتہ منظور تھا مگر اب جب کہ ارچنا کی نہ صرف بات طے ہو چکی ہے بلکہ چند ماہ بعد اس کی شادی بھی ہونے والی ہے تو میں کیسے یہ رشتہ قبول کرلوں۔ بلدیو رام نے اپنی چھوٹی بیٹی کملا دیوی کے رشتے کی پیش کش کرتے ہوئے کہا کہ اس کی ابھی منگنی نہیں ہوئی۔ اگر اس کو آپ اپنی بہو بنانا چاہتے ہیں تو آج سے یہ رشتہ طے سمجھیں۔ پتاجی نے ٹھاکر بتایا کہ راکیش تو صرف ارچنا کو پسند کرتا ہے اور اسی سے ہی شادی کا خواہش مند ہے۔ ہم اس سے کملا کے بارے میں بات کریں گے۔ اگر راکیش مان گیا تو ہم دوبارہ آئیں گے اور منگنی کی رسم ادا کر جائیں گے۔''

راکیش بھائی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے وہ کہنے لگے۔ ''میری پسند تو صرف ارچنا ہے۔ میں نے اپنا سب کچھ اسے ہی جان لیا تھا اگر وہ میری قسمت میں نہیں تو اور کوئی بھی میری زندگی میں حصے دار نہیں بن سکتی۔ میں کملا سے شادی نہیں کر سکتا کیونکہ وہ میری پسند نہیں ہے اس لئے آپ بلدیو رام کو جواب دے دیں کہ وہ کملا کے لئے ہمارا انتظار نہ کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ رام گڑھ والوں سے دوستی اور تعلقات بھی ختم کر ڈالیں۔''

راکیش بھائی اس وقت دکھ اور درد میں مبتلا ہو کر الٹی سیدھی باتیں کرنے لگے کہ اب وہ عمر بھر شادی ہی نہیں کریں گے۔ ماتا پتا نے انہیں بہت سمجھایا مگر اس وقت کوئی بھی بات ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اور اگلے ہی دن وہ بمبئی چلے گئے۔

ماتا اور پتاجی نے مجھ سے پوچھا کہ اگر میں کملا سے شادی کرنے پر رضامند ہوں تو وہ بات کریں۔ مگر میں نے بھی کملا سے شادی کرنے سے انکار کر دیا اور کہا۔ ''آپ لوگ جانتے ہیں کہ مجھے بلدیو رام سے نفرت ہے اس لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اس کا داماد بن جاؤں۔''

میرے انکار کے بعد پتاجی نے رام گڑھ جا کر بلدیو رام کو بتا دیا کہ وہ کملا دیوی کی شادی جہاں بھی کرنا چاہے، کر دیں۔ ہمارا انتظار نہ کرے۔

......☆☆☆......

میری چھٹیاں ختم ہو گئیں تو میں دہلی لوٹ آیا۔ آتے ہی کولج یونین کے الیکشن شروع ہو گئے۔ میں چونکہ اپنے کالج کی ہاکی ٹیم کا کپتان تھا لہٰذا میرے دوستوں نے مجھے سیکرٹری کے عہدے کے لئے الیکشن لڑنے پر مجبور کر دیا۔ میں اس بکھیڑے میں نہیں پڑنا چاہتا تھا مگر دوستوں کے اصرار پر اس میدان میں کود پڑا اور کاغذات جمع کر ڈالے۔

بلبیر سنگھ میرا گہرا دوست تھا۔ وہ امرتسر کا رہنے والا تھا۔ ہم ہوسٹل میں ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ بلبیر سنگھ یاروں کا یار تھا اور دوستوں کی خاطر ہر قسم کا خطرہ مول لے

لیتا تھا۔ اس نے ایک دوبار بے لفظوں میں مجھے منع کیا کہ میں الیکشن میں حصہ نہ لوں مگر میں نے اس کی بات ان سنی کر دی اور یہ نہ جان پایا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہا ہے۔ ہمارا مخالف گروپ بھی خاصا طاقتور تھا۔ مخالف گروپ کی طرف سے سیکرٹری کا الیکشن لڑنے والی انجنا تھی۔ اس کے علاوہ اور کوئی بھی لڑکی الیکشن میں حصہ نہیں لے رہی تھی۔ مخالف گروپ صرف اسی لئے انجنا کو سامنے لایا کہ لڑکیوں کے ساتھ لوگوں کی ہمدردیاں عموماً زیادہ ہوتی ہیں۔ جب مجھے علم ہوا کہ میرے مقابل ایک لڑکی ہے تو جی چاہا کہ میں اپنا نام واپس لے لوں مگر پھر سوچا، یہ بزدلی ہوگی لہٰذا میں بھی ڈٹ گیا۔ الیکشن کی گہما گہمی عروج پر پہنچ گئی۔ بلبیر سنگھ نے انتخابی مہم کی میں میرا بہت ساتھ دیا مگر اس نے انجنا کے خلاف کوئی بات نہ کی حالانکہ میرے دیگر ساتھی اسے بے ہودہ ہونے کا طعنہ دے رہے تھے۔ ساتھ ہی خواہ مخواہ اس کے اسکینڈل بھی بنا رہے تھے مگر بلبیر سنگھ خاموش تھا۔ میں نے ایک دوبار اس سے انجنا کے سلسلے میں بات کی مگر وہ ٹال گیا۔ الیکشن کی اس مہم میں لڑائی جھگڑے بھی ہوئے۔ دھواں دار تقریریں کی گئیں، ایک دوسرے پر الزامات بھی عائد کئے گئے۔ آخر کار الیکشن کا دن بھی آپہنچا اور پھر جب نتیجہ نکلا تو میری پارٹی ہار گئی۔ انجنا گروپ جیت گیا۔ مجھے اپنی ہار کا بہت دکھ ہوا۔ میں چار دن کالج بھی نہ گیا اور سارا دن ہوسٹل کے کمرے میں بند رہا لیکن پھر مجبور ہو کر کالج جانا شروع کر دیا۔ انجنا چونکہ تھرڈ ایئر میں پڑھتی تھی اس لئے میرا اور اس کا آمنا سامنا کم ہی ہوتا تھا اگر اتفاق سے وہ میرے مقابل آ بھی جاتی تو مجھ میں اس سے نگاہیں ملانے کی جرات نہ ہوتی۔ میں نگاہیں نیچی کر کے گزر جاتا۔ سیکنڈ ایئر کا امتحان ہوا تو کچھ عرصے کے لئے کالج بند ہو گئے۔ مجبوراً مجھے گاؤں میں آنا پڑا۔

گاؤں آ کر معلوم ہوا کہ ارچنا کی شادی ہو رہی ہے پتا جی اس شادی میں شرکت کے لئے تیار تھے مگر ان کے علاوہ ہم میں سے کوئی بھی اس شادی میں شرکت کے لئے تیار نہ ہوا۔ پتا جی نے بہت اصرار کیا۔ انہوں نے ارچنا کے لئے قیمتی تحفے بھی خرید لئے تھے مگر وہ ارچنا کی شادی میں شرکت نہ کر سکے کیونکہ شادی سے دو دن قبل ہی ایک رات ارچنا گھر سے فرار ہو گئی۔ صبح جب بلدیو رام کو ارچنا کے فرار کا علم ہوا تو وہ غصے سے پاگل ہو گیا۔ کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ ارچنا کہاں گئی ہے اور کس کے ساتھ گئی ہے؟ بلدیو رام نے زمین آسمان ایک کر ڈالا مگر ارچنا کو ملنا تھا نہ ملی۔ ارچنا کے منگیتر نے بھی اسے بہت ڈھونڈا مگر ارچنا نے اپنے پیچھے کوئی ایسا نشان نہیں چھوڑا تھا جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ وہ کہاں گئی ہے؟

جب بلدیو رام ہر طرف سے مایوس اور ناکام ہو گیا تو اس کا دھیان ہمارے گاؤں اور ہمارے خاندان سے ہوتا ہوا راکیش تک جا پہنچا۔ شک کا پودا اس کے دماغ میں سر اٹھانے لگا۔ اس معمولی سے شک نے ہمارے برسوں پرانے تعلقات میں دراڑیں ڈال دیں۔ دوستی اور بھائی چارہ دشمنی میں ڈھل گئے۔ بلدیو رام کو یقین سا ہو گیا کہ راکیش اور ارچنا ایک دوسرے سے محبت کرتے ہوں گے اس لئے کنیش کمار اپنے بیٹے کے لئے ارچنا کا رشتہ مانگنے آیا تھا اور جب میری طرف سے انکار ہو گیا تو ارچنا اور رراکیش نے مل کر میری عزت خاک میں ملانے کا پروگرام بنایا ہوگا۔

بلدیو رام نے ایک آدمی کے ذریعے پتا جی کو دھمکی دی کہ تمہارا بیٹا راکیش میری بیٹی ارچنا کو بھگا کر لے گیا ہے۔ اس نے میری عزت نیلام کی ہے۔ میں ان دونوں کو ایسی بھیانک سزا دوں گا کہ تمہاری آنے والی نسلیں بھی ایسا قدم نہ اٹھائیں گی۔ میں تمہارے خاندان سے بھی بھیانک انتقام لوں گا۔

ہم بلدیو رام کی دھمکی سن کر حیران ہو گئے کہ اس نے بغیر سوچے سمجھے ہم پر اتنا بڑا الزام کیوں لگایا؟ ہمیں یقین تھا کہ راکیش بھائی اتنا بڑا قدم اٹھانے کی جرات نہیں کر سکتے۔ یہ درست تھا کہ وہ ارچنا کو پسند کرتے تھے لیکن اب وہ خاموش ہو گئے تھے کہ شاید قدرت کو اس کا اور ارچنا کا ملن منظور نہیں تھا۔ یہ علیحدہ بات تھی کہ اس غم کی وجہ سے انہوں نے عمر بھر شادی نہ کرنے کا عہد کر لیا تھا مگر ارچنا کو بھگا کر لے جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ارچنا گاؤں کے کسی اور لڑکے سے محبت کرتی ہوگی اور وہ اسی لڑکے کے ساتھ فرار ہو گئی ہوگی۔ ایک طرح مجھے سکون بھی ملا کہ اچھا ہوا کہ وہ میری بھابی نہیں بنی۔ اگر ایسا ہو جاتا تو پھر ممکن ہے کہ وہ ہماری عزت کا بھی جنازہ نکال دیتی۔

پتا جی کو بھی راکیش بھائی پر اعتماد تھا پھر بھی وہ فوراً بمبئی روانہ ہو گئے کہ ممکن ہے یہ حقیقت ہو اور ارچنا، راکیش بھیا کے پاس ہو۔ راکیش بھائی پتا جی کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ان کی آمد کی وجہ جان کر وہ بھی پریشان ہو گئے اور کہنے لگے۔

''پتا جی! میں ارچنا کو صرف اپنی حد تک پسند کرتا تھا مگر ارچنا کو میری چاہت کا علم نہیں تھا۔ ارچنا یقیناً گاؤں کے کسی اور لڑکے سے محبت کرتی ہو گی اور کسی کے ہمراہ فرار ہو ئی ہو گی۔ میں اس سے لاعلم ہوں۔ آپ بلدیو رام کو جا کر سمجھائیں کہ وہ مجھ پر شک نہ کرے۔''

پتا جی نے واپس آ کر بلدیو رام کو بتایا کہ ارچنا راکیش کے ساتھ نہیں گئی بلکہ کسی اور کے ساتھ گئی ہو گی اس لئے تم اصل مجرم کا پتا لگاؤ۔ میں بھی اس سلسلے میں تمہاری مدد کروں گا مگر بلدیو رام نے پتا جی کی بات کا یقین نہ کیا۔ وسوسوں اور اندوہناک سوچوں کے ناگ اس کے وجود کو ڈسنے لگے۔ اس نے ہمیں ہی موردِ الزام ٹھہرایا۔ اس نے میرے پتا جی کی بے عزتی کی اور کہا۔

''کنیش کمار! تم نے مجھے برباد کیا ہے۔ میں تمہیں بھی برباد کر ڈالوں گا۔ تمہارے بیٹے نے میرے منہ پر جو کالک ملی ہے، میں اس کا بدلہ لوں گا۔ ارچنا تمہارے بیٹے راکیش کے پاس ہے۔ میں جلد ہی اسے ڈھونڈ لوں گا۔''

پتا جی پریشان ہو کر واپس آ گئے۔ بلدیو رام کی دھمکی نے ہمیں بھی پریشان کر ڈالا تھا کہ کہیں بلدیو رام کی نفرت ہمارے گھر کی دیواریں نہ ہلا دے کیونکہ شک اور نفرت ایسے پودے ہیں جنہیں صرف بونے کی ضرورت ہوتی ہے پھر یہ خود بخود تیزی سے پرورش پاتے ہیں اور بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ پتا جی نے اسے معاملے کو خوش اسلوبی سے طے کرنے کی بہت کوشش کی مگر بلدیو رام نے ہماری کوئی بات نہ سنی۔ یوں برسوں پرانے تعلقات ختم ہو گئے اور زندگی کا چلن ہی بدل گیا۔

......☆☆☆......

میری چھٹیاں ختم ہونے میں صرف دو دن باقی تھے کہ ارچنا کی لاش ہمارے گاؤں کے باہر ایک کنویں کے قریب پڑی ہوئی ملی۔ کسی نے اسے بے آبرو کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ رام گڑھ والے ارچنا کی لاش لے گئے۔ بلدیو رام نے پہلے پولیس کو خبر نہ ہونے دی۔ اس نے خاموشی سے ارچنا کی چتا کی راکھ کو بہا دیا۔ ہمیں تو یہ خوف تھا کہ ارچنا کی لاش بھی ہمارے ہی گاؤں سے ملی ہے اس لئے وہ یقیناً ہمارے خلاف تھانے میں رپورٹ درج کرائے گا مگر نہ جانے کس مصلحت کے تحت اس نے ایسا نہ کیا۔ ہم یہی سمجھے کہ شاید بلدیو رام کو اب یہ یقین آ گیا ہے کہ ہمارا خاندان اس قتل میں ملوث نہیں ہے مگر حقیقت کسی کو بھی معلوم نہ تھی کہ ارچنا اتنے دن کہاں رہی؟ اور اسے کسی نے قتل کیا؟ یہ سوال ہر ایک کی زبان پر تھا مگر اس کا جواب کس کے پاس نہ تھا۔

میری چھٹیاں ختم ہو گئیں اور میں واپس کالج چلا آیا۔ نتیجہ نکلا تو پاس ہو گیا۔ بلبیر سنگھ بھی پاس ہو گیا تھا مگر وہ ابھی تک امرتسر سے واپس نہیں آیا تھا۔ انجنا تھرڈ ایئر میں فیل ہو گئی تھی۔ مجھے اس کے فیل ہونے کا دکھ تھا۔ اب وہ میری کلاس فیلو تھی۔ میں بلبیر سنگھ کی وجہ سے پریشان تھا۔ کافی دنوں کے بعد کالج آیا تو میں اس کا مرجھایا ہوا چہرہ دیکھ کر تڑپ اٹھا۔ بلبیر نے بتایا کہ اس کا باپ ایک حادثے میں چل بسا ہے اور اب گھر کی تمام ذمے داری اسی پر آن پڑی ہے اس لئے اب وہ مزید تعلیم جاری نہ رکھ سکے گا۔

اس کے والد کی موت کی خبر سن کر مجھے بہت ہی دکھ ہوا۔ میں اس کے گلے لگ کر روتا رہا پھر یہ جان کر کہ اب بلبیر واپس امرتسر چلا جائے گا، اور میں ایک دوست سے محروم ہو جاؤں گا، مجھے اور بھی صدمہ ہوا۔ میں نے بلبیر پر زور دیا کہ وہ مزید تعلیم حاصل کرے مگر وہ نہ مانا۔ کہنے لگا۔

''اب میں اپنے شہر میں ہی یا تو کوئی ملازمت کروں گا یا کوئی کاروبار کر لوں گا مگر ہماری دوستی کبھی ختم نہیں ہو گی۔ ہماری خط و کتابت جاری رہے گی اور ہم کبھی کبھی ملتے بھی رہا کریں گے۔''

الوداع ہونے سے قبل اس نے مجھے ایک ایسی بات بتائی جسے سن کر دنگ رہ گیا۔ اس نے انکشاف کیا۔ ''انجنا میری منہ بولی بہن ہے اس نے انکشاف کیا۔ ''انجنا میری منہ بولی بہن ہے اس لئے الیکشن کے دنوں میں، میں نے انجنا کے خلاف کوئی بات نہیں کی تھی۔ چونکہ میری کوئی سگی بہن نہیں ہے اور انجنا کا بھی کوئی بھائی نہیں ہے اس لئے انجنا ہر سال راکھی کے موقع پر مجھے راکھی باندھتی ہے مگر اس سے

بھی اہم بات یہ ہے کہ وہ تھرڈ ایئر میں جان بوجھ کر فیل ہوئی ہے تاکہ اسے تمہارا قرب میسر آسکے۔ دوست! میری لاج اور بھرم رکھنا۔ میں تم دونوں کو ایک دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں اپنے ہاتھوں سے انجنا کو رخصت کروں گا۔ بس تم دعا کرنا کہ میں سلامت رہوں۔ امید ہے کہ تم کبھی بھی مجھے شکایت کا موقع نہیں دو گے۔"

بلبیر سنگھ چلا گیا۔ گاڑی پر سوار ہونے سے قبل ہم ایک دوسرے کے گلے ملے تو ہم دونوں کی آنکھیں بھر آئیں۔ انجنا بھی آئی ہوئی تھی۔ بلبیر نے ہم دونوں سے ہاتھ ملائے اور گاڑی میں سوار ہوگیا۔ گاڑی چل پڑی تو ہم اس وقت تک اس کو دیکھتے رہے جب تک گاڑی ہماری نظروں سے اوجھل نہ ہوگئی۔ چند دن میں نے بلبیر کی کمی شدت سے محسوس کی اور پھر اس کا خط آگیا کہ وہ خیریت سے پہنچ گیا ہے۔ اس نے انجنا کے بارے میں لکھا تھا اور ہم دونوں کو اچھے مستقبل کی دعائیں دی تھیں۔

میں تو خود بھی انجنا کو پسند کرتا تھا۔ بلبیر کے انکشاف نے مجھے انجنا سے مزید قریب کر دیا۔ انجنا کے سانسوں کی خوشبو میرے انگ انگ میں رچتی رہی۔ انجنا کے چہرے پر بھی گلاب کھل اٹھے۔ وہ بھی میری طرح پیار کی خواب آلود وادیوں میں گم ہوگئی اور یوں ہم تمناؤں کے دیپ جلائے آگے ہی آگے بڑھتے رہے۔

......☆☆☆......

اچانک ایک روز اس خبر نے میرے وجود میں زلزلے بپا کر ڈالے کہ کسی نے راکیش بھائی کو قتل کر دیا ہے۔ اس منحوس خبر سے میرے ہوش وحواس ساتھ چھوڑ گئے۔ انجنا بھی میرے اس غم میں شریک تھی۔ میں فوراً گاؤں پہنچا۔ بھائی جان کی لاش گاؤں پہنچ چکی تھی۔ مجھے اور پتا جی کو یقین تھا کہ یہ وار بلدیو رام نے ہی کیا ہے۔ بھائی جان بمبئی میں اپنے فلیٹ میں مردہ حالت میں پائے گئے تھے۔ ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق ان کا گلا گھونٹ کر ان کو ہلاک کیا گیا تھا۔ بمبئی پولیس نے کیس درج کر کے تفتیش شروع کر دی تھی۔ اس سلسلے میں بھائی جان کے دفتر کے لوگوں کو بھی شامل تفتیش کیا گیا تھا۔ پولیس نے بہت ہاتھ پیر مارے مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا جب کہ ہمیں صد فی صد یقین تھا کہ یہ سب کچھ بلدیو رام کا کیا دھرا ہے۔ اس نے راکیش بھیا کو ٹھکانے لگایا ہے۔ میرا اصرار تھا کہ ہم بلدیو رام کے خلاف تھانے میں رپورٹ درج کرا دیں کہ راکیش کے قتل میں اس کا ہاتھ ہے۔ پتا جی نے مجھ سے اتفاق نہ کیا اور کہنے لگے۔

"یہ ضروری نہیں کہ راکیش کو بلدیو رام نے ہی قتل کرایا ہو۔ قتل کی وجہ کوئی اور بھی ہو سکتی ہے۔ پولیس تفتیش کر رہی ہے، ممکن ہے حقیقت واضح ہو جائے۔"

میں نے بہت کوشش کی مگر وہ اس نازک لمحے میں کوئی بھی ایسا قدم اٹھانا نہیں چاہتے تھے جس سے حالات اور بگڑ جائیں۔ تنگ آکر میں پتا جی سے کہا کہ اب میں مزید تعلیم حاصل نہیں کروں گا بلکہ راکیش بھائی کے قتل کا بدلہ لوں گا کیونکہ نہ صرف ہمارے خاندان کی بلکہ پورے گاؤں کی عزت کا مسئلہ ہے۔ میری باتوں نے پتا جی کو خوفزدہ کر دیا اور انہوں نے مجھے زبردستی کالج میں بھیج دیا۔ مگر اب پڑھنے میں میرا جی ہی نہ لگتا تھا۔ بھیا کی بے وقت موت نے مجھے بھی توڑ پھوڑ کر رکھ تھا اور میں انجنا سے بھی بے پروا ہو گیا تھا۔ میرے بدلے ہوئے رویے کو دیکھ کر انجنا نے مجھے مسرتوں اور خوشیوں کی دنیا میں واپس لانے کی بہت کوشش کی مگر میرے اندر نفرت کا لاوا بڑھتا ہی رہا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں اور کس طرح اپنے انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کروں۔

اب میں بہت زیادہ اپنے گاؤں جانے لگا تھا۔ ماتا جی اور پتا جی نے راکیش بھائی کے غم کو سینے سے لگا لیا تھا۔ ماتا جی تو برسوں کی مریضہ لگنے لگی تھیں پھر ایک دن وہ چپکے سے سورگ سدھار گئیں۔ میں ان کی موت پر بلک بلک کر روتا رہا۔

ایک بار میں گاؤں گیا تو پتا جی کہنے لگے۔ "اب شکنتلا جوان ہوگئی ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس کی شادی کر دوں۔ اس کی شادی کے بعد یہ گھر بالکل ویران ہو جائے گا اس لئے اب تمہیں بھی شادی کرنا ہوگی۔ موقع جان کر میں نے ان کو انجنا کے بارے میں بتا دیا کہ میں انجنا سے محبت کرتا ہوں اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ پتا جی رضامند ہوگئے اور بولے۔ "راجیش! تم جیسا چاہو گے ویسا ہی ہوگا۔ اب تمہاری خوشیاں مجھے بے حد عزیز ہیں۔"

اب میں جب بھی گاؤں جاتا تو شکنتلا کو بدلا ہوا پاتا۔

وہ بہت ہی خوش دکھائی دیتی تھی جیسے اسے کوئی انمول خوشی مل گئی ہو۔ شکنتلا کا یہ روپ میں نے پہلی بار دیکھا تھا ورنہ وہ تو بہت معصوم اور سادہ سی لڑکی تھی۔ وہ محبت کرنا اور اپنی بات منوانا جانتی تھی مگر صرف بھائیوں سے۔ مجھے، پتا جی اور ماتا جی کو راکیش کی موت کا دکھ رلاتا رہتا تھا مگر شکنتلا ان باتوں سے بے نیاز نظر آتی تھی، تاہم میں نے ان شکوک کو نظر انداز کر دیا تھا جو میرے من میں جنم لیتے تھے۔

......☆☆☆......

وقت اسی طرح اپنے دامن میں کچھ اور دنوں کو سمیٹے دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ میں اور انجنا دونوں فورتھ ایئر میں آ گئے۔ ہماری محبت کے پرانے دن پھر لوٹ آئے۔ پت جھڑ کے بعد پھر سے بہاریں آئیں مگر اچانک ایک اور طوفان آیا جس نے میرے سارے خواب چکنا چور کر ڈالے۔ ابا جان ایک دن کالج آ گئے۔ وہ بہت ہی پریشان لگ رہے تھے۔ انہوں نے بتایا۔

''شکنتلا دو دن سے گھر سے غائب ہے۔ میں اسے بہت تلاش کر چکا ہوں مگر اس کی کوئی خبر نہیں ہے کہ وہ کہاں چلی گئی ہے؟ مجھے یقین ہے کہ یہ سب بلدیو رام نے کیا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ارچنا گھر سے غائب ہوئی تھی۔''

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے پگھلا ہوا سیسہ میرے کانوں میں انڈیل دیا ہو۔ میرا خون کھولنے لگا اور میری آنکھیں آنسوؤں کے بوجھ سے جھک گئیں۔ مجھے بھی یقین تھا کہ بلدیو رام نے ہی ہم سے بدلہ لیا ہے پھر میں پتا جی کے ہمراہ گاؤں چلا آیا۔ ہم نے شکنتلا کو بہت تلاش کیا۔ تھانے میں بھی رپورٹ درج کرائی مگر اس کا کوئی سراغ نہ ملا کہ اسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ ہر کوئی طرح طرح کی باتیں بنانے لگا کہ انسان جیسا کرتا ہے ویسا بھرتا ہے۔ اب تو لوگ یہ کہنے لگے کہ راکیش ہی نے ارچنا کو برباد کیا ہوگیا۔ قدرت نے شکنتلا کو گھر سے بھگا کر گنیش کمار کے خاندان سے بدلہ لیا ہے۔

پتا جی اور میں تھک ہار کر بیٹھ گئے اور گھر سے باہر نکلنا بھی بند کر دیا۔ پتا جی نے بلدیو رام کو دھمکی پیغام بھجوا دیا جو اس نے ہمیں بھجوا دیا تھا مگر اس نے بھی ہماری طرح اس معاملے سے لاتعلقی ظاہر کی۔ میں نے پھر قسم کھائی کہ میں بلدیو رام کی بیٹی کملا دیوی سے ضرور انتقام لوں گا اور اسے برباد کر کے رکھ دوں گا۔

میں نے رام گڑھ کے ایک شخص سے تعلقات پیدا کر لئے اور معلوم کروا لیا کہ کملا دہلی کے کسی کالج میں پڑھتی ہے۔ میں اس کے بارے میں تمام معلومات حاصل کر کے دہلی چلا آیا۔ میں نے انجنا کو ان حالات سے بے خبر رکھا تھا۔ اسے پتا جی کے دہلی آنے کا بھی علم نہ تھا اس نے مجھ سے گاؤں جانے کی وجہ پوچھی تو میں نے پتا جی کی بیماری کا بہانہ کر کے اسے ٹال دیا۔

میرے اندر نفرت کا لاوا ابل رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ بلدیو رام کا گلا گھونٹ کر اس کی حویلی کو آگ لگا دوں مگر میں بے بس تھا۔ اب میرا شکار کملا دیوی تھی۔ میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیا تھا۔ کملا واقعی بلا کی حسین تھی۔ اس کی خوبصورتی انجنا کو بھی مات کرتی تھی۔ وہ چاہے جانے اور پوجا کرنے کے قابل تھی مگر میرے لئے اب اس کی خوبصورتی کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی۔ میں اسے اغوا کر کے اس کا دامن داغ دار کرنے کے منصوبے بنانے لگا تھا کہ ایک روز کالج کے پتے پر مجھے ایک خط ملا جو پاکستان سے آیا تھا۔ میں لفافہ دیکھ کر حیران تھا کہ پاکستان میں تو میرا کوئی بھی جاننے والا نہیں ہے تو پھر یہ خط کس کا ہوسکتا ہے؟ میں نے ہاسٹل کے کمرے میں آ کر خط کھولا تو معلوم ہوا کہ یہ خط شکنتلا کا ہے۔ اس نے لکھا تھا۔

''راجیش بھیا! آداب! میں جانتی ہوں کہ آپ اور پتا جی میرا نام سننا بھی گوارہ نہیں کریں گے کیونکہ بدنامی اور رسوائی کا جو داغ میں نے آپ لوگوں کی پیشانیوں پر لگایا ہے، وہ اب شاید کبھی نہ دھل سکے گا مگر میں پھر بھی آپ سے شرمندہ اور نادم نہیں ہوں۔ میں چاہتی تو آپ کو خط ہی نہ لکھتی لیکن میں بتانا چاہتی ہوں کہ یہ سب کیوں اور کیسے ہوا۔ چونکہ میرا دامن صاف اور ضمیر مطمئن ہے اسی لئے آپ کو سب کچھ بتا رہی ہوں۔ میں نے اپنا گاؤں کیسے چھوڑا؟ اس میں کچھ تو میری اپنی ہمت ہے اور کچھ مدد ٹھاکر بلدیو رام کی۔ آج سے تین سال قبل، فیض نگر والے مولوی فیض کا ایک عزیز جوان کا بھتیجا لگتا ہے، فیض نگر اپنے عزیزوں سے ملنے پاکستان سے آیا تھا۔ اس کا نام نعیم ہے۔ فیض نگر چونکہ چھوٹا سا گاؤں ہے اس لئے وہ عموماً رام گڑھ اور ہمارے گاؤں آتا جاتا رہتا تھا۔ میں نے اسے دیکھا تو اپنا دل ہار

بیٹھی۔ نعیم بھی میرا دیوانہ تھا۔ ہم میں محبت شروع ہو گئی۔ میں اپنی ایک نوکرانی کے ذریعے نعیم کو محبت نامے پہنچانے لگی۔ نعیم بھی اس کے ہاتھ ہی جواب بھجوانے لگا۔ ایک دو بار رات کے اندھیرے میں میں نعیم سے ملنے گاؤں سے باہر بھی گئی۔ نعیم نے ایک سچا مسلمان ہونے کا ثبوت دیا۔ اس نے میرے جسم کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ ہم نے سنگ جینے اور مرنے کی قسمیں کھائیں۔ نعیم کہنے لگا۔ ''شگفتہ! میں نے آج تک کسی لڑکی سے محبت نہیں کی، تم میری پہلی اور آخری محبت ہو، میں تمہیں دل کی گہرائیوں سے چاہنے لگا ہوں مگر سوچتا ہوں کہ ہمارا ملن کیوں کر ممکن ہو گا کیونکہ ہمارے درمیان سرحد اور مذہب کی دیواریں حائل ہیں۔''

''سرحدیں چاہت کی راہ میں دیوار نہیں بنا کرتیں نعیم! یہاں تعصب اور نفرتوں کا گزر بھی نہیں ہوتا اور مذہب بھی احساس محرومی کا سبب نہیں بنتا۔ محبت کا کوئی وطن نہیں ہوتا۔ اس کی سرحدیں تو محدود ہوتی ہیں۔ افق کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پھیلے ہوئے وسیع نیلگوں آکاش کی مانند۔ اگر تمہارا پریم سچا ہے تو میں تمہاری خاطر مذہب کی دیواریں بھی گرا دوں گی۔ میں مسلمان ہو کر تمہارے سنگ دنیا کے دوسرے کونے تک جاؤں گی۔''

نعیم نے واپس جاتے ہوئے مجھ سے وعدہ کیا کہ اب وہ ایک سال بعد دوبارہ آئے گا تو تمام انتظام کر کے آئے گا اور مجھے ہمیشہ کے لئے ساتھ لے جائے گا۔ میرے ماں باپ سے میرا رشتہ مانگنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ کسی صورت میں یہ گوارہ نہ کرتے کہ ان کی بیٹی مسلمان ہو جائے۔ میں نے نعیم نے کہا کہ اس کے چچا مولوی فیض محمد اور بلدیو رام کے آپس میں گہرے تعلقات ہیں۔ تم اپنے چچا کی وساطت سے اس سلسلے میں بلدیو رام سے بات کرو۔ ممکن ہے وہ تمہاری مدد کرنے پر رضا مند ہو جائے۔ اس طرح تمہاری مشکل آسان ہو جائے گی اور ہمیں منزل بھی مل جائے گی۔ نعیم بولا۔ ''وہ بھی ہندو ہے، وہ بھی یہ برداشت نہیں کرے گا کہ تم ایک مسلمان کی بیوی بن جاؤ۔''

میں نے کہا۔ ''وہ ہمارا دشمن بن چکا ہے۔ میرے پتا جی اور خاندان کی بدنامی کے لئے وہ تمہاری مدد کرنے پر آمادہ ہو سکتا ہے۔''

''اور اگر اس نے ہماری مدد کرنے کی بجائے تمہارے باپ کو بتا دیا تو؟'' نعیم بولا۔

''اگر اس نے پتا جی کو بتا بھی دیا تو وہ اسے جھوٹ سمجھیں گے اور فوراً اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ وہ ہمارے خاندان کو بدنام اور ذلیل کرنے کے لئے الزام لگا رہا ہے۔''

یہ بات نعیم کی سمجھ میں آ گئی اور وہ ایک سال بعد آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ یہ عرصہ میں نے انتظار کی سولی پر لٹک کر گزارا۔ ہر لمحہ اس کے بارے میں سوچتی رہتی۔ اس نے میری سوچوں میں اپنی ساری محبتیں اور اپنا وجود تحلیل کر دیا تھا۔ وہ میرے روئیں روئیں میں خوشبو کی مانند بس گیا تھا۔ میرے جاگتے نینوں میں اسی کی چاہت کے سپنے سجے تھے۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اگر وہ واپس نہ آیا تو میں خود کشی کر لوں گی مگر وہ حسب وعدہ آ گیا۔ جب مجھے اس کی آمد کا علم ہوا تو میرے من کے پھول پھر سے کھل اٹھے۔ بہاروں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ محبت اندھی ہوتی ہے مگر اسے محبوب نظر آ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ دنیا کی کسی چیز کو نہیں پہچانتی۔ میری حالت بھی ان دنوں ایسی ہی تھی۔ گھر میں صرف پتا جی تھے یا نوکر۔ مجھے مکمل آزادی تھی۔ نوکرانی نے اس بار بھی میری بھرپور مدد کی۔ رات کے اندھیرے میں گاؤں سے باہر پرانے کنویں پر ایک سال بعد نعیم سے میری ملاقات ہوئی تو نعیم نے بتایا۔

''اب تمہیں ساتھ لے کر ہی جاؤں گا۔ میں ماں باپ کو بتا کر آیا ہوں کہ میں ان کی بھولانے ہندوستان جا رہا ہوں۔ انہوں نے مجھے اجازت دے دی ہے۔ میری امی میرے ساتھ آنا چاہتی تھیں مگر میں انہیں ساتھ نہیں لایا کیونکہ ان کو یہ معلوم نہیں ہے کہ تم ہندو مذہب سے تعلق رکھتی ہو۔ وہ اپنی ہی برادری کی کسی لڑکی کو بہو کے روپ میں دیکھنے کی منتظر ہوں گی مگر تم فکر نہ کرو۔ تم میرے ساتھ جاؤ گی۔ تمہاری شناخت بدل چکی ہو گی اور تم مسلمان ہو چکی ہو گی۔ میں نے چچا فیض محمد کو تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ پہلے تو انہوں نے مجھے سمجھایا کہ میں تمہارا خیال دل سے نکال دوں مگر میری محبت اور ضد کے آگے وہ بے بس ہو گئے اور انہوں نے بلدیو رام سے بات کرنے کا وعدہ کر لیا۔ میرے جانے کے بعد چچا بلدیو رام سے ملے تھے۔ جب اسے تمام حالات معلوم ہوئے تو وہ بہت خوش ہوئے

اور اس نے ہماری بھرپور مدد کا وعدہ کیا اور یقین دلایا ہے کہ اس سلسلے میں کسی اور سے بات نہ کرے گا۔ کل میں خود اس سے ملا تھا۔ وہ خفیہ طور پر تمہارا پاسپورٹ اور ویزا حاصل کرے گا۔ تم کل مجھے اپنی تصویریں لا دینا تاکہ تمہارے کاغذات مکمل ہو سکیں۔

اگلے روز میں نے تصویریں نعیم کے حوالے کر دیں۔ بلدیورام نے حسب وعدہ چند روز میں تمام کام کروا دیا۔ جب نعیم نے مجھے یہ خبر دی تو خوشی کے مارے میری آنکھیں بھر آئیں۔ میں بے چینی سے اس دن کا انتظار کرنے لگی کہ کب ملن کی گھڑی آئے گی۔ ان دنوں تم اور پتا جی بھی میری اس تبدیلی پر حیران تھے۔ مجھے اس کا احساس تھا مگر میں کیا کرتی؟ میں بے بس تھی۔ یہ سب کچھ میرے اختیار میں نہ تھا۔ میں ہر وقت غیر ارادی طور پر مسکراتی رہتی تھی پھر پروگرام کے مطابق ایک رات میں نے اپنی حویلی کو آخری بار دیکھا اور اسے ہمیشہ کے لئے الوداع کہہ دیا۔ میں فیض نگر چلی آئی۔ وہاں بلدیورام نے ہمیں دہلی پہنچا دیا کیونکہ صبح چھ بجے جہاز کو کراچی روانہ ہونا تھا۔ میری اور نعیم کی سیٹیں بک ہو چکی تھیں۔ جب میں فیض نگر سے روانہ ہونے لگی تو میں فیض صاحب اور بلدیورام کے گلے لگ کر خوب روئی اور ان سے وعدہ لیا کہ وہ میرے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتائیں۔ بلدیورام کہنے لگا۔ ''سلمٰی! میں تم لوگوں کا دشمن نہیں ہوں۔ میں نے تمہارے بھائی کو قتل نہیں کروایا تھا۔''

''انکل! یہ سچ ہو یا نہ مگر یہ حقیقت ہے کہ ارچنا کو گھر سے بھگانے اور اسے قتل کرنے میں میرے خاندان کے کسی فرد کا ہاتھ نہیں ہے۔''

بلدیورام بولا۔ ''ہاں سلمٰی! میں یہ حقیقت جان گیا ہوں کہ ارچنا تمہارے بھائی راکیش کے ساتھ نہیں بلکہ گاؤں کے ایک لڑکے سنیل کے ساتھ بھاگ گئی تھی مگر اس نے ارچنا سے بے وفائی کی تو ارچنا نے خودکشی کر لی تھی۔ اس وقت مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی۔ جب اصلیت معلوم ہوئی تو ہماری دوستی دشمنی میں بدل چکی تھی۔ اس غلطی کا ازالہ کرنے کے لئے میں تمہارے ساتھ یہ نیکی کر رہا ہوں۔ سدا سکھی اور سہاگن رہو۔''

......☆☆☆......

جب جہاز آسمان کی وسعتوں میں بلند ہوا تو مجھے آپ سب لوگ شدت سے یاد آئے۔ آنکھیں ڈبڈبا گئیں تو میں نے اپنا سر نعیم کے کندھے پر رکھ دیا۔ مجھے نیند آ گئی اور آنکھ اس وقت کھلی جہاز کراچی پہنچ چکا تھا۔ وہاں سے ہم بذریعہ ٹرین ساہیوال روانہ ہوئے کیونکہ نعیم وہاں رہتا تھا۔ جوں جوں ساہیوال نزدیک آتا جا رہا تھا، میرے وسوسے بڑھتے جا رہے تھے۔ اگرچہ مجھے نعیم پر بھروسا تھا پھر بھی نہ جانے کیوں میرے دل میں یہ خیال جاگزین ہو گیا کہ کہیں نعیم میرے ساتھ بے وفائی یا دھوکا نہ کر جائے یا پھر کہیں اس کے والدین، ان کا معاشرہ مجھے قبول کرنے سے انکار نہ کر دے مگر جب نعیم نے اپنے والدین کو بتایا کہ وہ مجھے کیسے اور کن حالات میں یہاں لایا ہے تو نعیم کے ماں باپ، بہن بھائیوں اور دوسرے رشتے داروں نے مسلمانوں کی روایتی فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ یہاں آ کر مجھے وہ پیار ملا جس کا میں تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ یہاں کے لوگ بہت سچے اور کھرے ہیں۔ نعیم کی محبت اور پیار تو میرے لئے مضبوط قلعے اور چٹان کی مانند ہے۔ میں نے جو خواب دیکھے تھے ان کی تعبیر پا لی ہے۔ مجھے اب کوئی تمنا اور خواہش نہیں ہے مگر پھر بھی آپ کی اور پتا جی کی بہت یاد آتی ہے اس لئے یہ خط آپ کو لکھ رہی ہوں۔ راجیش بھیا! اگر آپ نے اور پتا جی نے مجھے معاف کر دیا تو پھر میں اور نعیم آپ کو ملنے ضرور آئیں گے اور اگر معاف نہ کیا تو پھر یہ سمجھ لینا میں آپ کے لئے مر گئی ہوں۔ میں اپنا پتا لکھ رہی ہوں۔ آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔''

......☆☆☆......

سلمٰی کا خط پڑھ کر میرے زخم پھر سے ہرے ہو گئے۔ دکھ درد کی کیفیت نے میری دل میں طوفان بپا کر دیا۔ میرے اندر کے سارے چراغ بجھ گئے۔ میری کائنات اندھیروں میں ڈوب گئی اور زندگی کی راہیں تاریکی میں گم ہو گئیں۔ میں کملا کو بھول کر اپنی بہن کے لگائے ہوئے زخموں سے سسک اٹھا۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شکنتلا اتنا بڑا قدم اٹھا سکتی ہے۔ اس کے اس عمل نے مجھے سولی پر لٹکا دیا۔ میرے دل میں شکنتلا، بلدیورام اور مولوی فیض محمد کے خلاف نفرت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا مگر میں نے پتا جی سے چھپانا ضروری سمجھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اتنا بڑا صدمہ برداشت نہیں کر سکیں گے۔ اس لئے یہ صدمہ میں

نے اپنے سینے میں دفن کر لیا۔ میں نے اسے خط کا جواب نہ دیا اور قسم کھائی کہ شکنتلا! تو نے بدنامی کا جو داغ اپنے خاندان کی پیشانی پر لگایا ہے، میں اسے دھونے کے لئے پاکستان بھی آ جاؤں گا اور تم سے اور نعیم سے اس کا بدلہ لوں گا۔ میں تمہیں واپس بھارت ضرور لاؤں گا۔ زندہ یا مردہ کسی صورت میں بھی۔''

میں یہ فیصلہ کر کے کچھ پرسکون ہو گیا، مجھے مولوی فیض محمد پر بہت غصہ تھا کہ اس نے اپنے مذہب کی لاج تو رکھ لی مگر کسی باپ یا بھائی کی غیرت کی لاج نہ رکھی۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ میں نے اس سے بھی نمٹنے کا عہد کر لیا کہ اگر زندگی رہی تو میں اسے بھی سزا دوں گا۔ مجھے سب سے زیادہ غصہ بلدیو رام پر آیا۔ کملا کو برباد کرنے کا جوش اور بھی زور پکڑ گیا۔ میں نے گنگا اور جمنا کی سوگندھ کھا کر یہ عہد کیا کہ میں اپنے خاندان کی بربادی کا ایک ایک سے حساب نہ لے لوں خواہ اس کی خاطر مجھے زندگی سے ہی ہاتھ نہ دھونے پڑیں۔ میں نے انجنا کو بھول جانے کا بھی عہد کر لیا اور ایک دن اسے تمام بات بتا دی اور کہا۔ ''اب میں انجانی راہوں کا راہی ہوں۔ میری زندگی کا اب کوئی بھروسا نہیں ہے کیونکہ اب تو میں سرتاپا انتقام ہوں اس لئے تم مجھے بھول جاؤ۔''

انجنا ہنس کر بولی۔ ''راجیش! میں مشکل مرحلے میں بھی تمہارے ساتھ قدم ملا کر چلوں گی کیونکہ تمہاری خوشیاں ہی میری خوشیاں اور تمہارے دکھ میرے دکھ ہیں۔ میں تمہارا ساتھ چھوڑ دوں تو یہ محبت کی توہین ہو گی۔ میں تمام عمر تمہارا انتظار کروں گی اور اپنی چاہت کو سرخرو کروں گی۔ میں صرف تمہارے پیار کی خاطر زندہ ہوں۔ میرا پیار سچا اور ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے۔ مٹنے والا نہیں۔''

انجنا نے میری ڈھارس بندھائی تو میں نے اس سے کہا۔ ''میں کملا دیوی کو برباد کرنا چاہتا ہوں کیا تم اس معاملے میں میری مدد کر سکتی ہو؟ اگر تم مدد کا وعدہ کرو تو میں تمہارا ہوں اور اگر تم نے اس کام میں میرا ساتھ نہ دیا تو پھر میری اور تمہاری راہیں الگ ہو جائیں گی۔''

انجنا بولی۔ ''راجیش! تم میرا امتحان لینا چاہتے ہو تو میں اس امتحان میں پورا اتروں گی۔ میں تمہاری مدد ضرور کروں گی۔''

انجنا نے وعدہ کر لیا پھر میرے کہنے پر اس نے یہ کالج چھوڑ دیا اور اس کالج میں داخلہ لے لیا، جہاں کملا پڑھتی تھی۔ میرے کہنے کے مطابق انجنا نے کملا سے راہ رسم بڑھانا شروع کر دی۔ اس سے دوستی کرنے میں چھ ماہ گزر گئے۔ یہ چھ ماہ میں نے سولی پر لٹک کر گزار دیئے۔ میں گاؤں سے ڈھیروں رقم لے آیا تھا اور ہاسٹل چھوڑ کر کرائے کے ایک مکان میں رہائش رکھ لی۔ یہ میرے پلان کا ایک حصہ تھا۔ میں کچھ نامی گرامی غنڈوں کو کرائے پر حاصل کر لیا اور انہیں بتا دیا کہ ایک لڑکی کو اغوا کر کے امرتسر پہنچانا ہے۔ میرا ارادہ بلبیر سنگھ کے پاس جانے کا تھا۔ اس امید کے تحت کہ وہ میری مدد ضرور کرے گا اور رہنمائی بھی۔

چھ ماہ بعد انجنا، کملا کو لے میرے مکان پر آ گئی۔ وہ دونوں اب گہری دوست بن گئی تھیں۔ انجنا اسے دھوکے سے میرے مکان پر لائی۔ میں گھر سے باہر تھا۔ انجنا نے کملا کو بتایا یہ گھر میری خالہ کا ہے جس کی چابی میرے پاس ہے۔ وہ چند دنوں کے لئے بمبئی گئی ہوئی ہیں۔ انجنا اور کملا خریداری کرنے کے لئے بازار گئی تھیں وہ جب تھک گئیں تو انجنا آرام کی غرض سے کملا کو میرے مکان پر لے آئی تھی پھر میرے کرائے کے غنڈے پروگرام کے تحت مکان میں داخل ہوئے، ان دونوں کو کمرے میں بند کر دیا اور دھمکی دی کہ اگر انہوں نے شور مچایا تو ان کو قتل کر دیا جائے گا۔ جب رات ڈھلنے لگی تو ہم نے کملا کو بے ہوش کر کے گاڑی میں ڈالا اور امرتسر کی طرف روانہ ہو گئے۔ چلتے ہوئے میں انجنا کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔ ''انجنا! میں تمام عمر تمہارا ممنون رہوں گا۔ میرا انتظار کرنا میں جلد لوٹ آؤں گا۔''

......☆☆☆......

بلبیر سنگھ کو میری آمد کی خبر نہ تھی۔ اس کا پتا میرے پاس موجود تھا۔ کافی عرصے سے اس سے خط و کتابت بند تھی مگر اس مشکل مرحلے میں وہ مجھے یاد آیا۔ ہم امرتسر کے قریب پہنچے تو شام ڈھلنے لگی تھی۔ کملا ہوش میں آ گئی تھی اسے نہیں معلوم تھا کہ ہم کون ہیں اور اسے کہاں لے جا رہے ہیں۔ میں نے خود ہی اس کا تجسس دور کر دیا اور بتایا۔

''میں کھنگر پور کے ٹھاکر گنیش کمار کا بیٹا راجیش کمار ہوں۔ تمہارے باپ نے میرے بھائی راکیش کمار کا خون کیا ہے اور میری بہن کو اغوا کر کے پاکستان بھیج دیا ہے۔

تمہارے باپ سے بدلہ لینے کے لئے میں نے تمہیں اغوا کرلیا ہے۔ کملا دیوی! میں اب تم سے گن گن کر بدلے لوں گا لیکن یہ تسلی رکھو کہ میں تمہارا دامن داغ دار نہ کروں گا۔ میں تمہارے باپ کو تڑپانا چاہتا ہوں تاکہ اسے بھی احساس ہو کہ کسی کا گھر برباد ہونے سے ان کے دلوں پر کیا گزرتی ہے۔ اگر تم نے کوئی مزاحمت کی تو پھر تمہاری لاش ہی تمہارے گھر جائے گی۔ اس لئے میں جو کہوں اس پر عمل کرتی رہنا ورنہ یاد رکھو کہ میں تمہیں اس طرح برباد کروں گا کہ تم مرنے کی پرارتھنا کرو گی مگر مر نہ سکو گی اور جینا چاہو گی تو جی نہ سکو گی۔"

کملا رونے لگی۔ جلد ہی بلبیر سنگھ کا ٹھکانا مل گیا۔ میں نے غنڈوں کو فارغ کردیا۔ وہ گھر پر ہی تھا۔ اس نے فوراً مجھے پہچان لیا اور مجھے گلے لگالیا۔ اس نے کملا کو "بھابھی" سمجھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کی لکیریں ابھر آئیں۔ اس نے پوچھا۔ "انجنا؟"

میں نے اسے بات مکمل نہ کرنے دی اور کہا۔ "بلبیر سنگھ! میرے دوست! میں نے ابھی شادی نہیں کی یہ تمہاری بھابھی نہیں۔ یہ کملا ہے اس کے لئے علیحدہ کمرے کا بندوبست کرو۔"

بلبیر سنگھ نے میری پریشانی جان لی۔ وہ مجھے اور کملا کو مکان کی اوپر منزل پر لے آیا۔ کملا کو ایک علیحدہ کمرے میں داخل کرکے میں نے باہر سے کنڈی لگادی اور پھر اس دن سے لے کر جس دن ریلوے اسٹیشن پر بلبیر سے آخری ملاقات ہوئی تھی، آج تک کے تمام حالات اور واقعات بلبیر سنگھ کے گوش گزار کردیئے اور اسے تاکید کی کہ کملا کی حفاظت کی جائے اور اسے کسی کے ساتھ ملنے نہ دیا جائے کیونکہ اس کی مزاحمت سے میری ساری محنت ضائع جائے گی۔ بلبیر سنگھ سوچ میں پڑ گیا۔ کافی دیر بعد وہ بولا۔ "راجیش! تم میرے گہرے دوست ہو تم جو امید اور مان لے کر آئے ہو، میں ان پر پورا اتروں گا اور جان سے بڑھ کر تمہاری مدد کروں گا۔ اب بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو۔ کملا کے ساتھ کون سا سلوک کیا جائے؟ کیا اسے قتل کرنا ہے یا............؟"

"میں کملا کی عزت برباد نہیں کرنا چاہتا۔ اس کے علاوہ جو بھی کرنا ہے وہ فیصلہ تم کرو گے۔ میں اسی لئے اتنی دور سے تمہارے پاس آیا ہوں۔ اب اس کا حل تمہیں سوچنا ہے۔"

"راجیش! میں مانتا ہوں کہ یہ تمہارے خاندان کے دشمن کی بیٹی ہے۔ جس طرح تم اس کا خیال رکھ رہے ہو، یوں تو بات نہ بنے گی۔ تم ایسا کرو کہ کملا کے ساتھ پاکستان نکل جاؤ۔ وہاں اسے لاہور کے شاہی بازار میں فروخت کر دینا۔ تمہیں اس کے بہت اچھے دام مل جائیں گے اور کملا تمام عمر اپنی عزت نیلام کرتی رہے گی اور جب شکنتلا کی طرح کملا بھی اپنے باپ کو پاکستان سے تفصیلی خط لکھ کر اپنی بربادی کی داستان سنائے گی، تب بلدیو رام کو احساس ہوگا کہ جیسی کرنی، ویسی بھرنی کیا ہوتی ہے؟ یوں شاید تم شکنتلا کو بھی ڈھونڈ لو۔"

بلبیر کی بات میں وزن تھا۔ اس کی بات میرے دل کو لگی۔ میں نے کہا۔ "مگر ان حالات میں امرتسر سے باہر نکلنا ہمارے لئے مشکل ہوگا۔ بھلا پاکستان کیسے جایا جاسکتا ہے؟ یہ تو بہت مشکل کام ہے جو کم از کم میرے بس سے باہر ہے۔"

"یہ سب کچھ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں تم دونوں کو سرحد پار کرادوں گا۔"

"مگر کیسے؟"

"دوست! اب تمہارا یہ دوست اسمگلنگ کا دھندا کرتا ہے۔ میرا کاروبار یہی ہے مگر اسمگلنگ منشیات کی نہیں انسانوں کی ہے۔ میں پیسے لے کر کئی لوگوں کو سرحد پار کراچکا ہوں اور کئی لوگوں کو اپنے ملک لاچکا ہوں۔ تم یقیناً یہ جاننا چاہو گے کہ میں یہ دھندا کیوں کررہا ہوں؟ میں اس کا جواب نہیں نہ دے سکوں گا کیونکہ یہ میری مجبوری ہے۔ یہ کام صرف میں ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت سے لوگ کررہے ہیں اور پھر تم تو میرے دوست ہو۔ تمہارا کام بلا معاوضہ ہو گا۔ اگر تم رضامند ہو تو تین چار دن انتظار کرو۔ اس کے بعد میں تمہیں، کسی رات بارڈر کراس کرادوں گا۔"

بلبیر سنگھ سونے کے لئے چلا گیا اور میں مستقبل کے تانوں بانوں میں الجھ گیا۔ تمام رات میں نے سوچتے ہوئے گزاردی۔ بالآخر میں پاکستان جانے کا فیصلہ کرلیا کہ اس طرح کملا کو لاہور لے جاکر فروخت کرڈالوں گا۔ اور اس کے بعد شکنتلا کو تلاش کرکے اس سے بھی حساب لوں گا۔

اگلے روز بلبیر سنگھ نے مجھے اور کملا کو ایک مکان میں شفٹ کردیا جو اس نے خاص طور پر ہمارے لوگوں کے لئے بنا رکھا تھا۔ میں اس کی مجبوری جان گیا کہ وہ ایسا کیوں کررہا ہے۔ صرف اس وجہ سے کسی کو ہم پر شک نہ ہو۔ بلبیر نے مجھے تسلی دی کہ میں بے فکر رہوں۔ وہ مجھ پر کسی قسم کی آنچ نہ آنے دے گا۔ میں نے بھی اسے بتادیا کہ میں اس کے فیصلے سے اتفاق کرتا رہوں گا۔ اب میں پاکستان ضرور جاؤں گا۔

ادھر کملا نے رو رو کر اپنا حشر خراب کرڈالا تھا میں اس کے سامنے گیا تو وہ میرے پاؤں میں گر پڑی اور رو رو کر التجا کرنے لگی کہ میں اسے واپس رام گڑھ بھیج دوں۔ مگر مجھ پر اس کی آہ وزاری کا کوئی اثر نہ ہوا پھر اس نے ایک اور چال چلی اور کہنے لگی۔ ”تم مجھ سے شادی کرلو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمام عمر وفادار رہوں گی۔ مجھے یوں ذلیل وخوار مت کرنا۔“

مگر میں نے اس کی یہ پیشکش ٹھکرادی حالانکہ کملا، انجنا سے زیادہ خوبصورت تھی۔ اگر میں اسے انجنا سے ملنے سے پہلے دیکھ لیا ہوتا تو کبھی بھی انجنا کی زلفوں کا اسیر نہ ہوتا بلکہ کملا کو اپنے من کی رانی بنالیتا مگر اس وقت مجھے اس کا حسن زہر لگ رہا تھا کیونکہ وہ میرے بھائی کے قاتل اور ہماری عزتوں کے لٹیرے کی بیٹی تھی اس لئے میں نے اسے کہا۔

”کملا دیوی! بے شک تم خوبصورتی میں اپنی مثال آپ ہو۔ تمہیں جو بھی دیکھتا ہوگا، وہ تمہیں حاصل کرنے کا خواہش مند ہوگا۔ تم اگر مجھے پہلے ملی ہوتیں تو میں تمہیں دل کے سنگھاسن پر بٹھا کر تمہاری پوجا کرتا مگر اب تم اس شخص کی بیٹی ہو جو میرے خاندان کی بربادی کا ذمے دار ہے اس لئے میرے من میں تمہارے لئے ہمدردی کا کوئی جذبہ نہیں۔ میں تم سے انتقام لوں گا۔ تمہیں برباد کرنا اور تمہاری بربادی کا تماشہ دیکھنا ہی میری زندگی کا واحد مقصد ہے۔“

کملا کی آہ وزاری ناکام ہوگئی اور میں اپنے موقف پر ڈٹا رہا۔

تیسرے دن بلبیر سنگھ اس روز کا اخبار لے آیا۔ اس اخبار میں بلدیو رام نے کملا کی گمشدگی کا اشتہار دیا تھا اور سارا الزام مجھ پر لگایا تھا کہ راجیش ہی کملا کو اغوا کرکے کہیں لے گیا ہے۔ اس نے میری گرفتاری کے لئے ایک لاکھ کا انعام دینے کا بھی اعلان کیا تھا۔ پولیس حرکت میں آگئی تھی اور میری گرفتاری کے لئے جگہ جگہ چھاپے مار رہی تھی۔ میں اشتہاری بن گیا تھا۔ میں نے کملا کو اس خبر سے لاعلم رکھا مگر خود پریشان ہوگیا کہ اب کیا کیا جائے؟

بلبیر نے مجھے تسلی دی۔ ”تم بے فکر رہو۔ تمہارا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ صرف دو دن باقی ہیں۔ اس کے بعد ہندوستان کی تمام پولیس تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکے گی۔“ بلبیر کی باتوں اور تسلی نے میرے ذہن و دل پر چھائے غم اور افسردگی کے بادل ہٹادیئے۔

پروگرام کے تحت دو دن بعد ایک رات بلبیر سنگھ مجھے اور کملا کو ایک جیپ میں بٹھا کر لے گیا۔ اس نے کافی پاکستانی کرنسی بھی دی اور پھر کمال ہوشیاری سے مجھے اور کملا کو پاکستان کی حدود میں دھکیل دیا۔ اس نے مجھے راستوں کے بارے میں سمجھادیا کہ کس طرف رخ کرکے چلنا ہے مگر صحیح طور اس کی باتیں یاد نہ رکھ پایا۔ چلتے ہوئے بلبیر سنگھ نے مجھے کہا تھا کہ جب بھی مجھے ہندوستان واپس آنا ہو، میں اسے خط لکھ دوں پھر وہ خود ہی بندوبست کرے گا اور کسی قسم کی پریشانی نہ ہونے دے گا۔

جب ہم پاکستان میں داخل ہوئے، اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ کچھ آگے چل کر جب میں نے کملا کو بتایا کہ ہم پاکستان کی حدود میں داخل ہوگئے ہیں اور اب تم کبھی بھی واپس نہ جاسکو گی تو اس نے رونا شروع کردیا۔ مجھے اس پر بے حد غصہ آیا۔ میں نے اسے دو زوردار تھپڑ لگا دیئے اور دھمکی دی کہ اگر اس نے خاموشی اختیار نہ کی تو میں اس کا گلا دبا کر ہلاک کرڈالوں گا۔ کملا خوفزدہ ہوکر چپ ہو گئی اور میرے ساتھ چلنے لگی۔ ہم ایک گھنٹے تک ٹارچ کی روشنی میں چلتے رہے پھر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد آگے بڑھنے لگے مگر اس وقت میں راستے سے بھٹک گیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کدھر جانا ہے۔ بلبیر سنگھ نے چلتے وقت کھانے پینے کا کافی سامان مجھے دے دیا تھا کیونکہ اس نے بتایا تھا کہ دن کے وقت ہمیں سفر نہیں کرنا بلکہ جنگل میں ہی چھپ کر رہنا ہے اور دوبارہ رات کو سفر کرنا ہے۔ اس طرح اگلی صبح ہم ایسی آبادی میں پہنچ جائیں گے کہ جہاں ہم پر کوئی شک نہیں کرے گا۔ وہاں سے ہمیں لاہور جانے والی بس بھی مل جائے گی۔

صبح تک ہم نے بمشکل چار میل کا فاصلہ طے کیا اور اگلا

سارا دن جنگل میں چھپ کر گزارا۔ کملا مجھے رام کرنے کی بے حد کوشش کی، مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر صرف اتنا کہا۔
''راجیش! میرا دامن داغ دار نہ کرنا۔ اس کے علاوہ میں تمہاری ہر بات مانوں گی کیونکہ میں نے اپنے آپ کو تقدیر اور حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔ قسمت میں شاید یہی لکھا ہے۔''

اگلی رات کو پھر ہم نے سفر شروع کر دیا۔ رات کا سیاہ آنچل چار سو پھیلا ہوا تھا۔ کملا کی دبی دبی سسکیاں فضا میں بکھر رہی تھیں۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا اور میں اسے کھینچ کر آگے لے جانے کے لئے کوشاں تھا کہ اچانک چار نقاب پوشوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ان میں سے ایک نے حکم دیا۔ ''تم جو بھی ہو، اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دو ورنہ ہم تمہیں بھون کر رکھ دیں گے۔''

اس اچانک افتاد سے میں اور کملا گھبرا گئے اور اپنی جان بچانے کی خاطر ہاتھ اوپر اٹھا لئے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر اندھیرا ہونے کے باوجود ہماری آنکھوں پر پٹیاں باندھ دیں اور ہمیں لے کر ایک طرف چل پڑے۔ اس دوران میں ہم نے کوئی بات نہ کی اور نہ ہی ان لوگوں نے ہم سے کچھ پوچھا اور نہ ہی آپس میں ہم کلام ہوئے۔ میں یہ سمجھا کہ یہ لوگ ڈاکو لٹیرے ہوں گے مگر انہیں ہم سے کیا ملے گا کیونکہ ہمارے پاس تو کوئی زیادہ رقم بھی نہ تھی۔

جب ہماری آنکھیں کھولی گئیں تو ہم نے اپنے آپ کو ایک بہت بڑے غار میں پایا۔ جس میں مٹی کے کئی دیئے جل رہے تھے۔ وہ لوگ ہمیں ایک کمرہ نما جگہ میں لے گئے۔ وہاں پر گھنی مونچھوں والا ایک جوان بڑی سی چارپائی پر براجمان تھا۔ ان لوگوں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''سردار! یہ لڑکا اور لڑکی ہمیں اپنے علاقے میں ملے ہیں۔ معلوم نہیں کہ یہ کون ہیں۔ ہمارے مخبر ہیں یا مسافر؟ یہ آپ سے ان سے معلوم کر لیں۔'' یہ کہہ کر وہ تمام باہر نکل گئے۔

میں اور کملا بہت ہی پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ سردار کو شاید اندازہ ہو گیا تھا کہ مخبر نہیں ہیں بلکہ کوئی مسافر ہیں اس لئے اس نے ہمیں بیٹھ جانے کو کہا۔ جب میں اور کملا بیٹھ گئے تو اس نے مجھ سے کہا۔
''نوجوان! تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو اور کہاں جانا چاہتے ہو؟ یہ لڑکی تمہاری بیوی ہے یا اسے گھر سے بھگا کر لائے ہو؟ اگر تم ہماری مخبری کے لئے آئے ہو تو یاد رکھنا! میرا نام جمیلا ہے۔ تم یہاں سے زندہ واپس نہ جاؤ گے اور اگر تم راستہ بھول کر ادھر آ نکلے ہو تو میں تم دونوں کی مدد کروں گا۔''

سردار جمیلا کی باتوں نے میری جان میں جان ڈال دی تو میں نے اپنی تمام کہانی سنا ڈالی۔ میری زخم زخم داستان سن کر جمیلا سوچ میں پڑ گیا اور بولا۔ ''راجیش! جہاں تک تمہاری، بہن کا تعلق ہے تو وہ اب مسلمان ہو چکی ہے اور ماں بھی بن گئی ہو گی۔ یہ میرا وعدہ رہا کہ میں تمہیں اس سے ضرور ملواؤں گا۔ اگر وہ خوشی سے تمہارے ساتھ جانا چاہے تو لے جانا اور اگر وہ رضامند نہ ہوئی تو زبردستی نہ کرنا لیکن اس کا شوہر نعیم قابل معافی نہیں ہے۔ اس نے تمہارے ساتھ دھوکا کیا ہے تو اس کی سزا اسے ضرور ملنی چاہئے لیکن تم کملا کے ساتھ زیادتی کر رہے ہو، اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اگر تم اسے واپس بھیج دو تو تمہارا احسان ہو گا کیونکہ دنیا کا ہر مذہب عورت کا احترام کرنے کا درس دیتا ہے، اسے برباد کرنے کا نہیں۔ میں تمہیں کملا کو برباد کرنے کی اجازت نہ دوں گا۔ آگے تمہارے مرضی ہے۔''

''سردار! میری جگہ اگر تم شکنتلا کے بھائی ہوتے تو تم یہی کرتے مگر تم شاید ان احساسات سے عاری ہو کیونکہ تم صرف لوٹنا جانتے ہو، اگر تم عورت کے لئے اتنے ہی ہمدرد اور مخلص ہو تو چھوڑ کیوں نہیں دیتے یہ درندوں والا کام؟ نہ جانے تم نے کتنے گھروں کو لوٹا اور برباد کیا ہو گا؟ کتنی سہاگنوں کے سہاگ تم نے چھینے ہوں گے؟ کتنے بچے یتیم کیے ہوں گے، کتنا خون بہایا ہو گا؟ کبھی سوچا تم نے؟''

میری باتیں سن کر جمیلا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہنے لگا۔
''بہت خوب! بہت خوب دوست! واقعی میں ایک بے رحم اور بے درد انسان ہوں مگر میں نے کہیں ڈاکا نہیں ڈالا۔ کسی کا گھر نہیں لوٹا البتہ کئی انسانوں کا خون ضرور کیا ہے اور آئندہ بھی کرتا رہوں گا۔ اس سے پہلے کہ تم مجھ سے اس کی وجہ پوچھو، میں تمہیں خود بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں جمیل سے ''جمیلا'' کیسے بنا۔ راجیش! جو کچھ میں کر رہا ہوں، یہ میری مجبوری بن گئی ہے ورنہ یہ گھٹی گھٹی زندگی گزارنے کو کس کا جی چاہتا ہے پھر جمیلا اپنے ماضی میں کھو کر بتانے لگا۔

☆☆☆......

میں ساہیوال کے قریب ایک گاؤں نور پور کا رہنے والا ہوں۔ ابتدائی تعلیم گاؤں سے اور اعلیٰ تعلیم ساہیوال کے کالج سے حاصل کی۔ میں ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ میری دو بہنیں ہیں جو مجھ سے بڑی ہیں، شادی شدہ ہیں اور اپنے اپنے گھروں میں خوشحال زندگی گزار رہی ہیں۔ اکلوتا ہونے کی وجہ سے میں بہت ہی لاڈلا اور خاندان بھر کی آنکھوں کا تارا تھا۔ غصہ بچپن سے مجھ میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ہمارا گاؤں تقریباً ایک سو گھرانوں پر مشتمل ہے۔ سوائے کمی لوگوں کے چند گھروں کے ہم سب گاؤں والے آپس میں رشتے دار ہیں اس لئے برادری میں چھوٹی موٹی ناراضگیاں ہوتی رہتی ہیں مگر کبھی بھی بڑی لڑائی اور جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ نہ ہی ہمارے گاؤں کا کوئی فرد تھانے کچہری گیا تھا۔ تمام مسئلے برادری کے بڑے بوڑھے ہی حل کرتے تھے۔ سننے میں آیا ہے کہ ان دنوں میں بہت ہی چھوٹا تھا اور تیسری جماعت میں پڑھتا تھا کہ ایک مسئلے پر ہماری برادری میں دو پارٹیاں بن گئیں اور ایک دوسرے کے خلاف بیان بازی شروع کر دی اور پھر مرنا جینا بھی ختم ہو گیا گاؤں دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ہوا یوں کہ میرے چھوٹے چچا کا برادری ہی کی ایک لڑکی سے عشق چل نکلا۔ منیراں رشتے میں میرے چچا کی دور کی کزن بھی تھی۔ گاؤں میں ان باتوں کو بہت ہی برا سمجھا جاتا تھا۔ دیہاتوں میں ایسی باتیں جرم کے زمرے میں آتی ہیں۔ منیراں اور میرے چچا اشرف کی محبت بھی چھپی نہ رہ سکی اور بات گاؤں میں پھیل گئی پھر ایک دن منیراں اور اشرف کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا۔ معمولی سی بات اسکینڈل بن گئی۔ یوں منیراں اور اشرف کی راہیں جدا ہو گئیں۔ اشرف چچا کو دادا جان نے ڈانٹا پھٹکارا اور ادھر منیراں کو اس کے بھائیوں نے مارا پیٹا اور اس کا گھر سے باہر نکلنا بند کر دیا۔ چند معزز لوگوں نے کوشش کی کہ اس بدنامی اور رسوائی سے بچنے کے لئے اگر اشرف اور منیراں کی شادی کر دی جائے تو یہ مسئلہ اور ناراضگی ختم ہو جائے گی اور اشرف اور منیراں کے من کی مرادیں بھی پوری ہو جائیں گی مگر منیراں کے بھائی نہ مانے۔ انہوں نے آدھی برادری کو ساتھ ملا کر محاذ بنا لیا کہ وہ اشرف کو ماریں گے اور اس کا جینا مشکل کر دیں گے۔ آدھی برادری ان کے ساتھ اور آدھی ہمارے ساتھ مل گئی۔ یوں گاؤں دو حصوں میں بٹ گیا۔ مرنا جینا اور ایک دوسرے کی خوشیاں اور غموں میں شرکت کرنا ختم ہو گیا۔ ایک دو بار چچا اور منیراں کے بھائیوں کا ٹکراؤ بھی ہوا مگر بات زیادہ نہ بڑھی۔ منیراں اور اشرف کے سر سے بھی عشق کا بھوت اتر گیا۔ اس طرح کئی سال گزر گئے۔ اشرف چچا فوج میں ملازم ہوئے پھر ان کی شادی ہو گئی۔ بچے بھی ہو گئے ادھر منیراں کی بھی شادی ہو گئی اور وہ بھی بچوں کی ماں بن گئی۔ ان کا عشق قصہ پارینہ بن گیا کئی بڑے بوڑھے جن کو حقیقت معلوم تھی وہ دنیا سے چل بسے اور میرے جیسے اور میرے ہم عمر اس بات سے بے خبر ہی رہے آہستہ آہستہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حالات معمول پر آنے لگے۔

ہمارا خاندان تو اس قصے کو بھول گیا مگر منیراں کا باپ جب تک زندہ رہا، اس نے ہماری برادری کو زک پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ادھر منیراں کے بھائی بھی اس بات کو نہ بھلا سکے۔ انہوں نے چوری چھپے کوئی بھی ایسا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جس میں ہماری برادری کی تضحیک کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔ میں جوں جوں جوان ہو گیا توں توں ان باتوں کو محسوس کرنے لگا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ ہم سب ایک ہیں۔ ہمارا رنگ اور ہمارا خون ایک ہے۔ تمام گاؤں والے آپس میں رشتے دار ہیں تو پھر یہ ناراضگیاں کیوں ہیں؟ میں شروع ہی سے غصہ ور ہونے کے ساتھ ساتھ زیادہ حساس بھی تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ہم سب مل کر اور اتفاق سے رہیں۔ ہمارے درمیان محبت اور خلوص کے رشتے قائم ہوں۔ مجھے اس بات پر بڑا دکھ ہوا کہ میرے رشتے دار لکیر کے فقیر ہیں اور برسوں پرانی رنجش کو اب تک دلوں کا میل بنائے بیٹھے ہیں۔ میں ان دنوں کالج میں پڑھتا تھا اس لئے علم کی کتابوں نے بھی مجھے یہی سبق سکھایا تھا کہ آپس میں مل جل کر اور محبت سے رہو، ایک دوسرے کے دکھ درد بانٹا کرو مگر میں اس وقت بہت کڑھتا جب کسی شادی بیاہ کے موقع پر آدھی برادری تو موجود ہوتی اور آدھی برادری اپنے گھروں میں بیٹھی رہتی۔ میں فرداً فرداً ہر ایک کے گھر جاتا اور منتیں کر کے انہیں منا کر اس خوشی کے لمحات میں شامل کرتا۔ کئی لوگ میرے اس کردار کی تعریف کرتے تھے کئی مخالفت۔ جب میری بہنوں کی شادی ہوئی تو تب بھی میں نے کئی بزرگوں کے پاؤں پکڑ کر ان کو شادیوں میں شامل کیا۔

منیراں رشتے میں میری پھوپھی لگتی تھی۔ میرا ان کے گھر اوران کے بھائیوں کے گھروں میں آنا جانا تھا کیونکہ کہ وہ بھی میرے چچا ہی لگتے تھے۔ وہ نہ صرف مجھ سے محبت کرتے تھے بلکہ احترام بھی کرنے لگے تھے۔ جبھی تو اب ہمارے گھروں میں آزادانہ طور پر آنے جانے لگے تھے اور برسوں پرانی کدورتیں ختم ہو گئی تھیں۔ اس کا سارا کریڈٹ برادری والے مجھے ہی دیتے تھے مگر میں اب بھی مطمئن نہ تھا۔ میری دو بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ یہ چھوٹی فرزانہ غیر شادی شدہ تھی۔ اب وہ بھی جوان تھی اور ہم اس کی شادی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ فرزانہ کی شادی پھوپھی منیراں کی برادری میں ہو جائے تاکہ برسوں پرانی دشمنی رشتے داری میں بدل جائے اور آئندہ کے لئے برادری میں جھگڑے کا امکان ختم ہو جائے۔

پھوپھی منیراں کا ایک بھائی فوت ہو گیا تھا مگر ایک بھائی زندہ تھا جو گاؤں میں زمینداری کرتا تھا اور گاؤں کی نمبرداری بھی اس کے پاس تھی۔ اس کا کوئی جوان بیٹا نہ تھا مگر پھوپھی منیراں کا ایک جوان بیٹا مشتاق تھا۔ چونکہ میں ایک بہن کا بھائی تھا اس لئے میں تو اپنی بہن کے رشتے کی پیشکش نہ کرسکتا تھا لہٰذا خاموش تھا۔ آخر کار ایک دن خود ہی پھوپھی منیراں کے بھائی چچا خادم نے رشتے کی بات چھیڑ دی اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ اگر میری بہن فرزانہ کا رشتہ مشتاق سے ہو جائے تو یہ جوڑی خوب سجے گی۔ چچا خادم نے رشتے کی بات چھیڑ دی اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ اگر میری بہن فرزانہ کا رشتہ مشتاق سے ہو جائے تو یہ جوڑی خوب سجے گی۔ چچا خادم نے میرے دل کی بات کہی تھی۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ ہمارے گھر رشتہ مانگنے آئیں تو میں بھی ان کا ساتھ دوں گا۔ چچا خادم اور پھوپھی منیراں ایک دن رشتے کی غرض سے ہمارے گھر آ گئے۔ امی ابا نے انکار تو نہ کیا بلکہ یہ کہا کہ ہم سوچ کر اور برادری سے مشورہ کر کے جواب دیں گے۔ جب یہ بات عزیزوں اور رشتے داروں تک پہنچی تو انہوں نے اس رشتے کی مخالفت شروع کر دی کہ فرزانہ کا رشتہ مشتاق کو ہرگز نہ دیا جائے۔ ہر ایک نے یہ خدشہ ظاہر کیا کہ وہ لوگ فرزانہ کا رشتہ مشتاق کے لئے مانگ کر برسوں پرانا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ وہ اسے خوش نہیں رکھیں گے بلکہ اذیتیں دیں گے اور برسوں پرانی انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کریں گے مگر مجھے ان لوگوں سے اتفاق نہ تھا۔ میں اپنے موقف پر ڈٹ گیا اور امی ابا کو راضی کر لیا۔ یوں یہ رشتہ کئی لوگوں کی ناراضگی کے باوجود بھی طے ہو گیا اور فرزانہ کی شادی مشتاق کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے ہو گئی جس میں تمام برادری شریک ہوئی تھی۔ میں نے اس وقت تک رخصتی نہ ہونے دی جب تک کہ گاؤں کے تمام لوگ اس شادی میں شامل ہوئے تھے۔ میں نے ان کو بھی بتایا تھا کہ میں نے اپنی بہن کا رشتہ دے کر ایک بڑا مسئلہ حل کیا ہے۔ میں نے رشتوں کو مضبوط کرنے کی خاطر رشتوں کی بھینٹ دی ہے اس لئے مجھے امید ہے کہ پروردگار میری لاج رکھے گا اور فرزانہ مشتاق کے سنگ ایک خوشحال زندگی گزارے گی۔ برسوں بعد تمام گاؤں ایک ہو گیا۔ میں بہت خوش ہو کر کالج لوٹ آیا اور پڑھائی میں مشغول ہو گیا۔

ایک سال بعد فرزانہ ایک بیٹے کی ماں بن گئی جس کی سب نے بہت خوشی منائی۔ خود فرزانہ اور مشتاق بھی بہت خوش تھے۔ پھوپھی منیراں نے فرزانہ کو سگی بیٹیوں سے بڑھ کر چاہا۔ یوں برادری والوں کے تمام خدشے دم توڑ گئے اور میں سرخرو ہو گیا۔ فرزانہ کا بیٹا چھ ماہ کا تھا کہ اسے نمونیہ ہو گیا اور وہ فوت ہو گیا۔ مجھے اور سب کو اس کی موت کا بہت دکھ ہوا مگر قدرت کو یہی منظور تھا اس لئے یہ دکھ سہنا ہی پڑا۔ فرزانہ کی شادی ہوئے دو سال ہونے کو تھے کہ دھماکا ہوا جس نے میرے حواس چھین لئے۔ برادری والوں کا کہا سچ نکلا۔ فرزانہ کو مشتاق نے طلاق دے کر رخصت کر دیا۔ پھوپھی منیراں اور اس کے خاندان نے میری معصوم اور پاکیزہ بہن پر بدچلنی اور طرح طرح کے گھٹیا الزامات لگائے تھے۔ میں نے یہ خبر سنی تو یقین نہ آیا۔ اس انہونی خبر نے میرے اندر ایک طوفان بپا کر ڈالا۔ میں تو ایسا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ میری روح پر برچھیاں سی چلنے لگیں۔ مشتاق کے گھر والوں نے پہلے تو فرزانہ پر بدچلنی کا الزام لگایا مگر بعد میں کھل کر کہنے لگے کہ اشرف نے تو منیراں کی بے عزتی کروائی تھی مگر ہم نے اس سے بڑھ کر بدلہ لیا ہے اور فرزانہ کو طلاق دلوائی ہے۔

میں گاؤں گیا تو عزیزوں اور رشتہ داروں کی باتیں اور طعنے سن کر تنگ آ گیا۔ فرزانہ چند دنوں میں ہی سوکھ کر

ہڈیوں کا ڈھانچا بن گئی۔ اس کا معصوم اور زرد چہرہ اور نم آنکھیں دیکھ کر میرا دل تڑپ گیا۔ اپنی پیاری بہن کی اس قدر تضحیک اور بربادی دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا۔ میں نے فرزانہ کے آگے ہاتھ جوڑ کر اس سے معافی مانگی تو وہ میرے گلے لگ کر سسکنے لگی۔ اس کو روتا دیکھ کر میری آنکھیں بھی گنگ وجمن بن گئیں۔ میں نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا، اس کے ہاتھوں کو چوما اور اور قسم کھائی کہ فرزانہ بہن! میں تمہاری بربادی اور رسوائی کا بدلہ ضرور لوں گا۔ تم دیکھو گی کہ میرا انتقام کتنا انوکھا اور نرالا ہوگا۔

میں کالج لوٹ آیا مگر پڑھنے سے جی اچاٹ ہو گیا۔ دلدار شاہ میرا کلاس فیلو اور دوست تھا۔ وہ کالج پڑھنے نہیں صرف بدمعاشی کرنے آیا ہوا تھا۔ میں نے اسے تمام بات بتائی اور کہا کہ میں اپنی بہن کا بدلہ لینا چاہتا ہوں۔ مجھے اس سلسلے میں تمہاری مدد درکار ہے۔ دلدار شاہ مجھے اپنے گاؤں لے گیا۔ وہاں اس نے ہتھیاروں کا استعمال سکھایا۔ جب میں ماہر ہو گیا تو کالج لوٹ آیا۔ اب میرا پڑھنے کا ارادہ ہی نہ تھا۔ مجھ پر ایک ہی بھوت سوار تھا کہ میں مشتاق اور اس کا خاندان ختم کر ڈالوں۔ جب میں نے گاؤں آنے کا پروگرام بنایا تو دلدار شاہ بھی میرے ساتھ آنا چاہتا تھا مگر میں نے اسے ساتھ لانا مناسب سمجھا کیونکہ ہمارے گاؤں میں کسی شخص کے پاس کسی قسم کا اسلحہ نہ تھا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ میں جانتا تھا کہ مشتاق مکان کی چھت پر سوتا ہے۔ مجھے تمام راستوں کا بخوبی علم تھا۔ یوں مشتاق کو قتل کرنا میرے لئے مشکل ثابت نہ ہوا۔ میں نے خنجر کے وار سے ہی اس کا کام تمام کر ڈالا اور بھاگ کر کالج آ گیا۔ مشتاق کی موت سے ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ پہلی بار ہمارے گاؤں میں پولیس آئی۔ چچا خادم نے میرے اور میرے ابا جان کے خلاف رپورٹ درج کرادی کہ انہوں نے ہی مشتاق کو قتل کیا ہے۔ پولیس نے ابا جان کو گرفتار کیا اور تھانے لے گئے۔ میں کالج سے بھاگ کر دلدار شاہ کے گاؤں چلا گیا۔ جہاں اس کے بھائیوں نے نہ صرف پناہ دی بلکہ تسلی اور حوصلہ دیا۔ میرے فرار ہونے سے پولیس کو یقین ہو گیا کہ قتل میں نے کیا ہے اس لئے انہوں نے میرے ابا جان کو چھوڑ دیا اور میری تلاش شروع کر دی۔ دو ماہ تک میں دلدار شاہ کے گھر چھپا رہا اور پھر ایک رات میں نے چچا خادم کا کام بھی تمام کر ڈالا۔

میرے ساتھ دلدار شاہ کے آدمی تھے۔ انہوں نے میری بھرپور مدد کی۔ یوں میری جھجک ختم ہو گئی پھر میں نے خادم کے دو بچوں کو بھی موت کی نیند سلا دیا۔ ایک رات چوری چھپے میں اپنے گھر گیا۔ سب نے مجھے باری باری گلے لگایا۔ ابا جان کہنے لگے کہ میں اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دوں ورنہ کہیں نہ کہیں میں پولیس کی گولیوں کا نشانہ بن جاؤں گا مگر میں نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور کہا اب میں جن راہوں پر چل پڑا ہوں، ان سے پلٹنا مشکل ہے۔ اب یہ راہیں ہی میری زندگی ہیں۔ میں اپنی بہن کی خوشیوں اور ارمانوں کا قاتل ہوں۔ میں اپنے آپ کو بھی معاف نہ کر سکوں گا۔ میں جب تک زندہ ہوں، اپنی بہن کے برباد کرنے والوں کو چن چن کر مارتا رہوں گا۔ اب یہی میری زندگی کا مشن ہے۔ میں جانتا ہوں کہ پولیس میرے تعاقب میں ہے مگر میں پولیس کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔ میرے انتقام کی آگ ابھی ٹھنڈی نہیں ہوئی۔ یہ ایسی آگ ہے کہ میں قبر میں بھی سلگتا اور تڑپتا رہوں گا کیونکہ ان لوگوں نے انسانیت کی قدر نہیں کی۔ میرے جذبوں کا مان نہیں رکھا۔ میری قربانی کا پھل نہیں دیا۔ اس لئے میں پور پور انتقام میں ڈوبا ہوا ہوں۔"

میں اپنی ماں، باپ اور بہن کو روتا چھوڑ کر آخری بار ان سے مل کر گھر سے نکل آیا اور پھر وہ علاقہ ہی چھوڑنے کا عہد کر لیا۔ دلدار شاہ کے کئی ساتھی مجھ سے مل گئے جو چوریاں کرنے اور ڈاکے ڈالنے میں ماہر تھے۔ پولیس کی پہنچ سے بچنے کے لئے میں ایک نامی ڈاکو فیروز خان کے گروہ میں شامل ہو گیا۔ یہ ٹھکانہ فیروز خان کا ہی تھا۔ اسے بھی زمانے والوں نے ڈاکو بنا دیا تھا۔ میری اور اس کی کہانی ملتی جلتی تھی اس لئے اس نے مجھے سینے سے لگا لیا۔ جب مجھے مکمل تحفظ کا احساس ہوا تو میں نے منیراں اور خادم کے خاندان کو پیغام بھیجا کہ میں تم لوگوں سے اپنی بہن کے اجڑنے کا بدلہ لے رہا ہوں اور تمام عمر لیتا رہوں گا۔ اگر کسی نے میرے گھر کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو میں اس کا جینا حرام کر ڈالوں گا۔ میں نے ان پر واضح کر دیا کہ میں ان کی عورتوں کو میری وارننگ ہے کہ وہ بھی بیٹا پیدا نہ کریں۔ میں ان کے خاندان کے ہر مرد کا دشمن ہوں۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

کچھ عرصے بعد فیروز خان ایک پولیس مقابلے میں مارا

گیا۔ پھر اس کے ساتھیوں نے مجھے اپنا سردار مان لیا۔ اس لئے کہ میں بہت ہی اصول پسند آدمی ہوں۔ اب بھی میں منیراں اور خادم کے خاندان کا دشمن ہوں۔ ان کے خاندان میں جو بھی لڑکا پیدا ہوگا، میں اسے ماردوں گا اور جب تک میں زندہ ہوں، اپنے اس عہد پر قائم رہوں گا۔ اب میں اشتہاری ملزم ہوں۔ میری گرفتاری پر لاکھوں کا انعام رکھا گیا ہے۔ میں نے آج تک کسی غریب اور مظلوم کو نہیں لوٹا بلکہ ان کی مدد کرتا ہوں۔ میں نے آج تک کوئی ڈاکا نہیں ڈالا اور نہ ہی چوری کی ہے۔ یہ کام میرے ساتھی کرتے ہیں اور میں ان کا لوٹا ہوا سامان غریبوں میں بانٹ دیتا ہوں۔ میرے ساتھی بھی صرف اور صرف امیروں اور دولت مندوں کو ہی لوٹتے ہیں۔ ان دولت مندوں کو جو اس ملک کو لوٹ رہے ہیں جو غریبوں کا حق مار رہے ہیں۔ پولیس میری تلاش میں سرگرداں ہے، مجھے اپنی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں ہے نہ جانے کب زندگی کا پیمانہ چھلک جائے مگر جب تک زندہ ہوں، منیراں اور اس کے خاندان کو بھی معاف نہیں کروں گا، منیراں کا خاوند کویت میں ہے۔ اتنا عرصہ گزر گیا ہے مگر وہ میرے خوف سے پاکستان نہیں آیا۔ اب میں اس کا منتظر ہوں۔ جس دن وہ پاکستان آ گیا، میں اس کے خون میں انگلیاں ڈبو کر ہی چین سے بیٹھوں گا۔ نہ جانے میری یہ خواہش کب پوری ہوگی؟ پولیس اور میرے ساتھی اب مجھے ”جمیلا ساہی“ اس لئے کہتے ہیں کہ میرا تعلق ساہیوال سے ہے۔“

......☆☆☆......

جمیلا اپنی لہولہو داستان سنا کر خاموش ہوا تو اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی بجائے محرومیوں کے سائے تھے۔ شاید وہ اپنے تمام آنسو اپنی بہن کی بربادی پر بہا چکا تھا مگر میری آنکھیں ساون بھادوں بن گئیں کیونکہ میرے زخم ابھی ہرے تھے۔ میں نے بے اختیار جمیلے کو گلے سے لگا لیا اور کہا۔ ”دوست! میری اور تمہاری کہانی ایک جیسی ہی ہے مگر کسی اور طریقے سے اپنی بہن کی بربادی کا بدلہ لے رہے ہو جب کہ میں کسی اور طریقے سے۔ مگر ہمارا زخم ایک ہے۔ ہماری منزل ایک ہے۔ میں کملا کو اس لئے لایا ہوں کہ اسے لاہور کی ہیرامنڈی میں فروخت کرڈالوں گا تاکہ وہ تمام عمر اس آگ میں جلتی رہے مگر تم نے مجھے عورت کا احترام کرنے کی ترغیب دے کر میرے من میں اجالے بھر دیئے ہیں۔ ٹھیک ہے تم کہتے ہو تو میں کملا کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کروں گا۔ بلکہ اس کو واپس بھجوا دوں گا۔ ایسا نہ کرسکا تو اس کے ساتھ شادی کرلوں گا۔“

جمیلا میرا فیصلہ سن کر بہت خوش ہوا۔ ”راجیش! اگر تم کملا سے شادی کرلو تو خوشی کی بات ہوگی۔“

”یہ بعد کی کیا بات ہے ابھی میں اس مسئلے پر سوچوں گا کہ مجھے کیا فیصلہ کرنا چاہئے۔“

جمیلے نے ہم دونوں کو علیحدہ علیحدہ کمرہ نما غاروں میں سونے کے لئے بھیج دیا اور بولا۔ ”تم لوگ یہاں بے فکر ہو کر رہو۔ کل تک میں تمہاری مدد کے بارے میں فیصلہ کروں گا۔“

میں نے تمام رات کروٹیں بدلتے ہوئے گزار دی۔ اگلے دن جمیلا مجھے شام ڈھلنے سے قبل نزدیکی شہر لے گیا تاکہ وہ میرے اور کملا کے لئے کپڑے اور دیگر اشیاء خرید لے۔ وہ سیالکوٹ شہر کے قریب ایک شہری قصبہ تھا۔ جمیلے نے میرے اور کملا کے لئے کپڑے خریدے۔ ان کے علاوہ بھی ضرورت کی چند اشیاء خریدیں اور بڑے محتاط انداز میں واپس روانہ ہوئے۔ جب ہم ڈیرے پر پہنچے تو وہاں ایک اور قیامت ہماری منتظر تھی۔ جمیلے کے ساتھی گھبرائے ہوئے لگ رہے تھے۔ جمیلا فوراً ان کی پریشانی بھانپ گیا اور وجہ پوچھی کہ تم لوگوں نے اپنے چہرے کیوں لٹکائے ہوئے ہیں؟ ان میں سے ایک ڈرتا ہوا بولا۔ ”سردار! ہماری مہمان نے خودکشی کرلی ہے۔“

”کیا؟“ میں اور جمیلا دونوں کے ساتھ دہاڑے اور اس غار کی طرف بھاگے جہاں ہم کملا کو چھوڑ کر گئے تھے۔

کملا واقعی مر چکی تھی۔ اس کا مردہ جسم دیکھ کر میری اور جمیلے دونوں کی آنکھیں بھر آئیں۔ جمیلا کمرے سے باہر اور ساتھیوں کو آواز دے کر بلایا۔ جب وہ آئے تو جمیلا بولا۔ ”میں اپنے غیرملکی مہمان اور وہ بھی ایک عورت کو تمہارے حوالے کر کے گیا تھا کہ اس کی حفاظت کرنا مگر تم لوگوں نے اس کی حفاظت کی بجائے اس کا دامن داغدار کر ڈالا۔ یہ سب کیسے ہوا؟ بتاؤ ورنہ میں ایک ایک کو بھون کر رکھ دوں گا۔“

ایک ساتھی نے بتایا۔ ”نائب سردار کلو نے کملا سے

زبردستی کی۔ یہ سب کچھ ہماری اور کملا کی مرضی کے خلاف ہوا ہے۔ ہم نے کلو کو بہت منع کیا مگر وہ نہ مانا۔ اس پر تو جنون سوار تھا۔ اس نے ہم سب کو دھمکی دی کہ اگر کسی نے مزاحمت کی تو وہ اس کو زندہ نہیں چھوڑے گا اس لئے ہم بے بس ہو کر تماشا دیکھتے رہے۔ کملا دیوی شاید اپنی اتنی توہین برداشت نہ کرسکی کیونکہ کلو کے چلے جانے کے بعد جب ہم کملا کے پاس گئے تو وہ آخری سانسیں لے رہی تھی اس نے مٹی کا تیل پی لیا تھا اور ساتھ ہی چوڑیاں بھی پیس کر کھالی تھیں۔

جمیلا کا غصہ آسمان کو چھونے لگا۔ خود مجھے بھی کملا کی موت کا بے حد صدمہ ہوا۔ میری آنکھیں بھر آئیں۔ جمیلے کی آنکھوں میں شرارے ناچنے لگے۔ اس نے پستول نکال لیا اور شرمندہ سا ہو کر میرے طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''دوست! میں شرمندہ ہوں کہ تمہاری امانت کی حفاظت نہ کرسکا اور نہ ہی اپنے دل کی بات پوری کرسکا مگر میں اس شرمندگی کا داغ ابھی دھو دیتا ہوں۔'' اس نے گرجدار آواز میں پوچھا۔ ''کلو اس وقت کہاں ہے؟''

کوئی جواب نہ ملا تو اس نے باری باری سب سے پوچھنا شروع کردیا۔ پہلے ساتھی نے کوئی جواب نہ دیا تو جمیلے نے اس کے سر پر گولی داغ کر اس کا کام تمام کرڈالا اور پھر دوسرے کا بھی یہی حشر ہوا۔ جب تیسرے کی باری آئی تو اس نے زبان کھول دی اور بتانے لگا کہ کلو پیچھے والی چھوٹی غار میں چھپا ہوا ہے مگر سردار! تم ابھی اس کے سامنے نہ جانا اور نہ ہی اسے کچھ کہنا کیونکہ وہ بہت غصے میں ہے۔ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا ہے۔ یہ نہ ہو کہ وہ آپ کو کوئی نقصان پہنچادے۔

جمیلے نے اس کی بات ان سنی کردی۔ اس نے مجھے وہیں چھوڑا اور خود غار سے باہر نکل گیا۔ آدھے گھنٹے کے بعد جب جمیلا واپس آیا تو اس کے کندھے پر کلو کی لاش تھی۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''اس وحشی درندے کی لاش جنگل میں پھینک آؤ تاکہ اسے درندے کھاجائیں۔''

وہ لاش لے کر چلے گئے اور کہیں پھینک آئے پھر جمیلے نے اپنے دونوں ساتھیوں کا جنازہ پڑھ کر وہیں ان کو دفن کردیا۔ کملا کے لئے اس نے علیحدہ قبر تیار کرائی اور اس کو بھی دفن کردیا۔ کملا کا آخری دیدار کرتے وقت میری آنکھیں بھر

آئیں۔ میں نے اس کے بارے میں کیا سوچا تھا مگر قدرت کو کیا منظور تھا۔ جمیلا بار بار مجھ سے معافی مانگتا اور شرمندگی کا اظہار کرتا رہا مگر میں نے اسے یقین دلایا کہ مجھے کوئی دکھ اور شکوہ نہیں ہے۔ گملا مر گئی بات ختم ہو گئی۔ میں تمہاری جوانمردی، بہادری اور غیرت کے علاوہ تمہاری محبت اور دوستی ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ اب تم میرا ایک کام کر دو۔ مجھے شکنتلا کے پاس پہنچا دو۔"

جمیلا کہنے لگا۔ "دوست! تم بے فکر رہو۔ دو دن بعد میں خود تمہارے ساتھ جاؤں گا اور تمہیں تمہاری بہن تک پہنچا کر واپس آؤں گا بلکہ میں وہاں ہی کسی ایسی جگہ ٹھہروں گا جہاں کا صرف تمہیں علم ہو گا۔ کسی مصیبت یا پریشانی کی صورت میں تمہاری مدد کروں گا۔ اگر نعیم سے حساب لینا ہو تو وہ بھی لے لوں گا۔"

دو دن بعد میں جمیلے کے ہمراہ فیصل آباد کے لئے روانہ ہو گیا۔ ایڈریس میرے پاس تھا۔ جلد ہی ہم نے نعیم کا گھر ڈھونڈ لیا۔ جمیلا وہاں سے واپس چلا گیا اور مجھے تاکید کی کہ مجھے بڑی احتیاط سے ہوشیاری سے کام لینا ہے۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔ دروازہ ایک دس سالہ بچے نے کھولا اور سلام کرنے کے بعد پوچھنے لگا۔ "آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

"نعیم صاحب سے ملنا ہے۔ میں ان کا دوست ہوں اور بڑی دور سے آیا ہوں۔"

"نعیم انکل تو سعودی عرب میں ہوتے ہیں۔" بچے نے جواب دیا۔

"کوئی بات نہیں تمہاری آنٹی سلمیٰ تو گھر پر ہوں گی۔ میں ان سے مل لوں گا۔"

"گھر میں کوئی مرد نہیں ہے۔ آپ ڈرائنگ روم میں بیٹھیں۔ میں آنٹی سلمیٰ کو بتاتا ہوں۔ کیا بتاؤں ان کو؟ آپ کا نام کیا ہے؟"

"آنٹی سے کہنا کہ آپ کا بھائی آیا ہے۔ نام بتانے کی ضرورت نہیں ہے وہ خود ہی سمجھ جائیں گی۔"

بچہ مجھے بیٹھک میں بٹھا کر باہر نکل گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ آیا تو کہنے لگا۔ "انکل آپ کو تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑے گا کیونکہ آنٹی نماز پڑھنے کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کر رہی ہیں۔ وہ جب تلاوت سے فارغ ہو جائیں گی تو پھر ان کو آپ کی آمد کا بتاؤں گا۔"

یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد وہ ٹھنڈا مشروب لے آیا اور میز پر رکھ کر چلا گیا۔

میں نے شربت کو نظر انداز کر دیا کیونکہ میں جلد از جلد اپنی بہن سے ملنا چاہتا تھا۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھیں۔ غصے اور محبت کے جذبات آپس میں گڈمڈ ہونے لگے۔ اتفاق سے ہمارے گاؤں میں ایک بھی مسلمان آباد نہ تھا اس لئے میں نے نہ تو کسی کو نماز پڑھتے دیکھا تھا اور نہ ہی قرآن مجید پڑھتے ہوئے۔ اس لئے یہ سن کر میری بہن قرآن مجید کی تلاوت کر رہی ہے، میرا دل اتھل پتھل ہونے لگا۔ میں نے چاہا کہ اپنی بہن کی آواز تو سنوں لہٰذا میں نے اس کمرے کی وہ کھڑکی آہستہ کھولی جو صحن کی طرف کھلتی تھی۔ اس سے جھانک کر میں نے صحن کی طرف دیکھا تو میری نظر اپنی بہن پر پڑی۔ وہ برآمدے میں ایک چارپائی پر بیٹھی اپنا سر ڈھانپے ہوئے نہایت ہی خضوع وخشوع کے ساتھ تلاوت کر رہی تھی۔ وہ سورہ رحمان کی تلاوت کر رہی تھی۔ اس کی آواز برسوں بعد میرے کانوں نے سنی تو یوں لگا کہ جیسے کوئی میرے کانوں میں رس انڈیل رہا ہے۔ میں نے زندگی میں پہلی بار قرآن مجید سنا تھا۔ نہ جانے اس مقدس کتاب کی تلاوت سن کر مجھے کیا ہو گیا کہ میں تمام غصہ، نفرت اور انتقام بھول گیا۔ یوں لگا جیسے میرے اندر کوئی انقلاب آ گیا ہو۔ ایسا انقلاب جس نے میری کایا ہی پلٹ کر رکھ دی ہو۔ میری بہن کی زبان سے نکلے ہوئے خدا کی مقدس کتاب کے الفاظ میرے کانوں میں رس بن کر اترنے لگے۔ یوں لگا کہ میرے دل ودماغ پر تالے لگے ہوئے تھے جو کھلنا شروع ہو گئے ہیں۔ میرا دل بے قرار سا ہو گیا۔ جی چاہتا تھا کہ میں بھی سلمیٰ کی طرح اس کتاب کو پڑھوں اور تمام عمر اسی طرح پڑھتا رہوں۔ میرے اندر نور کی بارش ہونے لگی۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ وہ سب کچھ کیسے ہو گیا تھا۔ کوئی طاقت ایسی تھی جس نے پل بھر میں میری دنیا بدل ڈالی۔ میں نے سلمیٰ کو معاف کرنے کا عہد کر لیا اور خود کو بھی اس کے رنگ میں رکھنے کا سوچنے لگا۔ میری بیقراری بڑھنے لگی۔ میں زیادہ انتظار نہ کر سکا اور دروازہ کھول کر صحن میں چلا آیا مگر سلمیٰ دنیا ومافیہا سے بے خبر اپنے پروردگار کے حضور سجدہ ریز تھی۔ جب اس نے سر اٹھایا

تو مجھے دیکھ کر اسے یقین نہ آیا کہ اس کے سامنے اس کا بھائی کھڑا ہے۔ سلمیٰ نے قرآن مجید کو چوما، آنکھوں سے لگایا اور طاق میں رکھنے کے بعد "بھائی جان!" کہہ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ ہم دونوں دیر تک ایک دوسرے سے لپٹ کر روتے رہے۔ برسوں کا غبار اور رنج آنسوؤں نے دھو ڈالا۔ جب ہم علیحدہ ہو کر بیٹھے تو سلمیٰ کہنے لگی۔ "مجھے یقین تھا کہ آپ مجھ سے ملنے ضرور آئیں گے کیونکہ میں کئی دنوں سے آپ کو خواب میں دیکھ رہی ہوں۔ میرے خوابوں کی تعبیر سچ نکلی ہے۔"

"ہاں سلمیٰ! میں تم سے ملنے آیا تھا مگر کسی اور فیصلے کے تحت کہ میں تمہیں زبردستی واپس لے جاؤں گا اور تمہیں اپنے کئے کی سزا دوں گا مگر اب تمہیں اس مقدس روپ میں دیکھ کر تمام نفرتیں اور انتقام بھول گیا ہوں۔"

سلمیٰ نے ایک بار پھر اپنی داستان سنا ڈالی اور کہنے لگی۔ "میں یہاں بہت خوش ہوں۔ میری ساس اور سسر بیٹی کے پاس کراچی گئے ہوئے ہیں۔ نعیم اور اس کا بھائی وسیم دونوں سعودی عرب چلے گئے ہیں اور عنقریب میں بھی سعودیہ چلی جاؤں گی۔"

میں سلمیٰ کو سکھی اور خوشحال دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

کچھ دیر بعد سلمیٰ نے پوچھا "آپ کا ویزا کتنے دنوں کا ہے؟"

"میں ویزے کے بغیر آیا ہوں اور اب کبھی واپس نہیں جاؤں گا۔ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں اور اب یہیں رہوں گا۔ تمہارا ہم مذہب بن کر۔"

سلمیٰ کی آنکھیں خوشی سے جل تھل ہو گئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ چوم لئے۔

اگلے دن مسجد کے امام کے سامنے کلمہ پڑھ کر میں مسلمان ہو گیا۔ سلمیٰ نے میرا نام سلیم احمد رکھا اور پھر اس نے تمام تفصیل نعیم اور وسیم کو لکھ دی۔ نعیم فوراً پاکستان چلا آیا۔ اس کی خوشی دیدنی تھی۔ اس نے میری شادی اپنی بہن روبینہ سے کر دی۔ وہ سلمیٰ کے ساتھ سعودی عرب چلا گیا۔ کچھ عرصہ بعد اس نے میرا ویزا بھیجا اور میں بھی سعودی عرب چلا گیا اور پھر روبینہ کو یہاں ہی بلا لیا گیا۔ میں اب بھی ملازمت کرتا ہوں۔ سلمیٰ کے تین بچے ہیں جب کہ میرا ایک بیٹا ہے۔

جمیلے کو میں نے اسی دن تمام بات بتا دی تھی۔ وہ بہت خوش ہو کر واپس روانہ ہو گیا۔ میں ابھی پاکستان میں ہی تھا کہ پتا چلا کہ جمیلا محض اس وجہ سے پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے کہ اس کے ساتھیوں نے مخبری کر دی اور اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا کیونکہ اس میں سے زیادہ تر کلو کے طرف دار تھے۔ جمیلے کی موت کا سن کر مجھے بے حد صدمہ ہوا۔ بالکل ایسے ہی جیسے میرا سگا بھائی راکیش ایک بار پھر مر گیا ہو۔ میں اس دن بہت رویا تھا اس لئے کہ جمیلا ایک بدی کا خاتمہ نہیں بلکہ ایک نیکی کا خاتمہ تھا۔ اس کی موت کا دکھ میں تمام عمر نہ بھول پاؤں گا۔

میرا دوست بلبیر سنگھ ابھی زندہ ہے اور اپنا "دھندا" کر رہا ہے۔ اس سے میری خط و کتابت ہوتی رہتی ہے۔ اس کے خط سے ہی پتا چلا تھا کہ میرے ابا نے سلمیٰ، میرے اور کملا کے اسکینڈل کے بعد اپنی تمام جائیداد غریبوں میں بانٹ دی تھی اور خود گاؤں چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے کہیں چلے گئے تھے۔ ابھی تک ان کی کوئی خبر نہیں کہ وہ کہاں ہیں؟ زندہ ہیں یا مر گئے ہیں؟ جب کہ رام گڑھ والا ٹھاکر بلدیو رام کملا کے غم میں پاگل ہو گیا ہے۔ اس کی جائیداد پر لوگوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ وہ اب بھی رام گڑھ میں گلیوں میں پھرتا نظر آتا ہے۔ بچے اسے چھیڑتے اور پتھر مارتے ہیں مگر وہ زبان سے کچھ بھی نہیں کہتا۔ ایسا لگتا ہے کہ کسی نے اس کی قوت گویائی چھین لی ہے۔ وہ لوگوں کے لئے عبرت کا نشان بنا ہوا ہے۔



# ماں مامتا

تفسیر عباس بابر



تیمور لنگ کے متعلق عمومی تاثر یہی ہے کہ اس نے نصف صدی تک دھرتی کو تاخت و تاراج کیا لیکن اس کی شخصیت کا ایک دوسرا پہلو بھی تھا جس کا علم بہت کم لوگوں کو ہوگا دہشت و جبر کی علامت وہ شخص کس طرح ایک ماں کے سامنے پتھر سے موم بن گیا۔

تاریخ کے جھرونکوں سے ایک دلچسپ دلوں کو چھو لینے والی تحریر

تاریخ اسے تیمور لنگ کے نام سے جانتی ہے۔اس سے متعلق عمومی تاثر یہی ہے کہ وہ تمام تر دنیا کی تخریب و ریخت پر کمربستہ تھا۔نصف صدی تک وہ دھرتی کو تاخت و تاراج کرتا رہا۔تلواریں چمکتی رہیں،اور خون کی ندیاں بہتی رہیں۔اس کی آہنی ایڑھی شہروں اور ریاستوں کو چیونٹیوں کی طرح مسلتی رہی۔وہ جہاں سے گزرتا،اس کے پیچھے خون کی ندیاں بہنے لگتیں۔اس نے مفتوحوں کی ہڈیوں سے ایک عبرتناک تاریخ رقم کی،اس نے زندگی کے معنی اور نقوش تک بدل کے رکھ دیے۔اپنی طاقت اور منتقم مزاجی کو موت کے مدمقابل کھڑا کردیا،اس روح فرسا عمل کے پیچھے اس کے بیٹے جہاں گیر کی موت کے انتقام کا جذبہ کارفرما تھا۔اس دن سے لے کر جب جہاں گیر مرا اور سمرقند کے لوگ فاتح کے حضور میں سیاہ اور ہلکے نیلے لباس زیب تن کیے،سروں میں خاک اور راکھ ڈالے ہوئے جوق در جوق آئے تھے۔اس لمحے تک جب تیس سال کے بعد اوترار میں بالآخر اسے اجل نے پکارا،وہ ایک لمحہ بھی نہیں مسکرایا۔وہ تیس سال تک پتھر کا ناقابل شکست پہاڑ بنا رہا۔سرد مہری کے ساتھ ہونٹ بھینچے،عفو اور درگزر کے جذبات و احساسات سے نابلد،سر کو کبھی بھی،کہیں بھی جھکائے بغیر وہ تیس سال تک زندہ رہا،لیکن تیمور لنگ کی شخصیت کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ممکن ہے اس سے متعلق بہت کم لوگوں نے پڑھ رکھا ہو۔ایک ایسی عقیدت بھری قوت بھی ہے جس کے سامنے تیمور لنگ تو کیا،موت بھی سر جھکا دیتی ہے۔موت کا ہرکارہ،دہشت و جبر کی علامت،انتہائی شقی القلب تیمور لنگ کس طرح ایک ماں کے سامنے،پتھر کے پہاڑ سے موم بن گیا۔تاریخ میں یہ واقعہ کچھ یوں مرقوم ہے۔

وہ گلاب اور چنبیلی کی خوشبو سے مہکتی ہوئی دلفریب کانی گولا وادی میں جشن منا رہا تھا،سمرقندی شعراء نے اسے وادی گل کا نام دے رکھا تھا۔جہاں سے اس عظیم الشان شہر کے نیلے مینار اور مساجد کے نیلے گنبد نظر آتے تھے۔وادی میں پندرہ ہزار خیمے،پندرہ ہزار گل ہائے لالہ کی طرح پنکھے کی شکل میں پھیلے ہوئے تھے۔ہر خیمے پر سیکڑوں کی تعداد میں ریشمی مخروطی جھنڈے ہواؤں سے اٹکھیلیاں کررہے تھے اور ان کے عین وسط میں گورگان تیمور کا خیمہ نصب تھا۔یوں جیسے ایک ملکہ اپنی ریاست، اپنی مملکت میں، شاہانہ کروفر اور تاب و تمکنت کے ساتھ،اپنے حشم و خدم کے درمیان کھڑی ہو۔یہ خیمہ چو گوشیہ تھا۔اس کی لمبائی اور چوڑائی ایک ایک سو قدم پر مشتمل تھی اور وہ تین نیزے بلند تھا۔اس کے وسط میں سونے کے بارہ ستون اسے سہارا دے رہے تھے جن میں سے ہر ستون ایک صحت مند انسان کی جسامت کے برابر موٹا تھا۔اوپر کی جانب ایک نیم نیلے رنگ کا قبہ تھا۔خیمے کی دیواریں،زرد،سیاہ اور نیلی دھاریوں والے ریشم کی رہن منت تھیں۔پانچ صد ارغوانی رنگ کی خوبصورت ڈوریاں اسے زمین سے باندھے ہوئے تھیں۔چار عدد



نقرئی عقاب اس کے چاروں کونوں پر ایستادہ اور خیمے کے عین وسط میں ایک تخت کے اوپر پانچواں عقاب آرائش کی خوبصورتی کو فزوں تر کر رہا تھا۔ نا قابل تسخیر اور شاہوں کا شاہ، تیمور گورگان، ایک آسمانی رنگ کا قدرے کشادہ ریشمی جبہ زیب تن کیے جلوہ افروز تھا۔ پانچ ہزار بڑے بڑے سچے موتی اس جبے کی شان و شوکت کو چار چاند لگا رہے تھے۔ اس کے ہیبت ناک سفید سر پر ایک سفید رنگ کی چھجے دار ٹوپی اور اس کے سرے پر جڑا ہوا ایک بیش قیمت لعل دنیا کا معائنہ کرنے والی خون کی سی سرخ آنکھ کی طرح متحرک تھا۔ تیمور کا چہرہ ایک چوڑے پھل والے چاقو کی طرح تھا، جسے خون نے زنگ آلود کر دیا ہو، اس کی سفاک آنکھوں میں بلا کی تیزی تھی جو ہر متحرک و ساکت چیز کو فی الفور دیکھنے، اور پرکھنے کی صلاحیت سے مالا مال تھیں۔ ان پراسرار اور بے رحم آنکھوں کی چمک عرب کے محبوب ترین پتھر زمرد کی سرد چمک کی مانند تھی۔ مذکورہ پتھر مرگی (اپی لیپسی) کے مہلک مرض کو دور کرنے میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اسے امیر اللہ بھی کہا جاتا ہے۔ تیمور کے کانوں میں لٹکا کے لعلوں کے دل آویز، آویزے لٹک رہے تھے، جن کا رنگ ایک خوبرو اور طرح دار دوشیزہ کے لب و رخسار کی عکاسی کر رہا تھا۔ خیمے کے فرش پر خوبصورت و بیش قیمتی غالیچوں کے اوپر بنت انگور اور طلائی جام و مینا رکھے ہوئے تھے۔ اس کے عقب میں سازندے اور موسیقار اس کی جنبش ابرو کے منتظر تھے۔ اس کے قدموں کے آس پاس اس کے اعزا، رشتہ دار، شہزادے اور مختلف ریاستوں و قبیلوں کے سردار براجمان تھے۔ اس کے عین بغل میں عظیم شاعر کرمانی بیٹھا ہوا تھا۔ یہ وہی شاعر ہے جسے ایک دفعہ تیمور نے کہا تھا۔

''کرمانی، اگر مجھے نیلام کیا جائے تو تم میری کیا قیمت لگاؤ گے؟''

وہ بولا ''پچیس آسکر۔''

وہ تحیر سے دوچار ہوتے ہوئے بولا۔ ''میری ایک پیٹی ہی اتنی مالیت کی ہے۔''

''میں نے تمہاری پیٹی کی ہی قیمت لگائی ہے'' شاعر بولا۔ ''پیٹی کے بغیر تمہاری قیمت کیا ہے؟ ایک پیسہ بھی نہیں۔''

کرمانی اس مجسمہ ہیبت سے اسی لہجے میں بات کرتا تھا۔ بلا مبالغہ اس کی صداقت اور حق گوئی و بیباکی بھی تاریخی اوراق میں ہمیشہ سرفراز رہے گی۔ ان گنت فتوحات اور مشکل ترین و خون ریز مرحلوں اور معرکوں میں شاندار فتوحات کے بعد رنگ رلیاں اور رنگین محفلیں، بصد شوق و اہتمام سج رہی تھیں۔ بلند و بانگ اور جذبات ولہو کو گرمانی موسیقی کے درمیان، اور ان مختلف عوامی کھیلوں کے دوران، جو بادشاہ کے خیمے کے عین سامنے کھیلے جا رہے تھے، جہاں ان گنت مسخرے اچھل کود میں مصروف تھے۔ پہلوانوں کی کشتیاں، کرتب کرنے والے اپنے اجسام کو یوں توڑ مروڑ رہے تھے جیسے ان میں ہڈی کا نام تک نہ ہو۔ سپاہی قتل و خون کے فن میں اپنی مہارت و مشاقی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ لال اور سبز رنگ سے رنگے ہاتھیوں کے کرتب بھی ورطہ حیرت میں

ڈال رہے تھے، جن میں سے بعض انتہائی خطرناک تھے اور بعض مضحکہ خیز۔ جب سپاہی، مصاحب، تیمور کی دہشت، اس کی شان و عظمت کے فخر، فتوحات کی تھکن اور خوشی میں بنت انگور اور کومیس سے معمور و مخمور رنگ رلیوں میں مدہوش و بدمست تھے۔ اس عالم غفلت و غرور میں ایک عورت کی آواز بلند ہوئی۔ بادلوں کی اوٹ سے یکبارگی چمکنے والی بجلی کی طرح شور و غل کا سینہ چاک کرتی ہوئی وہ آواز مغرور و فاتح سلطان کی سماعتوں میں اترتی چلی گئی۔ اس مانوس آواز سے اس کی سماعتیں بخوبی آشنا تھیں۔ یہ آواز اس کی روح کے زخموں کی ہم آہنگ تھی۔ آواز کے سوز و گداز نے اسے چند لمحوں کے لیے دہلا کے رکھ دیا۔ اس نے اپنے ایک سپاہی سے کہا۔

''جاؤ اور پتا کرو کہ یہ کس کی آواز ہے، کون ہے جو بزم طرب میں اشکوں کی نمی گھول رہا ہے۔''

سپاہی گیا اور فوراً ہی واپس آ گیا۔ وہ سر جھکاتے ہوئے دھیمی آواز میں منمنایا۔

''حضور، ایک مفلوک الحال و مخبوط الحواس عورت دریدہ دامن لیے اذن باریابی کی ملتمس ہے۔''

وہ شاہانہ کروفر سے بولا ''اسے پیش کیا جائے۔''

چند لمحوں بعد حسرت و یاس کی بے رنگ سی تصویر اس کے روبرو تھی۔ پابرہنہ، تار تار لباس کا رنگ دھوپ کی حدت کی شدت نے اڑا دیا تھا۔ اس کی میلی کچیلی سیاہ زلفیں اس کے عریاں سینے کو ڈھانپنے کی اپنی سی کوشش میں محو عمل تھیں۔ چہرے کا رنگ تانبے کی طرح تھا۔ تیمور کی زیرک آنکھوں نے اس کی ویران آنکھوں میں تحکمانہ جھلک محسوس کی۔ اس کی جانب بڑھا ہوا اس کا سیاہ ہاتھ کانپ نہیں رہا تھا۔

''کیا تم ہی سلطان بایزید کے فاتح ہو؟'' اس نے بلا جھجک استفسار کیا۔

''ہاں'' وہ پرغرور لہجے میں بولا۔ ''میں نے سلطان بایزید کے علاوہ ان گنت بادشاہوں کو شکست دی ہے، تم اپنا مدعا بیان کرو۔''

وہ بولی۔ ''تم نے جو کچھ بھی کیا ہو مگر تم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ تم بہر حال گوشت پوست کے ایک انسان ہو'' لمحاتی خاموشی کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوئی۔ اس کی آواز میں جذبات کی لرزش تھی، لیکن خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔ ''میں ماں ہوں، تم موت بانٹتے ہو، میں زندگی کی محافظ ہوں۔ تم میری ممتا کے گناہ گار ہو۔ میں تمہارے پاس اس گناہ کا کفارہ مانگنے آئی ہوں۔''

وہ خاموش ہو گئی۔ تیمور کی جسم کے آر پار ہوتی ہوئی آنکھیں اس کے عبرت زدہ ملول چہرے پر مرتکز تھیں۔ مصاحب انگشت بدنداں ورطہ حیرت میں غوطہ زن تھے، جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ وہ دوبارہ بولی۔

''مجھے بتایا گیا ہے کہ تم ایک عادل بادشاہ ہو، تمہارا ماننا ہے کہ قوت کا راز انصاف میں مضمر ہے۔ مجھے یقین نہیں ہے کہ میری فریاد کو داد ملے گی، لیکن......''

وہ خاموش ہو کر چند لمحے پتھر کے اس ہیبت ناک پہاڑ کو گھورتی رہی۔ ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے اس نے اپنی فریاد مکمل کی۔

''لیکن تمہیں میرے ساتھ انصاف کرنا چاہیے۔''

''تمہارے ساتھ کیوں؟'' تیمور نے تحیر و تجسس آمیز لہجے میں استفسار کیا۔

اس مرتبہ وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

''کیونکہ میں ماں ہوں۔''

تیمور میں اتنی فہم و فراست تھی کہ ان بیباک لفظوں میں مضمر طاقت کو محسوس کر سکے۔ وہ قدرے نرم لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہے، بیٹھ جاؤ، میں تمہاری فریاد تفصیل سے سننا چاہتا ہوں۔''

وہ غالیچے پر بیٹھ گئی، اور اپنی داستان بیان کرنے لگی۔

''میں اطالیہ کے شہر سالیرنو میں رہتی تھی۔ میرا باپ ایک مچھیرا تھا، یہی وجہ ہے کہ میری شادی بھی ایک مچھیرے سے ہوئی۔'' اس نے کرب انگیز لہجے میں کہا اور چند لمحوں کیلئے خاموش ہو گئی۔ شاید وہ ذہن کے قرطاس پر بکھرے لفظوں کو ترتیب دے رہی تھی۔ اس کی مجروح آنکھیں تیمور پر مرتکز تھیں، جو کہ اسی کی طرف متوجہ تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی، خشک لبوں پر زبان پھیری اور بولی۔ ''میرا شوہر بہت وجیہہ تھا۔ اتنا خوبرو کہ جتنی ایک خوش و خرم زندگی ہوتی ہے۔ میری سہیلیاں مجھ پر رشک کرتی تھیں۔ پھر اللہ نے مجھے ایک خوبصورت

بیٹے سے نوازا۔“

”میرے شہزادے جہاں گیر کی طرح۔“ تیمور بیساختہ بولا۔

وہ خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگی۔اس کی بوڑھی آنکھوں میں درد جوان تھا۔وہ کچھ دیر چپ رہی تو تیمور نے تجسس سے کہا۔

”بولتی رہو، میں سن رہا ہوں۔“

”میرے بیٹے جیسا ذہین اور خوبصورت میں نے کبھی نہیں دیکھا“ اس کے لہجے میں تفاخر تشکر اور کرب کی آمیزش تھی۔”وہ چھے سال کا تھا، جب ساسان کے سمندری لٹیروں نے ساحل پر حملہ کر دیا۔اس حملے میں میرے باپ اور شوہر کے علاوہ اور بھی کئی لوگ موت کے منہ میں چلے گئے۔“

ضبط کا یارا نہ رہا تو وہ ہچکیاں باندھ کر رونے لگی۔دوسری دفعہ پتھر کے پہاڑ کی پیشانی پر نمی آئی تھی۔پہلی دفعہ جب جہاں گیر مرا، اور اب جب وہ ایک ماں کی دکھ بھری کہانی سن رہا تھا۔درباری ہمہ تن گوش تھے۔سب کی نگاہوں کا مرکز وہی بوڑھی عورت تھی۔وہ اپنی قمیص کے بوسیدہ و دریدہ دامن سے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے دوبارہ بولی۔

”وہ میرے بیٹے کو اٹھا کر لے گئے، اور میں پچھلے چار سال سے قریہ قریہ بھٹک رہی ہوں، اسے ڈھونڈ رہی ہوں۔“

وہ خاموش ہو کر تیمور کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

”تمہارے ساتھ بہت برا ہوا، مجھے دکھ ہے، لیکن اس کہانی کا مجھ سے کیا تعلق ہے؟“

تیمور کے استفسار پر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی اور چیخ نما آواز میں بولی۔

”سلطان بایزید کے سپاہیوں نے ساسان کے لٹیروں کو پکڑا تھا، تم نے سلطان بایزید کو مغلوب کیا، اس کے تمام مال و متاع پر قبضہ کیا، لہٰذا اس حساب سے میرا لخت جگر تمہارے پاس ہوا۔“

یکبارگی دربار کا ماحول بدل گیا۔درباری ہنسنے لگے۔وہ بادشاہ، شہزادے اور دیگر مصاحب جو قالین پر براجمان تھے، ان کی آنکھوں میں استہزا در آیا اور وہ کہنے لگے۔”بادشاہ یہ عورت پاگل ہے۔“

شاعر صوف کرمانی اور تیمور لنگ ورطہ حیرت میں تھے۔انہوں نے کسی درباری یا مصاحب کے مضحکہ خیز تبصرے پر غور نہیں کیا۔

”ہاں یہ واقعی میں پاگل ہے“ تیمور بڑبڑایا۔”جس طرح ایک ماں اپنی اولاد کے لیے پاگل ہوتی ہے۔“

مجسمہ ہیبت تخت سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔بوڑھی عورت اس کی سرخ آنکھوں کے حصار میں تھی۔وہ بولا۔

”اے عورت، یہ کیسے ممکن ہے، کہ تو دریاؤں پہاڑوں اور جنگلوں کو عبور کر کے مجھ تک آ پہنچی، تجھے راستے میں درندوں اور انسانوں نے کچھ نہیں کہا؟“ چند لمحوں پر محیط خاموشی کے بعد وہ دوبارہ بولا۔”وہ انسان جو تنہائی میں درندوں سے بھی زیادہ وحشی اور خطرناک ہوتے ہیں۔تو کسی ہتھیار سواری اور سہارے کے بغیر یہاں کیسے پہنچ گئی، مجھے بتا تاکہ مجھے تمہاری صداقت پر یقین آ سکے، میرا تعجب تحیر اور بے یقینی تیری بات کو سمجھنے میں حارج نہ ہو۔“

اس ماں کی عظمت کو سلام جس کی محبت کسی رکاوٹ کھوٹ اور کوتاہی سے آشنا نہیں۔جس کے چشمہ شیر نے پوری دنیا کو پالا پوسا، پروان چڑھایا۔انسانوں میں جو بھی خوبصورت خصوصیات ہیں وہ سورج کی شعاعوں اور ماں کے دودھ کی مرہون منت ہیں۔وہی ماں ہیبت و دہشت کے سلطان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

”سفر کے دوران میں نے صرف ایک سمندر دیکھا، جس میں متعدد جزیرے، اور مچھلیاں پکڑنے والی کشتیاں تھیں۔“ اس کے لہجے میں استقامت اور ممتا کی صداقت تھی۔وہ کہہ رہی تھی۔”جب کسی جان سے پیارے کی تلاش کا مرحلہ درپیش ہو تو ہر مشکل آسان لگتی ہے، ہر ناکامی امید کا سندیسہ دیتی ہے۔ہر درد ہر زخم آگے بڑھتے رہنے کی ترغیب و تحریک دیتا ہے“ وہ سانس لینے کے لیے رکی پھر بولی۔”اور میں تو پلی بڑھی ہی سمندر اور جنگلوں کی آغوش میں ہوں۔مجھے پہاڑ بھی سنگریزے لگتے تھے۔“

بلا ارادہ شاعر کرمانی بولا۔”محبت کرنے والوں کو

پہاڑ سنگریزے، اور آگ گلزار لگتی ہے۔''
بوڑھی ماں نے اسے تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھا، اور بولی۔ ''البتہ راستے میں جنگل بہت بھیانک تھے، جن میں خونخوار جانوروں کا بسیرا ہوتا ہے، دو دفعہ جنگل کے خونخوار چیتوں نے مجھے تیرے ہی جیسی آنکھوں سے گھورا، لیکن دل تو جانور کے سینے میں بھی ہوتا ہے۔''
تیمور کی آنکھوں میں حیرت و بے یقینی ہلکورے لے رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا بوڑھی بولی۔
''میں نے ان درندوں سے اسی طرح بات کی جس طرح تم سے کر رہی ہوں۔ وائے حیرت کہ انہوں نے میری بات پر یقین کیا اور روتے ہوئے جنگل کی وسعتوں میں کھو گئے۔''
''ناقابل یقین'' تیمور بڑبڑایا۔
''انہیں مجھ پر، میری ممتا پر ترس آ گیا تھا۔'' بوڑھی نے دلیل دی۔ ''کیونکہ درندے بھی اپنے بچوں سے محبت کرتے ہیں۔''
اسے ایک بوڑھی ماں کے جذبات و احساسات اور مدلل گفتگو نے از حد متاثر کیا۔ وہ اسے سوچتی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اے بزرگ عورت، تو نے ٹھیک کہا، میں نے دیکھا ہے جب چڑیا گھونسلا بناتی ہے تو میں اس کی ترتیب و مہارت پر انگشت بدنداں رہ جاتا ہوں، اور پھر وہ کس طرح اپنے بچوں کی حفاظت کرتی ہے۔ ماں کی ممتا سے انکار قطعی ناممکن ہے۔''
''بوڑھی کی آنکھوں میں حیرت در آئی۔ اس نے اپنے نحیف و مضمحل وجود کو دیکھا، اور کہنے لگی۔
''بچہ جتنا بھی بڑا ہو جائے، ماں کے لیے بچہ ہی رہتا ہے، ہر عام و خاص، غیر معتبر و ذیشان پہلے بچہ ہوتا ہے اور ہر بچے کی ایک ماں ہوتی ہے'' وہ چند لمحوں کیلیے خاموش ہوئی اور تیمور کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔
''اے بوڑھے شخص، تم نے بھی تو ایک عورت کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ تم اللہ کی ذات سے تو انکار کر سکتے ہو، لیکن ماں کی حقیقت سے ہرگز نہیں، کیونکہ اللہ کو تم نے نہیں دیکھا، لیکن ماں کی کوکھ سے جنم لے کر اس کی آغوش میں پرورش پائی ہے۔ اس کے چشمہ شیر سے سیراب ہو کر تمہیں طاقت ملی ہے۔''

''خوب، درست کہا بزرگ عورت'' شاعر کرمانی چلایا۔ ''سورج کے بغیر پھولوں کی نشوونما ممکن نہیں۔ محبت ایک الوہی جذبہ ہے، اس کے بغیر زندگی کے ایک بھی پل سے خوشی کشید نہیں کی جا سکتی۔ عورت کے بغیر مرد تو کیا کائنات کی تکمیل ناممکن ہے، اور ماؤں کے بغیر کوئی شاعر پیدا ہو سکتا ہے نہ ہی کوئی سورما۔'' اس کی طائرانہ نگاہیں مجسمہ ہیبت پر جا ٹھہریں جو کہ اب سرتاپا مجسمہ حیرت لگ رہا تھا۔ کرمانی کی حوصلہ افزا باتوں نے سرتاپا فریادی عورت کی ہمت کو جلا بخشی۔ اس نے روئے سخن تیمور کی طرف کیا، اور ملتمس ہوئی۔
''تو اے بادشاہ سلامت، میرا بیٹا مجھے دے دو، میں اس کی ماں ہوں اور اس سے محبت کرتی ہوں۔''
لائق صد احترام ہے ماں، جس نے محمد جیسی ذی مرتبت شخصیت کو جنم دیا۔ اسی ماں نے ارسطو، سعدی، اور فردوسی جیسی شخصیات پیدا کیں۔ اور پھر زہریلی شراب جیسا سکندر، اور بینائی سے محروم ہومر، سب اسی زرخیز ممتا کی پیداوار ہیں۔ سب نے اسی ماں کا دودھ پیا۔ اس کے سینے پر دم بدم پروان چڑھتے رہے۔ دنیا کا سارا مایہ ناز سرمایہ ماؤں ہی کی بدولت ہے'' اور سفید بالوں والا دہشت ناک غارت گر عالم، لنگڑا چیتا تیمور گورگان فکر و حیرت کی عمیق گہرائیوں میں گر گیا۔ ایک طویل جاں گسل خاموشی کے بعد وہ اپنے درباریوں سے مخاطب ہوا تو اس کی آواز میں لرزش تھی۔
''میں تیمور، خدا کا ادنیٰ سا بندہ وہی کہہ رہا ہوں، جو برحق ہے۔ مدتوں سے زمین میرے پاؤں تلے چیخ رہی ہے، اور میں اسے روندتا چلا جا رہا ہوں۔''
اک غیر یقینی کا عالم تھا۔ آنکھیں اور منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ تمام درباری، مصاحب، اور جنگجو سپاہی پتھر کو پگھلتا دیکھ رہے تھے۔ وہ یوں مہر بہ لب تھے جیسے سانسوں کا تسلسل رک گیا ہو۔ جیسے ہر نبض ساکت، اور ہر جسم کا روح سے رابطہ منقطع ہو گیا ہو۔ ایسی خاموشی تھی کہ جیسے قیامت کے بعد سب کچھ ختم، اور خاموش ہو گیا ہو۔ حتیٰ کہ چرب زبان شاعر کرمانی بھی پتھر کا بت بنا کھڑا تھا۔
تیمور دوبارہ گویا ہوا تو گویا، زندگی کے وجود نے اپنے ہونے کی دلیل دی۔ وہ بولا تو گویا سلسلہ تنفس بحال ہوا۔

''زمین میرے قدموں تلے کراہ رہی ہے، اور میں تیس سال سے اپنے بیٹے جہاں گیر کی موت کا بدلہ لینے کیلیے اسے مسلسل روندرہا ہوں، اسے تباہ و برباد و تہہ و بالا کررہا ہوں۔''

اب بوڑھی عورت کی مغموم و تاریک آنکھوں میں امید کی کرن پھوٹنے لگی۔ وہ ایک تاریخ ساز شخصیت کا مطمح نظر تبدیل ہوتے دیکھ رہی تھی، اور بلاشبہ یہ اس کی ممتا کی طاقت کی بدولت ممکن ہوا تھا۔ تیمور کہہ رہا تھا۔

''میری نظروں میں حضرت انسان کی کوئی توقیر، کوئی قیمت نہیں۔ شہروں، ریاستوں اور مملکتوں کی وجہ سے لوگ مجھ سے برسرِ پیکار ہوئے، لیکن آج تک کسی نے کسی انسان یا انسانی حقوق کے لیے مجھ سے جنگ نہیں کی، میں نے بستیاں، شہر، ریاستیں مملکتیں گھر اور کئی دل برباد کر دیے۔ مجھے کبھی ادراک اور احساس ہی نہیں ہوا کہ میری راہ میں کون اور کیوں حائل ہے۔''

لمحاتی خاموشی کے بعد وہ بولا۔ ''میں وہی تیمور ہوں جس نے سلطان بایزید کو شکست فاش سے دوچار کیا اور اس سے کہا۔ ''بایزید! مجھے لگتا ہے اللہ کے نزدیک مملکت اور انسان کی کوئی قیمت اور وقعت و اہمیت نہیں ہے، اسی لیے تو وہ انہیں ہم جیسوں کی دسترس میں دے دیتا ہے۔ تو جو کہ کانا ہے اور میں جو کہ لنگڑا ہوں۔ میں نے یہ باتیں سلطان بایزید سے اس وقت کی تھیں جب وہ پابہ زنجیر میرے سامنے پیش کیا گیا۔ زنجیروں اور طوق کے بوجھ سے اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔''

اس نے ایک طویل سرد آہ بھری، درباریوں اور بوڑھی عورت پر طائرانہ نگاہ ڈالی، پھر بولا۔ ''تب مجھے زندگی ایک کڑوی اور بدذائقہ جڑی بوٹی کی طرح لگی۔ میں تیمور اعتراف کرتا ہوں کہ یہ جو میرے سامنے عورت کھڑی ہے۔ یہ ایک عظیم ترین ماں ہے۔ کروڑوں میں ایک ہے۔ جس نے میری خوابیدہ روح کو جھنجوڑ کر جگایا، اور مجھے ایسے جذبے سے روشناس کروایا جو انسانیت کی معراج ہے، جس سے میں ہمیشہ ناآشنا رہا۔''

''اس عورت نے منت سماجت نہیں کی کیونکہ ماں منت نہیں کرتی، حکم دیتی ہے، مجھے ادراک ہوگیا ہے کہ یہ کمزور نہیں ہے، یہ بہت زیادہ طاقت ور ہے'' چند لمحوں کیلیے اس نے توقف کیا پھر بولا۔ ''اس کے پاس ممتا کی طاقت ہے جو پتھروں کو پگھلا سکتی ہے۔''

پھر اس نے عالم ارواح میں اپنے بیٹے جہانگیر کو مخاطب کیا۔ ''میرے لخت جگر، میرے جہاں گیر، شاید تو بھی زمین کو شعلہ ساماں کرنے کیلیے اس دنیا میں آیا تھا، اس میں مسرتوں کے بیج بونے آیا تھا، لیکن میں نے، تیرے باپ تیمور نے، اسے خون سے سینچ ڈالا۔ اب یہ زمین زرخیز ہے، ہموار ہے، ماں کی گود کی طرح نرم و ملائم اور پرسکون ہے۔''

پھر وہ غارت گر بہت دیر تک کسی سوچ میں مستغرق رہا۔ اب درباری اس کے لبوں کی جنبش کے منتظر تھے۔ بالآخر اس نے لبوں کو جنبش دی، اور اپنے سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔

''میں تیمور گورگان، تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تین سو گھوڑسوار میری مملکت کے چاروں اطراف میں پھیل جاؤ، اور اس کے لخت جگر کو ڈھونڈ کے لاؤ'' اس نے عورت کی طرف دیکھا، جو تشکر و حیرت سے اسی کی طرف متوجہ تھی، وہ بولا۔ ''یہ عورت اور میں یہاں انتظار کریں گے، اور جو شخص اس کے بیٹے کو اپنے ساتھ لے کر آئے گا، میں اسے مالا مال کردوں گا۔''

عورت نے اپنے سفید و سیاہ میلے کچیلے بال ایک جھٹکے کیساتھ اپنے چہرے سے ہٹادیے، زیرلب مسکرائی، اور فرط مسرت سے کہا۔

''بادشاہ، تم سدا سلامت رہو، ایک ماں کی ممتا تم پر راضی ہے۔''

اسی لمحے جبر و دہشت کا وہ بوڑھا پہاڑ اس کے سامنے جھک گیا۔



# کرب آشنائی



محمد عرفان رامے

یہ دنیا مکافات عمل ہے ہم جو کچھ بوتے ہیں
اسی دنیا میں کاٹتے ہیں اس کہانی کا یہی پس منظر
ہے۔
ایک عورت کی روداد اس نے اپنی گود ہری کرنے
کے چکر میں دوسری عورت کی گود اجاڑ دی تھی

اس روز سرشام ہی فضا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ لیکن پھر بھی ایک عجیب سی گھٹن کا احساس تھا۔ رات کی تاریکی سرمئی شام کو نگلنے کے لیے تیار کھڑی تھی کہ حویلی کا صدر دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ سے کھلا اور ملک زاہد تھکے تھکے قدموں سے اپنے وجود کو گھسیٹتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کے باریش چہرے پر بے بسی اور آنکھوں کے متورم پپوٹے اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ وہ باہر ڈیرے پر بیٹھا روتا رہا ہے۔

حویلی کے کشادہ صحن سے گزر کر ملک زاہد اپنے کمرے میں داخل ہوا تو سامنے جائے نماز پر بیٹھی رقیہ بیگم کو پرنم آنکھوں کے ساتھ دُعا مانگتا دیکھ کر خود بھی آبدیدہ ہو گیا۔

''کچھ پتا چلا میرے یوسف کا ملک جی.....؟''

رقیہ بیگم نے آہٹ پاتے ہی دُعا ختم کر کے پُر اُمید نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ لیکن جواب میں ملک زاہد خاموشی سے سر جھکا کر اس کے پاس زمین پر بیٹھ گیا جیسے اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ بچا ہو۔

شوہر کی خاموشی دیکھ کر رقیہ بیگم کی آنکھوں میں تیرتی نمی گہری ہو کر آنسوؤں کا روپ دھارنے لگی اور وہ بے اختیار سجدے میں گر کر اپنے رب کے حضور گڑگڑانے لگیں۔

''ہم پر رحم فرما میرے پروردگار.....ہم تیری آزمائش کے قابل نہیں ہیں۔ تجھے واسطہ ہے اُس محبت کا جو تو اپنی مخلوق سے کرتا ہے۔ اس بے بس ماں کو اُس کا بیٹا لوٹا دے..... مجھے میرا یوسف لوٹا دے..... میں اس کے بغیر جی نہیں پاؤں گی..... مجھے میرا یوسف لوٹا دے۔''

رقیہ بیگم مسلسل روئے چلی جا رہی تھی۔ جب کہ ملک زاہد حوصلے سے کام لیتے ہوئے اسے صبر کی تلقین کر رہا تھا۔

رقیہ بیگم کی دہائی سن کر ان کی دیورانی طاہرہ بیگم دوڑتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور انہیں گڑگڑاتا دیکھ کر یوں خاموش ہو گئی جیسے اس چیخ و پکار کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

''بھائی جان! کچھ معلوم ہوا یوسف کے بارے.....؟'' اس نے ڈرتے ڈرتے ملک زاہد سے پوچھا۔

''ابھی نہیں.....گاؤں والے اپنی سی کوشش کر رہے ہیں اور پولیس بھی تفتیش کر رہی ہے۔ مل جائے گا، ضرور ملے گا میرا بچہ۔ رب سوہنے کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں ہے.....میرا یوسف ضرور مل جائے گا۔ تو سمجھا اپنی بھابی کو، حوصلہ کرے۔ دیکھ کیا حالت بنالی ہے اس کملی نے۔''

ملک زاہد نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا اور اپنے آنسو چھپانے کے لیے اُٹھ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

ملک زاہد اپنے علاقے کا با اثر جاگیر دار تھا۔ گاؤں کی سرداری اسے وراثت میں ملی تھی۔ ملکوں کے اس ہنستے بستے خاندان کو غم کا پہلا جھٹکا اس وقت لگا تھا



جب اس کا چھوٹا بھائی ملک نواز گاؤں سے شہر جاتے ہوئے پر اسرار طور پر لاپتہ ہوگیا تھا..... ملک نواز بہت قابل آدمی تھا۔ اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی اور نہایت اونچے خیالات رکھتا تھا۔

اس واقعہ کو دو سال گزر چکے تھے لیکن ابھی تک اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔ ملک نواز شہر میں کسی لڑکی سے محبت کرتا تھا لیکن بھائی اور بھابی کے اصرار پر اس کی شادی خاندان ہی کی ایک لڑکی طاہرہ سے کردی گئی۔

طاہرہ بیگم ان پڑھ اور جھگڑالو عورت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ شادی کے بعد ان کی ازدواجی زندگی زیادہ خوشحال نہیں رہی تھی۔ پھر بھی ملک نواز اس بندھن کو قائم رکھے ہوئے تھا کہ اچانک خود بھی منظر سے غائب ہوگیا۔

ملک نواز کی پُر اسرار گمشدگی کے بعد ملک زاہد نے اپنے بھائی کو تلاش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، لیکن کوئی سراغ نہ مل سکا..... یہاں تک کہ پولیس بھی اسے ڈھونڈ نے میں ناکام رہی۔

جب کہ طاہرہ بیگم بضد تھی کہ ملک زاہد اپنی نامعلوم محبوبہ کے ساتھ ملک سے باہر چلا گیا ہے جسے وہ شادی سے قبل پسند کرتا تھا۔

یوسف، ملک زاہد کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جس کی پیدائش بڑی منتوں مرادوں کے بعد ہوئی تھی۔ یوسف سے قبل رقیہ بیگم کے ہاں تین بچے پیدا ہوتے ہی فوت ہوچکے تھے۔ اکلوتا ہونے کے باعث یوسف لاڈلا تو تھا ہی ،خوبصورت بھی بہت تھا۔ گاؤں کا ہر فرد اسے پیار کرتا تھا۔

ایک روز قبل وہ حویلی سے ملحقہ باغ میں کھیلنے کے لیے گیا تو لوٹ کر نہ آیا۔ حیرت کی بات یہ تھی حویلی کے کسی ملازم نے اسے حویلی سے باہر جاتے نہیں دیکھا تھا۔

یہی وہ کاری زخم تھا جس نے ملک زاہد اور رقیہ بیگم کی

روح کو گھائل کر دیا تھا۔ بیٹے کی جدائی نے انہیں جیتے جی مار ڈالا تھا۔ اسے تلاش کرنے کے لیے تمام ممکنہ ذرائع استعمال کیے جا رہے تھے مگر نتیجہ فی الحال صفر تھا۔

......☆......

رات کے پچھلے پہر گہری تاریکی میں دو سائے درختوں کے جھنڈ میں تیزی سے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ چال ڈھال سے یہ دونوں سائے عورتوں کے محسوس ہو رہے تھے جنہوں نے خود کو سیاہ چادروں میں اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا۔ وہ ہر قدم پھونک پھونک کر رکھ رہی تھیں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات اپنی ہی آہٹ پر سہم کر کسی درخت تلے دبک کر بیٹھ جاتی تھیں۔ جیسے پکڑے جانے کا خوف ان کی نس نس میں دوڑ رہا ہو۔

کافی دیر چلنے کے بعد وہ دونوں درختوں کے جھنڈ کے درمیان بنے ایک خستہ حال مکان کے سامنے پہنچ کر رک گئیں.... پھر چند لمحے اپنا سانس درست کرنے کے بعد ایک سائے نے ہاتھ بڑھا کر لکڑی کے دروازے پر دستک دی تو پاٹ یوں جھٹکے سے کھل گئے جیسے مہمانوں کا شدت انتظار سے کیا جا رہا ہو۔

ان کے سامنے ایک ادھیڑ عمر شخص نہایت غلیظ حلیے میں کھڑا تھا۔ اس نے لمبا سا چوغا پہنا ہوا تھا اور بال بری طرح الجھے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں پکڑی ہوئی لالٹین کی روشنی میں اس کے ہونٹوں پر کھیلتی شیطانی مسکراہٹ بھیانک منظر پیش کر رہی تھی۔

''آؤ ملکانی.... اندر آ جاؤ۔''

اس نے اپنی داڑھی کھجاتے ہوئے کہا تو سامنے کھڑی عورت نے چہرے سے نقاب ہٹا دیا اور تیزی سے اندر داخل ہو کر ایک کمرے میں چلی گئی۔

وہ عورت ملک نواز کی بیوی طاہرہ بیگم تھی جو اپنی خاص ملازمہ رشید بی بی کے ساتھ آج تیسری مرتبہ بالے عامل کے پاس آئی تھی۔

''لگتا ہے تم کامیاب لوٹی ہو.....؟''

چند لمحے بعد بالا بھی ان کے پاس آ بیٹھا۔ اس کی بات سن کر طاہرہ بیگم نے رشید بی بی کو اشارہ کیا تو اس نے اپنے کاندھے سے لگا ہوا چار پانچ سالہ بچہ چارپائی پر لیٹا تھا۔

بچے پر نظر پڑتے ہی بالے کی زہریلی مسکراہٹ قہقہے میں بدل گئی۔ اس نے نہایت بے رحمی سے چارپائی پر لیٹے ہوئے بچے کو یوں ٹٹولنا شروع کر دیا جیسے قصائی بکرے کو دبا کر گوشت کا اندازہ لگاتا ہے۔

پھر وہ کچھ دیر زیر لب بڑبڑا کر مسلسل یوسف کے چہرے پر پھونکتا رہا اور کونے میں پھڑ پھڑانے والے کالے مرغ کی گردن کاٹ کر اس کا لہو بچے کے ماتھے پر لگاتے ہوئے بولا:

''کیا نام ہے اس کا.....؟''

''یوسف.....'' طاہرہ بیگم نے مختصر جواب دیا۔

''اچھا نام ہے..... بچہ پیارا بھی بہت ہے۔ کام بن جائے گا تمہارا۔'' اس نے بھرپور قہقہہ لگایا اور طنزیہ لہجے میں بولا:

''عورت بھی عجیب مخلوق بنائی ہے اُوپر والے نے..... اگر اس کے دل میں محبت ہو تو جان دینے سے دریغ نہیں کرتی اور اگر کینہ ہو تو جان لینے کے ہزاروں طریقے ڈھونڈ لیتی ہے۔''

''مجھے ہر صورت اپنے شوہر کو پانا ہے۔ اس کے لیے میں کوئی بھی قربانی دے سکتی ہوں۔''

یہ سن کر بالا، یوسف کی چارپائی سے اٹھا اور طاہرہ کے پرکشش سراپے کو سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے بولا:

''تو پھر جا میری اجازت ہے تجھے..... کل رات پورا کر لے اپنا عمل اور پھر دیکھ تماشا اپنی خوب صورت آنکھوں سے..... میرا یہ عمل تو مردوں کو بھی قبروں سے نکال لاتا ہے تیرا شوہر تو صرف اپنی محبوبہ کے پاس چلا گیا ہے..... جیسے ہی تیرا عمل پورا ہوگا، ملک نواز تیری جانب کھنچا چلا آئے گا۔''

یہ کہہ کر بالے نے اپنے تعفن زدہ چوغے کی جیب سے ایک پوٹلی نکال کر اس کی جانب بڑھا دی جس میں وہ ضروری چیزیں تھیں جو اسے عمل کے دوران استعمال کرنا تھیں۔ یوسف کو مسلسل بے ہوش رکھنے کے لیے بھی اسی کا دیا ہوا سفوف استعمال کیا جا رہا تھا۔

''جا..... لے جا اب اس مورکھ کو یہاں سے۔ یہی تجھے تیری کھوئی ہوئی محبت واپس دلائے گا۔'' بالے نے

طاہرہ بیگم کے ہاتھ سے کڑکتے ہوئے نوٹ تھام کر کہا تو رشید بی بی نے جلدی سے بے سدھ پڑے یوسف کو کاندھے سے لگا کر چادر میں چھپالیا۔
کچھ دیر بعد وہ دونوں اسی راستے سے حویلی کی جانب بڑھتی چلی جارہی تھیں۔ بالے کے پاس جانے کے لیے انہوں نے حویلی کا عقبی دروازہ استعمال کیا تھا۔
اس کام میں طاہرہ بیگم کو رشید بی بی کی مکمل معاونت حاصل تھی۔ بالے سے متعارف کروانے میں بھی رشید بی بی نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ رشید بی بی اس سے پہلے بھی بالے سے کئی کام لے چکی تھی..... لیکن ان میں سے کوئی بھی عمل اتنا سخت نہیں تھا جتنا طاہرہ بیگم کے حصے میں آیا تھا۔
ملک زاہد کی آبائی حویلی وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں طاہرہ بیگم کے لیے بالکل الگ پورشن تھا۔ طاہرہ بیگم کے آتے ہی حویلی میں لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے تھے۔ وہ مزاج کی تیز تھی۔ کسی کے ساتھ مل کر رہنا اس کی فطرت کے خلاف تھا۔ چنانچہ ملک زاہد کی اجازت سے ملک نواز نے حویلی کے عقبی حصے میں اپنے لیے ایک نیا پورشن تعمیر کروالیا تھا۔ اس مقصد کے لیے جگہ طاہرہ بیگم کی پسند سے حویلی کی مرکزی عمارت سے ذرا ہٹ کر منتخب کی گئی تھی۔ تاکہ کوئی اس کی تنہائی میں مخل نہ ہوسکے۔
وہاں منتقل ہونے کے بعد طاہرہ بیگم خاصی مطمئن دکھائی دینے لگی تھی۔ ملک نواز کے کھو جانے کے بعد بھی طاہرہ بیگم نے اپنی رہائش حویلی کے اسی حصے میں رکھی تھی۔ البتہ دن کا زیادہ حصہ وہ رقیہ بیگم کے ساتھ ہی گزارتی تھی۔

......☆......

یوسف کو غائب ہوئے دوسرا دن تھا۔
رقیہ بیگم نے رو رو کر اپنا برا حال کرلیا تھا۔ اب تو اس پر غشی کے دورے پڑنے لگے تھے۔ حویلی کے باہر ڈیرے پر سارے گاؤں کے مرد ملک زاہد کو حوصلے دینے کے لیے موجود رہتے تھے۔ جوانوں نے الگ سے گاؤں کے داخلی اور خارجی راستوں پر پہرا دینا شروع کر دیا تھا..... اس کے علاوہ تھانے میں بھی یوسف کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروادی گئی تھی۔ پولیس اپنے طور پر بچے کو تلاش کررہی تھی مگر ابھی تک کوئی اچھی خبر موصول نہیں ہوئی تھی۔
''مجھے تو لگتا ہے کہ بچے کو ہوائی چیزیں اُٹھا کر لے گئی ہیں۔'' بوڑھے تاج دین نے حقے کا گہرا کش لے کر باقی ساتھیوں کی جانب دیکھا۔
''ایسا کیسے ہوسکتا ہے چاچا؟'' قریب بیٹھے نوجوان نے اس کی رائے سے اختلاف کیا۔
''ہو کیوں نہیں سکتا پتر..... یاد نہیں چند سال پہلے ساتھ والے گاؤں سے ایک خوب صورت لڑکی پر اسرار طور پر غائب ہوگئی تھی..... ہمارا یوسف بھی تو ماشاء اللہ چاند کا ٹکڑا ہے۔ اتنا پیارا کہ گاؤں کا ہر شخص اسے دیکھ کر جیتا ہے۔''
''کچھ بھی ہو چاچا تاج دین ہمیں یہی دعا کرنی چاہیے کہ یوسف پتر خیریت سے ہو اور جلدی واپس اپنے ماں باپ تک پہنچ جائے۔''
''آمین.....'' سب نے یک آواز کہا اور چند لمحے کے لیے گہری خاموشی چھا گئی۔
''ایک تجویز ہے ملک صاحب..... اگر آپ مان جائیں تو ہم لوگوں کو بھی کچھ حوصلہ ہو جائے گا۔ بہت امید ہے کہ یوسف پتر کا سراغ بھی مل جائے گا۔'' قریب بیٹھے صدیق نے کہا تو ملک زاہد نے چونک کر اس کی جانب دیکھا:
''بولو صدیق..... میں اپنے بیٹے کی بازیابی کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہوں؟''
''ساتھ والے گاؤں میں اللہ کا ایک نیک بندہ رہتا ہے۔ کسی سے ایک ٹکا بھی نہیں لیتا۔ بس اپنے ہی ڈیرے پر بیٹھا رہتا ہے۔ کوئی حاجت مند آجائے تو اس کی مدد کر دیتا ہے مگر زیادہ بولتا نہیں ہے..... ہم سب کی دلی خواہش ہے کہ آپ ہمارے ساتھ اس کے پاس چلیں۔ ممکن ہے اللہ سائیں کوئی بہتر راستہ دکھا دے۔ یوسف ہمیں بھی بہت پیارا ہے۔ اسے کوئی تکلیف پہنچے یہ ہم میں سے کسی کو گوارا نہیں ہے۔''
''وہ تو ٹھیک ہے صدیق۔ میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں..... پولیس اپنا کام کررہی ہے۔ گاؤں کے جوان دن رات یوسف کی تلاش میں مصروف ہیں۔ گھر

میں عورتیں سجدوں میں پڑی ہیں..... اللہ نے چاہا تو یوسف بخیریت گھر پہنچ جائے گا۔'' ملک زاہد نے اسے ٹالنا چاہا۔

''اللہ والوں کی دُعا سے تو ٹھنڈے گرم چشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔ دم توڑتے مریضوں کو نئی زندگی مل جایا کرتی ہے..... اس اللہ کے بندے سے ملنے میں کوئی حرج نہیں ہے ملک صاحب۔ ویسے بھی وہ کوئی پیشہ ور پیر فقیر نہیں۔''

تاج دین اور گاؤں کے دوسرے معززین کے اصرار پر ملک زاہد کو جانے کی ہامی بھرنا پڑی اور وہ ان کے ساتھ چلنے کے لیے آمادہ ہوگیا۔ چنانچہ اسی شام چند سر کردہ لوگ ملک زاہد کے ہمراہ دوسرے گاؤں روانہ ہوگئے۔

صدیق کا کہنا بالکل درست تھا۔ حضرت صاحب نہایت درویش صفت آدمی تھے۔ ان کے لباس پر کئی جگہ پیوند لگے ہوئے تھے۔ وہ پیدائشی طور پر نابینا تھے۔ ملک زاہد نے رو رو کر اپنی بپتا سنائی تو وہ اسے دلاسہ دے کر مراقبہ میں چلے گئے اور پھر کافی دیر بعد گہری سانس لیتے ہوئے بولے۔

''ملک صاحب! بچہ آپ کے اپنے گاؤں میں ہے۔''

''کہاں.....؟'' سب بری طرح چونکے۔

''آپ کی حویلی کے ارد گرد کسی مقام پر..... لیکن.....'' وہ یکدم خاموش ہوگئے۔

''لیکن کیا.....؟'' ملک زاہد نے بے چینی سے پوچھا۔

''اس کی جان خطرے میں ہے.....اس پر نہایت سخت سفلی عمل کیا جارہا ہے۔ آپ کے پاس وقت بہت کم ہے۔'' حضرت صاحب نے بتایا۔

''مگر وہ کس کے پاس ہو سکتا ہے حضرت صاحب.....کون ہے اس معصوم کا دشمن بھرے گاؤں میں۔''

''یہ میں نہیں بتا سکتا.....اس بارے میں میرا علم کچھ نہیں کہتا۔ اس کے گرد کالا حصار کھینچا جا چکا ہے۔ آپ فوری طور پر اپنے گاؤں میں ہر مشکوک جگہ کی تلاشی لیں۔ بچہ حویلی کے آس پاس ہی موجود ہے۔''

حضرت صاحب کی بات سن کر سب لوگ پر جوش انداز میں گاؤں لوٹ آئے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ یوسف کو ڈھونڈ نکالیں گے۔

......☆......

وہ رات کچھ زیادہ ہی تاریک تھی۔ آسمان پر چھائے گھرے بادلوں نے چاند کو اپنی اوٹ میں چھپا رکھا تھا اور ہر جانب وحشت سی برس رہی تھی۔

رات کے آخری پہر جب حویلی کے تھکے ماندے مکین آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے تو طاہرہ بیگم اپنے کمرے سے نکل آئی۔ اس کا رخ رشید بی بی کی رہائش گاہ کی جانب تھا۔

حویلی کی عقبی دیوار کے قریب دو خستہ حال کمروں پر مشتمل یہ چھوٹا سا کوارٹر رشید بی بی کو اس لیے دیا گیا تھا کہ وہ ہر وقت طاہرہ بیگم کے قریب رہے اور ضرورت پڑنے پر فوراً اس کی مدد کو پہنچ سکے۔

رشید بی بی کا خاوند فوت ہو چکا تھا۔ اس کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی اور ساری زندگی ملک زاہد کی حویلی میں گزری تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اسے وفادار ملازمین میں شمار کیا جاتا تھا۔

طاہرہ بیگم محتاط انداز میں اس کے کوارٹر کی جانب بڑھتی چلی جارہی تھی۔ اس نے رقیہ بیگم کو آج نیند کی دوا دے دی تھی تاکہ وہ بے چینی کے عالم میں اس کے پاس آنے اور عمل کے دوران تنگ کرنے کی کوشش نہ کرے۔

دروازے کے سامنے پہنچ کر طاہرہ بیگم نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر ہلکی سی دستک دی۔ اگلے ہی لمحے رشید بی بی نے اندر سے کنڈی کھول دی۔ وہ تیزی سے اندر داخل ہوگئی۔

''سب انتظامات ہوگئے نا؟'' وہ تیز لہجے میں بولی۔

''جی بیگم صاحبہ۔''

''کہاں ہے یوسف.....؟''

''ساتھ والے کمرے میں۔'' رشید بی بی نے جواب دیا۔

طاہرہ بیگم نے اثبات میں سر ہلایا اور دوسرے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔ جہاں زمین پر مردوں کو غسل دینے والا تختہ بچھا ہوا تھا.....اس تختے

پر معصوم یوسف دنیا جہان سے بے خبر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر سفید چادر تھی۔ قریب ہی پانی سے بھری بالٹی رکھی ہوئی تھی اور انگیٹھی میں انگارے دہک رہے تھے۔

"ٹھیک ہے رشید بی بی! اب تم جاؤ..... دروازہ باہر سے بند کردو اور جب تک میں آواز نہ دوں اندر مت آنا۔" طاہرہ بیگم نے کرخت لہجے میں حکم دیا تو رشید بی بی نے باہر نکل کر دروازہ بند کردیا۔

اس کے جاتے ہی طاہرہ بیگم آگے بڑھی اور تختے پر گہری نیند سوئے ہوئے یوسف کے گالوں پر ہاتھ پھیر کر مسکرا دی۔ یوسف مسلسل خواب آور دوا کے زیر اثر تھا۔ وہ غنودگی یا پھر نیم بے ہوشی کی سی کیفیت میں رہتا تھا۔ اب تو اس کا رنگ بھی قدرے پیلا پڑ چکا تھا۔

عمل شروع ہونے کا وقت ہو چکا تھا۔

طاہرہ بیگم نے اٹھ کر اپنا عروسی جوڑا پہنا اور پھر پوٹلی سے ایک تیز دھار استرا نکال کر اس پر بالے کا بتایا ہوا منتر پھونکنے لگی..... ساتھ ساتھ وہ دہکتی ہوئی انگیٹھی میں بالے کا دیا ہوا سفوف بھی گراتی چلی جارہی تھی جس کے جلنے سے کمرے میں عجیب قسم کی سرانڈ پھیل گئی تھی۔

جیسے جیسے طاہرہ بیگم منتر پڑھتی چلی جارہی تھی اس کے جوش وخروش میں اضافہ ہورہا تھا۔ پھر اس نے استرا دوبارہ اٹھایا اور منتر پڑھتے ہوئے یوسف کے سر سے بال اتارنے لگی۔ بال اتارتے ہوئے کئی جگہ پر زخم بھی لگ گئے تھے مگر طاہرہ بیگم نے اپنا عمل جاری رکھا۔

اس کام سے فارغ ہوکر طاہرہ بیگم معصوم یوسف کے سینے پر بیٹھ گئی اور آنکھیں بند کر کے پھر سے کچھ پڑھنا شروع کردیا..... اب اس کے ہاتھ ننھے یوسف کی گردن پر تھے۔ وہ قدرے اونچی آواز میں شیطانی منتر پڑھتے ہوئے اس کے نازک گلے پر اپنی انگلیوں کا دباؤ بڑھا رہی تھی۔

دباؤ بڑھانے سے یوسف کا سانس رک گیا تو نیم بے ہوشی کے باوجود اس کا جسم بری طرح پھڑپھڑانے لگا.....

مگر طاہرہ بیگم تو انسانیت کے رتبے سے گر کر شیطان کے زیر اثر آچکی تھی۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت یوسف کی نازک گردن پر مضبوط ہوتی چلی جارہی تھی۔

پھر دھیرے دھیرے یوسف کی بے نام مزاحمت بھی دم توڑ گئی۔ اس کی معصوم آنکھیں جو کبھی بات بے بات مسکراتی رہتی تھیں، بے نور ہونے کے بعد ابل کر باہر آ گئی تھیں اور سانس لینے کی ناکام کوشش میں منہ بھی کھلا رہ گیا تھا۔

یوسف کے دم توڑنے کے بعد طاہر بیگم کچھ دیر اسی حالت میں اس کے سینے پر بیٹھی رہی اور پھر قریب پڑی بالٹی میں سے پانی لے کر غسل کرنے لگی۔

طاہر بیگم کے بھاری بھر کم وجود کے نیچے دبے بے جان یوسف کے منہ اور ناک سے خون بہنے لگا تھا۔ غسل کے لیے استعمال کیا جانے والا پانی اس تختے کے نیچے کھودے گئے گڑھے میں جمع ہو رہا تھا۔

اس کام سے فارغ ہو کر وہ عفریت نما عورت لاش کے سینے سے اتر آئی اور پر سکون انداز میں اپنا لباس تبدیل کرنے لگی۔

خشک کپڑے پہن کر طاہرہ بیگم نے رشید بی بی کو آواز دی تو اگلے ہی لمحے دروازہ کھل گیا۔ رشید بی بی نے اندر داخل ہوتے ہی ایک نظر سامنے پڑی لاش کی جانب دیکھا تو اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

''کیا ہوا..... ڈر گئی ہو رشید بی بی۔'' طاہر بیگم نے اسے گھورتے ہوئے سخت لہجے میں پوچھا۔

''نن..... نہیں تو۔'' وہ ہکلائی۔

''تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ کچھ پانے کے لیے قربانی تو دینا ہی پڑتی ہے۔'' وہ دھیرے سے مسکرائی۔

''جج..... جی..... مجھے یاد ہے۔'' رشید بی بی کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

''تو پھر آگے بڑھ کر میری مدد کرو تاکہ اس کام کو انجام تک پہنچایا جا سکے۔''

طاہرہ بیگم کا حکم سن کر رشید بی بی نے اثبات میں سر ہلایا اور دونوں نے تختے کو اٹھا کر دیوار کے قریب رکھ دیا۔ پھر انہوں نے یوسف کی لاش اٹھا کر پانی سے بھرے ہوئے گڑھے میں ڈال دی۔ چند ہی لمحوں میں لاش گدلے پانی کی تہ میں بیٹھ گئی۔

اس کام سے فارغ ہو کر انہوں نے گڑھے میں خشک مٹی ڈالنا شروع کر دی۔ کچھ ہی دیر میں فرش کی سطح ہموار ہو گئی..... ہر دم مسکرانے والا یوسف ایک بے نشان قبر میں دبا دیا گیا تھا۔

......☆......

وہ رات گاؤں والوں نے جاگ کر گزاری لیکن باوجود تلاش کے یوسف کا کہیں سراغ نہ مل سکا تھا۔

بعض لوگوں کو اس بات کا بھی شک تھا کہ ممکن ہے یوسف کو کسی بھیدی نے تاوان کے لالچ میں اغوا کر لیا ہو..... اگر ایسا ہوتا تو اغوا کرنے والا یقیناً ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتا مگر تا حال ہر طرف خاموشی تھی۔

حضرت صاحب کے مطابق یوسف کو کسی ایسی عورت نے اغوا کیا تھا جس کی اولاد نہیں تھی۔ چنانچہ گاؤں کی ان تمام عورتوں پر خاص نظر رکھی جاری تھی جن کے ہاں اولاد نہیں تھی۔ یہاں تک کہ بعض مشکوک گھروں کی تلاشی بھی لی گئی تھی مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔

اگلے روز گاؤں والے دوبارہ حضرت صاحب کے پاس پہنچ گئے۔

حضرت صاحب نے ان کی بات توجہ سے سنی اور ایک بار پھر مراقبہ کرنے کے بعد ملک زاہد کی جانب متوجہ ہوئے:

''آپ کا بیٹا بہت جلد مل جائے گا.....''

''مگر کب تک.....اب تو ان آنکھوں میں بہانے کے لیے پانی بھی نہیں بچا۔'' ملک زاہد رندھی ہوئی آواز میں بولا۔

''سب لوگ گاؤں واپس چلے جائیں اور زیادہ سے زیادہ درود شریف پڑھیں.....کل سورج طلوع ہونے سے قبل یوسف ہر صورت آپ کو مل جائے گا۔

حضرت صاحب سے ملاقات کے بعد سب لوگ واپس حویلی پہنچ گئے۔ اور درود شریف کا ورد شروع کر دیا گیا..... حویلی کے اندر خواتین باہر مرد حضرات درود شریف پڑھنے میں مشغول تھے۔

بہت سے جوان مسلسل گاؤں کے راستوں اور قد آور فصلوں پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ تاکہ یوسف کو لانے والے شخص کو گرفتار کیا جا سکے۔

......☆......

یوسف کو کمرے میں دفن کرنے کے بعد طاہرہ بیگم

بہت مطمئن دکھائی دے رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ چوبیس گھنٹے میں ملک نواز واپس آجائے گا۔ طاہرہ بیگم نے رشید بی بی کو زبان بند رکھنے کی بھاری قیمت ادا کی تھی۔

لیکن جب سے گھر میں درود شریف کا ورد شروع ہوا تھا جانے کیوں طاہرہ بیگم کی بے چینی بڑھتی چلی جارہی تھی۔ اس کے اندر ایک انجانا سا خوف انگڑائی لینے لگا تھا اور دل کی دھڑکن اتنی تیز ہوگئی تھی کہ ایک پل بھی چین نہیں آرہا تھا۔

دن ڈھلنے تک اس کی حالت غیر ہونے لگی.....دل چاہ رہا تھا کہ ورد کرنے والوں کو حویلی سے نکال دے۔ مگر جیسے تیسے اس نے خود پر قابو رکھا اور طبیعت خراب ہونے کا بہانہ بنا کر اپنے کمرے میں آگئی۔

لیکن یہاں پہنچ کر بھی اس کو ایک پل کے لیے سکون نہ ملا۔ سر درد سے پھٹا جارہا تھا اور پکڑے جانے کا خوف اس کی نس نس میں سرائیت کر گیا تھا.....طبیعت کچھ سنبھلنے کے بعد جیسے ہی وہ دوبارہ حویلی کے مرکزی حصے میں پہنچی اسے پھر سے ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ درود شریف سنتے ہی اس کے دل کی دھڑکن ایک بار پھر بے قابو ہوگئی تھی۔

سارا دن اسی طرح گزرا.....لیکن جیسے ہی رات کا اندھیرا پھیلنا شروع ہوا اس کے سینے میں جیسے نشتر چلنے لگے تھے۔ یوں محسوس ہورہا تھے جیسے ابھی گاؤں والے اس کمرے میں جاکر یوسف کی قبر کھود لیں گے۔

طاہرہ بیگم کی حالت خوف کے باعث لمحہ بہ لمحہ غیر ہوتی چلی جارہی تھی۔ جب معاملہ برداشت سے باہر ہوا تو اس نے رشید بی بی کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور عورتوں کے درمیان سے اٹھ گئی۔

''خیریت تو ہے بیگم صاحبہ؟'' رشید بی بی نے پوچھا۔

''تم فوراً اپنے گھر پہنچو.....میں وہیں آتی ہوں۔'' طاہر بیگم نے دھیمے مگر تیز لہجے میں کہہ کر اسے وہاں سے رخصت کر دیا اور خود بھی کچھ دیر ادھر ادھر ٹہلنے کے بعد اس کے پاس پہنچ گئی۔

''جی بیگم صاحبہ فرمائیں.....'' رشید بی بی کے لہجے میں تذبذب تھا۔

''رشید بی بی! میرے دل میں عجیب سے وسوسے پیدا ہو رہے ہیں؟''

''کیسے وسوسے.....؟'' رشید بی بی چونکی۔

''مجھے یقین ہے کہ اگر آج رات یوسف نہ ملا تو کل سے دوبارہ گھر گھر تلاشی شروع کر دی جائے گی..... ممکن ہے کہ تمام مشکوک جگہوں پر کھدائی بھی کروائی جائے۔'' طاہرہ بیگم کے لیے بات کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

''اب کیا کیا جائے.....؟'' رشید بی بی بھی گھبرا گئی۔

''ہمیں فوراً یوسف کی لاش یہاں سے غائب کرنی ہے۔''

''مگر بیگم صاحبہ! ہم اسے کہاں لے جا سکتے ہیں۔'' رشید بی بی بوکھلا گئی۔

''کہیں بھی.....لاش کو خود سے دور کرنا بہت ضروری ہے۔ کسی ویرانے میں پھینک آتے ہیں یا پھر قریبی جوہڑ میں۔ لاش جوہڑ میں ڈوب جائے گی تو کسی کو شک نہیں ہوگا۔''

رشید بی بی اس کی باتیں سن کر خوف زدہ ہو گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر یوسف کی لاش اس کمرے سے مل گئی تو اس کی موت بھی یقینی ہوگی.....کوئی بھی یقین نہیں کرے گا کہ اس معاملے میں طاہرہ بیگم کا ہاتھ ہے۔ سب لوگ اسے ہی قاتل ٹھہرائیں گے۔

اس خطرے کے پیش نظر رشید بی بی نے بھی طاہرہ بیگم کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا اور دونوں نے گڑھا دوبارہ کھودنا شروع کر دیا۔

مسلسل کیچڑ میں پڑے رہنے کے باعث لاش بری طرح پھول گئی تھی اور تعفن بھی پھیل چکا تھا۔ انہوں نے لاش کو بوری میں بند کر دیا مگر کمرے میں تعفن بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

پانی کا جوہڑ حویلی سے زیادہ دور نہیں تھا۔ طاہرہ بیگم نے مزید رقم کا لالچ دے کر رشید بی بی کو اس کام کے لیے بھی رضامند کر لیا کہ وہ بوری کو جوہڑ میں پھینک آئے گی۔

گو اس وقت گھبرائی ہوئی رشید بی بی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ یہ مشکل کام تنہا کر سکے، مگر مرتی کیا نہ کرتی۔ اپنی گردن بچانے کے لیے نا چاہتے ہوئے بھی اسے یہ ذمہ داری قبول کرنا پڑی۔

اس مقصد کے لیے حویلی کا عقبی دروازہ استعمال کیا گیا۔ آدھے چاند کی مدھم روشنی میں رشید بی بی بوری میں بند لاش اُٹھائے ناہموار پگڈنڈیوں پر آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی منزل گاؤں کے وسط میں موجود گندے پانی کا جوہڑ تھا۔ جوہڑ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔

ابھی اس نے بہت کم فاصلہ طے کیا تھا کہ سامنے سے آنے والے لڑکوں کو دیکھ کر بری طرح گھبرا گئی اور پھر کچھ نہ سوجھنے پر بوری کو ایک گھنے درخت کے نیچے پھینک کر تیزی سے واپس بھاگ گئی۔

......☆......

سارے گاؤں نے وہ رات بھی آنکھوں میں گزار دی۔ مگر یوسف کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔ جیسے جیسے رات ڈھلتی چلی جا رہی تھی ملک زاہد اور رقیہ بیگم کی مایوسی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

صبح فجر کی اذان کے بعد جب چند لوگ نماز کے لیے مسجد کی طرف جا رہے تھے تو انہوں نے درخت کے نیچے ایک لاوارث بوری دیکھی جس میں سے بہت تیز بدبو اٹھ رہی تھی۔

سب بوری کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے تھے۔ کچھ ہی دیر میں یہ خبر ملک زاہد کی حویلی تک پہنچ گئی اور وہاں بیٹھے لوگ بھی درخت کے پاس پہنچ گئے.....کوئی بھی بوری کو ہاتھ نہیں لگا رہا تھا۔ پھر ملک زاہد کے اشارے پر ایک شخص نے آگے بڑھ کر بوری کا منہ کھول اور اندر جھانکتے ہی چیخ مار کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔

بوری کے لڑھکتے ہی اس کے کھلے منہ سے یوسف کی لاش آدھی سے زیادہ باہر نکل آئی جسے دیکھتے ہی ملک زاہد چکرا کر زمین پر گر پڑا۔

لاش ملتے ہی گاؤں میں کہرام مچ گیا۔ ملک زاہد دھاڑیں مار کر رو رہا تھا جب کہ رقیہ بیگم پر غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ لاش کی حالت بہت خراب تھی اور اس قدر بدبو اٹھ رہی تھی کہ قریب کھڑے ہونا بھی محال تھا۔

اس موقع پر طاہرہ بیگم بھی مگر مچھ کے آنسو بہاتے ہوئے سینہ کوبی کر رہی تھی۔ لیکن دل ہی دل میں مطمئن تھی

کہ بروقت ذہانت سے کام لے کر وہ بڑی مصیبت سے بچ گئی تھی۔

جنازے کی تیاری ہو رہی تھی کہ گاؤں کے چند بڑے تنہائی میں ملک زاہد سے ملے اور تاجدین بولا:

''ملک صاحب! لاش سے اُٹھنے والے تعفن سے اندازہ ہو رہا ہے کہ یوسف پتر کے ساتھ یہ ظلم آج نہیں ہوا..... اگر تعفن یہاں موجود ہے تو یقیناً اُس جگہ بھی ہوگا جہاں سے لاش نکالی گئی..... اس وقت گاؤں کی اکثریت یہاں جمع ہے۔ مجھے یقین ہے قاتل خود بھی یہیں موجود ہو گا۔ ہم دوستوں نے فیصلہ کیا ہے کہ خفیہ طور کھوجی کی مدد سے اس مقام تک پہنچنے کی کوشش کی جائے جہاں یہ ظلم برپا ہوا۔ کیوں کہ وہ جگہ ابھی تک نرم ہوگی جہاں لاش دبائی گئی ہوگی۔''

ملک زاہد جو کہ پہلے ہی غم سے نڈھال تھا ان کا خلوص دیکھ کر انکار نہ کر سکا۔ ویسے بھی تجویز معقول تھی۔

چنانچہ چند بزرگوں پر مشتمل ایک ٹیم کھوجی کے ہمراہ اس درخت کے پاس پہنچ گئی جہاں سے لاش برآمد ہوئی تھی۔ کھوجی نے وہاں پہنچ کر جائے وقوعہ کا جائزہ لیا اور پھر اپنی تفتیش کا دائرہ وسیع کرتا ہوا حویلی کے عقبی دروازے تک پہنچ گیا۔

سب لوگ اس مقام پر پہنچ کر نہایت حیران اور پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ لیکن کسی میں اتنی جرات نہیں تھی کہ حویلی کے اندر داخل ہو سکے..... چنانچہ نہایت رازداری سے ملک زاہد کو اس بات سے آگاہ کیا گیا تو وہ بھی موقع پر پہنچ گیا اور کھوجی کو بلا جھجک آگے بڑھنے کا حکم دیا۔

اجازت ملتے ہی کھوجی نے اپنا کام دوبارہ شروع کر دیا اور حویلی کے عقبی دروازے سے اندر داخل ہونے کے بعد آگے بڑھتا ہوا رشید بی بی کے گھر جا پہنچا۔

اس لمحے ملک زاہد کو زمین گھومتی محسوس ہو رہی تھی۔ دروازے پر تالا تھا۔ رشید بی بی یقیناً جنازے کے پاس تھی۔ ملک زاہد کے اشارے پر ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر دروازے کا تالا توڑا تو سب اندر داخل ہو گئے۔ جہاں دونوں کمرے بند تھے۔ لہٰذا پہلے ایک کمرہ کھول کر چیک کیا گیا لیکن وہاں ایسی کوئی علامت موجود نہیں تھی جس کی انہیں تلاش تھی۔ اس کے بعد دوسرے کمرے کا دروازہ کھولا گیا تو ملک زاہد کے جسم میں سردی کی تیز لہر دوڑ گئی..... کیوں کہ کسی روشندان یا کھڑکی کے بغیر کمرے سے وہی تعفن اٹھ رہا تھا جو لاش کے گلنے سڑنے سے پیدا ہوتا ہے۔

کھوجی نے آگے بڑھ کر کمرے کے فرش کو مختلف جگہ سے ٹھونکا تو ایک جگہ اس کی چھڑی دھنستی چلی گئی..... کھوجی کی نشاندہی پر وہاں کھدائی کی گئی تو گڑھے میں سے یوسف کی قمیص کا ایک ٹکڑا بھی برآمد ہو گیا جو ثبوت تھا کہ لاش کو یہیں دفنایا گیا تھا۔

ملک زاہد یہ سب کچھ دیکھ کر آگ بگولا ہو گیا۔ اسی وقت رشید بی بی کو طلب کر لیا گیا۔ اس نے آتے ہی صورت حال دیکھی تو فوراً ملک زاہد کے قدموں میں گر گئی اور صاف بتا دیا کہ یہ سب کچھ اس نے طاہرہ بیگم کے کہنے پر کیا تھا۔

کچھ ہی دیر میں یہ خبر سارے گاؤں میں پھیل گئی اور پولیس نے موقع پر پہنچ کر طاہرہ بیگم اور رشید بی بی کو حراست میں لے لیا..... رقیہ بیگم یہ انکشاف سنتے ہی ہوش کھو بیٹھی اور پھر چند دن بیمار رہنے کے بعد اپنے بیٹے کے پاس اُفق کے اس پار جا بسی۔

اس واقعہ کے بعد ملک زاہد نے خاموشی اختیار کر لی تھی..... لوگ سمجھتے تھے کہ بیوی اور بیٹے کی جدائی نے اسے اندر سے توڑ ڈالا ہے مگر حقیقت یہ تھی کہ دنیا مکافات عمل ہے..... برسوں پہلے جائیداد کے لالچ میں اس نے اپنے سگے بھائی ملک نواز کو قتل کر کے اس کی لاش کو ویرانے میں دبا دیا تھا..... لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ مستقبل میں کسی کمزور لمحے طاہرہ بیگم اپنے لاپتہ شوہر کی واپسی کے لیے شیطانی عمل کرتے ہوئے اسی کے بیٹے کی بھینٹ پیش کر دے گی۔



# سیریل کلر



عمارہ خان

ایک سیلز مین کا فسانہ، وہ اپنے طور پر قانون کی مدد کرنا چاہتا تھا لیکن جب حقیقت سامنے آئی تو......

ایک دلچسپ مغربی کہانی کی تلخیص جو یقینا آپ کو پسند آئے گی

"ایڈم پلیز چیک کرنے میں کیا جاتا ہے؟"

میں نے ایڈم ابراہام سے ایک بار پھر درخواست کی ایڈم نے ناگواری سے مجھے دیکھا۔

کم آن جیسن، جاؤ جا کے میری طرف سے ایک بیئر کا گلاس پی لو اور ختم کرو اس بات کو۔"

"لیکن......!"

"پلیز گو......!"

میں نے بولنا چاہا لیکن اس کے ناگواری سے بڑھے ہاتھ نے میرا حوصلہ پست کر دیا لیکن اسے خطرے کا احساس دلانا میرا فرض تھا آخر۔ اسے کچھ ہوتا یا ہمارے اسٹور کو تو دونوں صورتوں میں میرا برابر کا نقصان تھا۔

"میں پہلے بھی تمہاری بکواس کے ہاتھوں شرمندہ ہو چکا ہوں، اب اور نہیں۔" ایڈم نے قطعی انداز میں میری بات کاٹ کے ایک ڈالر دیتے ہوئے جانے کا اشارہ کیا۔

"تم میرے دوست ہو ایڈم اور یہ جگہ ہم دونوں کے لیے اہم ہے۔" میں نے اسے یاد دلانا چاہا۔

"ہاں مجھے بہت اچھی یاد ہے، اسی لیے اس حال میں ہوں۔ شکر ادا کرو پچھلی بار والی خاتون نفیس تھی ورنہ وہ ہم دونوں کو "سو" کر سکتی تھی۔ میرے معافی مانگنے سے بات ختم ہو گئی تھی۔ یاد ہے نا؟

ایڈم نے مجھے گھورتے ہوئے کہا پرانی بات کا حوالہ دے کے مجھے شرمندہ کیا اور چپ کرانے کی کوشش کی۔

"پلیز کاؤنٹر دیکھو، دو کسٹمر تمہارے سیکشن میں ہیں، جن کو تم نظر انداز کر کے مجھے کہانیاں سنا رہے ہو کہ ایک بار پھر کوئی مشکوک انسان جو تمہارے حساب سے کوئی سیریل کلر ہے اور تمہارے ہی حساب سے اب وہ کسی کو قتل کرنے کی منصوبہ بندی کر رہا ہے اور وہ بھی عین تمہاری ناک کے نیچے اتنا ہی عقل سے پیدل ہے نا وہ جو قتل کرنے سے پہلے ہی کرسی پر بیٹھنے کے لیے گواہ تیار کر رہا ہے۔

ایڈم نے ماتھے پر ہاتھ مارا اور میرے ہاتھ میں تھامے جاسوسی ناول پر ایک تیکھی نظر ڈالتے ہوئے مزید میری بے عزتی کی۔

"اور پلیز یہ فضول قسم کے جاسوسی طرز کے ناولز کم پڑھا کرو۔ خاص کر جب لکھا بھی کسی عورت نے ہو تو جبکہ وہ خود سات پردوں میں چھپ کے بیٹھی ہو...... ہنہ...... یقیناً تمہارا یہ نیا ناول بھی ان کسی خوفناک قسم کے سیریل کلر کے متعلق ہو گا اسی لیے...... ہم۔ تو کیا لکھا ہے اس بار وہ تمہاری "ایملی سنگ" نے ہاں؟"

"پلیز ایڈم، بات تو سنو۔ میں قسم کھانے کے لیے تیار ہوں۔ اس بار سچ میں......!"

میں نے مشہور معروف سسپنس جاسوسی رائٹر "ایملی سنگ" کا نیا تھرل ناول "اسٹریٹ سیریل کلر" کو لاشعوری طور پر اپنے پیچھے کرتے ہوئے ایڈم کو یقین کرانا چاہا۔

اوہ پلیز جیسن......!"

ایڈم بری طرح کراہا اس نے یقیناً میری حرکت نوٹ کر لی تھی۔

یہ جاسوسی رائٹرز پوری طرح فارغ ہوتے ہیں، کام دھندہ کچھ ہوتا نہیں ان کو، ایک کرسی پر بیٹھے بیٹھے تم جیسے لوگوں کو



بہکاتے ہیں، جو یہ فضولیات پڑھ کے ہر ایک کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ادھر کس کو فرصت ہے جو ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں گھس کے کسی کے مرڈر کی منصوبہ بندی کرے گا۔ وہ بھی تب جب کوئی اس پر نظر رکھے ہو۔"

میں نے ایک گہری سانس لی، اب ایڈم کو کوئی نہیں روک سکتا، اسے ناولز وغیرہ سے کوئی خاص چڑ تھی۔

"بے وقوفی مت کرنا اب ایڈم نے مجھے خونخوار نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا میں افورڈ نہیں کر سکتا سیزن کے شروع ہوتے ہی ہر جانے کے طور پر ہزاروں ڈالرز بھرنا۔

میں پوری طرح مایوس ہو کے اپنی جگہ بیٹھنے کے لیے پلٹا ہی تھا کہ ایکدم ایڈم نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکا اور چونکتے ہوئے پوچھا۔

"اور ہاں یاد آیا۔"

میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی سمت دیکھا کہ شاید اس نے میری بات کی اہمیت سمجھ لی ہو ایڈم نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو مزید سکیڑتے ہوئے، ماتھے پر بل لاتے ہوئے کہا۔

"جان اپنی تیسری ساس کو ڈینٹسٹ کے پاس لے کے جانے والا تھا، پوچھو اس سے کب جائے گا، یقیناً وہ بھول چکا ہوگا اور وہ۔" ایڈم نے کیش کاونٹر کھولتے ہوئے خود کلامی کی۔

"وہ پھر ادھر آ جائے گی اس کی بد صورت ساس شور مچانے، ایماندار ورکرز کی ساس کو بھی برداشت کرنا عذاب ہے ورنہ اس عورت کی چبھتی آواز کانوں کو کینسر کر دے۔"

میں نے بالآخر ایڈم سے مایوس ہو کے واپس اپنے کاونٹر کی سمت قدم بڑھائے۔

بھاڑ میں جائے جان اور اس کی ساس، میں اس کا سیکرٹری نہیں ہوں جو اسے یاد دلاتا پھروں...... ہنہ......

میں نے اپنے کاونٹر کی آرام دہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے اپنے دل کی بھڑاس نکالنی شروع کی۔

جب پانی سر سے اونچا ہو جائے گا تو اس ایڈم کو یاد آئے گا، اس کے بچپن کے دوست نے پہلے ہی وارن کر دیا تھا کہ وہ لڑکا......اوہ میرا اڈالر کہاں گیا......!"

میں نے اسٹور کی یونیفارم یعنی ڈانگری کی پاکٹس کو ٹٹولتے ہوئے بیئر کا ذائقہ اپنے منہ میں محسوس کیا اور میں چھ ماہ پہلے ہوئے اس بھیانک تجربہ اور اس عورت کے بارے میں سوچنے لگا جس کی وجہ سے آج ایڈم نے میری بات پر کان نہیں دھرا تھا اور مجھے یقین تھا وہ پچھتائے گا۔ ہر بار غلط فہمی نہیں ہو سکتی۔ اگر ایک بار میرا اندازہ غلط ثابت ہو گیا تو لازمی ہے اس بار بھی ہو۔

"ہنہ اچھا تو ایڈم اب تم جانو اور وہ لڑکا میں نے اپنا ناول کھولتے ہوئے دل ہی دل میں ایڈم کو سنائی لیکن مجھے سامنے کھلے ناول کے الفاظ آپس میں مکس ہوتے دکھائی دے رہے تھے کیونکہ میرا ذہن چھ ماہ پرانے واقعات کی سمت مڑ گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا میری نگاہوں کے سامنے کوئی اسکرین روشن ہوئی ہو اور میں واضح طور پر گزرے ہوئے لمحات پہ فوکس کر سکتا ہوں۔

......☆☆......

ہوا کچھ یوں کہ کچھ ماہ پہلے ایک عجیب حواس باختہ قسم کی عورت اسٹور میں آنے لگی تھی، لطف کی بات یہ تھی وہ ہمارے قصبے کی ایک شادی میں شرکت کے لیے خاص طور پہ شہر سے

آئی تھی۔ کچھ ہی دن ہوئے تھے اسے آئے ہوئے اور اس کا نام شاید کیتھرائن تھا۔
دبلی پتلی کوئی پچاس پچپن کے جی کا وزن لمبی نہیں نہیں لمبی تو ہرگز نہیں تھی ہاں جسامت کے لحاظ سے ایوریج ہی تھی۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی بدحواسی اس کا پورا امیج برباد کر دیتی تھی لیکن۔
لیکن قابل ذکر چیز اس کے موٹی ہاتھ تھے بالکل کسی آرٹسٹ قسم کے نازک اور حسین جیسے کسی سانچے میں ڈھال کے بنائے ہوں۔ وہ جب بھی بل بھرنے کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھاتی۔ میری نظریں اس کے ہاتھوں پر جم جاتی تھی۔
"خیر، ہوگی حسین وسین میری بلا سے۔ ہاں تو میں بتا رہا تھا، ایک دن وہ بدحواس عورت عین میری کرسی کے پیچھے کسی ریک سے تیز دھار پیپر کٹر اور قینچی لے رہی تھی ساتھ ہی مستقل فون پر سرگوشیاں بھی کر رہی تھی میں نے ایک دم چونک کے اسے دیکھا تو وہ سٹ پٹا گئی، مجھ سے نظریں چرانے لگی اور گاہے بگاہے مجھے کن انکھیوں سے دیکھ دیکھ کے سرگوشیاں کرتی رہی اس کی اس حرکت سے میں مزید چوکنا سا ہو گیا اور لاشعوری طور پر میں اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔
ہو نا ہو یہ عورت یقیناً کوئی غلط کام کو کرنے جا رہی ہے۔ حسن تم کو اس کی مدد کرنی ہی ہوگی تاکہ معاشرے میں کم سے کم جرم ہو میں نے اپنی ہمت بندھائی۔ اس سے پہلے کہ وہ بیچاری عورت کچھ الٹا سیدھا کر کے جیل چلی جاتی میں نے اس کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔
میں نے اس پر نظر رکھی لیکن مجھے محسوس ہوا وہ بھانپ گئی ہے میرا اسے تکنا۔
"اوہ..... یعنی گھاگ عورت ہے۔"
میں نے بھی ہمت نہیں ہاری اور خاموشی سے اپنی جگہ چھوڑ کے اس کے پاس کھسکنے لگا تاکہ اس کی باتیں سن کے کوئی فیصلہ کر سکوں۔
"ٹھیک ہے ٹھیک ہے ٹام لیکن یہ آخری بار ہو گا بس.....!"
میں جیسے ہی اس کے برابر والے ریک کی طرف بڑھا اس کی سرگوشی نے قدم تھام لیے۔
"کیتھی ڈارلنگ... مجھے جواب دینا پڑتا ہے۔ ایک ایک باڈی پیس کا حساب ہوتا ہے ہمارے پاس۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے نا.....!"
یقیناً اس کا غلطی سے موبائل اسپیکر کھل گیا تھا اور دوسری طرف یہ اتنی سی بات نے ہی میرے کان کھڑے کر دیے تھے۔
"باڈی پیس؟"
"او کے تم کو اب دایاں بازو چاہیے؟"
میرے جسم میں سنسنی سے دوڑ گئی۔ یہ تو کافی نازک صورت حال درپیش تھی۔
"پہلے بھیجا ہوا گلہ ٹھیک تھا؟ مناسب کٹا تھا؟ تم کو اندازہ نہیں کس قدر مشکل درپیش تھی مجھے اس کا گلہ کاٹتے ہوئے۔"
میرے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔
"ہاں ہاں یقیناً وہ موٹی عورت کا ہی تھا لیکن اب کیا کرنا ہے۔ صوفیہ تو اسمارٹ سی ہے۔ یقیناً مجھے مشکل نہیں ہوگی۔"
یک طرفہ گفتگو سے میں نے باآسانی اندازہ لگا لیا، یہ یقیناً لاشوں کے باڈی پارٹس سپلائی کرتی ہے۔
"افف یسوع مسیح۔"
میں نے بے اختیار کراس بنایا اور اس کی معصوم شکل کو کراہیت سے دیکھا۔
"تم رات کو اسٹور کے پچھلے دروازے سے آجانا لیکن پلیز یہ آخری بار ہے۔ یہ غلط کام ہے لیکن صرف تمہاری خاطر کرنے پر مجبور ہوں۔"
میں جو لفظ اسٹور سن کے چونکا تھا وہی آگے کی بات سن کے سکتے میں چلا گیا۔ وہ موٹا حسن مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہا ہے، کہیں اسے مجھ پر شک تو نہیں ہو گیا؟
اس عورت نے مجھے موٹا کہا خود چوہیا جیسی ہے، گندے کام کرتی ہے اور مجھے موٹا ہونہہ دیکھتا ہوں تمہیں بھی مجھے غصہ آ گیا۔
"چلو تم خود ہی نمٹنا اس سے ایویں سا ہے لیکن مجھے آج لگا جیسے..... جیسے..... یو نو میں بیان نہیں کر نہیں سکتی، لیکن کچھ الگ ہے آج اس کی نگاہوں میں۔"
"بے تکی عورت کیسے میرے بارے میں ریمارکس دے سکتی ہے، بدتمیز عورت۔"
"او کے او کے میں جا رہی ہوں مائیکل کو نہیں بتایا میں نے کہ.....!"

اس قاتل عورت نے اپنی ٹرالی کھینچتے ہوئے گہری سانس لی۔

"یاد رکھنا اگر پکڑے گئے تو میرا نام ہرگز نہ لینا مائیکل کو یقیناً یہ بات پسند نہیں آئے گی کہ اس کی بہن ایسا کام کرے لیکن میں بھی کیا کرسکتی ہوں۔"

ہلکی سی مسکراہٹ سے کیتھرائن نے اپنا موبائل بائے کہہ کے بند کیا میں سٹپٹا گیا وہ اب پلٹ رہی تھی اور یقینی طور پر مجھ سے ٹکراؤ ہونے والا تھا اور پھر میرے بھی قتل کے بعد باڈی پارٹس کا سودا ہو جاتا اوہ پروردگار ہیلپ ہیلپ۔"

میری سانس پھولنے لگی شاید دمے کا اٹیک ہونے والا تھا۔

"اوہ مسٹر جیسن، آر یو آل رائٹ؟"

اچانک میرے کافی نزدیک سے اس عورت کی آواز ابھری۔

کیتھرائن گھبرائی ہوئی مجھ سے پوچھ رہی تھی اور میری آنکھیں کاؤنٹر پہ رکھا انہیلر دیکھ رہی تھیں اس نے نگاہوں کا تعاقب کیا دوسرے ہی پل انہیلر اٹھا کے میرے منہ سے لگادیا۔

دو چار گہری سانس لینے کے بعد میں قدرت کی اس ستم ظریفی پر گراہ کے رہ گیا، جس بندی کی جاسوسی کررہا تھا اسی نے میری جان بچائی۔

"شکریہ مس۔"

"کیتھرائن کیتھرائن جوزف۔" میں نے مصنوعی مسکراہٹ سے اسے نوازا۔

"شکریہ مس کیتھرائن میری زندگی بچانے کے لیے۔"

"اٹس او کے جیسن۔"

"تم میرا نام جانتی ہو۔ جاسوسی کررہی ہو میری۔" میں نے گھبرا کے اسے گھورا۔

کیتھرائن نے مسکرا کے میرے گلے میں لٹکا بیج دیکھتے ہوئے اس کی سمت اشارہ کیا۔

"اوہ بے ساختہ میرے چہرے پہ جھینپی جھینپی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"سوری وہ ایکچوئلی وہ......"

"میں فادر مائیکل جوزف کی اسٹیپ سسٹر ہوں اور ان کی بیٹی صوفیہ کی شادی کے لیے خاص طور پر مدعو ہوں تاکہ صوفیہ

میاں بیوی اور فساد

میاں بیوی کا رشتہ ایک عظیم رشتہ ہے جو جوڑا تو مشکل سے جاتا ہے لیکن توڑا آسانی سے جاسکتا ہے۔ ہر گھر میں فساد جھگڑے ہوتے ہیں کبھی کبھار جھگڑا حد سے بڑھ جاتا ہے لیکن یہ پتا نہیں چل پاتا کہ زیادہ جھگڑالو کون ہے میاں یا بیوی؟

اکثر بیویاں بہت باتونی ہوتی ہیں جو بات بات پر آپے سے باہر ہوجاتی ہیں اور جھگڑا کرنے میں پہل کرتی ہیں کہتے ہیں جس گھر میں برتن ہوں وہ آپس میں کھڑکتے ضرور ہیں۔ اس لحاظ سے چند لمحے اپنی بے عزتی اور بیوی کے نازیبا جملے سننے کے بعد بزدل میاں آکر میانوالی کا ہیرو بن ہی جاتا ہے۔ جو بیوی میاں والی ہوتی ہے وہ اپنے شوہر کو نیک دیکھنا چاہتی ہے اور گھر میں میلے جیسا ماحول پسند کرتی ہے اسی لیے چالاک اور ہوشیار لوگ کہتے ہیں کمپیوٹر کی ونڈو، موٹر سائیکل کی ٹیوننگ اور بیوی کے دماغ کو ایک ماہ کے بعد برین واش کرنا ضروری ہے۔ ہمارے ہاں بیویوں اور ان کے فساد کی تین قسمیں زیادہ مشہور ہیں۔

ماڈرن میاں بیوی کا فساد

ماڈرن میاں بیوی کا فساد بڑھتا ہے کم نہیں ہوتا ایسی بیویاں جنہیں پارلر سے محبت اور کچن سے خدا واسطے کا بیر ہو، محلے اور گلی کی خواتین سے فوراً گھل مل جاتی ہوں اور کئی خواتین کے گلے میں با آسانی پڑ جاتی ہوں اس کے علاوہ وہ گھر کے کام کاج سے جان چھڑا کر دور بھاگتی ہوں یہ اتنی ماڈرن ہوتی ہیں کہ ان کی آیا ان کے بچے سنبھالتی ہیں جبکہ وہ خود کو سوشل ورک میں مصروف رکھتی ہیں یہ بیویاں محلے میں بھی ڈراؤنا فساد کرا کر انجوائے کرتی ہیں ان کی طرف سے کرائے گئے فساد ''ماڈرن فساد'' کہلاتے ہیں۔

سادگی پسند میں بیوی کا فساد

سادگی پسند میاں بیوی کا فساد سادہ ہی ہوتا ہے اور ایسی بیویوں کی یہ قسم نصیب والوں کو ہی ملتی ہے جی ہاں خراب نصیب والوں کی یہ بیویاں اتنی سادہ ہوتی ہیں کہ سادگی، سادگی میں فساد برپا کردیتی ہیں اگر گھر میں اکیلی ہوں تو اپنے آپ سے ناراض ہوکر بیٹھ جاتی ہیں۔ جب ان کے دماغ کی گرمی ٹھنڈی ہوجاتی ہے تو انہیں یاد آتا ہے کہ میاں صاحب تو ابھی آئے ہی نہیں۔ پھر خود ہی دل میں سوچتی ہیں کہ شوہر کو جب گڑ کھلا کر مارا جاسکتا ہے تو پھر زہر ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ اتنی سادہ ہوتی ہیں کہ کسی بھی تقریب میں جانے کے لیے میک اپ نہیں کرتیں بلکہ تقریب سے واپس آکر میک اپ کرتی ہیں جس دن فساد شروع ہوجاتا ہے تو یہ اپنی شادی کی تصویر دیکھ کر رونا شروع کردیتی ہیں اور کہتی ہیں کہ کاش میری شادی اس سے نہیں بلکہ اس کی شادی مجھ سے ہوئی ہوتی۔ سادگی پسند میاں بیوی کا یہ فساد ''سادہ فساد'' کہلاتا ہے۔

سازشی میاں بیوی کا فساد

سازشی میاں بیوی کا فساد شروع ہوتے ہی نت نئے منصوبے بننا شروع ہوجاتا ہیں ان بیویوں کے حوالے سے یہ کہنا ہی کافی ہے کہ ایسی بیوی کے ملنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس شخص کو قدرت اس کی خطاؤں کی سزا اسی دنیا میں ہی دینا چاہتی ہے ایسی بیویوں کی نیت میں ہی سازش ہوتی ہے۔ انہوں نے ہر لمحہ فساد کو دماغ پر سوار کیا ہوتا ہے ان میں سازش کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے جیسے سازش کو آرائش کررہی ہوں۔ یہ پہلے لڑائی کا منصوبہ سوچتی ہیں اور پھر فساد کرتی ہیں۔ کبھی کبھار اگر ان کی سازشی منصوبہ ناکام ہوجائے تو یہ جعلی خودسوزی کا منصوبہ بنالیتی ہیں۔

کے۔''

''اچھا اچھا لیکن فادر تو بہت نفیس اور ایمان دار بندے ہیں۔'' تعارف سنتے ہی بے اختیار میرے منہ سے نکلا

''کیا مطلب۔'' وہ پہلے ہی اپنی بات کاٹنے پر ناگواری سے مجھے دیکھ رہی تھی رہی سہی کسر اب پوری ہوگئی۔

''سوری سوری وہ ایسے ہی پلیز ڈونٹ مائنڈ بس ایسے ہی منہ سے نکل گیا۔''

''میرا خیال آپ کی طبیعت واقعی خراب ہے مسٹر جیسن۔'' بالآخر اس نے مجھے غصے سے گھورا اور اپنا لیا ہوا سامان بھی وہیں کاؤنٹر پہ پٹخ گئی۔

''ہنہ ایک تو مردوں کے جسمانی اعضاء چوری کرتی ہے اوپر سے نخرے دیکھو۔''

میں نے بڑبڑاتے ہوئے اس کا چھوڑا ہوا شاپر اپنی طرف کھینچا۔

"لیکن قادر...... اور صوفیہ...... یہ عورت کیسے ان کے خاندان کا حصہ بن سکتی ہے۔ اوہ بیچارے جب پولیس اس عورت کو پکڑ کے لیجارہی ہوگی تو صوفیہ کی کیا حالت ہوگی۔ میرا خیال ہے صوفیہ کی شادی کے بعد ہی شیرف کو انفارم کیا جائے تو بہتر ہے لیکن وہ تو آج رات ہی۔

اچانک میری نگاہیں شاپر سے نکلے سامان پر جم گئی اور میں نے فوراً موبائل کی سمت ہاتھ بڑھایا۔

"ہیلو شیرف۔"

میں نے سامنے بکھرے ڈک ٹیپ، مختلف سائز کی قینچیاں اور سوئیوں کے ساتھ تیز ترین دھار والے کٹر سے نظریں چراتے ہوئے اپنے کپکپاتے لہجے کو کنٹرول کرنا چاہا۔

اور اس کے بعد صرف یہ ہوا کہ جب شیرف نے کیتھرائن کو موٹیل سے لیا، مجھے لنچ بریک میں ایڈم کے ہمراہ بلایا تو میں یقینی طور پر اپنا بہترین سوٹ زیب تن کر کے ممکنہ تعریفی سند وصول کرنے کے لیے تیار ہو کے گیا لیکن کیفے میں کیتھرائن کے ساتھ شیرف کو ہنستے ہوئے بیئر پیتے دیکھا تو ایک دھچکا سا لگا۔

میں نے حیرت کی زیادتی سے خاموش ہو کے ایڈم کو دیکھا جو پہلے ہی مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

پورے راستے میں ایڈم کو بتاتا آیا تھا کیسے جب وہ شہر گیا ہوا تھا تو میں نے نا صرف اسٹور کا، دھیان رکھا بلکہ باریک بینی اور حاضر دماغی کے ساتھ ایک جرائم پیشہ عورت کو رنگے ہاتھوں بھی پکڑوایا۔ ورنہ وہ مزید بیگناہ اور معصوم شہریوں کے رشتے داروں کے جسمانی اعضاء کاٹ پیٹ کے اپنا بزنس چلاتی رہتی۔



# چاچو سی آئی ڈی



ایم زیڈ شیخ

وادی کشمیر کے پس منظر میں ایک ہنستی مسکراتی تحریر چھوٹے خان موٹے خان کی ایک پر مزاح مہم جو آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دے گی۔

اداس لمحوں کے لیے اکسیر، ایک دلچسپ تحریر

کشمیر میں زلزلہ تو "۲۰۰۵" میں آیا پر چاچو کی زندگی میں اس سے پندرہ سال پہلے ہی آ گیا تھا جب چچی جان ان کی بے جان زندگی میں تین من وزنی بہار بن کر آئی اور اس کے بعد بھی چاچی نے مہنگائی کی رفتار سے صحت میں اضافہ کیا۔ بھلا چاچو کہاں پیچھے رہنے والے تھے پس چاچو بھی فقط چاچو سے بڑھ کر "موٹے چاچو" بن گئے مگر صرف میرے لیے یعنی "چھوٹے خان" کے لیے باقی اگر کسی کی زبان سے اپنے لیے موٹے کا لفظ سن لیتے تو اس کی شامت آ جاتی۔

ہماری جوڑی نے سرزمین کشمیر پر وہ قہر برپا کیا کہ سب ہمیں "لٹل بوائے" اور "فیٹ بوائے" (little fat boy & boy) کہنے لگے اور اتفاق کی بات ہے کہ دونوں میزائل یعنی میں اور چاچو ایک ہی جگہ موجود ہوں تو کیا حال ہوگا اس جگہ کے رہنے والوں کا۔

وادی کشمیر کے خوبصورت مقام "نیلم ویلی" کے ایک گاؤں کے رہائشی ہم دونوں چچا بھتیجے عجوبے سمجھے جاتے ہیں کیونکہ ہر کام میں پنگا لینا ہمارا معمول ہے۔

ہمارا علاقہ نہایت ٹھنڈا ہے پر چچی جان اللہ جانے کس موسم میں پیدا ہوئیں جو ہر وقت یوں لگتا ہے کہ انگارے چبا رہی ہیں۔ تو بات ہو رہی تھی چچا جان کی کہ بے چارے سارے گاؤں کے لیے تو ایٹم بم ہیں پر چاچی کے لیے "ببل گم" یہ اُن دنوں کی بات ہے جب چاچو کی مالی حالت کچھ کمزور تھی بے چارے کی اکلوتی بھینس آج کل روٹھی ہوئی تھی اور آمدن کم خرچ زیادہ سے پریشان تھے۔ پر مجھے ملے تو یوں لگا کہ بھینس وقت سے پہلے ہی ایک کے بجائے دو دو "کٹوں" کی ماں بن گئی ہے ملتے ہی بولے۔

"چھوٹے میاں دعا کرو ہمارا اس بار کا سفر وسیلہ ظفر بن ہی جائے اور ہمیں کسی اچھی جگہ نوکری مل جائے اور ہماری جان ان دو بھینسوں سے چھوٹ جائے۔"

"پر چاچو آپ کے پاس تو ایک ہی بھینس تھی۔" میں نے حیرت سے پوچھا اور منہ کے اندر آنے والی مکھی پر ڈرون حملہ کرنے کی کوشش کی۔

"بیٹا تم اپنی چاچی کو کیوں بھول رہے ہو۔" چاچو حسرت سے بولے۔ "اگر وہ پیدا نہ ہوتی تو اس کی جگہ دو بھینسوں نے پیدا ہونا تھا۔"

"خیر چاچو آپ کسی ظفر اور سفر کی بات کر رہے تھے؟"

"ہاں چھوٹے دراصل میں ایک بار پھر قسمت آزمانے شہر (مظفر آباد) جا رہا ہوں......اور اس سے پہلے ہم میلہ دیکھیں گے خوب جوائے کریں گے۔"

"چاچو! جوائے نہیں......انجوائے ہوتا ہے اور میلہ تو کل سے شروع ہو چکا ہے' ماموں نے کل مظفر آباد سے فون کیا تھا...... ہائے اللہ! چاچو مجھے کتنا شوق ہے میلہ دیکھنے کا پر آپ......ہٹلر چاچی کو کیسے منائیں گے؟"

"تیری چاچی کو بھی منا ہی لیا ہے کسی طرح پر تو یہ نوکری والی بات کسی کو نہ بتانا۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا اور



چونکتے ہوئے چاچو سے کہا۔

''موٹے چاچو! ایک ترکیب آئی ہے دماغ میں۔''

چاچو نے اپنا مٹکے جیسا سر اور توند یوں موڑ کر میری طرف دیکھا جیسے میں ''پینلٹی سٹروک'' مارنے لگا ہوں اور چاچو گول کیپر ہیں۔

میں قصہ چہار درویش کی طرح یوں گویا ہوا۔

''چاچو...... کیا ایسا نہیں ہوسکتا ہے کہ ہم بچپن میں کھوئے ہوئے تایا جان کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں...... اور وہ ہمیں میلے میں ایسے ہی مل جائیں جیسے ہم شکل بھائی اکثر فلموں یا کہانیوں میں ملتے ہیں اور ہم مالا مال ہو جائیں؟''

چاچو کی آنکھیں حیرت سے ایسے پھیل گئیں جیسے آخری منٹ میں فیصلہ کن گول ہونے پر گول کیپر کی پھیل جاتی ہیں۔

''چھوٹے! اللہ کرے تیرے منہ کی طرح تیری زبان بھی کالی ہو...... اور تیری بات ایسے ہی سچ ہو جیسے تیری چاچی کا منحوس ہونا۔''

چاچو نے میرے کئی دنوں سے بغیر نہائے جسم کو یوں اپنی بانہوں میں بھر لیا جیسے ہیرو آخری سین میں ہیروئن کو۔

......☆☆......

منظر تھا میلے کا ہر طرف رنگ و نور کی برسات نظر آ رہی تھی، بچوں کے قہقہے اور کسی جگہ بڑوں کی ہاہا کار...... سب سے پہلے میں نے اور چاچو نے جھولے کی سواری کی چاچو نیچے اتر کر بولے۔

''چھوٹے! آج پتہ چلا دنیا میں تیری چاچی سے زیادہ خطرناک چیزیں بھی موجود ہیں، میرا تو سارا کیپر (دماغ) ہی گھوم گیا ہے۔''

''چاچو! ابھی آپ نے موت کا کنواں نہیں دیکھا، چلیں وہ بھی دیکھتے ہیں۔''

شام تک ہم دونوں نے میلے کے خوب مزے لوٹے اور باتھ روم کے لوٹے تک دیکھ کر واپس دربار کی طرف لوٹے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے گمشدہ ''تایا ابو'' کو بھی ڈھونڈنے کی کوشش بھی کرتے رہے۔

میں آپ کو بتانا بھول گیا کہ میرے اندر ایک خاص صلاحیت بھی ہے وہ ہے میری ''عقابی نظر'' یعنی میری نظر دوربین کی طرح ہے اور دور کی ہر چیز باقی لوگوں کی نسبت مجھے زیادہ قریب سے نظر آتی تھی پس چاچو نے میری ذمہ داری زیادہ لگائی تھی اور خود میلے کی رونق دیکھنے میں محو تھے۔

اچانک میری نظر ایک منظر پر پڑی اور میری جاسوسی والی حس بیدار ہوگئی، کیا دیکھتا ہوں کہ ایک مشکوک (مجھے مشکوک ہی لگا تھا) سا بندہ ایک عجیب سی حرکت کر رہا ہے ایک بندے سے گلے ملتے ہوئے مشکوک سا شخص دوسرے شخص کی پیٹھ پر کچھ چپکا کر ایک تیسرے شخص کو اشارہ کرتا ہے جس شخص کی پیٹھ پر گلے ملتے ہوئے کچھ چپکایا گیا تھا اس شخص کی پیٹھ میری طرف تھی جبکہ مشکوک نظر آنے والے کا چہرہ...... میں اتنی دور سے یہ منظر صاف دیکھ رہا تھا۔

چاچو فروٹ چاٹ کھانے میں مشغول تھے کہ میں نے ان سے کہا آپ رکیئے میں آتا ہوں اور میں ٹہلتے ٹہلتے اس شخص کے پاس پہنچا جس کی پیٹھ پر کاغذ کا ٹکڑا چپکا تھا میں

نے اچانک ہی اس شخص کو دھکا دیا انداز ایسا تھا کہ جیسے قدرتی طور پر گرا ہوں' وہ شخص میرے ساتھ ہی گرا اور میں اُٹھ کر "بھرا معاف کرنا" (بھائی معاف کرنا) کہہ کر ہاتھ جھاڑنے لگا۔ میں نے وہ کاغذ کا ٹکڑا انگلیوں کے درمیان ایسے رکھا ہوا تھا کہ کسی دوسرے کو نظر نہ آئے' میں وہاں سے رفو چکر ہو کر واپس چاچو کے پاس آ گیا۔

اب مجھے تلاش تھی اس بندے کے پتر کی جس نے یہ ٹکڑا چپکایا تھا۔ وہ بندہ کام کر کے میلے کی بھیڑ میں گم ہو چکا تھا۔ میں اُس شخص سے بھی چھپ رہا تھا جس نے یہ وصول کرنا تھا' ممکن ہے اس نے میری حرکت دیکھی ہو۔

میں چاچو کو اپنے ساتھ کھینچ کر فٹافٹ ایک باربر شاپ میں گھس گیا اور اپنی جیب سے عینک نکال کر پہن لی ساتھ ہی سر سے ٹوپی اتار کر بالوں کو کانوں پر پھیلا دیا چاچو کو لے کر واپس باہر آیا چاچو میرے ساتھ یوں ہکا بکا چلے آ رہے تھے جیسے پہلی بال پر آوٹ ہونے والا بیٹسمین۔

"چاچو! ایک منٹ رکیے میں آپ کو بتاتا ہوں ساری بات۔" میں نے چاچو کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اپنی بات شروع کر دی۔ چاچو کو ایک دو منٹ میں مختصراً میں نے بات سمجھائی اور پھر وہ کاغذ کا ٹکڑا کھول کر پڑھنے لگا۔

"دو کلو پیاز...... چار پیکٹ چائے کے...... ٹماٹر آدھا کلو...... ایک پیکٹ نمک...... دھنیا اور سبز مرچ۔"

میں اپنی جاسوسی کے "ڈراپ سین" پر افسوس کر رہا تھا کہ کاغذ اُلٹانے کا خیال آیا پھر میرا سانس واپس آیا اور اصل بات سمجھ آئی کہ میں کاغذ کی دوسری طرف سامان کی فہرست پڑھ رہا تھا۔

انگریزی میں لکھی ہوئی وہ تحریر مختصر ہی تھی' یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں میٹرک میں تھا' اوسط درجے کا طالب علم ہونے کی وجہ سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی پڑھ اور سمجھ لیتا ہوں حالانکہ میری انگریزی کی حالت ملک کی ایک "اداکارہ" جیسی ہی ہے...... انگریزی میں لکھی ہوئی اس تحریر کا مفہوم یا مطلب یہ تھا کہ "کل رات آٹھ بجے اپنا کام کر دینا اور اس صفحے کو پڑھ کر جلا دینا ورنہ ذمہ دار اور جواب دہ خود ہو گے۔" نیچے دستخط یا نام کی جگہ سانپ کی تصویر پینسل سے بنائی گئی تھی۔

چونکہ یہ مغرب سے کم و بیش ایک گھنٹہ بعد کا وقت تھا اور رش بھی خوب تھا اس لیے میں اُس مشکوک شخص کو ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کر کے وقت کا ضیاع نہیں چاہتا تھا اس لیے چاچو کے ساتھ دربار پر لنگر کھانے پہنچ گیا۔ ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید وہ شخص وہاں پر موجود ہو مگر

"یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا"

چاچو دبی زبان اور لب و لہجے میں مجھے یاد کرواتے رہے کہ ہم یہاں کسی اور "سبب" بھی آئے تھے مگر میں ان کی بات ایک کان سے ڈال کر دوسرے سے نکال رہا تھا۔

رات جیسے تیسے کاٹ لی صبح پھر سے میری جاسوسانہ حس بیدار ہو گئی یا یہ کہنا چاہیے کہ جاسوسانہ رگ پھڑکی پر سمجھنے کے لیے ابھی بہت کچھ تھا خیر ہم ساتھ ساتھ بیدار ہوئے اور ناشتہ کرنے لگے تو چاچو کہنے لگے "چھوٹے میاں میرا تو دل کرتا ہے کہ پکا پکا ہی یہیں شفٹ ہو جاؤں...... مفت کھانا' مفت رہائش اور سیر بھی الگ کم از کم تمھاری ہٹلر چاچی سے تو جان چھوٹے گی' پھر اپنی "رانو...... کا خیال آتا ہے تو یہ پہلا خیال رد کرنا پڑتا ہے۔" میں مسکرانے لگا چونکہ "رانو" چاچو کی بھینس کا نام تھا اور محاورتاً جان چھوٹنے کی بات الگ ورنہ چاچو کو سب چیزوں سے زیادہ پیار اپنی رانو سے تھا۔

"موٹے چاچو...... ذرا دریا کی سیر کو چلتے ہیں صبح ہی صبح بڑا مزہ آئے گا۔" میں نے کہا تو چاچو میرے ساتھ دریا کی طرف چل پڑے۔

دریا کے کنارے پر خاکروب اور صفائی کرنے والے بھنگیوں کی ایک خیمہ بستی بھی تھی جنھیں چوڑا بھی کہا جاتا ہے اور ان میں سے اکثریت عیسائی مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے...... پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ کوئی بستی تو ایسی ہے جس پر میں اپنی۔ "خوبصورتی" کے باعث اکڑ کر چل سکتا ہوں' ورنہ گاؤں میں تو اکثر لوگ میرے سانولے رنگ کی وجہ سے مجھے دبی دبی زبان میں کالا لونڑ (کالا نمک) کہتے تھے۔ دریا کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھا کر ہم لوگ واپس آ رہے تھے کہ لڑکوں کی ایک ٹولی ہمارے گزرنے کے بعد ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہونے لگی' میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ ہماری طرف اشارہ کر کے ہنس رہے تھے' ہم چپ چاپ اپنی راہ ہو لیے کہ کیا پتہ ہم نئے ہیں اس شہر میں اس لیے سب دیکھ کر ہنس رہے ہیں ہمیں...... مگر میلے

والی جگہ پہنچنے پر پتہ چلا کہ ہر وہ بندہ ہم پر ہنس رہا ہے‘ جس کے پاس سے ہم گزریں...... میں اور چاچو حیران و پریشان کہ الٰہی! ماجرا کیا ہے؟ جب کئی بار ایسا ہوا تو ہم لوگ تھک ہار کر ایک جگہ بیٹھ گئے مگر پھر ہماری عقبی طرف سے قہقے گونجے تو میرا خون کھول اٹھا پر کرتا بھی تو کیا؟ میں نے رونی شکل بنا کر ایک صاحب سے پوچھا۔

’’بھائی! یہ ہمارے سر پر سینگ نکل آئے ہیں کیا؟ جو ہر کوئی ہمیں دیکھ کر ہنس رہا ہے۔‘‘ اس شخص نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔

’’بیٹا! لگتا ہے اس شہر میں نئے ہو اور پہلی بار آئے ہو اسی لیے بے وقوف بن گئے ہو ذرا اپنی پیٹھ پر اور اِن بڑے میاں کی پیٹھ پر یہ ’اسٹیکر‘ دیکھو۔‘‘ جب میں نے چاچو کی پیٹھ پر اسٹیکر دیکھا تو ساری بات سمجھ آ گئی...... اور چاچو نے کہہ کر اپنی پیٹھ پر سے بھی اسٹیکر اکھڑوا لیا حیرت کی بات تھی کہ چاچو والے اسٹیکر پر لکھا تھا۔

’’میں گدھا ہوں‘ اور میرے والے پر میں ٹٹو ہوں......‘‘ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا کہ کیا حرکتیں اور شرارتیں ہیں اِن لوگوں کی کسی نے گزرتے ہوئے یا رات سوتے ہوئے ہماری پیٹھ پر یہ لگا دیا تھا اور اس کے بعد جہاں بھی ہم جاتے پیچھے لکھا نظر آتا ’’میں گدھا ہوں‘‘ یا ’’میں ٹٹو ہوں......‘‘ اللہ بچائے ان شہر والوں کے شر سے چاچو نے ساری بات سمجھنے کے بعد دعا کی۔

......☆☆......

میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا اور میری قیادت میں چاچو بھی دیدے پھاڑ پھاڑ کر اس شخص کو ڈھونڈ رہے تھے‘ جس نے کاغذ چپکایا تھا میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اس پاگل کے بچے کو یہ کیا سوجھی کہ ایسے مشکوک انداز میں یہ سب کرے‘ خود جا کر یہ ٹکڑا اس دوسرے بندے تک پہنچا آتا یا پیغام زبانی دے آتا۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہی شخص مختلف حلیے میں مجھے پھر نظر آ گیا...... اس پاگل کو یہ نہیں پتہ تھا کہ چھوٹے خان کی آنکھ میں کیمرہ فِٹ ہے جسے ایک بار دیکھ لیا وہ سات پردوں میں بھی چھپ جائے پھر بھی پہچانا جائے گا‘ مجھے اس کی طرف سے بالکل فکر نہیں تھی کیونکہ اس نے تو مجھے دیکھا ہی نہیں تھا گزشتہ دن اس کے ساتھ جو شخصیت تھی اسے دیکھ کر میں اپنی جگہ سے ایسے اچھلا جیسے گرم توے پر مکئی کا دانا اچھلتا ہے‘ میرے ساتھ ساتھ چاچو بھی اس کے ساتھ موجود ’’شخصیت‘‘ کو دیکھ کر حیرانی سے منہ کھولے آنے والی مکھیوں کو ویلکم کرنے لگے...... اس شخص کے ساتھ ہمارے گاؤں کی چھیل چھبیلی ’’سارہ‘‘ تھی جو کہ اکثر ٹی وی چینل پر نظر آتی تھی...... ہمارا واحد لوکل چینل اسی کی وجہ سے اکثر انڈین چینل کے نظارے پیش کرتا تھا‘ بہرحال ’’سارہ‘‘ کو دیکھ کر میرے ساتھ ساتھ چاچو بھی حیران تھے‘ جب تک ہم لوگ اُن دو تک پہنچتے وہ لوگ میلے میں گم ہو چکے تھے دوپہر کا وقت تھا اور موسم معتدل تھا‘ ہم لوگ میلے کی رنگینیوں کو بھول گئے تھے‘ چاچو بے دلی سے میرا ساتھ دے رہے تھے اور کئی بار کہہ چکے تھے کہ ہم یہاں جاسوسی کرنے نہیں آئے ہوئے ہیں......مگر میں نے چاچو کو سمجھایا کہ مجھے بہت گڑبڑ لگ رہی ہے۔

میں نے چاچو کو ساتھ لیا اور انھیں لے کر ایک قریبی پرانی دکان کی طرف بڑھ گیا‘ دکان میں گھس کر ایک فارغ بیٹھے بندے سے گپ شپ کرنے لگا میں نے باتوں ہی باتوں میں اس سے کہا کہ ہم ’’اٹھمقام‘‘ گاؤں سے میلہ دیکھنے آئے ہوئے ہیں‘ اور A J K T V پر کام کرنے والی لڑکی سارہ کے رشتہ دار ہیں‘ وہ شخص یہ سن کر بہت خوش ہوا‘ لگتا تھا کہ وہ سارہ کا پرستار ہے...... میں نے پریشانی کے عالم میں اس کے گوش گزار اپنی روداد کی کہ ’’دراصل ہم نے انھیں بھی ملنا تھا پر اُن کا پتہ ہم سے کہیں کھو گیا ہے کیا کوئی ایسا شخص مل سکتا ہے جو سارہ جی کی رہائش گاہ کا پتہ دے سکے؟‘‘

اس شخص نے ہمیں ایک اور دوکاندار کا بتایا کہ وہ دوکاندار خود بھی کبھی کبھی چینل پر نعت پڑھتا ہے اسے لازمی پتہ ہوگا‘ اس کی ایک اور وجہ بھی ہمیں اِس دکاندار نے بتائی کہ وہ نعت پڑھنے والا اکثر سودا سلف لے کر سارہ کے ساتھ گھر تک جاتا ہے‘ ہم تھوڑی دیر اور گپ شپ کرتے رہے اور پھر اٹھ کر دوسری مطلوبہ دوکان تک آ گئے‘ ہماری حالت اور بولی چونکہ ہمارے علاقے ہی کی چغلی کھاتی تھی اس لیے کسی کو ہم پر شک نہیں ہوا کہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں۔

یہاں لوگ کم ہی کسی پر شک کرتے ہیں‘ اپنے کام سے

کام رکھتے ہیں' ہاں اگر کوئی زیادہ مشکوک نظر آئے تب بات اور ہے...... قصہ مختصر ہم لوگوں نے بڑی آسانی سے سارہ کے گھر کا پتہ معلوم کرلیا' اب سارہ اتنی بڑی اداکارہ تو تھی نہیں کہ اپنا گھر لے کر رہتی' بس ایک بوڑھی عورت کے ساتھ رہتی تھی' بقول دکاندار کے سارہ اس عورت کے اخراجات اٹھاتی تھی جس کے عوض اسے نہایت معقول رہائش میسر تھی۔

میں اور چاچو واپس لوٹے تو میں نے چاچو کو بات سمجھائی کہ ''سارہ کا گھر چونکہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے بس یہ سامنے والا پل کراس کرنا ہے اور اُس پار دائیں طرف راستے میں سارہ کا گھر پڑے گا ہم دونوں فی الحال وہاں جا رہے ہیں۔'' راستے میں میں نے چاچو کو مزید باتیں سمجھائیں کہ وہ واپس آ کر سارہ اور اس کے ساتھ والے آدمی پر نظر رکھیں گے اور میں سارہ کے گھر کے پاس جھاڑیوں میں ان کا انتظار کروں گا جوں ہی کوئی کام کی بات پتہ چلے وہ مجھے اسی جگہ آ کر اطلاع دیں گے' میں نے چاچو کو سارہ کی رہائش کے بائیں جانب وہ جھاڑیاں دکھا دیں۔

قارئین! میری آٹھویں یا نویں حس کہہ رہی تھی کہ جو کچھ بھی ہے اس کا سارہ کی اس رہائش گاہ سے تعلق ہوگا...... میں فی الحال روشنی میں بھی ستانے اور کبھی گزرنے کے بہانے مین گیٹ کی نگرانی کرنے لگا' چاچو کو میں نے واپس بھیج دیا تھا' اب یہ اُن کی قسمت تھی کہ وہ دونوں یا ان میں سے ایک بندہ چاچو کی نظر میں آجاتا' یوں ہی پھرتے پھرتے میری نگرانی جاری تھی' شام کا وقت ہوگیا تھا کئی بار میرا دل چاہا کہ سارہ کے گھر کی دیوار پھلانگ کر اندر پہنچ کر چیک کروں کہ اندر کیا ہو رہا ہے...... پر پھر خود ہی اپنے خیال کی تردید کر دیتا کہ میں کونسا فلمی ہیرو ہوں جو دیوار کے اس پار جاتے ہی بندوق لے کر گولیوں کی بارش شروع کر دوں گا اور دشمن کے ہر راز سے پردہ اٹھا کر واپس سرخرو ہو کر آؤں گا...... میں آخری چانس کے طور پر نگرانی کر رہا تھا اور رات سات یا ساڑھے سات تک واپس جانا تھا تاکہ میلے میں جا کر چیک کر سکوں کہ آج رات آٹھ بجے کیا ہونے والا ہے اور ممکن تھا کہ میں کسی سیکیورٹی والے کو بھی بتا دیتا کہ کچھ گڑبڑ ہے...... میں متضاد سوچوں میں گم تھا کہ کیا کروں کیا نہ کروں؟

سات بجے جب واپس میلے میں جانے کا سوچ ہی رہا تھا تب چاچو ہاتھ میں سیاہ شاپر اٹھائے کسی اجنبی شخص کے ساتھ آتے نظر آئے' پہلے تو دل میں خیال آیا کہ بھاگ جاؤں...... کیا پتہ وہ شخص چاچو کو زبردستی ساتھ لایا ہو اور میرا پتہ بتانے کا کہا ہو اور چاچو میری طرف آ رہے ہوں' پھر چاچو کا خیال آیا کہ اگر انھیں کچھ ہوگیا تو میں ''ہٹلر چاچی'' کو کیا منہ دکھاؤں گا' حالانکہ میرا اکلوتا منہ پہلے ہی کسی کو دکھانے لائق نہیں تھا' چاچو نے مجھے دیکھ لیا تھا اور مجھے دیکھ کر مسکرائے تو مجھے کچھ اطمینان اور تسلی ہوئی' پاس آ کر انھوں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے شاپر سے برگر اور پکوڑوں کا ایک چھوٹا لفافہ مجھے نکال کر دیا اور اُن صاحب کو سارہ کی رہائش کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ ''یہ گھر ہے جناب اور وہ اسی گھر میں گیا ہے۔

میں چاچو اور اُس آدمی کا منہ دیکھنے لگا کہ یہ کیا معاملہ چل نکلا ہے' میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی چاچو اپنی ہلتی توند کو سنبھالتے ہوئے اور سانس درست کرتے ہوئے کہنا شروع ہوئے۔ ''چھوٹے میاں...... یہ انسپکٹر صاحب ہیں وہاں میلے کی سیکورٹی پر مامور تھے' میں نے انھیں بھی ساتھ ملا لیا ہے' اب یہ بھی سادہ لباس میں ہمارے ساتھ رہیں گے' ان کو باتیں بتانے کی وجہ یہ ہے کہ۔''

یہ کہہ کر چاچو سانس لینے کو رکے اور پھر دوبارہ سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولے۔ ''جونہی مجھے وہ بندہ نظر آیا جو سارہ کے ساتھ تھا تو میں اس کے تعاقب میں لگ گیا۔

وہ اور اس کے ساتھ ایک اور بندہ بھی ''بیت الخلاء'' کی طرف گئے میرے گھسنے سے پہلے ہی وہ دونوں ایک ایک کر کے بیت الخلا (ٹوائلٹ) میں چلے گئے اب میں بھی دبے قدموں ان کے پیچھے پیچھے تیسرے اور ایک طرف سے ایک کے ساتھ والے بیت الخلا میں گھس گیا' اور دروازہ بند کیے بغیر ہی دروازے کے پیچھے چھپ گیا' تاکہ انھیں پتہ نہ چلے کہ کوئی اور بھی ان کے ساتھ والی بیت الخلا میں گھسا ہوا ہے۔

دونوں نے سرگوشیوں میں گفتگو شروع کی تھوڑی تھوڑی آوازیں مجھے بھی سنائی دینے لگیں' اُن میں سے چند جملے یہ تھے...... ''گوی (لڑکی) کے پاس سے

جا کر پیکٹ تم نے لانا ہے اور 'بے' تک پہنچانا ہے' بے تمہیں اُسی جگہ پر ملے گا جہاں ہر بار ہمارا مال پہنچتا ہے......اور گونگے تک ہمارا پیغام نہیں پہنچ سکا اس لیے اب اُس پر کوئی ذمہ داری نہیں رہی ہے' ابھی جاؤ اور جا کر مال وصول کرو۔''

میں اُن کے نکلنے سے پہلے ہی دبے پاؤں نکل آیا اور باہر آ کر سوچنے لگا کہ کیا کرنا چاہیے' وقت کم تھا اور فیصلہ جلدی کرنا تھا اوپر سے مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی...... تمہیں پتہ ہے بھوک اور یہ (چاچو نے چھوٹی انگلی کھڑی کر کے اشارہ کیا) مجھ سے برداشت نہیں ہوتے۔

چاچو ایک بار پھر سانس لینے کے لیے یا درست کرنے کے لیے رکے اور پھر سلسلہ کلام دوبارہ جوڑتے ہوئے کہنے لگے۔ میں نے باہر آ کر اِن انسپکٹر صاحب کو دیکھا ان سے جلدی جلدی آ کر سب کچھ اِن کے گوش گزار کر دیا۔ اتنے میں اُن دو میں سے ایک شخص باہر نکل کر آیا تو میں نے انسپکٹر صاحب سے کہا کہ وہ اس کا پیچھا کریں یہ کہیں کچھ لینے جا رہا ہے' انسپکٹر صاحب نے پہلے غور سے مجھے دیکھا پھر میرے اصرار کرنے پر بولے۔

''ایک منٹ رکو! میں کپڑے تبدیل کر کے آتا ہوں۔'' انسپکٹر صاحب ایک دو منٹ میں ساتھ والی دوکان سے کپڑے تبدیل کر کے واپس آئے تو اتنی دیر سے میں نے بھی ایک قریبی دوکان سے تمہارے لیے یہ سب کھانے پینے کا سامان خرید لیا ابھی اور پکوڑے بھی ہیں اس میں پہلے یہ ختم کر لو۔

''چاچو آگے بتائیں پھر کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا تو وہ دوبارہ پٹڑی پر واپس آئے اور کہنے لگے۔

''ہونا کیا تھا یہ کپڑے تبدیل کر کے واپس آئے تو ابھی وہ شخص نظروں سے اوجھل نہیں ہوا تھا' وہ ٹہلنے کے انداز میں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ابھی پل تک ہی پہنچا تھا کہ ہم نے اس کا پیچھا کرنا شروع کر دیا......اس کا تعاقب کرتے ہوئے ہم یہاں پہنچے تو وہ یہاں آ کر اس مکان کی طرف دیکھنے لگا پھر موقع پا کر وہ یہاں سے عقبی طرف والی دیوار سے اندر کود گیا' میں انسپکٹر صاحب کو لے کر اس طرف آ گیا ہوں......اب تمہارے ساتھ مل کر ہم دونوں طرف نگاہ رکھیں گے'' چاچو نے اتنا کہہ کر بات ختم کی تو میں انسپکٹر صاحب کی طرف دیکھنے لگا جو کہ سادہ لباس میں تھے۔ انسپکٹر صاحب چاچو سے مخاطب ہو کر بولے۔

''بڑے میاں! کیا آپ کے پاس شناختی کارڈ ہے اپنا؟'' چاچو نے اثبات میں اپنا سر ہلایا اور اپنی جیب سے شناختی کارڈ نکال کر اُن کے حوالے کیا' انسپکٹر صاحب نے شناختی کارڈ اپنی جیب میں رکھ لیا اور ہم دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''تم دونوں یہیں سامنے والے گیٹ کی نگرانی کرو' میں پچھلی طرف جا رہا ہوں اور اگر کسی قسم کی گڑ بڑ دیکھو تو ایک چیخ مار دینا میں فوراً پہنچ آؤں گا۔''

انہوں نے اپنی جیب سے پستول نکال لیا اور چوکنے ہو کر آہستہ آہستہ مکان کی عقبی طرف بڑھے' میں اور چاچو جھاڑیوں میں چھپ کر گیٹ کی طرف دیکھنے لگے...... باتوں کی سنسنی خیزی میں مجھے ہاتھ میں پکڑے برگر اور پکوڑوں کے کھانے کا یاد ہی نہیں رہا' میں فرصت ملتے ہی برگر سے دو دو ہاتھ کرنے لگا تو چاچو نے مجھ سے برگر کا کچھ حصہ مانگا تو میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا اور پھر آنکھوں سے اُن کے ہاتھ میں پکڑے شاپر کی طرف اشارہ کیا کہ آپ کا سب کچھ تو اِس شاپر میں ہے۔

انہوں نے میرے کان میں سرگوشی کی کہ شاپر سے نکال کر بعد میں دونوں کھائیں گے ابھی آدھا مجھے دو اور پھر میرے ہاتھ سے پکوڑے بھی لے کر یوں اپنے معدے میں ٹھونسنے لگے جیسے پنج سالہ دور میں حکومتی وزرا جنھیں پتہ ہوتا ہے کہ اب اگلی بار نہ وزارت ہوگی نہ حکومت اور نہ ہی یہ عیش وعشرت۔

چاچو کی اکثر باتوں کی سمجھ نہیں آتی مجھے' خیر مجھے کیا...... کسی اور کو بھی سمجھ نہیں آتی مگر چاچو ہیں بہت اچھے......مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ ابو کے مرنے کے بعد آج تک کبھی کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دی مجھے' میری امی تو ابو سے بھی پہلے گزر گئی تھیں۔

یہ باتیں اس وقت میرے ذہن میں آ رہی تھیں حالانکہ یہ لمحات بڑے نازک تھے اور خطرناک بھی' حالانکہ اس خطرے میں چاچو کو ڈالنے والا ابھی میں خود ہی تھا اِنہوں نے ہمیشہ میری ہر بات بلا چوں چرا ان مانی ہے' جیسا کہ تایا ابو کو میلے میں ڈھونڈنے والی بات' حالانکہ اِنہیں بھی پتہ

ہے کہ ایسا ممکن نہیں پھر بھی میرا دل رکھنے کی خاطر جھوٹ موٹ کی تفریح کے لیے ہی سہی میرا ساتھ دے رہے تھے اور اس کھیل میں بھی میرا ساتھ دے رہے تھے اور ہم اس شام (اندھیرا پھیل رہا تھا) جو کہ رات میں بدل رہی تھی...... میں بے یار و مددگار کھیتوں کے قریب گوبر اور ایسی ہی ''قیمتی'' چیزوں کی ''بھینی بھینی'' خوشبو سے لطف اندوز ہو رہے تھے' جبکہ چاچو صرف میری وجہ سے اس پر تعیش کھیت کے کنارے پڑے ہوئے تھے اور ابھی تک ماتھے پر بل نہیں پڑے تھے ان کے'' کہ کن پنگوں میں ڈالا ہوا ہے چھوٹے''

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کے مکان کے سامنے والے گیٹ سے ایک شخص برآمد ہوا' اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا' میں نے چاچو سے اشارے سے پوچھا کہ یہی ہے وہ تو چاچو نے سر ہلا کر جواب اثبات میں دیا اور اشارے سے بتایا کہ یہیں اس کو گھیرنا ہے اس لیے...... وہ شخص چلتے ہوئے آگے آیا تو ہم بھی جلیبی نما راستے پر پیچھے کو ہٹنے لگے ہم چھپتے چھپاتے اُس کی گزرگاہ کی طرف بڑھنے لگے' جونہی وہ شخص ہمارے قریب پہنچا تو میں نے چپکے سے اس کے راستے میں اپنی ترڑے (گھاس کے تڑے) جیسی ٹانگ رکھ دی اِس اچانک افتاد سے وہ اپنے ہی زور میں دھڑام سے گرا اور تھیلا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

وہ اوئی ماں کہہ کر مٹی میں لوٹ پوٹ ہونے لگا۔

میں نے اس کے سر پر اپنا پاؤں رکھا اور گونجدار آواز میں بولا ''خبردار ہلنے کی کوشش مت کرنا ورنہ کھوپڑی میں سوراخ ہو جائے گا۔'' وہ بالکل ساکت ہو گیا' چاچو نے اُس کا تھیلا اٹھا لایا اور ساتھ ہی انسپکٹر صاحب کو بھی سگنل دے دیا تھا' ایک منٹ کے اندر اندر وہ ہمارے پاس پہنچ گئے اور اسے قابو کر لیا' چاچو نے اُس کا تھیلا اُسے واپس کر دیا میں حیرانی سے چاچو کی طرف دیکھنے لگا کہ یہ کیا کیا چاچو نے کم از کم دیکھتے تو سہی اس میں کیا تھا' پر چاچو کو اللہ ہی سمجھے انسپکٹر صاحب نے اس کو کھڑا کیا اور پستول اس پر تانے رکھا اور ساتھ ہی بولے۔

''اوہ اچھا! تو جناب آپ ہیں یہاں؟ خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' میں نے دیکھا اُس شخص کے چہرے پر تھوڑا سکون پھیل گیا جیسے کسی شناسا سے مصیبت میں ملاقات ہو گئی ہو۔

''ویسے کیا ہے اس تھیلے میں؟'' انسپکٹر صاحب نے معنی خیز انداز میں پوچھا تو اس شخص نے اور مضبوطی سے تھیلے کو اپنے سینے سے لگا لیا اور بولا۔

''انسپکٹر صاحب آپ نے پوری پوری قیمت لی ہوئی ہے اِس لیے ہمیں کرنے دیں ہمارا کام۔'' انسپکٹر صاحب گہری مسکراہٹ چہرے پر پھیلا کر بولے۔

''بیٹا وہ پہلی بار کا حساب کتاب تھا یہ تو معاملہ ہی الگ ہے اس بار تو۔''

اتنے میں اُنہیں احساس ہوا کہ ہم دو بھی ان کے ساتھ ہی ہیں اور اُن کی خفیہ باتیں سُن رہے ہیں انہوں نے چاچو کو ''ہزار ہزار'' کے دو نوٹ جیب سے نکال کے دیے اور اُن کا شناختی کارڈ بھی واپس کرتے ہوئے سفاک لہجے میں بولے۔

''بڑے میاں! میری بات ذرا غور سے سن لیجیے...... یہاں جو کچھ بھی آپ نے سنا یا دیکھا اسے بالکل بھول جائیے اور یہ دو ہزار روپیہ آپ دونوں کا انعام ہے' اب مجرم جانے اور پولیس' اس جگہ کیا ہوا؟ اس تھیلے میں کیا ہے؟ کس نے کس کو کہاں سے پکڑا؟ کس کا کس سے کیا تعلق ہے؟ اِن باتوں کو ایسے بھول جائیے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں اور نہ کبھی آپ مجھ سے ملے یا مجھے دیکھا...... بصورت دیگر ابھی اِس پکٹ کے ساتھ آپ دونوں کو تھانے لے چلوں گا تو پھر چھٹی کے ساتھ ساتھ ساتویں اور آٹھویں کا دودھ بھی یاد آ جائے گا...... اس لیے ایک دو گھنٹے کے اندر اندر چپ چاپ اِس شہر سے دفعان ہو جاو اور اگلے ایک ماہ تک اِس شہر میں نظر آئے تو وہ حشر کروں گا کہ گھر والے پہچان بھی نہیں سکیں گے۔''

چاچو تھر تھر کانپ رہے تھے (یا کانپنے کی ایکٹنگ کر رہے تھے) اور میں بھی حیرت کا بُت بنا انسپکٹر صاحب کو دیکھ رہا تھا کہ یہ کیا ہوا؟ خیر چاچو نے لجاجت سے انسپکٹر صاحب کے سامنے تو یہ کی کہ وہ بالکل ایسا ہی کریں گے جیسے کہا گیا ہے' پھر ہم لوگ واپس چلنے لگے تو چاچو نے کہا کہ رکو! میں اپنا کھانے والا شاپر اٹھا لوں' قریب ہی پڑا وہ شاپر اٹھا کر میں اور چاچو پل کراس کر کے میلے والی طرف آنے لگے' اُنھوں نے پل کے اوپر سے وہ تھیلا غصے میں

آ کر دریا میں پھینک دیا اور غصے میں بڑبڑائے۔
''سارے حرام خور ہی ملتے ہیں کمینے جہان کے۔''
واپس میلے میں آ کر ہم لوگوں نے جلدی جلدی شاپنگ شروع کردی جن میں سے خواتین کی چیزیں زیادہ تھیں۔
میں جانتا تھا کہ وہ زبان سے ''ہٹلر چاچی'' کو سو برا کہیں پر اُن کے دل میں ہمیشہ چاچی (چچی) کے لیے محبت ہی رہی ہے بے شک یہ محبت ڈر کی گرد تلے چھپ گئی تھی مگر موجود تھی...... اسی لیے اُنہوں نے ڈھیر ساری چیزیں چاچی اور میرے لیے خریدی' ہم لوگوں نے ''مال مفت'' سے خوب جی بھر کے شاپنگ کی اور ایک اچھے سے ہوٹل میں تگڑا سا کھانا کھایا' تمام عیش کر کے بھی ابھی ہمارے پاس پندرہ سو کے قریب رقم بچی ہوئی تھی' چاچو نے گاؤں تک کے لیے کار بک کی بحث وتکرار کے بعد ''دو سو روپیہ'' کرایہ طے کر کے ہم لوگ اپنے گاؤں کے لیے روانہ ہو رہے تھے' چاچو نے چچا غالب کو یاد کیا۔
''بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے''
ہمیں اِسی رات گھر پہنچنا تھا اور ابھی تو بہت لمبی رات پڑی تھی راستے میں مزید کوئی بات نہ ہوئی ہم دونوں پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی' چاچو کا منہ ایسے پھولا ہوا تھا جیسے پھٹنے سے پہلے غبارہ' خیر اللہ کر کے گھر پہنچے تو چاچو نے درود شریف پڑھ کر دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے ہٹلر چاچی کی جناتی آواز گونجی۔
''کون ہے؟'' چاچو نے رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھا اور اِشارے سے کہا کہ میں بولوں' میں نے اونچی آواز میں کہا۔
''چاچی جان...... میں ہوں چھوٹے خان۔''
''اور وہ گینڈا کدھر ہے؟'' چاچی نے اندر ہی سے پوچھا اور ساتھ ہی دروازہ کھول دیا۔
چاچو نے خاموشی سے سامان اندر چھوڑا اور پھرتی سے بھاگ کر باتھ روم میں گھس گئے۔
میں نے بھی سلام دعا کے بعد موقع پا کر راہ فرار اختیار کی کہ کہیں وہ اِس وقت سوال وجواب کی نشست نہ شروع کردیں اور اُن کے سوال وجواب کا سلسلہ ''منکر نکیر'' جیسا نہ ہو' اس لیے آرام سے اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا' سفر کی تھکن اتنی تھی کہ فوراً ہی نیند آنے لگی' چونکہ فجر کی اذان کے ساتھ ہی اٹھنا تھا اس لیے سونا ضروری تھا نیند کی وادیوں میں جانے سے پہلے یہی سوچ ذہن پر سوار تھی کہ......
''یہ کیا تھا۔''
......☆☆......
صبح فجر پڑھ کر پھر سو گیا اور دھوپ نکلنے پر ہی اٹھا' باہر نکل کر اپنے گاؤں کی فضا میں سانس لی تو یوں محسوس ہوا کہ آج کئی دن بعد رکی ہوئی سانس چلی ہے' واقعی کسی نے سچ کہا ہے کہ ''اپنا جھونپڑا بھی غیر کے محل سے اچھا ہوتا ہے'' ناشتہ کر کے اور چھوٹے موٹے کام نبٹا کر نہر کی طرف چل پڑا یہ نہر ہمارے گھر کے قریب ہی تھی' میرا اور چاچو کا ملاقات اور گپ شپ کا مستقل ٹھکانہ بھی یہی تھا' یہاں بیٹھ کر میں اور چاچو بقراط وسقراط کو بھی مات دیتے تھے اور دنیا جہان کے فسادات اور فلسفے زیر بحث کرتے تھے...... میں نہر میں پتھر پھینک رہا تھا کہ چاچو آتے نظر آئے اُن کے ہاتھ میں پاپڑ اور نمکو کے پیکٹ تھے جو پاس آ کر انہوں نے مجھے دے دیے اور بولے۔
''لو چھوٹے میاں! ہمارے ایک اور کامیاب کیس کی خوشی میں......اور یہ لو تمھارا انعام بھی۔'' یہ کہہ کر چاچو نے اپنی جیب سے ایک ہزار کا نوٹ نکال کر ایسے مجھے دینا چاہا جیسے وہ آئی ایم ایف (I M F) کے سربراہ ہوں' میں نے ہاتھ آگے نہ بڑھایا بلکہ پاپڑ نکال کر کھانے لگا اور مسکراتے ہو بولا۔
''ویسے چاچو! آپ ہیں بڑے ایماندار پورا ففٹی پرسنٹ مجھے دے رہے ہیں...... خیر ابھی پاس ہی رکھیے جب مجھے لوڑ (ضرورت) پڑی میں آپ سے لے لوں گا۔ البتہ یہ بتائیں کہ ہیڈ کوارٹر کی کیا صورت حال ہے کہیں گوشمالی تو نہیں ہوئی آپ کی؟'' وہ بھی مسکرا دیے اور پیسے واپس رکھتے ہوئے گہری سانس لے کر بولے۔
''بس چھوٹے! نہ پوچھ یہ جو دولت ہے نا! یہ دولتی جیسی ہی ہے' جب پاس آتی ہے یا ہوتی ہے تو اگلے بندے کی مت مار دیتی ہے' دوست...... دشمن اور دشمن...... دوست بن جاتے ہیں' اب تمھاری ''ہٹلر چاچی'' کا موڈ بھی اچھا جا رہا مطلب مطلع ابر آلود ہونے کے بجائے صاف ہے فی الحال' اتنی چیزیں دیکھ کر حیران رہ گئی اور سارا

''ہٹلر پن'' بھول گئی اور آنکھوں میں آنسو لا کر پتہ نہیں کیا کیا بولتی رہی مجھے تو یاد بھی نہیں' بس اتنا ہی کافی ہے کہ ''جان بچی سو لاکھوں پائے'' اب تمھاری چاچی سے مار نہ کھانا بھی ایک آرٹ اور انعام ہوئے میرے لیے' بس راوی بلکہ چناب اور جہلم بھی اس وقت چین ہی چین لکھ رہے ہیں۔'' اب چاچو نے بھی نہر میں ایک پتھر پھینکا جس سے نہر کے پانی میں لہریں سی پیدا ہوگئیں۔

''پر چاچو! کیس تو حل ہوا مگر ادھورا ہی...... ہمیں جان بچا کر بھاگنا پڑا اور وہ رشوت خور پولیس والا تو لگتا ہے اُن ہی لوگوں کا ساتھی تھا یا سہولت کار قسم کی چیز اور ہمیں دو ہزار دے کر کئی گناہ زیادہ لے کر چھوڑ دیا ہوگا اس کو۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا تو اُن کی مسکراہٹ بہت گہری ہوگئی' وہ مسکراتے ہوئے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

''تو کیا سمجھتا ہے چھوٹے! میں نے یہ بال دھوپ میں سفید کیے ہوئے ہیں؟ ویسے ہی تو سی آئی ڈی (CID) نہیں بن گیا میں سب سمجھ گیا تھا میں۔''

''چاچو آپ سی آئی ڈی میں ہیں یعنی کہ خفیہ ایجنسی میں؟'' میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاچو کو دیکھتے ہوئے پوچھا' تو وہ ایک بار پھر مسکراہٹ چہرے پر سجا کر بولے۔

''نہ پتر! میں تو خود سی آئی ڈی ہوں بھلا میرا نام کیا ہے؟ اِمام دین یعنی چچا اِمام دین یا پھر (چاچو اِمام دین) سی سے چاچا آئی سے اِمام اور ڈی سے دین یعنی چاچا اِمام دین (C I D) اب تم خود ہی بتاؤ سی آئی ڈی کی نظر سے کچھ بھی چھپا رہ سکتا ہے کیا؟ میں تمھیں ساری بات سمجھاتا ہوں تاکہ تمھیں پتہ چلے کہ تیرا چاچا سی آئی ڈی کسی اصلی سی آئی ڈی سے کم نہیں ہے۔'' چاچو سانس درست کرنے کو رکے پھر دوبارہ شروع ہوئے۔

''پہلے پہل تو میں نے تمھاری باتوں پر زیادہ توجہ نہیں دی اور بے دلی سے تمھارا ساتھ دیتا رہا پھر جب بات تھوڑی واضح ہوئی تو میں نے بھی میدان میں اترنے کا فیصلہ کیا جب مجھے یہ علم ہوا کہ کسی جگہ سے کسی قسم کا پیکٹ وصول ہونا ہے تو...... میں نے جا کر پولیس والے کو اُس کا بتایا تو وہ بھی اُس بندے کو دیکھ کر چونک پڑا اور روکنے کی کوشش نہیں کی بلکہ میرے مشورے پر تعاقب ہی کرنے کی حامی بھری اور پھر جب وہ کپڑے تبدیل کرنے کے لیے اندر کسی دکان میں گھسا تو میں نے بھی پھرتی سے پکوڑے برگر اور کے ساتھ ساتھ ایک نمک کا پیکٹ بھی خرید لیا اور اپنے کالے تھیلے میں ڈال لیا' اب یہ اُس شخص کی بدقسمتی بھی تھی کہ وہ ٹہل ٹہل کر آرام آرام سے چل رہا تھا اور انسپکٹر صاحب کے آنے تک نظروں سے اوجھل نہیں ہوا تھا......
پھر وہاں پہنچ کر تمھارے کھانے کی چیزیں نکال کر تمھیں دی پر نمک کا پیکٹ شاپر ہی میں پڑا رہا اور پھر جب وہ شخص پیکٹ لے کر آیا تو ہمارے ٹانگ اڑانے سے اس کا تھیلا دور جا گرا تھا اور اٹھا کر میں نے اسے لا کر واپس دیا تھا' تمھیں یاد ہوگا؟ تب ہی میں نے پھرتی سے اپنے شاپر سے نمک کا پیکٹ نکال کر اُس کے تھیلے میں ڈال دیا اور اس ادلہ بدلی کے نتیجے میں اُس کی چیز میرے پاس اور میرا نمک کا پیکٹ اُس کے تھیلے میں منتقل ہو چکا تھا۔

اس کے بعد میں نے سگنل دے کر پولیس والے یا انسپکٹر جو بھی تھا کو بلایا اور اپنا شاپر وہیں نیچے چھوڑ دیا اور اُسکا تھیلا بڑے آرام سے اُس کے حوالے کر دیا' اگر وہ تھیلا اُسکے ہاتھ سے نہ گرتا تو میں اُس سے چھین کر ویسا ہی کرتا تھیلا دور گرنے سے میرا کام مزید آسان ہوگیا اور میں نے اپنا کام کر لیا...... تمھیں یاد ہی ہوگا کہ میں نے تمھارے ساتھ ہی برگر اور پکوڑے کھائے تھے اور اپنے حصے کے نکالنے کے لیے ہاتھ اندر نہیں ڈالا تھا' وہ اس لیے کہ شاپر میں تو صرف نمک کا پیکٹ ہی باقی بچا تھا اور کچھ نہیں تھا' پھر میں بڑے اعتماد سے پیکٹ اٹھا کر واپس آیا اور تمھارے پیچھے ہی چلتے ہوئے پیکٹ کو ذرا سا پھاڑ کر چکھا بھی تھا اور حسب توقع اس میں منشیات کی موجودگی کو محسوس کر لی اور واپس آ کر کھاپی کر مزے سے گھر پہنچ گئے۔''

''پر چاچو! وہ پیکٹ تو آپ نے شاید......'' میں نے کہنا چاہا تو چاچو نے ہنستے ہوئے میری بات کاٹی اور دوبارہ کہنے لگے۔

''ہاں وہ تو میں نے پُل کے اوپر سے نیچے دریا میں پھینک دیا تھا...... اور واپس آ کر ایک دو جملے کاغذ پر لکھ کر ایک ٹھیلے والے کو دے آیا تھا کہ جو سامنے انسپکٹر صاحب ڈیوٹی دے رہے تھے اُنھیں دے دیجئے گا...... اور اُس

کاغذ پر میں نے اِتنا ہی لکھا تھا کہ......آج دریا کا پانی خمار آلود ہوگا کیونکہ......اس کے بعد جملہ ادھورا چھوڑ کر نیچے لکھ دیا تھا (سپیشل فورس)۔

یہ کہہ کر چاچو قہقہے لگانے لگے' اب پہلے تو وہ شخص حیران ہوگا یا پھر جس تک وہ پیکٹ پہنچے گا وہ یا پھر سب سے آخری بندہ اور اگر بات واپس پولیس والے تک پہنچی تو اُسے میرے جملے کا مطلب سمجھ میں آئے گا کہ دریا کا پانی خمار آلود کیسے ہوگیا اور پھر وہ پتہ کرنے کی کوشش بھی نہیں کرے گا کہ پیکٹ کہاں گیا کیونکہ اسپیشل برانچ یا اسپیشل فورس کا نام ہی کافی ہے اور وہ خود اپنا آپ بچاتا پھر رہا ہوگا کہ کہیں وہ بھی لپیٹ میں نہ آجائے اور رشوت خوری اور منشیات فروشوں کا ساتھ دینے کے جرم میں وہ خود ہی نہ پھنس جائے خیر "چور کی داڑھی میں تنکا" کے مصداق وہ چپ ہی رہے گا البتہ مال اُس نے بھی خوب کمایا ہوگا اگر ہمیں دو ہزار دے دیے تھے تو خود اندازہ لگا لو اور بے چارے کو اندازہ بھی تو نہیں تھا کہ وہ "ٹلل بوائے اور فیٹ بوائے" کے ہتھے چڑھا ہے' تو یہ تھی ساری رام کہانی۔"

"پر چاچو! ایک بات تو ابھی بھی غور طلب ہے کہ اُس بندے نے اتنا مشکل طریقہ کیوں اپنایا؟ کہ کسی کی پیٹھ کے پیچھے کاغذ چپکا کر پیغام ارسال کرنا حالانکہ سیدھا سیدھا جاکر بول بھی سکتا تھا۔" میں نے پوچھا تو چاچو اپنی جووں کو جگاتے ہوئے بولے۔

"اصل بات کا تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے...... پر میرا اندازہ ہے کہ شاید ان لوگوں کا کوئی طریقہ کار ہی ایسا ہے' جس کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسا کیا گیا ہے یا پھر ایک وجہ اور بھی ہوسکتی ہے کہ میلے کی سیکورٹی کے پیش نظر خفیہ مائیک لگے ہوں اور ان کو پتہ ہو کہ ساری آوازیں ریکارڈ ہو رہی ہیں' اِس ڈر کی وجہ سے اُن لوگوں نے بولے بغیر ہی پیغام پہنچانے کا پروگرام بنایا ہو اور بعد میں بھی بیت الخلا میں جاکر چپکے سے سرگوشیاں کی ہوں...... بہرحال اُن کی قسمت ہی خراب تھی اور ہماری خوش قسمتی یا خوش نصیبی کہ بیٹھے بٹھائے "چپڑی اور دو دو" مل گئیں۔"

ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ ہمسائے کا بچہ تیز تیز چلتا ہوا ہمارے پاس آیا اور پھولی ہوئی سانس میں بولا۔

"موٹے چچا...... موٹے چچا......"

"ابے موٹا ہوسی تو ڑا پے" (موٹا ہوگا تیرا باپ) چاچو نے اُس کی بات کاٹ کر اسے جھاڑا کیونکہ انھیں لفظ موٹے سے اِتنی ہی چڑ تھی خیر میں نے چاچو کو چپ کروایا اور لڑکے سے اصل بات پوچھی تو وہ بولا' "وہ ہٹلر چاچی کہہ رہی ہیں کہ بازار سے جاکر دوالا کر دیں اُن کا بازو زخمی ہوگیا ہے۔"

"ہیں؟ بازو زخمی وہ کیسے؟" چاچو نے حیرت سے پوچھا تو لڑکے نے جو کچھ بتایا اُس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہٹلر چاچی اپنی "نازک" کلائی میں چوڑیاں پہن رہی تھی کہ وہ ٹوٹ گئیں اور اُنکا بازو زخمی ہوگیا۔" چاچو نے اپنا سر پکڑ لیا اور پھر بولے۔

"دیکھ لے چھوٹے! یہ تو چوڑیاں تھی...... تیری چاچی کے ہاتھ میں لوہے کی ہتھکڑی بھی پہنا دی جائے تو وہ بھی اُس کے سانس لیتے ہی ٹوٹ جائے گی...... چل بے اِمام دین کشمیری کاش کے ہم بھی اِمام دین گجراتی ہوتے اور اِس موقع پر کہتے......

لائے جو میلے سے چوڑیاں، سمجھ کر اُس کو گل کندہ
اب پڑ گئیں وہ ہمارے گلے میں، بند کے محبت کا پھندا

میری داد حاصل کرنے سے پہلے ہی چاچو نے واپسی کا سفر شروع کیا اور میں اُن کے لیے "دعائے خیر" کرنے نہر پر ہی رک گیا......

آپ لوگ بھی چاچو کی سلامتی کے لیے دعا کریں ورنہ یہ ہمارا آخری کیس ہوگا۔



# انصاف

عارف شیخ



ان دونوں نے نئی نئی پریکٹس شروع کی تھی اور وہ وکالت میں نام پیدا کرنے کے بعد اپنی زندگی کی شروعات کرنا چاہتے تھے انہوں نے ایک ایسا کیس چنا تھا جو فائلوں میں دب چکا تھا جب وہ اس کیس کی حقیقت تک پہنچے تو ان کی راہیں جدا ہو چکی تھیں۔

نادیہ خوشی سے سرشار گھر پہنچی تھی گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے بلند آواز میں پکار لگائی۔ ''میں آ گئی ہوں' امی' بابا' میں آ گئی ہوں۔'' وہ آگے بڑھی تو اپنی ماں سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

''دیکھ کر چلو۔'' ماں نے غصہ دکھایا۔ ''تمہیں بھی چوٹ لگے گی اور مجھے بھی گراؤ گی۔''

''آج چوٹ کی کوئی پروا نہیں' آج خوشی خوشی ہر تکلیف برداشت کر لوں گی۔'' اس کی سانس پھول رہی تھی۔

''لڑکی ذرا آرام سے رہ۔ بہت زیادہ خوشی نقصان دہ بھی ہو جاتی ہے۔'' وہ آگے بڑھ گئیں۔

نادیہ نے ماں کا بازو تھاما۔ ''آپ کہاں جا رہی ہیں' آج میرے ساتھ بیٹھئے' مجھے ڈگری ملی ہے' میں وکیل ہو گئی ہوں۔''

ماں بیٹی کی طرف گھومی۔ ''مجھے یہ وکیلوں والا کام قطعی پسند نہیں ہے۔'' وہ بولیں۔ ''اس کام میں سب برا ہوتا ہے' جھگڑے' پولیس' مقدمہ' کچھ اچھا نہیں ہوتا ہے۔''

''ایک وکیل کے ساتھ پوری عمر گزار دی ہے اب بھی یہ کام ناپسند ہے۔'' نادیہ بولی۔

''تمہارے ابا وکیل تھے جب میری ان سے شادی ہوئی۔'' وہ گہری سانس بھر کر بولیں۔ ''اس وقت مجھے نہیں معلوم تھا کہ وکیل کی زندگی کیسی ہوتی ہے' جب برتا تو معلوم ہوا کہ وکیل کی زندگی جرائم اور مجرموں کی داستانوں سے بھری ہوتی ہے' کوئی خیر کی بات نہیں ہوتی ہے۔''

''کیا امی آپ بھی کس زمانے میں رہ رہی ہیں۔ بیٹی وکیل ہو گئی ہے اور آپ خوش نہیں ہیں۔'' نادیہ نے ماں کے گلے میں بازو ڈال دیئے تھے۔ ''بیٹی پڑھے لکھے آپ کو پسند نہیں ہیں۔''

''میں پرانے خیالات کی نہیں ہوں۔'' ماں نے اس کے گالوں کو تھپتھپایا اور اس کے بازوؤں سے اپنی گردن آزاد کروائی۔ ''بیٹی اعلیٰ تعلیم حاصل کرے کون سی ماں خوش نہیں ہو گی لیکن یہ وکیل والی ڈگری چھوڑ کر کوئی بھی ڈگری لے لیتیں مجھے بے حد خوشی ہوتی۔ ڈاکٹر بن جاتیں۔''

''لیکن مجھے وکیل بننا تھا۔ میں ڈاکٹر کیونکر بنتی۔'' وہ ہنس کر بولی۔

''اچھا اب شادی کے لیے سنجیدہ ہو جانا۔'' ماں نے کہا۔

''مطلب کے موضوع پر آ گئی ہو۔'' وہ بولی۔

''لڑکی اب تک تمہاری شادی ہو جانی چاہیے تھی۔'' ماں نے غصے سے کہا۔ ''پورے چوبیس برس کی ہو رہی ہو۔''

''ابھی تین ماہ باقی ہیں۔''

''میں اب کچن دیکھوں۔'' نادیہ کی امی جو مسز ثمینہ مسعود خان تھیں اور ان کے شوہر ایڈووکیٹ مسعود خان اعلیٰ عدالت کے وکیل رہے تھے۔

نادیہ کو تھوڑی دیر میں معلوم ہو گیا تھا کہ اس کے والد اس وقت کہاں ہوں گے' لہٰذا وہ اپنے مکان کے اوپری حصے کی طرف بڑھ گئی۔

وہ بیڈروم میں داخل ہوئی تو اپنے والد کو بیڈ پر بیٹھے اخبار پڑھتے دیکھا۔ وہ دوڑ کر باپ کے گلے لگ گئی۔ اس



کی آنکھوں کی نمی بہہ کر رخساروں پر آ گئی تھی۔

''ڈگری مل گئی ہے۔'' باپ نے بیٹی کی پشت پر شاباشی دی۔

وہ اپنے بابا سے الگ ہوئی۔ ''میں وکیل ہو گئی ہوں۔'' اس نے اپنے خوشی سے باہر آنے والے آنسو صاف کیے۔

''مجھے فخر ہے اور بے حد خوشی کہ تم نے میرے کام کو اپنایا اور اسے آگے بڑھاؤ گی۔'' مسعود خان اپنی بھاری بھرکم آواز میں بول رہے تھے۔ ''اب آگے کیا ارادہ ہے؟''

''میں کسی بڑے وکیل کے ساتھ پہلے تو کام شروع کروں گی۔'' وہ بولی۔ ''دو سال کے بعد میں اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن جانا چاہتی ہوں۔''

''بیرسٹر بنو گی۔''

اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔

''اپنی امی کو بتایا ہے۔'' مسعود خان نے مسکرا کر پوچھا۔

''زوردار ڈانٹ پڑے گی۔'' وہ ہنس دی۔

''میں تو اب تمہاری مدد نہیں کر سکتا ہوں۔'' مسعود خان کی آواز میں مایوسی تھی۔ ''دو برسوں نے مجھے بالکل ختم کر دیا ہے۔''

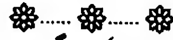
''آپ ایسا کیوں بولتے ہیں؟'' وہ محبت سے بولی۔ ''آپ گھر پر ہی رہ کر مدد کریں میرے لیے یہی کافی ہے۔''

''تم نے ادھر وکالت کے لیے کالج میں داخلہ لیا ادھر مجھے ہارٹ اٹیک آیا اور پھر فالج بھی حملہ آور ہوا۔'' مسعود خان نے بتایا۔ ''ڈاکٹر کہتے ہیں بس گھر پر اور بستر پر رہنا ہے ورنہ دوبارہ دل کا دورہ پڑ سکتا ہے اور فالج کی وجہ سے سیدھا ہاتھ بھی ناکارہ ہو چکا ہے۔''

''آپ حوصلہ بڑھاتے رہیں میں ایک دن بیرسٹر بن کر دکھاؤں گی۔'' وہ جوش سے بولی۔

''میں سو فیصد تمہارے ساتھ ہوں۔'' مسعود خان نے

کہا۔
''امی کو ابھی مت بتایئے گا کہ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن جانا چاہتی ہوں۔'' وہ بولی۔
''تمہاری امی تو اب صرف تمہاری شادی کی بات کریں گی۔''
''میں جانتی ہوں' اور اس پر میں خود ان سے بات کرلوں گی۔'' وہ بولی۔
اس کے بعد وہ فریش ہونے کے لیے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

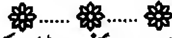


ایڈووکیٹ مسعود خان کی زندگی بڑی پرسکون تھی۔ مسعود خان نے جیسے ہی وکالت شروع کی ان کی شادی ثمینہ کے ساتھ اٹھائیس برس قبل ہوگئی تھی اور ان دونوں نے اپنے بچوں کے ساتھ مکمل اچھی زندگی گزاری تھی۔ مسعود خان کا بڑا بیٹا آفاق خان جو نادیہ سے تین برس بڑا تھا وہ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ایک غیر ملکی بینک میں ملازمت کرتا تھا۔
دو برس قبل مسعود خان اپنی بیماری کی وجہ سے گھر میں قید ہوکر رہ گئے تھے۔ وہ اگر پریکٹس کررہے ہوتے تو آج ان کی بیٹی ان ہی کے دفتر سے وکالت شروع کرتی لیکن ان کا تمام کام اب بند ہوچکا تھا۔ اس لیے وہ صرف زبانی کلامی حوصلہ بڑھا سکتے تھے۔



نادیہ لائرز پلازہ پہنچی تو اسے گیٹ پر ہی عدنان کو منتظر پایا۔ اس سے پہلے کہ عدنان کچھ بولتا' وہ بول پڑی۔
''سوری دیر ہوگئی۔''
''میں نے وقت لے رکھا ہے اور ہم لوگ دس منٹ لیٹ ہوچکے ہیں۔'' عدنان نے کہا۔
''میں سوری کہہ چکی ہوں۔'' وہ خفگی سے بولی۔
''اچھا چلو اب جلدی کرو۔'' عدنان نے کہا اور وہ دونوں دوڑتے ہوئے لفٹ میں گھس گئے۔
پلازہ کی ساتویں منزل پر ایڈووکیٹ ریاض الحق کا دفتر تھا۔ ان دونوں کو وہاں جانا تھا۔ ان سے لیٹ آنے پر کوئی باز پرس نہیں کی گئی تھی۔ ریاض الحق صاحب جو پچاس برس کی عمر کے ایک نامور وکیل تھے انہوں نے آدھے گھنٹے کی ملاقات کے بعد ان دونوں کو اپنے پاس جونیئر وکیل کی حیثیت سے کام کرنے کی اجازت دے دی تھی۔
نادیہ اور عدنان دونوں اب کورٹ آئے تھے اور سیدھے کیفے ٹیریا میں آبیٹھے تھے۔ عدنان نے میزبانی کے فرائض سنبھال لیے تھے۔
''کیا کھاؤ گی؟''
''چائے کے ساتھ سینڈوچ آرڈر کردو۔'' وہ بھی بے تکلفی سے بولی۔
عدنان نے ویٹر کو آرڈر نوٹ کرایا اور پھر نادیہ کی طرف متوجہ ہوا۔
''یہ کام تو ہوگیا' کل سے ہم ریاض الحق صاحب کے ساتھ کام شروع کردیں گے۔''
''تمہارے لیے سارے کام بے حد آسان ہوتے ہیں۔'' وہ بولی۔ ''میں لڑکی ہوں مجھے ہر چیز کی بابت بتانا ہوتا ہے اور اجازت بھی حاصل کرنا ہوتی ہے۔''
''لیکن تمہارے فادر تو تمہیں سپورٹ کرتے ہیں۔'' وہ بولا۔
''ان کی وجہ سے تو یہاں تک پہنچی ہوں۔'' وہ بولی۔ ''ورنہ اب تک شادی ہوچکی ہوتی۔''
''کیا تم نے اپنے گھر والوں کو میرے بارے میں بتایا ہے۔'' عدنان نے پوچھا۔
''نہیں ابھی تک کوئی ذکر نہیں کیا ہے لیکن اب میں انہیں اپنے اور تمہارے بارے میں بتادینا چاہتی ہوں اگر تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے تو۔''
''مجھے کیوں اعتراض ہوگا' میں نے تو تمہیں پہلے ہی اجازت دے رکھی تھی لیکن تم ہی نے ہم دونوں کی محبت کو پوشیدہ رکھا ہوا تھا۔''
''میں چاہتی تھی کہ وکالت مکمل کرکے بتاؤں۔'' وہ بولی۔
''کیوں.....'' اس نے پوچھا۔
''اس وقت مجھے ڈر تھا کہ شاید میری پڑھائی رک جائے گی اور میں وکیل نہیں بن سکوں گی۔''
''اب تو تم وکیل بن چکی ہو۔'' وہ مسکرایا۔
''ہاں اب ڈر نہیں ہے اس لیے چاہتی ہوں کہ تمہارا ذکر اپنے گھر والوں کے سامنے کردوں۔''

''میں بھی چاہتا ہوں کہ ہم دونوں کا ملنا اب راز نہیں رہے۔'' عدنان نے کہا مزید اسے خاموش ہونا پڑا کیونکہ ویٹر آڈر کا سامان لے کر آ گیا تھا۔



وہ اپنے والد کے پاس پہنچی تو بیٹی کو دیکھتے ہی مسعود خان کی آواز سنائی دی۔ ''آج کا دن کیسا رہا؟''

وہ نزدیک ہی بیٹھ گئی۔ ''بہت اچھا رہا' آج میں ایڈووکیٹ ریاض الحق صاحب سے ملی ہوں۔'' وہ بتانے لگی۔

''ہائی کورٹ والے ریاض الحق۔'' مسعود خان پہچان کر بولے۔

''جی وہی ریاض الحق صاحب۔'' اس نے کہا۔ ''وہ بھی آپ سے واقف ہیں۔''

''ہاں بار کے الیکشن کے دنوں میں ملاقات رہتی تھی۔'' مسعود خان نے سر ہلا کر جواب دیا۔

'میں کل سے ریاض الحق صاحب کے جونیئر وکیل کے طور پر کام کا آغاز کر رہی ہوں۔''

''یہ تو بڑی اچھی خبر ہے اس لیے کہ ریاض الحق صاحب کا وکالت میں اچھا نام اور مقام ہے۔'' مسعود خان بولے۔ ''ان کے ساتھ رہتے ہوئے تمہیں بہت کچھ سیکھنے کو ملے گا۔''

''مجھے گھر میں آپ کی بھی ضرورت پڑے گی۔''

''ہاں کیوں نہیں میں گھر پر رہ کر تمہاری معاونت کروں گا اور تم ایک روز بڑی وکیل بنو گی۔'' مسعود خان کے لفظ محبت اور شفقت میں ڈوبے ہوئے تھے۔

نادیہ کچھ دیر اپنے والد کے ساتھ گزارنے کے بعد کچن میں ماں کے پاس آ گئی تھی جو رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں' وہ بھی ہاتھ بٹانے لگی۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے بات بھی شروع کر دی۔

''امی میرے ساتھ ایک لڑکے نے وکالت پاس کی ہے۔''

ماں نے تجربے سے بھانپ لیا۔ ''کیا نام ہے اس کا۔'' وہ اپنا کام چھوڑ کر بیٹی کی طرف گھوم چکی تھیں۔

''عدنان نام ہے۔'' وہ ماں کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

''کیا وہ شادی کرنا چاہتا ہے۔'' ماں نے سوال کیا۔

''ہاں۔'' اس نے مختصراً کہا۔

''کون ہے تم اس کے بارے میں کیا جانتی ہو؟''

اب اسے ماں کی طرف گھومنا پڑا۔ ''اس نے میرے ساتھ وکالت پاس کی ہے' وہ گھر آنا چاہتا ہے' میں چاہتی تھی کہ آپ اس سے مل لیتیں۔''

''تم نے بابا کو بتایا ہے؟''

''میں نے صرف ابھی آپ کو بتایا ہے۔ آپ بابا سے بات کر لیجیے گا۔'' وہ بولی۔

''ٹھیک ہے اسے گھر بلا لو' پھر دیکھتے ہیں۔'' نادیہ کی امی نے ہامی بھر لی تھی یہ بات نادیہ کے لیے باعث اطمینان تھی۔

عدنان کی آمد نادیہ کے گھر ہو گئی تھی کیونکہ اب نادیہ کے گھر میں سب کو عدنان کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا' اس لیے یہ ملاقات اہم بھی تھی اور ضروری بھی ہو گئی تھی۔ نادیہ کی امی کو عدنان فوراً ہی پسند آ گیا تھا اس لیے کہ وہ ایک خوبصورت نوجوان تھا۔

''تمہارے گھر میں کون کون ہے؟'' امی نے سوال کیا۔

''میں اکیلا ہی ہوں۔'' عدنان نے جواب دیا۔

''کیا مطلب اکیلے ہو۔'' امی کی آواز میں حیرانی تھی۔

'مجھے یاد نہیں لیکن سن رکھا ہے کہ میں ایک برس کا تھا تو میرے والد اور والدہ میں علیحدگی ہو گئی تھی۔'' وہ دھیمی آواز میں سر جھکائے بول رہا تھا۔

''جب میں پانچ برس کا تھا تو والدہ دنیا سے گزر گئی تھیں۔''

''اوہ بڑا افسوس ہوا۔'' امی نے کہا۔

''والد تو ہوں گے۔'' نادیہ کے والد جو اس ملاقات میں شامل تھے انہوں نے والد کا فرض نبھاتے ہوئے خود کو بات چیت میں شامل کیا۔

''جی نہیں وہ بھی انتقال کر چکے ہیں۔''

''تم کو کس نے پالا ہے؟'' امی نے پوچھا۔

''میں اپنی نانی کے پاس رہتا ہوں۔ میری نانی خالہ اور ماموؤں نے مجھے پالا ہے پڑھایا لکھایا' سب کچھ انہوں نے ہی کیا ہے۔''

''تمہارے والد نے والدہ کی موت کے بعد تمہیں

ساتھ لے جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔'' امی نے پوچھا۔
''شروع دنوں میں وہ کبھی کبھار ملنے ضرور آئے پھر وہ سلسلہ بند ہوگیا' نانی بتاتی ہیں کہ ابتدا میں میرا خرچہ بھی دیا لیکن بعد میں وہ بھی بند ہوگیا اور میری نانی ماموں کیونکہ میرے والد کو ناپسند کرتے تھے اور میری پرورش میں مدد نہیں لینا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے میرے والد کو مجبور نہیں کیا کہ وہ میرا خرچ اٹھائیں پھر والد کا انتقال ہوگیا تو یہ رابطہ مکمل طور پر ختم ہوگیا۔''
''تمہارے ددھیال والے بھی نہیں ملتے ہیں۔'' امی نے پوچھا۔
''میں آپ لوگوں سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا۔'' عدنان بولا۔''میں بھی ان لوگوں سے نہیں ملنا چاہتا ہوں۔''
نادیہ اس طرح کے سوال جواب سے بے زار ہو رہی تھی لیکن وہ کوئی مداخلت نہیں کرنا چاہتی تھی کہ کہیں بات بگڑ نہ جائے اس لیے وہ خاموشی سے اس انکوائری کو بھگتتی رہی۔ جب امی کی مطمئن آواز اس کی سماعت تک پہنچی جو مہمان کے لیے کھانا لگانے کا کہہ رہی تھیں اس نے سکون کی سانس لی۔

❁......❁......❁

نادیہ اور عدنان کو وکالت کا آغاز کیے ایک ہفتہ بیت چکا تھا' دونوں کیونکہ جونیئر وکیل کے طور پر کام کر رہے تھے اس لیے سخت محنت بھی کر رہے تھے۔ نادیہ اور عدنان دونوں اس بات پر مطمئن تھے کہ نادیہ کے گھر والوں نے ان دونوں کے مستقبل کے ارادوں کو تسلیم کرلیا تھا۔ نادیہ کی امی نے عدنان کو گھر آتے رہنے کی ہدایت بھی کی تھی۔
وہ دونوں کورٹ کے دھکے کھانے کے بعد دفتر لوٹ آئے تھے' اس وقت دونوں لنچ کرکے ریسٹ کر رہے تھے' دونوں کے درمیان طاری سکوت کو آخر کار نادیہ نے توڑا۔
''تم کب جارہے ہو اپنی نانی سے ملنے کے لیے؟''
''یہ کہو کہ کب جارہے ہو اپنی نانی کو میرے بارے میں بتانے کے لیے۔'' وہ ہنس کر بولا۔
''اوکے چلو یہی بتادو۔'' نادیہ نے جواب دیا۔
''کام ابھی شروع کیا ہے' اتنی جلدی نہیں جانا چاہتا۔'' وہ بولا۔''ایک ماہ بعد ملتان جاؤں گا۔''
''بہت دن وہاں مت رک جانا۔'' وہ گویا ہوئی۔
''تھوڑا وقت تو لگے گا۔'' وہ بولا۔''نانی بھی نہیں چھوڑتی ہیں۔''
''کام کا حرج ہوگا۔''
''تم بھی تو یاد کروگی۔'' اس نے کہا۔
''جب کوئی روزانہ ساتھ رہتا ہے تو بچھڑنے پر یاد بھی آتا ہے۔'' وہ بولی۔''تمہیں اگر میں یاد آؤں تو جلدی آجانا۔''
''میں جلدی ہی آؤں گا۔'' وہ ہنس کر بولا۔ پھر وہ دونوں دوبارہ سے اپنے کام میں مصروف ہوگئے۔

❁......❁......❁

عدنان ریاض الحق کے کیبن میں اجازت لے کر داخل ہوا۔''سر مجھے آپ سے ایک کیس کے بارے میں بات کرنا تھی۔'' وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔
''کوئی نیا کیس آیا ہے؟'' ریاض الحق نے عینک کے پیچھے سے عدنان کو دیکھا۔
''سر وہ کیس ہمارے دفتر کا نہیں ہے اور نا ہی نیا کیس ہے۔'' اس نے بتایا۔ چند لمحے توقف کرکے دوبارہ بولا۔ ''اصل میں یہ کیس بہت پرانا ہے۔ کئی برس پرانا ہے۔''
''تم کیا چاہتے ہو؟'' ریاض الحق نے پوچھا۔
''سر اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اس پرانے کیس کی فائل دوبارہ سے کھولنا چاہتا ہوں۔''
''تم اگر اس کیس میں دلچسپی رکھتے ہو اور اسے دوبارہ سے کھولنا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''
''تھینک یو سر۔'' وہ خوش ہوا تھا۔
''کچھ تفصیل بتاؤ۔ یہ کیس کیا ہے؟'' ریاض الحق نے پوچھا۔
عدنان انہیں کیس سے متعلق معلومات دینے لگا' دونوں کے درمیان ایک گھنٹے تک گفتگو جاری رہی تھی۔

❁......❁......❁

عدنان اور نادیہ شام کے وقت کورٹ کیفے ٹیریا میں بیٹھے تھے۔
''تم نے کس کیس کے متعلق سر سے اجازت حاصل کی ہے؟'' نادیہ نے پوچھا۔
''ہاں ایک برسوں پرانا کیس ہے۔'' وہ بولا۔''شاید

پچیس برس پرانا مقدمہ ہے۔‘‘
’’تم کیوں اس مقدمے میں سر کھپا رہے ہو۔‘‘ نادیہ حیران تھی۔
’میں اپنی وکالت میں کوئی سرپرائز کرنا چاہتا ہوں۔‘‘ وہ بولا۔’’میں ایک مقدمہ ری اوپن کر کے اس کو نئے سرے سے چلا کر اپنی وکالت کو عروج دینا چاہتا ہوں۔‘‘
’’اچھا سوچتے ہو لیکن یہ مشکل کام ہے‘ برسوں پہلے والے مقدمے کے شواہد‘ گواہ کہاں سے لاؤ گے۔‘‘
’’کوشش تو کرنے دو۔‘‘ وہ مسکرا کر بولا۔
’’میں کب روک رہی ہوں میں تو صرف معلومات لے رہی ہوں۔‘‘ وہ کندھے اچکا کر بولی۔’’ویسے کیس ہے کیا؟‘‘
’’قتل کا کیس ہے‘ ایک عورت کے قتل کا مقدمہ ہے جو حل نہیں ہو سکا ہے اس کے قتل میں کوئی قصوروار ثابت نہیں ہوا ہے۔‘‘
’’یہ تم نے کہاں سے ڈھونڈ نکالا۔‘‘
’’کوئی مشکل کام نہیں تھا‘ سیکڑوں کی تعداد میں ایسے مقدمے بھرے پڑے ہیں ان میں سے یہ ایک مقدمہ ہے۔‘‘
’’تم سے مقابلہ کرنے کے لیے مجھے بھی کچھ کرنا ہوگا۔‘‘ وہ بولی۔
’’کیوں مقابلہ کرنا چاہتی ہو؟‘‘
’’تم مجھ سے وکالت میں آگے نکل جاؤ‘ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جب کہ وکالت پڑھتے وقت میرے نمبر ہمیشہ تم سے زیادہ رہے ہیں۔‘‘
’’لیکن میں کوئی مقابلہ نہیں کر رہا ہوں۔‘‘
’’میں بھی مذاق کر رہی ہوں۔‘‘ وہ ہنس دی۔
’’تم سے ڈر لگتا ہے کیونکہ تم سنجیدہ ہو جاتی ہو کسی بھی معاملے کو لے کر۔‘‘
’’ڈرتے ہو یہ سن کر اچھا لگا‘ اب آج کا بل تم ہی ادا کرو گے اور مجھے گھر بھی چھوڑو گے۔‘‘
عدنان جواب میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

نادیہ اپنے روزانہ کے معمولات سے وقت نکال کر اس وقت اپنے والد کے پاس بیٹھی تھی۔ دونوں کے درمیان وکالت اور کیسوں کے بارے میں تبادلہ خیال ہو رہا تھا۔
’’تو تمہیں اس وقت پراپرٹی کے ایک مقدمے کی پیروی میں مدد کرنی ہوگی۔‘‘ مسعود خان کی آواز کمرے میں گونجی۔
’’جی مجھے جائیداد کے ایک جھگڑے میں مدد کرنے کا کام ملا ہے۔‘‘ وہ بولی۔’’ساتھ ہی کچھ اور مقدمے کے کاغذات بھی پڑھنے اور تیار کرنے ہوں گے۔‘‘
’’کام میں مزہ آ رہا ہے؟‘‘ مسعود خان نے پوچھا۔
’’بہت لطف آ رہا ہے۔‘‘ وہ بولی۔’’آپ کا ساتھ ہوتا تو اور بھی اچھا ہوتا۔‘‘
’’ہاں میری بھی یہی خواہش تھی کہ تم میرے ساتھ پریکٹس کرتی لیکن میں تو بستر سے لگ گیا ہوں اور وکیلوں کو ذہنی اور جسمانی دونوں طرح سے صحت مند ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔‘‘
’’آپ گھر پر ہی رہ کر میری رہنمائی کرتے رہیں۔‘‘ نادیہ نے کہا۔’’میرے لیے اتنا ہی بہت ہے کہ آپ موجود ہیں۔‘‘
’’عدنان کا کام کیسا چل رہا ہے؟‘‘ مسعود خان نے بات کا رخ تبدیل کیا۔
’’اسے بڑا نامی وکیل بننا ہے اس لیے وہ ایک مرے ہوئے مقدمے کو قبر سے نکال کر اسے حل کر رہا ہے۔‘‘ وہ منہ بنا کر بولی۔’’وہ ایسا مانتا ہے کہ اس طرح اسے شہرت ملے گی۔‘‘
’’بات تو وہ ٹھیک ہی کر رہا ہے۔‘‘ مسعود خان نے کہا۔ ’’ہم اگر کسی مقدمے کو ری اوپن کر کے حل کر دیتے ہیں یا پھر اس وقت کے ہونے والے فیصلے کو بدل دیتے ہیں تو ہماری عدالتی دنیا میں اچھا مقام بن جاتا ہے۔‘‘
’’لیکن اس کے لیے تو ایسا مقدمہ سامنے ہونا چاہیے جو حل نہیں ہوا ہو اور فائلوں میں گم کر دیا گیا ہو یا پھر اس مقدمہ کا جو فیصلہ ہوا ہو ہمیں یقین ہو کہ وہ فیصلہ غلط ہوا ہے۔‘‘ وہ سوچتے ہوئے بولی۔
’’یقیناً ان تمام باتوں کا ہونا ضروری ہے ورنہ ساری محنت بے کار ہو جاتی ہے۔‘‘ مسعود خان نے کہا۔’’کیا عدنان کو کوئی ایسا کیس مل گیا ہے جو پرانا ہو اور حل نہیں ہو ا یا پھر وہ کیس حل ہی نہ ہو سکا ہو۔‘‘

”میرے خیال میں مل گیا ہے۔“ وہ گویا ہوئی۔
”خیال سے کیا مراد ہے۔ اس نے تمہیں اس پرانے مقدمے کے بارے میں نہیں بتایا ہے۔“
”ہاں اسی طرح سمجھ لیں۔“ وہ بولی۔ ”اس نے کہا ہے کہ وہ پہلے پوری طرح سے اس مقدمے کو جانچ لے پھر وہ مجھے بتائے گا بلکہ مجھ سے مدد لے گا۔“
”چلو ٹھیک ہے۔“ مسعود خان نے گفتگو کا اختتام کیا۔ ”اللہ تم دونوں کی مدد کرے اور تم لوگوں کو کامیابی عطا کرے۔ میں اب آرام کرتا ہوں۔“
نادیہ نے سر ہلا کر جواب دیا اور کمرے سے نکلتی چلی گئی۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

وہ عدنان کے عین سامنے بیٹھی تھی اور اس کے چہرے کو گھور رہی تھی۔
”تو تم نے پرانا کیس ڈھونڈ لیا ہے؟“ اس نے کہا۔
”ہاں یہ کیس ایک عورت کے قتل کا معاملہ ہے۔“ وہ بتانے لگا۔ ”اور حل ہوئے بغیر بند کر دیا گیا تھا۔“
”یعنی اس مقدمے میں کوئی گرفتاری نہیں ہوئی۔“ نادیہ نے پوچھا۔
”ایف آئی آر میں ملزم نامزد ہوا تھا لیکن ثابت نہیں ہو سکا اس لیے کسی کو سزا نہیں ہوئی۔“
”کیس تو دل چسپ معلوم ہوتا ہے۔“ وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔ ”یہ قتل کا مقدمہ کتنا پرانا ہے۔“
”کم و بیش چوبیس پچیس سال پرانا ہے۔“
”اتنے پرانے مقدمے میں کیا کرو گے۔“ وہ حیرانی سے بولی۔
”کیس تو بہت پرانا ہو چکا ہے لیکن میں پھر بھی کوشش تو کروں گا۔“ وہ فیصلہ کن انداز میں بولا۔
”بے کار محنت کرو گے، اس کے گواہ شواہد سب کچھ ختم ہو چکے ہوں گے اور اگر موجود بھی ہوں گے تو تم کیسے تلاش کرو گے۔“
”مجھے کوشش تو کرنے دو۔“ وہ بولا۔
”تم اگر صحرا میں پانی ڈھونڈنے پر بضد ہو تو مجھے کیا۔“ اس نے کندھے اچکائے۔ ”کرو کوشش میرا کام سمجھانا تھا وہ میں کر رہی ہوں، لیکن تم سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہو تو پھر کچھ نہیں کیا جا سکتا ہے۔“
”تمہیں اس کیس میں میری مدد کرنی ہے۔“ وہ مسکرا کر بولا۔
”میں بے وقوفوں والی حرکتیں ہرگز نہیں کروں گی۔“ اس نے کہا۔
”میری خاطر۔“ وہ بولا۔
”اب تم بلیک میل کر رہے ہو۔“ وہ سنجیدہ تھی۔
”میں صرف تمہارا ساتھ مانگ رہا ہوں۔“ وہ بولا۔
”لیکن مجھے یہ سراسر بے وقوفی وقت کا ضائع ہونا لگ رہا ہے میں اس میں تمہارے ساتھ کیسے شامل ہو جاؤں۔“
”میں نے مقدمے کی ایک سمری تیار کی ہے وہ میں تمہیں دیتا ہوں تم اسے پڑھ لو۔ شاید تمہیں بھی اس کیس میں دلچسپی ہو جائے۔“ وہ بولا۔
”ٹھیک ہے لیکن فیصلہ میں خود کروں گی۔“ اس نے کہا۔ ”کہ میں تمہاری مدد کروں یا نہ کروں۔“
”مجھے منظور ہے۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ ”دیکھنا تم کو خود بھی یہ کیس حل کرنے میں دلچسپی ہو جائے گی۔“
”دیکھتے ہیں۔“ نادیہ نے جواب دیا، پھر دونوں اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

وہ رات میں اپنے بستر پر بیٹھی ایک کیس کی سمری پڑھ رہی تھی جو عدنان نے پرانے کیس سے متعلق تیار کی تھی، جس میں اس نے بتایا تھا کہ لاہور کے پرانے محلے کے ایک مکان میں ایک عوت جس کا نام آسیہ تھا مردہ حالت میں پائی گئی تھی۔ موت کے وقت کا تعین رپورٹ کے مطابق رات کے وقت کا تھا اور اس عورت کی موت دم گھٹنے کی وجہ سے ہوئی تھی۔
تحقیقات کے دوران جن لوگوں کو شامل تفتیش کیا گیا اس میں اس عورت کا شوہر اس کے سسرالی لڑکی کے اپنے گھر والے اور وہ دوسرے لوگ جو ان دنوں اس سے ملتے رہے تھے لیکن کوئی ثبوت نہیں ملنے کی وجہ سے کوئی مجرم ثابت نہ ہو سکا اور ایک سال بعد یہ مقدمہ بند کر دیا گیا اور یوں اس عورت کا نہ تو قاتل پکڑا جا سکا اور نا ہی وجہ قتل معلوم ہو سکی۔
نادیہ نے تمام تفصیلات کو دو مرتبہ پڑھا اور اس کے بعد

تھک کر سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

''تم نے کیس کی سمری پڑھی ہوگی۔'' عدنان نے خاموش بیٹھی نادیہ کو مخاطب کیا۔

''ہاں......'' وہ چونک کر بولی۔''ہاں میں نے پڑھی ہے اس لیے کچھ سوالات دماغ میں کلبلا رہے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے تمہیں کیس میں دلچسپی ہوگئی ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''تمہارے سوالات پر ہم بحث کر لیتے ہیں۔ ویسے تو ضروری نہیں کہ میرے پاس جوابات ہوں لیکن کوشش کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔''

''مقتولہ کی موت کی وجہ؟'' وہ بولی۔''جب تک وجہ سامنے نہیں آتی تو قاتل کا تعین بھی نہیں ہو پاتا ہے۔''

''بالکل ٹھیک ہے۔'' وہ بولا۔''ہمیں سب سے پہلے وہ وجہ تلاش کرنا ہوگی۔'' وہ جوش سے بولا۔

''مقتولہ جس رات قتل ہوئی اس رات کیا وہ گھر میں اکیلی تھی؟'' نادیہ نے ذہن میں اٹھنے والا پہلا سوال کیا۔

''مقدمے کی فائل کے مطابق اس کا بچہ اور وہ گھر پر تنہا تھے۔'' اس نے بتایا۔

''بچے نے تو قاتل کو دیکھا ہوگا۔'' نادیہ چونک کر بولی۔

''فائل میں تفصیل تو موجود نہیں ہے لیکن بچے کی عمر صرف چار برس لکھی ہوئی ہے۔''

''بچہ تو پھر چھوٹا تھا۔'' وہ ہونٹ سکیڑ کر بولی۔''شاید رات کا وقت تھا اس لیے سو رہا ہوگا۔''

''ہاں شاید ایسا ہی ہو۔'' عدنان نے ہاں میں ہاں ملائی۔

''اس کا شوہر کہاں تھا جب وہ قتل ہوئی۔''

''وہ ساتھ نہیں رہتا تھا' دونوں کے درمیان اختلاف چل رہا تھا۔'' عدنان نے بتایا۔

''اس سے تو یہ ثابت ہو رہا ہے کہ آسیہ کے قتل میں اس کے شوہر کا ہاتھ ہے۔'' نادیہ نے کہا۔

''قتل کی وجہ صرف اختلاف ہونا تو نہیں ہوسکتی ہے۔'' عدنان نے کہا۔ دونوں چند ماہ سے الگ رہ رہے تھے اور ان کے درمیان طلاق کا مقدمہ بھی چل رہا تھا۔''

''کیس بہت دلچسپ ہے لیکن محنت طلب بھی ہے۔'' اس نے کہا۔

''تم چاہو تو پوری فائل کی اسٹڈی کرسکتی ہو۔'' عدنان نے پیشکش کی۔

''مجھے یہ مقدمہ بے جان لگتا ہے لہٰذا تم اس میں دماغ لگاؤ میں اپنا کام کروں گی۔''

''ٹھیک ہے میں کیس ری اوپن کی درخواست کل لگا رہا ہوں۔'' عدنان نے فیصلہ سنایا۔



''یہ عدنان کیا آج کل زیادہ مصروف ہے۔'' امی نے نادیہ سے سوال کیا۔''پہلے تو دوسرے تیسرے دن آجاتا تھا۔ اب پورا ہفتہ ہوگیا ہے۔''

''ہاں وہ کچھ مصروف ہے۔'' نادیہ نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''تم دونوں کے درمیان کوئی جھگڑا وغیرہ تو نہیں ہوا ہے۔'' امی نے خدشے کا اظہار کیا۔

''نہیں لیکن آپ کو ایسا کیوں لگا ہے۔'' نادیہ نے جواب دیا۔

''تمہارا مزاج تیز ہے اس سے مجھے ڈر لگتا ہے۔'' امی نے کہا۔

''کیوں مجھے بدنام کر رہی ہیں۔'' وہ خفگی سے بولی۔''میں بالکل بدمزاج نہیں ہوں' ہاں کوئی غلط بات برداشت نہیں کرتی ہوں۔''

''اور وہ غلط بات وہ ہوتی ہے جو تمہیں ناپسند ہو۔''

''ایسا لگ رہا ہے آپ میری امی کم اور عدنان کی ماں زیادہ ہیں۔'' وہ ناراض ہوگئی۔

''خفا مت ہو میں تو اس لیے یہ بات کر رہی تھی کہ وہ ایک لڑکا ہے اور تم دونوں کی جوڑی بہت اچھی ہے۔''

''امی جوڑی کا مطلب ہوتا ہے ایک جیسی دو چیزیں۔'' وہ بولی۔

''چپلوں کی جوڑی ہوسکتی ہے' جانوروں کی جوڑی ہوسکتی ہے ہم انسان ہیں' اور دو انسان ایک جیسے نہیں ہوتے ہیں۔''

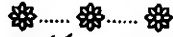
''میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتی ہوں' صرف یہ سمجھا رہی ہوں کہ وہ اچھا لڑکا ہے' اسے بے فضول ناراض

مت کر دینا۔"

"میں اچھا برا جانتی ہوں اور وہ ناراض بھی نہیں ہے بس کام میں مصروف ہے۔ اسے کہہ دوں گی وہ آپ سے آ کر مل جائے گا۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے وہ آ کر ملتا رہے تا کہ ہم لوگ مطمئن رہیں۔" امی نے کہا۔

"میں اب اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔" وہ وہاں سے نکلتی چلی گئی۔



نادیہ عدنان کو اپنے سامنے دیکھ کر بے اختیار بولی۔ "کہاں ہو صبح سے کہیں دکھائی نہیں دیے ہو۔"

"ہاں میں آج سو تا رہ گیا اور صبح اٹھ نہیں سکا۔" عدنان نے بتایا۔

"وہ تو تمہارا چہرہ اور آنکھیں بتا رہی ہیں کہ تم ساری رات سوئے نہیں ہو۔" وہ بغور عدنان کو دیکھ رہی تھی۔

"ہاں میں رات بھر جاگتا رہا ہوں۔" وہ بولا۔ "صبح کے قریب آنکھ لگ گئی اور پھر سارا معاملہ الٹ سلٹ ہو گیا۔"

"کوئی رابطہ نہیں تھا' سر نے بھی دو بار معلوم کیا ہے۔" نادیہ نے بتایا۔

"تمہیں سر کے ساتھ ہیئرنگ پر بھی جانا تھا۔"

"ہاں مجھے یاد تھا لیکن میں ساری رات آسیہ مرڈر کیس کی فائل دیکھتا رہا تھا جس کی وجہ سے صبح اٹھ نہیں سکا۔"

"تم ایک بے کار بے مقصد پرانے مقدمے کے پیچھے اپنے کیریئر سے کھیل رہے ہو اور مجھ سمیت دوسرے لوگوں کو ڈسٹرب بھی کر رہے ہو۔" نادیہ نے ناگواری سے کہا۔

"سوری میں نے یہ سب جان بوجھ کر نہیں کیا ہے۔" اس کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔ "بس مجھے ایک پرانا مقدمہ حل کرنے کا جنون سا ہو گیا ہے۔"

"تم صرف وقت برباد کر رہے ہو۔" نادیہ بولی۔ "اس طرح کے کیسوں کو کبھی حل نہیں ہونا ہوتا ہے۔"

"نہیں مجھے کلیو مل گیا ہے۔" عدنان نے نادیہ کو چونکا دیا تھا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ تمہیں کوئی ثبوت مل گیا ہے۔"

"بالکل ٹھیک سمجھی ہو۔" وہ بولا۔ "ایک ایسا اشارہ ملا ہے جو ہماری مدد کر سکے گا۔"

"میں کچھ بھی نہیں ہوں۔" وہ بولی۔

"میں سمجھاتا ہوں۔" اس نے چند لمحے توقف کر کے لفظوں کی ترتیب کی اور پھر بولا۔ "مقتولہ آسیہ کی اپنے خاوند سے علیحدگی کا جھگڑا اچل رہا تھا۔ اس بات سے تو تم واقف ہو اور میں نے یہ بھی بتایا تھا کہ مقتولہ آسیہ اپنے شوہر سے طلاق لینا چاہتی تھی۔"

"ہاں یہ سب تفصیل تم اپنی سمری میں بتا چکے ہو۔" اس نے ہامی بھری۔

"لیکن تم یہ نہیں جانتی ہو کہ آسیہ نے طلاق کے قانونی مرحلے کے لیے جس وکیل کی خدمات حاصل کی تھیں وہ کون ہے؟"

"ظاہر ہے اتنی پرانی بات ہے میں کیسے جان سکتی ہوں۔" وہ ہنس کر بولی پھر چونک کر بولی۔ "تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ میں اس وکیل کو جانتی ہوں۔"

"میں یہی کہنا چاہ رہا ہوں۔" وہ بولا۔

"کیا سر ریاض الحق وہ وکیل تھے۔" وہ حیرانی سے بولی۔

عدنان نے نفی میں سر ہلایا پھر بولا۔ "مقتولہ آسیہ کے وکیل کا نام تھا' ایڈووکیٹ مسعود خان۔"

"کیا......" وہ تقریباً چیخ اٹھی تھی۔

عدنان نے ادھر ادھر دیکھا پھر بولا۔ "تمہارے والد مسعود خان اس مقتولہ کے وکیل تھے۔"

"شاید کوئی اور مسعود خان ہوں گے۔" وہ ابھی بھی غیر یقینی کی صورت حال سے دوچار تھی۔

"میں نے تو معلومات حاصل کی ہیں مجھے تو یہی پتہ چلا کہ وہ تمہارے والد محترم ہی ہیں۔ اب تم ان سے بات کر کے اور یقین کر سکتی ہو۔"

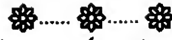
"میں بابا سے ضرور معلوم کر لوں گی۔"

"مسعود خان کی یادداشت ہماری مدد کرے گی تو اس پرانے مقدمے میں جان پڑ جائے گی اور یہ حل ہو سکتا ہے۔"

"میں آج ہی بات کرتی ہوں۔" وہ بولی۔

"وہ راضی ہو جائیں تو پھر میں بھی ان سے ملنا چاہوں

گا۔" عدنان نے کہا۔



"بابا آپ کو یاد ہے کہ آپ کو برسوں پہلے ایک کیس ملا تھا۔" وہ مسعود خان سے مخاطب تھی۔ "ایک شادی شدہ عورت کی اس سے طلاق حاصل کرنے کا مقدمہ تھا۔"

"میرے کیسوں کی تعداد شاید سیکڑوں میں ہوگی اس میں درجنوں کی تعداد اسی طرح کے مقدموں کی تھی جس کا ذکر تم کررہی ہو۔" مسعود خان نے جواب دیا۔ "پھر بھی تم اگر ٹھیک سے بتاؤ تو شاید مجھے یاد آجائے۔"

"چوبیس پچیس برس پرانا کیس ہے۔" وہ بولی۔ "اس عورت کا نام آسیہ خاتون تھا۔ اس کا تعلق بھاولپور سے تھا' بعد میں وہ لاہور منتقل ہوگئی تھی۔"

مسعود خان کی آنکھیں سوچنے کے انداز میں نادیہ کو گھوررہی تھیں۔ "یاد نہیں آرہا ہے۔"

"دوران کیس اس کا قتل ہوا تھا۔" اس نے کہا۔

"شاید بیماری نے یاد کمزور کردی ہے۔" مسعود خان نے کہا۔ "لیکن تم کیوں اتنی پرانی بات کے پیچھے پڑ گئی ہو۔"

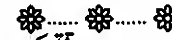
"مجھے تو دلچسپی نہیں تھی عدنان کو پرانا کیس جیتنے کی دھن سوار ہے اور اس نے وہی کیس کھولا ہے جس کی پیروی آپ کررہے تھے لہٰذا مجھے بھی اس مقدمے میں شامل ہونا پڑا۔"

"وہ کیوں اپنا وقت برباد کررہا ہے۔" مسعود خان نے کہا۔ "اتنا پرانا مقدمہ وہ جیت کر کیا کرے گا۔"

"بہرحال میں آپ کو اب تکلیف نہیں دوں گی۔" وہ جانے کے ارادے سے اٹھی تو مسعود خان نے کہا۔

"کوئی معلومات ملے تو آنا میرے پاس شاید میری یادداشت ساتھ دے جائے اور میں تم لوگوں کی مدد کرسکوں۔"

نادیہ سر ہلاتی ہوئی کمرے سے نکل گئی تھی۔



"کیا تمہارے والد نے آسیہ قتل کیس میں کچھ مدد کی۔" عدنان جو آسیہ سے کورٹ احاطے میں ملا تھا۔

"ان سے کوئی مدد مل نہیں سکے گی۔" نادیہ نے بتایا۔ "کیس بہت پرانا ہے اور میرے والد کی بیماری نے انہیں بالکل بستر پر لگا دیا ہے۔ ان کا دماغ بھی کمزور ہوگیا ہے زیادہ زور نہیں ڈال سکتے اور میں بھی انہیں دباؤ میں نہیں رکھنا چاہتی ہوں۔"

"لیکن تمہارے والد کے کسی جونیئر وکیل سے اگر بات ہو تو مدد مل سکتی ہے۔" عدنان نے کہا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ اپنے والد سے دوبارہ بات کروں اور ان کے کسی جونیئر وکیل کا نام پتہ معلوم کروں۔" وہ عدنان کو گھوررہی تھی۔

"میں یہی چاہتا ہوں۔"

"ایک تو تم بے مقصد کیس میں الجھ رہے ہو اور پھر میرے بابا کو بھی گھسیٹ رہے ہو۔" وہ ناراض ہوگئی تھی۔

"چلو ٹھیک ہے میں خود ہی کیس پر محنت کرتا ہوں۔" اس نے معاملے کو ٹھنڈا کیا۔

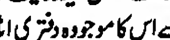
"ساتھ ہی وعدہ کرو کہ اگر اس کیس میں آسانیاں ہوئیں تو تم اس پر کام کروگے ورنہ اسے بند کردوگے۔"

"وعدہ رہا۔" اس نے ہاتھ بلند کردیا۔

"تم شاید اپنی نانی سے ملنے جانے والے تھے۔" نادیہ نے اسے یاد دلایا۔

"ہاں شاید اگلے ہفتے جاؤں۔" وہ بولا۔

دونوں خاموشی سے دفتر کے لیے روانہ ہوگئے۔



مسعود خان کے آواز لگانے پر نادیہ ان کے کمرے میں آئی تھی۔ وہ بیٹی کو دیکھتے ہی بولے۔ "کیا ہوا تمہارے اس پرانے مقدمے میں کوئی پیش رفت ہوئی۔"

"نہیں ابھی تو نہیں ہوئی لیکن آپ کی مدد مل جاتی تو شاید آسان ہوجاتا یہ سارا معاملہ۔" اس نے کہا۔

"مجھے تو یاد نہیں آرہا ہے لیکن میرا ایک جونیئر وکیل ہوتا تھا اس زمانے میں شاید وہ کچھ مدد کرے تمہاری۔" مسعود خان کی بات سن کر نادیہ خوش ہوگئی اور بولی۔

"آپ اس کا نام دے دیں میں معلوم کرلوں گی۔"

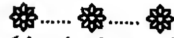
"اس کا نام رفاقت حسین ایڈووکیٹ ہے۔" مسعود نے کہا۔ "تم بار سے اس کا موجودہ دفتری ایڈریس حاصل کرسکتی ہو۔"

"شکریہ بابا۔" وہ بے اختیار بول اٹھی۔

"عدنان سے کہنا کہ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"میں کہہ دوں گی کہ وہ آپ سے مل لے۔" نادیہ نے

جواب دیا۔



عدنان اور نادیہ کو رفاقت حسین کو تلاش کرنے میں کچھ مشکل نہیں ہوئی تھی وہ خاصا بوڑھا شخص تھا لیکن صحت مند تھا اس لیے پریکٹس میں موجود تھا۔

''تو تم ایڈووکیٹ مسعود خان کی بیٹی ہو۔'' رفاقت حسین نے عدنان پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔

''جی۔'' وہ مختصراً بولی۔

''کئی برس میں نے مسعود خان کے ساتھ کام کیا ہے۔'' وہ ٹھہر ٹھہر کر بات کررہے تھے۔ ''اب تو مسعود خان کو دیکھے ہوئے بھی کئی برس بیت گئے۔''

''وہ اب گھر پر ہی رہتے ہیں اور زیادہ تر آرام کرتے ہیں۔'' نادیہ نے بتایا۔

''آپ کو یاد ہے آج سے چوبیس پچیس برس قبل میرے پاپا کے پاس ایک کیس آیا تھا۔'' نادیہ خود ہی بات کررہی تھی۔ ''آسیہ خاتون کو اپنے خاوند سے طلاق لینی تھی اور دوران مقدمہ وہ خاتون مرگئی تھی۔''

''وہ مردہ حالت میں پائی گئی تھی۔'' رفاقت حسین نے یہ بات کرکے سمجھا دیا تھا کہ انہیں وہ کیس یاد ہے۔

''اس کا مطلب ہے کہ آپ کو وہ مقدمہ یاد ہے۔'' عدنان پہلی بار بولا تھا۔

''ہاں مجھے یاد ہے' اس لیے کہ مجھے وکالت شروع کیے صرف چند ماہ ہوئے تھے اور میں مسعود خان کی مدد کرتا تھا۔'' رفاقت حسین دماغ پر زور ڈالتے ہوئے بات آگے بڑھا رہے تھے۔ ''میری موجودگی میں پہلی بار وہ خاتون دفتر آئی تھیں۔'' رفاقت حسین آگے کی طرف جھک کر بولے۔ ''آسیہ خاتون کے یاد رہنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ایک حسین عورت تھی لیکن نہیں وہ ایک جوان لڑکی تھی' شاید تمہاری عمر کی ہوگی لیکن تم سے زیادہ خوبصورت تھی۔'' رفاقت حسین نے نادیہ کو مخاطب کیا۔

نادیہ کو اس بوڑھے وکیل کا انداز تخاطب اچھا نہیں لگا تھا لیکن اس وقت تو اسے برداشت کرنا تھا ورنہ معاملہ ختم ہوجاتا۔ ''وہ خاتون اگر قتل کی گئی تھیں تو کسی کو نامزد نہیں کیا گیا تھا۔'' وہ موضوع کی طرف آتے ہوئے بولی۔

''پولیس کا شک اس کے شوہر پر تھا لیکن ایک تو وہ اثر ورسوخ والا آدمی تھا دوسرے مقتولہ کے گھر والوں نے بھی کیس کی پیروی بہت دور تک نہیں کی جس کی وجہ سے وہ کیس وقت کی گرد میں دب کر رہ گیا۔''

''یعنی اس عورت یعنی اس لڑکی کا قاتل پکڑا ہی نہیں گیا۔'' نادیہ کی آواز خاصی تیز تھی۔

''یہی سچ ہے اور تم پریشان نہیں ہو' ابھی نئی نئی اس پیشے میں آئی ہو جلد جان جاؤ گی زیادہ تر مقدمے حل ہوئے بغیر ہی بند ہوجاتے ہیں۔'' رفاقت حسین نے کہا۔

''سر آپ کے پاس وہ فائل ہوگی۔'' عدنان نے کہا۔

''وہ میرا کیس نہیں تھا اس وقت میں مسعود خان کے دفتر میں کام کرتا تھا۔ اس لیے وہ فائل مسعود خان کے پاس ہی ہوگی اگر انہوں نے ضائع نہیں کردی ہوگی تو۔''

''شکریہ جناب۔'' نادیہ نے عدنان کا اشارہ پاکر اجازت حاصل کی اور روانہ ہوگئے۔



نادیہ نے گھر لوٹ کر ماں سے پوچھا کہ اس کے والد نے جب دفتر بند کیا تو اس کے سامان کا کیا کیا..... اس کی امی نے بتایا کہ کیونکہ کئی برس قبل اچانک انہیں ہارٹ اٹیک آیا اور انہوں نے دفتر جانا چھوڑ دیا' ظاہر ہے پھر دھیرے دھیرے سب کچھ بند ہوگیا۔ ہارٹ اٹیک کے چھ ماہ بعد دفتر مکمل طور پر بند ہوگیا تھا۔ اس کا سامان زیادہ تر تو فروخت کردیا گیا' کتابیں انہوں نے اپنے ساتھ کام کرنے والے وکیلوں کو دے دی تھیں۔ فائلیں یا تو ادھر ادھر ہوگئیں یا پھر ردی کی نذر ہوگئیں کچھ چیزیں ضرور موجود ہیں اوپر چھت پر رکھے صندوق میں وہ دیکھ لو۔ چنانچہ نادیہ نے صندوق کی جانچ پڑتال کرڈالی تھی لیکن اسے وہاں کچھ نہیں ملا تھا جو اس کے مقصد میں کام آتا۔

اس نے فائلوں کے سلسلے میں مسعود خان سے بھی بات کی تھی تو انہوں نے جواب دیا کہ اگر انہیں ذرا بھی معلوم ہوتا کہ ان کی بیٹی آگے چل کر وکیل ہوجائے گی تو وہ اپنا برسوں کا اثاثہ سنبھال کر رکھتے۔ نادیہ کو ایک بار پھر سے مایوس ہونا پڑا تھا۔



''تم کو کیا لگتا ہے کہ آسیہ خاتون کو کس نے قتل کیا ہوگا؟'' نادیہ نے پوچھا۔

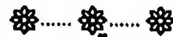
عدنان آج اسے باہر کھانے پر لے کر آیا تھا۔
''بغیر ثبوت کے ہم کوئی فیصلہ کیسے کر سکتے ہیں۔''
''میں فیصلہ کرنے کا نہیں بلکہ کس پر شک کیا جاسکتا ہے یہ کہہ رہی ہوں۔''
''ایک ہی شخص سمجھ آ رہا ہے۔'' عدنان نے جواب دیا۔
''مقتولہ کا وہ شوہر جس سے وہ طلاق لینا چاہتی تھی۔''
''اسے انصاف ملنا چاہیے زندگی میں نہیں ملا ہے مرنے کے بعد ہی اسے انصاف مل جائے اس کا قاتل سزا پائے۔'' نادیہ نے کہا۔ ''مجھے بھی اب اس لڑکی سے ہمدردی ہو رہی ہے' میری بھی یہ خواہش ہے کہ اس کی روح کو انصاف ملنا چاہیے۔''
''تم ساتھ ہو مجھے بے حد خوشی ہے۔'' عدنان نے کہا۔
''اس کیس میں اہم خوش قسمتی یہ رہی ہے کہ مسعود خان تمہارے والد اس عورت کی طلاق کے معاملے کو دیکھ رہے تھے۔''
''لیکن انہیں تو کچھ یاد نہیں آ رہا ہے۔'' نادیہ بولی۔
''میں جانے سے پہلے ملاقات کرتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ شاید کوئی بات وہ بتا پائیں۔''
''وہ ویسے بھی تمہیں یاد کر رہے تھے۔'' نادیہ نے کہا۔
''میں کل ملنے آؤں گا۔'' عدنان بولا۔
نادیہ نے سر ہلا دیا۔

❁......❁......❁

نادیہ کو اس کے نمبر پر رفاقت حسین ایڈووکیٹ کا فون ریسیو ہوا۔ جس میں اس سے استدعا کی گئی تھی کہ آج دوپہر کورٹ کے بعد وہ دفتر میں آ کر ملے لیکن وہ تنہا آئے' نادیہ نے ایسا ہی کیا اور رفاقت حسین کی ہدایت کے مطابق اس نے اپنی اس ملاقات کی بابت عدنان کو بھی نہیں بتایا تھا۔ چنانچہ جب وہ رفاقت حسین کے دفتر پہنچی تو انہیں منتظر پایا۔
''میں تمہیں آسیہ خاتون سے متعلق کچھ بتانا چاہتا تھا۔'' رسمی جملوں کے تبادلوں کے بعد رفاقت حسین نے کہا۔
''لیکن آپ نے مجھے اکیلے آنے کے لیے کیوں کہا؟'' اس نے حیرانی سے سوال کیا۔ ''جب کہ میرا اس مقدمے سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ کیس عدنان دیکھ رہا ہے آپ معلومات اسے دے سکتے تھے۔''
''وہ میرے لیے اجنبی ہے' تم مسعود خان کی بیٹی ہو۔'' رفاقت حسین نے کہا۔
''میں کچھ سمجھ نہیں سکی۔'' وہ آنکھوں میں الجھن لیے بات کر رہی تھی۔
''یہ وہ فائل ہے جو آسیہ خاتون نے اپنے شوہر کے خلاف مقدمہ دائر کرتے وقت ہم سے تیار کروائی تھی۔'' رفاقت حسین نے سامنے رکھی فائل اس کی طرف کھسکا دی۔
''لیکن آپ نے تو کہا تھا کہ.....'' اس کا جملہ ادھورا رہ گیا اس لیے کہ بات رفاقت حسین نے مکمل کی تھی۔
''کہ میرے پاس کوئی فائل نہیں ہے۔''
اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
''میرے پاس اس وقت بھی یہ فائل موجود تھی۔'' رفاقت حسین نے کہا۔ ''دراصل جب تم نے اپنے والد مسعود خان سے اس مقدمے کے بارے میں بات کی تھی اس کے بعد مسعود خان نے مجھ سے رابطہ کر کے اس فائل کے بارے میں پوچھا تھا۔''
''بابا جانتے تھے کہ فائل آپ کے پاس ہے؟'' اس بار اسے حیرانی کا دورہ پڑا تھا۔
''انہی کے کہنے پر میں نے پہلے فائل کی موجودگی سے انکار کیا اور اب انہی کے کہنے سے تمہارے حوالے کر رہا ہوں۔''
''بابا نے ایسا کیوں کیا؟'' وہ خود کلامیہ انداز میں بولی۔
''شاید وہ تمہیں اس مقدمے سے دور رکھنا چاہتے تھے۔'' رفاقت حسین نے کہا۔
''اس کا مطلب ہے کہ کچھ ایسا ہے جو مجھ سے چھپایا جا رہا ہے۔'' نادیہ کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا۔
''اس کا جواب تو صرف مسعود خان ہی دے سکتے ہیں۔''
''آپ کو مجھے کوئی اور بات بتانی ہے۔'' نادیہ نے پوچھا تو رفاقت حسین نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
''نہیں' اب میرے پاس کچھ نہیں بتانے کے لیے۔''
''کیا آپ کے پاس بابا کے کیسوں کی اور بھی فائلیں ہیں۔'' نادیہ نے اٹھتے ہوئے سوال کیا۔
''مسعود خان نے اس فائل کو چھوڑ کر سب کچھ ختم

کردیا تھا' صرف یہ فائل مجھے حفاظت سے رکھنے کا کہا تھا' سو وہ ذمے داری بھی آج پوری ہوگئی ہے۔"

نادیہ وہاں سے روانہ ہوئی تو الجھنوں سے گھری ہوئی تھی وہ سیدھی گھر کی طرف جارہی تھی' نادیہ نے گھر پہنچ کر بھی خود کو نارمل رکھتے ہوئے آسیہ مرڈر کیس سے متعلق کوئی بات نہیں کی تھی' وہ ماں کے ساتھ گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹانے کے بعد اپنے کمرے میں آ گئی اور رفاقت حسین کی دی ہوئی فائل کی تفصیلات پڑھنے لگی۔ اس نے صبح فجر کے نزدیک فائل مکمل کی تھی' وہ اتنی تھک چکی تھی کہ اسے بیٹھے بیٹھے نیند آرہی تھی' اور پھر اس کی بوجھل آنکھوں نے اس کو غافل کردیا۔



نادیہ عدنان سے مل رہی تھی اس نے رفاقت حسین کی دی ہوئی فائل عدنان کے حوالے کردی تھی' عدنان فائل پڑھتے ہوئے بولا۔

"تم نے پوری فائل دیکھ لی ہے۔"

"ہاں اس فائل میں وہی کاغذات ہیں جو آسیہ خاتون نے اپنے شوہر محمد اقبال خان کے خلاف مقدمہ دائر کرتے وقت تیار کروائے تھے۔" نادیہ نے بتایا۔ "فائل پڑھ کر صرف اتنا معلوم ہوا ہے کہ کس تاریخ کو کیس فائل کیا گیا اور کیا وجوہات تھیں اپنے شوہر سے طلاق لینے کی۔"

"کیا تم نے دیکھا کہ کتنی پیشیاں ہوئی تھیں اور کیا اقبال خان کیس کے سلسلے میں پیش ہوا تھا۔" عدنان نے پوچھا۔

"اس فائل سے معلوم ہوا ہے کہ یہ کیس سات ماہ تک چلا ہے اور صرف تین پیشیاں ہوئی ہیں۔" وہ بولی۔ "دو بار آسیہ خاتون کا خاوند عدالت آیا ہے۔"

"آگے کیا ہوا؟" عدنان نے پوچھا۔

"آگے تو ظاہر ہے کہ کیس نہیں چل سکا ہوگا۔" نادیہ نے کہا۔ "وہ لڑکی اپنے گھر میں مردہ پائی گئی تھی۔" وہ بولی۔

"اس کا مطلب ہے کہ یہ طلاق کا مقدمہ تھا اور قتل کا کیس الگ سے ہے۔" وہ سوچتے ہوئے بولا۔

"اب کیا کرنے کا ارادہ ہے۔" اس نے پوچھا۔

"تمہارے والد اس وقت طلاق کے کیس کو دیکھ رہے تھے اس کا مطلب ہے کہ آسیہ خاتون کے قتل کے وقت انہیں کچھ معلومات حاصل ہوئی ہوں گی اس لیے کہ وہ لڑکی ان کی کلائنٹ تھی۔"

"لیکن میرے بابا کی صحت ایسی نہیں ہے۔" وہ بولی۔ "انہیں استعمال کرنے کا مطلب ہے ان کو ذہنی دباؤ میں لانا اور میں یہ نہیں چاہوں گی۔"

"دوسری صورت میں یہ ہے کہ پولیس کا اس وقت کا ریکارڈ چیک کیا جائے۔" عدنان بولا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے اگر وہ ریکارڈ مل سکے تو ہمیں معلوم ہوجائے گا کہ پولیس کی تحقیقات کس سمت کام کررہی تھیں۔"

"میں پہلے مقتولہ کے قتل کے وقت کا ایڈریس معلوم کرتا ہوں اور پھر اس علاقے کے تھانے دار سے ملتے ہیں۔"

"تھانے میں بھی چلوں گی۔" نادیہ نے فیصلہ سنایا۔

عدنان نے لاچاری سے منظوری دے دی تھی۔



وہ دونوں تھانے میں انسپکٹر سے مل رہے تھے' دونوں نے وکیل کی حیثیت سے تعارف کرایا تھا لہٰذا تھانے دار مدد کے لیے راضی ہوگیا تھا۔ اس نے پرانے ریکارڈ سے معلومات نکالتے ہوئے کہا۔

"یہ اتنا پرانا کیس ہے کہ میں تو اس وقت پولیس میں بھرتی بھی نہیں ہوا تھا' لیکن یہ تھانہ یہاں موجود تھا اس لیے کیس سے متعلق معلومات مل جائے گی۔" وہ انسپکٹر کافی باتونی تھا۔ "اتنے پرانے کیس میں کیوں سر کھپا رہے ہیں آپ دونوں آپ لوگوں کا کیا اس مقدمے سے تعلق ہے۔"

"انسانیت کے ناتے اور قانون کی حکمرانی کی خاطر ہم یہ کام کررہے ہیں۔" عدنان نے جواب دیا۔

"آپ دیکھیے مقدمے میں کس کو نامزد کیا گیا ہے۔" نادیہ بولی۔

"ایف آئی آر کس نے درج کرائی تھی اور کس کے خلاف کی تھی۔" عدنان بھی چاہتا تھا کہ وہ تھانے دار اب بکواس کرنے کی بجائے کام کرے۔

"وہ جی مقتولہ کی والدہ رحیمہ خاتون نے ایف آئی آر درج کروائی تھی۔" وہ بڑے غور سے پرانا ریکارڈ چیک کررہا تھا۔ "اور مقدمہ مقتول کے خاوند اقبال خان کے نام

تھا۔"

"تحقیقات سے کوئی بات سامنے آئی تھی۔" عدنان نے پوچھا۔

"دیکھو جی ادھر تحریر ہوئی کارروائی سے تو صرف اتنا معلوم ہو رہا ہے کہ اقبال احمد خان کو حراست میں لے لیا گیا تھا لیکن کورٹ نے ضمانت پر رہائی دے دی اور کیونکہ ثابت نہیں ہوسکا اس لیے کیس سمجھو ختم ہی ہوگیا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ پولیس نے ادھوری تفتیش کی ہے۔" عدنان نے کہا۔

"عجیب انسان ہو پولیس مدد کر رہی ہے تم اس پر الزام لگا رہے ہو۔" وہ انسپکٹر ناراض ہوا۔

"کوئی اگر قتل ہوجائے تو کسی کو سزا تو ملنی چاہیے۔" نادیہ بھی بولی۔

"یہ کام کورٹ کا ہے اور مقتولہ کے وکیل کا ہے۔" انسپکٹر کی بات پر دونوں چونکے۔

"مقتولہ کے قتل کے بعد وکیل سرکاری تھا کہ مقتولہ کے لواحقین نے کوئی وکیل کیا تھا؟" عدنان نے دماغ میں آنے والے سوال کو زبان دی۔

"میں دیکھتا ہوں۔" وہ کاغذات دیکھنے لگا۔ "جی مقتولہ کے وکیل کا نام ادھر مسعود خان لکھا ہے' لو جی وکیل صاحب کا کارڈ بھی ریکارڈ میں لگا ہوا ہے۔"

عدنان نے انسپکٹر سے کارڈ لے کر دیکھا اور پھر نادیہ کی طرف بڑھا دیا۔ نادیہ دیکھ رہی تھی کہ وزیٹنگ کارڈ پر جلی حروف میں ایڈووکیٹ مسعود خان تحریر تھا' دونوں انسپکٹر کا شکریہ ادا کر کے باہر آ گئے تھے۔

"اب کیا خیال ہے؟" عدنان نے پوچھا۔

"آج کی معلومات سے یہ پتہ چلا ہے کہ بابا آسیہ خاتون کی شوہر سے علیحدگی کا کیس ہی نہیں دیکھ رہے تھے بلکہ مقتولہ کی ماں نے انہیں ہی آسیہ کے قتل کے بعد بیٹی کے لیے وکیل کیا تھا۔"

"مسعود خان اس کیس میں مددگار ہوسکتے ہیں۔" عدنان نے کہا۔

"تم بابا سے ملنا چاہتے ہو۔" اس نے عدنان کی طرف دیکھا۔

"میں کل جا رہا ہوں مقتولہ کی والدہ کے گھر۔" وہ بولا۔

"کیوں؟" "وکالت نامہ سائن کروانا ہے اور انہیں راضی کرنا ہے کیس ری اوپن کرنا ہے۔"

"کیا رحیمہ خاتون ابھی زندہ ہیں۔" نادیہ نے پوچھا۔

"ہاں میں نے معلومات کرلی ہیں وہ حیات ہیں۔" وہ بولا۔ "میں واپس آ کر تمہارے بابا سے ملوں گا۔"

"ٹھیک ہے میں چاہتی ہوں کہ یہ کیس حل ہو اور آسیہ خاتون کو انصاف ملے اسے قتل کرنے والے کو قانون کے مطابق سزا ملے۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔" وہ کافی سنجیدہ تھا۔

وہ دونوں وہاں سے روانہ ہوگئے۔

❀......❀......❀

"تمہاری وکالت کیسی چل رہی ہے۔" مسعود خان نے نادیہ کو بلا کر پوچھا۔

"اچھی جا رہی ہے بہت کچھ سیکھنے کو مل رہا ہے۔" وہ بولی۔

"عدنان کیا کر رہا ہے؟" مسعود نے پوچھا۔

"وہ اسی آسیہ خاتون کیس پر کام کر رہا ہے۔" اس نے بتایا۔ "وہ آج مقتولہ کی ماں سے ملنے گیا ہے۔"

"کچھ معلوم ہوا ہے۔" مسعود خان نے پوچھا۔

"صرف یہ کہ قتل کے بعد مقتولہ کے وکیل آپ ہی تھے۔" وہ اب اپنے والد کو بغور دیکھ رہی تھی۔ "آپ کی مدد اس کیس کے لیے ضروری ہوگئی ہے۔"

مسعود خان کی آنکھوں میں موجود پریشانی نادیہ سے چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ "آپ شاید کچھ چھپا رہے ہیں۔"

"میں کچھ چھپا نہیں رہا ہوں۔" مسعود نے سر پیچھے کی طرف کیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ "ہاں یہ سچ ہے کہ مقتولہ آسیہ خاتون کا شوہر سے طلاق کا کیس بھی میرے پاس تھا اور اس کے قتل کے بعد میں ہی وکیل تھا۔"

"آپ تو بڑے نامی وکیل تھے پھر کیس بند کیوں ہوگیا؟" وہ تھوڑا جھنجلا کر بولی۔

"مجھے اس وقت آرام کرنے دو۔" مسعود خان کی آواز میں التجا تھی۔ "میں کل صبح تم سے بات کروں گا۔"

نادیہ نے بے بسی سے اپنے بابا کو دیکھا لیکن وہ مزید بات نہیں کرسکی اور کمرے سے نکلتی چلی گئی۔

❀ ...... ❀ ...... ❀

دھماکے کی آواز نے جیسے نادیہ کو جھنجوڑ ڈالا ہو۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی' پہلے پہل تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا' لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ وہ دھماکے کی آواز کسی فائر کی تھی اور آواز اتنی تیز تھی جیسے قریب سے آئی ہو۔ اس نے وقت کا تعین کیا تو صبح کے چھ بج رہے تھے وہ بستر سے باہر نکلی تو اس نے دیکھا کہ اس کا بھائی بھی بیدار ہے اور پریشانی کے عالم میں کمرے سے باہر آگیا ہے۔

''تم بھی دھماکے کی آواز سے جاگے ہو۔'' اس نے بھائی سے پوچھا۔

''گولی کی آواز تھی۔'' بھائی نے کہا۔

''چلو امی کی طرف چلتے ہیں۔'' اس نے کہا اور وہ آگے بڑھنا ہی چاہتی تھی کہ اس کی امی وہاں پہنچ گئیں' اور ان دونوں کو دیکھتے ہی بول پڑیں۔

''تم نے دھماکے کی آواز سنی۔''

''آپ تو خیریت سے ہیں۔'' نادیہ نے ماں کو سنبھالا اور بولی۔ ''بابا کیا کمرے میں ہیں؟''

''وہ وہاں نہیں ہیں۔'' امی نے بتایا۔

''کیا......؟'' نادیہ اور اس کا بھائی ایک ساتھ چیخے تھے اور پھر مکان کے دوسرے حصوں کی طرف دوڑ پڑے۔

انہیں جلد ہی ڈرائنگ روم میں بھیانک منظر دیکھنے کو مل گیا تھا۔ صوفے پر بیٹھے مسعود خان کی کنپٹی سے خون بہتا ہوا باہر کپڑوں تک آرہا تھا۔ نزدیک ہی پستول گرا ہوا تھا۔ نادیہ تو بالکل سکتے کی حالت میں آگئی تھی جب کہ ثمینہ خاتون کھڑے کھڑے ہی بے ہوش ہو کر گر پڑی تھیں۔

نادیہ کے بھائی نے نادیہ کو جھنجوڑا تو وہ چونکی۔ ''اپنے آپ کو سنبھالو ورنہ ایک سے زیادہ جانوں کا نقصان ہوسکتا ہے۔'' وہ چیخا۔

نادیہ نے پہلے ماں کو دیکھا جسے بھائی اٹھا رہا تھا' وہ ماں کو لے کر دوسرے کمرے کی طرف چلا گیا تو وہ اپنے والد مسعود خان کی طرف متوجہ ہوئی جس کی بے نور آنکھیں اس بات کی غماز تھیں کہ وہ دنیا سے رخصت ہوچکے ہیں۔ اچانک نادیہ کو لاش کے عین سامنے وہ کاغذ نظر آیا جس پر تحریر یہ بتا رہی تھی کہ مرنے سے پہلے مسعود خان نے یہ خط چھوڑا ہے۔ نادیہ نے کانپتے ہاتھوں وہ پرچہ اٹھایا اور پڑھنے لگی۔

''میری بیٹی نادیہ مجھے معاف کردینا' میرے دل پر برسوں سے بوجھ تھا وہ آج میری موت سے ختم ہوجائے گا' وہ بوجھ تھا آسیہ خاتون کے قتل کا' جس کے کیس کو دوبارہ کھولنے کا فیصلہ کرکے میرے لیے یہ آسانی پیدا ہوگئی کہ میں اپنے لیے موت کا راستہ چن سکوں' میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ میں آسیہ خاتون کی موت کا ذمے دار ہوں۔

یہ قصہ اس طرح شروع ہوتا ہے کہ مقتولہ آسیہ خاتون اپنے شوہر سے ناراض طلاق حاصل کرنے کے لیے میرے دفتر آئی' وہ اتنی خوبصورت تھی کہ میں خود پر قابو نہ رکھ سکا اور میرے اور اس کے درمیان نزدیکیاں بڑھتی چلی گئیں' وہ بھی یہی چاہتی تھی کہ میں اس کا ساتھ دوں لیکن میں ایک شادی شدہ شخص تھا اس لیے میرا تعلق دھیرے دھیرے کم ہونے لگا' یہ بات آسیہ بھی بھانپ گئی اور اس کے اور میرے درمیان جھگڑا رہنے لگا' پھر وہ مجھے بلیک میل کرنے لگی کہ اگر میں نے اس سے شادی نہیں کی تو وہ مجھ پر ریپ کا کیس کرے گی اور مجھے بدنام کردے گی' چنانچہ میں خود کو بچانے کے لیے ایک رات سوتے میں میں نے تکیے کی مدد سے اس کا دم گھونٹ دیا' اور یوں وہ موت کی آغوش میں چلی گئی۔

میں نے خود کو بچانے کے لیے مقتولہ کی ماں کو یہ بتایا کہ آسیہ کے شوہر اقبال نے طلاق کا بدلہ لینے کے لیے اسے قتل کیا ہے اور میں آسیہ کا وکیل بن کر اسے سزا دلوانا چاہتا ہوں' وہ مان گئیں اور میں ہی آسیہ کا وکیل نامزد ہوا' اور میں نے مقدمے کی کارروائی اس طرح چلائی کہ کیس میں کوئی جان نہیں رہے اور یوں وہ کیس بند ہوگیا۔

آسیہ کے قتل کے بعد میں بھی سکون سے نہیں رہا بس زندہ تھا۔ میں چاہتا تھا کہ مجھے سزا ملے لیکن بزدل تھا اس لیے خود کو سزا اسے بچانے کے لیے خاموش رہتا تھا لیکن جب اس کیس کی دوبارہ سے کارروائی کا پتہ چلا تو میں فکر مند ہوگیا اور پھر یہ کیس آگے بڑھنے لگا' تو مجھے یہ خوف ہوا کہ اب سچ چھپ نہیں سکے گا' مجھے سزا کا خوف نہیں تھا۔ میں اب اپنی بدنامی سے بھی نہیں ڈرتا تھا مجھے اپنی فیملی کے حقیقت کے سامنے آجانے کے بعد تم لوگوں کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ لہٰذا میں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ

آسیہ کے قاتل کو اب زندہ رہنے کا حق نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ میں خود کو اپنے ریوالور سے گولی مار کر خودکشی کر رہا ہوں' مجھے تم سب معاف کر دینا۔''

نادیہ کی آنکھوں میں آنسو اس رفتار سے رواں تھے کہ اس کا پورا چہرہ بھیگ گیا تھا۔ دفعتاً وہ چونک اٹھی کیونکہ بھائی واپس لوٹ آیا تھا۔

''میں نے پولیس اور ایمبولینس کو اطلاع دے دی ہے اور امی بھی ہوش میں ہیں تم ان کے پاس چلی جاؤ۔''

نادیہ نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنی امی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔



مسعود خان کے سوئم کے بعد نادیہ نے عدنان کے سامنے ان کا موت سے قبل لکھا ہوا خط سامنے رکھ دیا تھا۔ جو عدنان نے پڑھ ڈالا تھا۔ پھر بولا۔

''اس کا مطلب ہے کہ اب آسیہ قتل کیس اوپن ہوئے بغیر ہی مکمل ہو گیا۔''

وہ اپنی آنکھوں میں آنسو لیے عدنان کو دیکھ رہی تھی۔ ''کاش تم نے یہ کیس اوپن کرنے کی ضد نہیں کی ہوتی' کاش تم کوئی اور پرانا کیس لے لیتے۔'' وہ بولی۔

''میں اگر جانتا کہ یہ سب ہونے والا ہے تو شاید میں کیس اوپن کرنے سے متعلق سوچتا۔'' وہ بولا۔ ''لیکن شاید میں انجام جانتے ہوئے بھی یہ کیس ضرور اوپن کرتا۔''

''کیوں؟'' وہ چونک کر بولی۔ ''تم یہ جانتے جب بھی کہ تم جس سے محبت کرتے ہو اس کے والد اس جرم کے ذمے دار ہیں' تمہارے اس فیصلے سے اس لڑکی اور اس کے گھر کو نقصان پہنچ سکتا ہے پھر بھی تم یہ کیس اوپن کرتے۔''

''ہاں میں یہ کیس ضرور اوپن کرتا۔'' وہ بولا۔

''کیوں......'' وہ چیخی۔

''تم نے کیس فائل پڑھتے وقت یہ ضرور پڑھا ہوگا کہ آسیہ خاتون شادی شدہ تھی اور اس کا ایک بچہ بھی تھا۔'' وہ بولا۔

نادیہ اسے حیرانی سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ہاں فائل میں تحریر تھا۔''

''میں وہی بچہ ہوں میں مقتولہ آسیہ خاتون کا بیٹا ہوں۔'' وہ بولا۔

''کیا......'' نادیہ چونکی۔

''تم یقیناً حیران ہو اور شاید غصہ بھی کرو گی کیونکہ میں نے بہت کچھ چھپایا ہے تم سے۔'' وہ چپ ہوا تو نادیہ بولی۔

''بولتے رہو میں سن رہی ہوں۔''

''میں نے بڑے ہوتے ہی وکالت پڑھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مجھے اپنی ماں کو انصاف دلانا تھا لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ تم میری ماں کے قاتل کی بیٹی نکلو گی' تم سے ملاقات لاء کے فائنل ایئر میں ہوئی تھی' اور میں نے تمہیں پسند کر لیا تھا۔ اس معاملے میں میں نے دھوکا نہیں دیا تھا۔''

''لیکن جھوٹ تو بولا کہ تم مقتولہ کو نہیں جانتے ہو۔'' وہ بولی۔

''ہماری محبت کا یہ انجام ہوگا' یہ نہیں جانتا تھا۔'' عدنان نے کہا۔

''آج ہماری یہ آخری ملاقات ہے۔'' نادیہ نے فیصلہ سنایا۔

''ہم دونوں پوری عمر ایک چھت کے نیچے کبھی نہیں رہ سکیں گے۔ میرے بھائی اور ماں تمہیں بھی میرے والد کی موت کا ذمے دار مانتے ہیں اور میں اتنی مشکل زندگی نہیں گزارنا چاہتی۔''

''شاید یہی ہم دونوں کے لیے اچھا ہوگا' مجھے بھی یہ احساس رہے گا کہ میں نے اس شخص کی بیٹی کو جیون ساتھی بنایا ہے جس نے میری ماں کو قتل کیا ہے۔''

اس کے بعد وہ دونوں وہاں سے رخصت ہو گئے اور ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔



# آتش عشق

**مہتاب خان**

جذبات میں کیے جانے والے فیصلے کیا گل کھلاتے ہیں اس کے بارے میں کوئی سوچ لے تو کبھی انجان راہوں پر سفر نہ کرے۔
رانگ نمبر سے شروع ہونے والی محبت کا فسانہ



سنگلاخ پہاڑوں سے گھری وہ ایک نہایت سرسبز و شاداب وادی تھی، جو پشاور سے چند کلو میٹر دور واقع تھی اس وادی میں ایک گاؤں آباد تھا، جہاں روشنا اور سعد پروان چڑھے تھے کھلی فضا میں پروان چڑھنے والی اٹھارہ سالہ دوشیزہ روشنا کا حسن بے مثال تھا کہنے کو تو وہ ایک گاؤں تھا مگر جدید دنیا کی ہر سہولت وہاں موجود تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ یہاں رہنے والے افراد اپنی قدیم روایات سے بھی جڑے ہوئے تھے یہاں کئی قبیلے آباد تھے جن کی آپس میں دشمنیاں بھی تھیں روشنا اور سعد بھی ایسے ہی دو مخالف قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے۔

اتفاقیہ ملنے والی ایک رانگ کال سے ان دونوں کے درمیان گفتگو کا آغاز ہوا تھا جو سعد کی جانب سے اپنے کسی دوست کو کی گئی تھی اور روشنا سے جا ملی تھی پھر رفتہ رفتہ ان کے درمیان طویل گفتگو کا سلسلہ دراز ہوتا گیا تھا۔

کچھ ہی عرصے میں بات گفتگو سے بڑھ کر ملاقاتوں پر آ گئی تھی ان ملاقاتوں نے ان کے آتش شوق کو اور بھڑکا دیا تھا محبت کا شعلہ ان دونوں کے درمیان کب بھڑکا تھا اور کس طرح انہیں اس نے اپنی لپیٹ میں لیا تھا انہیں خبر نہیں ہوئی تھی۔ وہ جس راہ پر چل پڑے تھے وہ راہ پر خار تھی۔

روشنا کی سہیلی جو اس کی کزن بھی تھی نے سنا تو اپنا سر پیٹ لیا۔

''جانتی ہو آغا جان کبھی نہیں مانیں گے، وہ دشمن قبیلے کا فرد ہے۔''

''مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا میں روایات کے پہروں اور رسم و رواج کی پابندیوں کو نہیں مانتی۔'' روشنا کے جواب نے اسے چکرا کر رکھ دیا تھا۔

''کیا تم واقعی نہیں جانتیں یا تجاہل عارفانہ سے کام لے رہی ہو، تمہیں شاید احساس نہیں کہ تم نے کس راستے پر قدم رکھ دیا ہے اور جس برق رفتاری سے تم یہ پیش قدمی کر رہی ہو اس میں واپسی کا تمہیں اختیار نہیں ہوگا۔'' اس نے روشنا کو خبردار کیا، دونوں قبائل کی دشمنی بہت پرانی تھی روشنا کے دادا کو سعد کے قبیلے والوں نے بے دردی سے قتل کیا تھا جس کا بدلہ فوراً لے لیا گیا تھا قریب تھا کہ خون کی ندیاں بہادی جاتیں لیکن پیر صاحب جیسے باضمیر شخص نے دخل اندازی کی تھی جو دونوں قبیلوں کے لیے محترم تھے انہیں کی وجہ سے وہ جنگ ٹھنڈی پڑ گئی تھی پیر صاحب اب اس دنیا میں نہیں تھے یہ دبی چنگاریاں کسی وقت بھی شعلے کا روپ دھار سکتی تھیں اور یہ آگ کسی بھی وقت بھڑک سکتی تھی اس عشق کی بھنک بھی کسی کے کان میں پڑ گئی تو خیر نہیں ہے دادا کا قتل اور بات تھی مگر اب معاملہ عزت اور غیرت کا ہوگا اس لیے میری التجا ہے اپنے بڑھتے ہوئے قدم روک لو اور اس محبت سے باز آ جاؤ۔'' زرمین نے اس کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے۔

''تمہیں کیا لگتا میں ان باتوں سے بے خبر ہوں مگر اسے چھوڑنا میرے بس سے باہر ہے اس تصور سے ہی میری سانسیں رکنے لگتی ہیں اور میرا دل لرز جاتا ہے۔'' اس پر زرمین کے سمجھانے بجھانے کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

روشنا کے گھر سے کچھ فاصلے پر آبادی سے ہٹ کر ایک ویران کھنڈر تھا جو ان دونوں کی پناہ گاہ تھا اور جہاں ان دونوں کی ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں ان دونوں کے تعلق سے چند لوگ واقف تھے اور اس تاک میں تھے کہ انہیں ایک ساتھ پکڑا



جائے اور یہ موقع انہیں جلد ہی میسر آ گیا تھا ایک ملاقات میں انہیں دھر لیا گیا تھا۔

روشنا کو گھر کی چار دیواری میں قید کر دیا گیا سعد کو بھی اس کے ماں باپ کی نگرانی میں پابند کر دیا گیا تھا لیکن ان کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آئی تھی انہیں کسی پل قرار نہیں تھا۔

"بیٹا ہماری عزت کا واسطہ ہم سارے قبیلے میں رسوا ہو جائیں گے روشنا کا خیال اپنے دل سے نکال دے۔" ماں نے روتے ہوئے کہا۔

"بیٹا بپھرے ہوئے طوفان کو روک لے ورنہ ہم سب بے سروسامان ہو جائیں گے۔" باپ نے نشیب و فراز سمجھایا لیکن وہ عشق ہی کیا جس میں اضطراب نہ ہوا سے اعتدال میں لانے کے لیے ہر حربہ آزمایا گیا تھا۔

یہی ہنر روشنا پر بھی آزمایا گیا لیکن دونوں آزمائش کی بھٹی میں کندن بنتے گئے دونوں کی تڑپ میں ذرا فرق نہ آیا تھا۔

روشنا کے گھر والے حد سے زیادہ محتاط ہو گئے تھے اور جلد سے جلد اس کی شادی کر دینا چاہتے تھے غافل سعد کے گھر والے بھی نہیں تھے اور اس پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے روشنا کا موبائل فون اس سے چھین لیا گیا تھا۔

روایات کے مطابق روشنا کا رشتہ اس کا تایا زاد سے طے کر دیا گیا تھا اور گھر میں شادی کی تیاریاں ہونے لگیں اس آفت ناگہانی سے نمٹنے کے لیے اسے کوئی راستہ سجھائی نہ دیتا تھا کہ اس دن اس کی والدہ کا فون اس کے ہاتھ لگ گیا۔

اس نے موقع پاتے ہی سعد کا نمبر ملایا دونوں کا رابطہ بحال ہو گیا تھا۔

"روشنا یہ کیا ہو گیا؟" سعد کے لہجے میں زمانے بھر کا دکھ تھا۔ "جو کچھ ہوا سو ہوا یہاں میری شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں مگر میں شادی ہرگز نہیں کروں گی میں......!"

"تم کچھ نہیں کرو گی سن رہی ہو نا تم۔"

"گھبراؤ نہیں میں جان دینے کی بات نہیں کر رہی۔"

"پھر ہم کیا کریں کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔"

"بہتے دریا کا راستہ روکنا ممکن نہیں ہوتا اس کی روانی اپنا راستہ خود بناتی ہے کوئی متبادل راستہ ہمیں خود تلاش کرنا ہوگا۔" روشنا نے پرعزم لہجے میں کہا۔

"تمہارا کیا مطلب ہے ہم......!" سعد اس کی جرأت پر حیران تھا۔

"پہلے ہم منظر سے غائب ہو جائیں گے کچھ عرصے طوفان اٹھے گا ہمیں تلاش بھی کیا جائے گا مگر ہم بہت دور جا چکے ہوں گے۔"

"تم ہمیشہ مجھے اپنے ساتھ ثابت قدم پاؤ گی میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ کبھی تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا ہم ایک ساتھ جئیں گے اور ایک ساتھ مریں گے سعد نے فیصلہ کن لہجے میں کہا پھر کافی دیر ان دونوں میں عہد و پیماں ہوئے اور مستقبل کے خواب بنے گئے تھے۔

رات کا ایک بجا تھا سعد اپنے گھر میں دروازے کے قریب بچھی چارپائی پر لیٹا تھا تمام گھر والے گہری نیند سو رہے تھے اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی سعد نے پھرتی سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے روشنا برقع میں لپٹی کھڑی تھی۔

تم تیار ہو نا میں نے اپنا زیور اور کچھ کپڑے رکھ لیے ہیں ہاں ایک منٹ رکو میں اپنا بیگ لے کر آتا ہوں۔"

سعد اندر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا روشنا اندھیرے میں دروازے کے قریب دبکی کھڑی تھی سعد کو گئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک اندر سے ایک قد آور جیم شحیم شخص باہر آیا اور گونج دار آواز میں اس سے مخاطب ہوا۔

"لڑکی کون ہو تم اور رات کے اس پہر یہاں کیوں کھڑی ہو۔" وہ انتہائی پریشانی کے عالم میں پٹر پٹر اسے دیکھنے لگی

"وہ چاچا میں...... روشنا ہوں۔" وہ اٹکتے ہوئے بولی۔

"اللہ خیر...... اندر آؤ۔" اجنبی شخص نے بارعب لہجے میں کہا۔

وہ اس کے ساتھ اندر آ گئی اس وقت سعد بیگ کندھے پر لٹکائے آ گیا۔

"تم دونوں کہاں جا رہے ہو۔"

"ہم یہاں سے دور جا رہے ہیں بابا۔" سعد اچانک اپنے والد کو دیکھ کر حیرت پر قابو پا چکا تھا اور فیصلہ طلب نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"یہ طریقہ غلط ہے ہر کام کے دو طریقے ہوتے ہیں جائز اور ناجائز تم دونوں نے ناجائز طریقہ اپنایا ہے۔" وہ اپنے بیٹے کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہم جائز طریقے سے ایک ہونا چاہتے ہیں چچا جان لیکن......!" روشنا نے کہا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ کوئی نہ کوئی حل نکال لوں گا لیکن اس کے لیے تم دونوں کو میرے ساتھ تعاون کرنا پڑے گا۔"

"میں سعد کے لیے ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہوں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے تمہیں ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ اپنے گھر چلنا ہوگا تمہیں یہاں آتے کسی نے دیکھا تو نہیں۔"

"نہیں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"ابھی کچھ نہیں بگڑا مگر ہر گزرتا ہوا پل بہت کچھ بگاڑ سکتا ہے۔" وہ فیصلہ کن لہجہ میں بولا۔

"بابا آپ کیا کریں گے؟" سعد نے کہا تو انہوں نے اس کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔"

سعد کے والد روشنا کو لیے اس کے گھر کی سمت چلے گئے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ روشنا کے گھر والوں کا سامنا کیسے کرے گا یہ بات باعث تقویت تھی کہ روشنا خود ان کے گھر آئی تھی اسی کشمکش میں راستہ طے ہونے لگا پھر ایک خیال اس کے دل میں آیا جیسے یہ خاموشی سے آئی تھی اسی خاموشی سے واپس چلی جائے گی اس خیال سے اس کا دل مطمئن ہو گیا۔

روشنا کا گھر نزدیک آیا تو اس نے اجازت طلب کی۔

"تم جیسے آئی تھیں ایسے ہی خاموشی سے واپس چلی جاؤ یہی بہتر ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔"

"ہاں چچا جان یہی بہتر ہے لیکن آپ اپنا وعدہ یاد رکھنا ورنہ میری شادی کہیں اور کر دی جائے گی۔" وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ اس نے سر ہلایا اور واپس مڑ گیا۔

طوفان آتے آتے ٹل گیا تھا وہ گھر پہنچا تو بیٹے کو ہارے ہوئے جواری کی طرح بیٹھے پایا بظاہر اس نے حالات پر قابو پالیا تھا دو تین روز خیریت سے گزرے تھے مگر یہ طوفان سے پہلے کا سناٹا تھا چوتھے روز سعد اور روشنا اپنے اپنے گھر سے غائب تھے۔ دونوں گھرانوں میں ٹھن گئی تھی۔

"تمہارے بیٹے نے ہماری بیٹی کو ورغلا کر قہر خداوندی کو دعوت دی ہے۔" روشنا کے باپ نے سعد کے بابا سے کہا تھا۔

"میرے سیدھے سادے بیٹے کو گمراہ کرنے والی تمہاری بیٹی ہے وہ خود ہمارے گھر آئی تھی۔" اس نے انکشاف کیا قریب تھا کہ دونوں قبیلوں میں مسلح معرکہ ہو جاتا دونوں قبائل میں کہرام مچ گیا تھا قبیلوں کے بزرگ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے سر جوڑ کر بیٹھ گئے تھے، متفقہ فیصلہ ہوا کہ سارے قبیلے کے خلاف اعلان جنگ کرنے کے بجائے پہلے دونوں کو تلاش کیا جائے۔

دونوں قبیلے اس حقیقت سے واقف تھے کہ سعد اور روشنا کو ملک کا کون سا گوشہ پناہ دے سکتا ہے سعد بھی اپنے بزرگوں کی سوچ سے واقف تھا لہٰذا وہ ہر اس کنج عافیت سے دور رہا جہاں اس کے قبیلے والوں کی سوچ جا سکتی تھی۔

نوخیز جوانی کے دور میں عموماً جذبات پر عقل کے پہرے نہیں ہوتے یہ دونوں بھی جذبات کی رو میں بہہ کر گھر سے نکل آئے تھے سعد روشنا کو لے کر اجنبی راستوں کی طرف چل پڑا تھا ان کی منزل کراچی تھی۔

منزل پر پہنچ کر انہوں نے سکھ کا سانس لیا تھا لیکن اسٹیشن سے باہر نکلتے ہی انسانوں کا ایک ہجوم دیکھ کر دونوں گھبرا گئے تھے عملی زندگی کا دونوں کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔

ایک ٹیکسی والے نے اس گھبرائے ہوئے جوڑے کو غور

سے دیکھا سارا معاملہ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا اس کا آج کا شکار اسے مل گیا تھا۔
"ٹیکسی چاہیے بابو جی کہاں جانا ہے؟" وہ تیزی سے سعد کے قریب آ کر بولا۔
"ہاں، کسی اچھے ہوٹل لے چلو دراصل ہم پہلی بار کراچی آئے ہیں اس لیے یہاں کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔"
"فکر مت کرو آپ کی بہترین رہائش کا انتظام کروا دوں گا میں یہاں کے بہت سارے ہوٹل والوں کو جانتا ہوں آ ؤ گاڑی میں بیٹھو۔" پھر کچھ دیر ان میں کرائے وغیرہ کے بارے میں بات ہوتی رہی اور وہ دونوں اس کی ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔
ٹیکسی ڈرائیور بڑا چرب زبان تھا راستے میں دوران گفتگو اس نے سعد اور روشنا کے بارے میں تمام ضروری معلومات حاصل کر لی تھیں یہ تمام گفتگو پشتو میں ہوئی تھی اجنبی شہر میں ہم زبان شخص کا ملنا ان کے لیے خوشی کا باعث تھا اب ان میں بے تکلفی سے گفتگو ہو رہی تھی۔
"یہاں سیر و تفریح کے لیے آئے ہیں یا زیادہ دن رہنے کا ارادہ ہے۔" ڈرائیور نے سعد سے پوچھا تھا۔
ارادہ تو مستقل رہائش کا ہے مگر فی الحال ہم میاں بیوی حالات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں اگر مجھے یہاں ملازمت مل گئی تو کوئی گھر کرائے پر لے لیں گے۔
"ارے پہلے کیوں نہیں بتایا میں ایک شخص کو جانتا ہوں جو رہائش کا مسئلہ حل کر سکتا ہے اس کے شہر میں کئی مکان ہیں۔"
"بس تو ٹھیک ہے بھائی ہمیں ان کے پاس لے چلو، تمہاری بڑی مہربانی۔" ڈرائیور نے اطمینان کا سانس لیا تھا شکار پوری طرح اس کے قابو میں آ گیا تھا۔
بشیر قریشی نے کشادہ دلی سے دونوں کو خوش آمدید کہا تھا ٹیکسی ڈرائیور نے جب اس سے ان کی مدد کی درخواست کی تھی تو اس نے سعد کو ہر طرح سے تسلی دی تھی۔
"فکر نہ کرو لڑکے میری یہاں بہت دکانیں بھی ہیں میرے پاس کام کرنا، میں تمہیں معقول تنخواہ دوں گا اور گھر کا بندوبست تو سمجھ ہو گیا۔" سعد کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا وہ ان دونوں کے درمیان ہونے والے اشاروں کنایوں کو دیکھ نہیں پایا تھا کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر وہ دونوں کمرے سے باہر چلے گئے۔

تنہائی میسر آتے ہی روشنا نے سعد سے کہا تھا۔
"نیت نیک ہو تو منزل آسان ہو جاتی ہے دیکھو کتنی آسانی سے ہماری رہائش اور تمہاری ملازمت کا بندوبست بھی ہو گیا۔"
"ٹھیک کہتی ہو ورنہ اجنبی جگہ بہت سارے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔" سعد بہت خوش تھا۔
بشیر قریشی زیر زمین مافیا کا ایک سرکردہ فرد تھا اور شہر میں اس کے کئی غیر قانونی کاروبار چل رہے تھے اور وہ انسانی اسمگلنگ سے بھی وابستہ تھا وہ روشنا کی خوب صورتی دیکھ کر بڑا خوش ہوا تھا غیر ملکی منڈی میں وہ اس کی بہت اچھی قیمت وصول کر سکتا تھا۔
"ایسا مال لایا ہوں کہ طبیعت خوش ہو جائے گی آپ کی۔" ٹیکسی ڈرائیور ایک آنکھ دبا کر بولا۔
"دونوں گھر سے بھاگے ہوئے لگتے ہیں میری تجربہ کار آنکھیں دھوکہ نہیں کھا سکتیں۔"
"ہاں ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" وہ بے پروائی سے بولا اور نوٹوں کی ایک موٹی گڈی بشیر قریشی کی جیب سے ڈرائیور کی جیب میں منتقل ہو گئی۔
وہ دونوں کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے جب بشیر قریشی کا ایک ملازم ان کے لیے چائے اور دیگر لوازمات لیے کمرے میں آیا تھا ان دونوں نے چائے پی پھر انہیں کچھ ہوش نہیں رہا۔
رات گئے بشیر چار بندوں کے ساتھ کمرے کے اندر آیا وہ دونوں بے سدھ پڑے تھے اس نے اپنے شکار کا جائزہ لیا۔
"شاید زمان ان کو سپر ہائی وے والے ٹھکانے پر پہنچا دو میں دو روز بعد آؤں گا لڑکی کا خاص خیال رکھنا۔" اس نے ان میں سے ایک فرد کو مخاطب کیا نصف شب گزری تھی جب ایک کار اس بنگلے سے نکلی تھی اس کا رخ شہر سے باہر جانے والے راستے کی جانب تھا بے ہوش افراد کے ساتھ کار میں خوف ناک شکلوں والے نگران بھی بیٹھے تھے حالانکہ چار محافظوں کی ضرورت نہیں تھی بے ہوش افراد مزاحمت کے قابل نہیں تھے۔
ایک گھنٹے کے سفر کے بعد وہ گنجان آبادی سے باہر نکل آئے تھے۔
"لو جی سہراب گوٹھ آ گیا۔" ڈرائیور کے برابر بیٹھے ہوئے محافظ نے کہا۔

اسی وقت گدی پر پڑنے والے زوردار تھپڑ نے اس کے چودہ طبق روشن کردیے۔

"تم کو سفر کے آداب نہیں آتے ہوائیں بھی سرگوشیاں سن لیتی ہیں۔" پیچھے بیٹھا محافظ دانت پیس کر بولا۔

"مگر یہاں سننے والا کون ہے، یہ تو بے ہوش پڑے ہیں۔" مار کھانے والے نے احتجاج کیا۔

"کچھ بھی ہوسکتا ہے ایسی غلطی دوبارہ ہوئی تو غلطی کے قابل نہیں رہو گے۔"

"چھوڑو شیر زمان رفتہ رفتہ سیکھ جائے گا۔" ڈرائیور نے کہا۔

کچھ دور جا کر وہ کار مین شاہراہ چھوڑ کر ایک ذیلی سڑک پر مڑ گئی تھی آگے راستہ سنسان اور ویران تھا یہاں کسی قسم کی کوئی آبادی نہیں تھی دور بنا ایک وسیع وعریض بنگلہ ویرانی کا منظر پیش کررہا تھا کچھ دیر بعد وہ مطلوبہ مقام تک پہنچ گئے۔

قیدیوں کو منزل پر پہنچا کر ڈرائیور ایک محافظ کے ساتھ واپس چلا گیا تھا باقی دونوں محافظ آتشیں اسلحہ سے لیس تھے ان دونوں کو ایک کمرے میں بند کردیا گیا تھا سعد نہتا تھا اور لڑکی کسی شمار میں نہیں تھی لہٰذا فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔

جانے وہ رات کا کون سا پہر تھا جب سعد کو ہوش آیا تھا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا رفتہ رفتہ اس کی آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہونے لگیں اور دماغ پر چھائے ہوئے غبار کے بادل چھٹے تو کمرے میں موجود اشیا کے خدوخال واضح ہوگئے وہ ایک بیڈ پر دراز تھا اور روشنا بیڈ پر ایک جانب گٹھری بنی پڑی تھی سرہانے کی جانب ایک کھڑکی تھی جو بند تھی۔

صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے متعدد سوالات اس کے ذہن میں گردش کررہے تھے انہیں یہاں کیوں لایا گیا تھا اور یہ کیسے ممکن ہوا تھا فی الحال اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا قابل اطمینان بات یہ تھی کہ اس کی زندگی روشنا اس کے پاس موجود تھی اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو اس کا سر بری طرح چکرانے لگا وہ روشنا کی طرف متوجہ ہوا اس کی سانس ہموار تھی لیکن وہ ابھی بے ہوش تھی متاع حیات خطرے سے ہو تو اپنے دکھ ثانوی حیثیت اختیار کرجاتے ہیں۔

سعد نے خود پر قابو پایا اور اٹھ کر کھڑکی کے پٹ کھول دیے اس میں فولادی سلاخیں لگی ہوئی تھیں کھڑکی سے آنے والی مدہم روشنی میں اس نے دیکھا کمرہ جدید فرنیچر سے آراستہ تھا گویا یہ بشیر قریشی کا عشرت کدہ تھا اس نے تلخی سے سوچا۔

اسی وقت روشنا تھوڑا سا کسمسائی پھر اس نے آنکھیں کھول دیں اب وہ حالات سے بہتر طور پر نمٹ سکتا تھا۔

"شکر ہے تمہیں ہوش آ گیا۔" سعد نے کہا۔

"ہم کہاں ہیں یہاں ہمیں کون لایا؟"

"بشیر قریشی کی نیت ٹھیک نہیں لگتی وہ ہمیں اپنے کسی اور ٹھکانے پر لے آیا ہے۔"

"اب کیا ہوگا سعد۔" وہ فکر مندی سے بولی اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔

"ہم حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے ان شاء اللہ ہمارا بال بھی بیکا نہیں ہوگا تم مجھ پر بھروسہ رکھو تم تک پہنچنے سے پہلے اسے میری لاش پر سے گزرنا ہوگا۔"

"تم کیسے اس کا مقابلہ کرو گے؟" وہ نقاہت سے بولی۔

"تم اپنے خوب صورت سر کو ان تفکرات سے آزاد ہی رکھو۔"

سورج طلوع ہوچکا تھا بند دروازے کے دوسری جانب زندگی کے آثار نمودار ہوگئے تھے جیسے ہی دروازے پر کھٹ پٹ ہوئی دونوں نے لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں۔

کچھ دیر بعد دو مسلح افراد کمرے میں داخل ہوئے۔

"یہ تو ابھی تک ہوش میں نہیں آئے لگتا ہے خواب آور دوا کی زیادہ مقدار انہیں دی گئی تھی۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"میری انگلی ٹریگر پر ہے تم احتیاط سے لڑکی کو باہر لے جاؤ اور باس کے کمرے میں پہنچا دو۔" شیر زمان نامی شخص نے اپنے ساتھی سے کہا۔

اب سعد کے لیے آنکھیں بند رکھنا ممکن نہیں رہا وہ اس کی توقع سے زیادہ چالاک نکلے تھے اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے، تم ایسا نہیں کرسکتے روشنا کو ہاتھ لگانے سے پہلے تمہیں مجھ سے مقابلہ کرنا ہوگا۔" "ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔" سعد اٹھ کر بیٹھ گیا کلاشنکوف کا رخ اس کے سینے کی جانب تھا۔

"کسی قسم کی مداخلت کی تو تمہارے سینے میں اتنے سوراخ کردوں گا کہ کوئی گن نہیں سکے گا۔"

روشنا بھی اٹھ بیٹھی تھی اور اس صورت حال نے اسے

حواس باختہ کر دیا تھا وہ زور زور سے رونے لگی تھی شیر زمان نے دوٹوک لہجے میں کہا۔
"باس پرسوں آئیں گے جو کچھ کہنا سننا ہے ان سے کہنا ہمارے ذمہ ایک تو لڑکی کی نگہداشت اور دوسرے مداخلت کی صورت میں تم کو آخری سفر پر بھیجنا ہے باس تمہارے خون سے ہاتھ رنگنا نہیں چاہتے مگر تم نے مزاحمت کی تو تمہیں مار دیا جائے گا۔" شیر زمان نے سفاک لہجے میں کہا وہ جانتا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس پر عمل بھی کر سکتا ہے لیکن دل کو یہ اطمینان بھی تھا کہ روشنا کو فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں تھا۔
"آس پاس کی تمام زمین باس کی ملکیت ہے یہاں ان کے حکم کے بغیر پرندہ پر نہیں مار سکتا، اس لیے یہاں سے فرار ہونے یا کوئی اور چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔" شیر زمان نے کہا اور ساتھی کو اشارہ کیا وہ جیسے ہی روشنا کی طرف بڑھا سعد پھرتی سے اٹھا اور ان کے اور روشنا کے درمیان آ گیا اور اسے زوردار دھکا دیا وہ سنبھلنے کی کوشش میں زمین بوس ہو گیا اسی وقت کمرہ گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھا۔
شیر زمان نے صرف ایک برسٹ مارا تھا گولیاں زن سے سعد کے سر کے اوپر سے گزر گئیں روشنا نے ایک زوردار چیخ ماری تھی سعد سکتے میں رہ گیا تھا۔
"یہ صرف تمہیں حد میں رکھنے کے لیے ایک اشارہ تھا۔" اس نے پرسکون اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔
سعد اندر سے کانپ کر رہ گیا تھا زندگی میں پہلی بار اس نے موت کو اتنے قریب سے دیکھا تھا وہ دونوں روشنا کو لے کر باہر نکل گئے اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔
کچھ دیر بعد وہ اٹھا اور دروازے پر زور زور سے مکے برسانے لگا۔
"اب کیا تکلیف ہے۔" ایک کرخت آواز آئی۔
"خدا کے لیے دروازہ کھولا مجھے روشنا کے ساتھ قید کر دو۔"
"چپکے بیٹھے رہو ذرا بھی آواز نکالی تو تمہاری اس بلبل کا گلہ دبا دوں گا۔" اس نے کہا۔
"وہ میری وجہ سے در بدر ہوئی ہے جو سزا دینی ہے مجھے دو اسے مجھ سے جدا نہ کرو۔" وہ التجا کرتے ہوئے بولا۔
"اس جدائی کی تمہیں عادت ڈالنی ہوگی اس کو بھول جاؤ۔" وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔

شیر زمان لہجہ اور انداز سے تعلیم یافتہ لگتا تھا لیکن اس کی سفاکی میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی سہ پہر کو شیر زمان کھانے کی ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔
"کھانا کھا لو، لڑکی ٹھیک ہے اس نے کھانا کھا لیا ہے۔" شیر زمان نے نرم لہجہ میں کہا۔
"بھائی خدا کے لیے ہمیں چھوڑ دو، ہم نے گھر سے بھاگ کر بہت بڑی بھول کی ہے۔"
"تم دونوں گھر سے بھاگے ہوئے ہو؟" اس نے حیران نظروں سے اسے دیکھا۔
"بشیر کے ہتھے کیسے چڑھے؟" وہ کرسی کھینچ کر ان کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔
سعد نے شروع سے اپنی رام کہانی اسے سنا دی۔
"ہم نے روایات سے بغاوت ضرور کی ہے اور اس کا خمیازہ بھگتنے لیے بھی تیار ہیں ہم نے شادی نہیں کی مگر ہم دونوں پاک دامن ہیں۔" سعد نے کہا۔
"تم نے شادی کیوں نہیں کی معاشرے کو گواہ کیوں نہیں بنایا۔"
"ہنگامہ خیز حالات نے اس کا موقع نہیں دیا۔" وہ شرمندگی سے بولا۔
"بشیر بہت خطرناک ہے اس کے چنگل سے نکلنا آسان نہیں ہے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں تم لوگوں کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔" اس نے کہا اور باہر چلا گیا۔
اگلے دن رات گئے بشیر قریشی آ گیا تھا آتے ہی اس نے شیر زمان سے ان دونوں کے بارے میں دریافت کیا تھا سب قابو میں ہے کی رپورٹ ملنے پر اس نے اطمینان کا اظہار کیا تھا۔
"لڑکی کہاں ہے؟"
"آپ کے کمرے میں۔"
بشیر تیزی سے اپنے کمرے کی جانب بڑھا شیر زمان بھی اس کے ساتھ تھا اس نے دروازہ کھولا اور دونوں کمرے کے اندر داخل ہو گئے انہیں دیکھ کر روشنا ششدر رہ گئی۔
"ٹھیک ہے تم جاؤ۔" بشیر شیر زمان کی طرف دیکھ کر بولا مگر شیر زمان کے قدم تو جیسے زمین نے جکڑ لیے تھے بشیر روشنا کی طرف بڑھا اور اس کے سر سے دوپٹا کھینچ کر زمین پر پھینک دیا۔

روشنا ایک چیخ کے ساتھ ”بھائی مجھے بچالو“ کہتی ہوئی دوڑتی ہوئی شیر زمان کے سینے سے آ لگی۔ روشنا کا اسے بھائی کہنا اس کے لیے عجیب تجربہ تھا وہ جذبات کی رو میں بہہ رہا تھا وہ ایک خوشبودار لمحہ تھا جو اس کے دل پر اور اس کے ضمیر پر دستک دے رہا تھا یہ سب اس کے لیے غیر متوقع تھا وہ ایک سفاک انسان تھا مگر اس لڑکی کے معصومیت اور سادگی سے کہے ایک لفظ نے اسے پاکیزہ رشتے سے باندھ لیا تھا برائی کی راکھ تلے دبی غیرت نجانے کس طرح شعلہ بن گئی تھی۔

”تم ابھی تک کمرے میں ہو دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ بشیر روشنا کی طرف بڑھتے ہوئے بولا اس نے روشنا کو آہستگی سے پیچھے دھکیلا اور بشیر سے کہا۔

”اس سے دور رہو ورنہ۔“

”ورنہ کیا؟“ قریب تھا کہ وہ روشنا کی کلائی تھام لیتا اسی وقت شاہ زمان کی کلاشنکوف نے برسٹ اگلا اور بشیر کے جسم میں بے شمار سوراخ کردیے۔ جس سے خون ابل پڑا تھا اس کی کھلی ہوئی آنکھوں میں حیرت جمی ہوئی تھی وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گرا پڑا تھا روشنا چکرا کر رہ گئی تھی وہ تیزی سے کمرے سے نکل گیا تھا روشنا بھی اس کے پیچھے باہر لپکی اس کا رخ سعد کے کمرے کی طرف تھا۔

سعد اس پورے معاملے سے بے خبر تھا مگر کلاشنکوف کی آواز سے وہ پریشان ہو گیا تھا اور بند دروازے پر مکے برسا رہا تھا اس وقت شیر زمان کا ساتھی دوڑتا ہوا آیا اور کہا۔

”یہ کیسی آواز تھی، کیا لڑکے کو مار دیا۔“ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور سعد کی آواز آئی۔

”دروازہ کھولو وہاں کیا ہو رہا ہے۔“ ساتھی کی توجہ لمحہ بھر کے لیے آواز کی سمت ہوگئی شیر زمان کے لیے اتنا موقع کافی تھا وہ تیزی سے آگے بڑھا اس کا کلاشنکوف والا ہاتھ گھوما اور اس کے سر پر ایک زوردار ضرب لگائی ساتھی وہیں ڈھیر ہو گیا وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

شیر زمان نے دروازہ کھولا تو سعد تیزی سے باہر نکلا۔

”یہاں کیا ہوا ہے؟“ اس نے اس کے ہوش ساتھی پر ایک نظر ڈال کر شیر زمان سے پوچھا روشنا بت بنی کھڑی تھی پے در پے پیش آنے والے ان واقعات نے اسے حواس باختہ کر دیا تھا۔

”بشیر کو جہنم واصل کر دیا ہے۔“ شیر زمان نے اطمینان بھرے انداز میں کہا۔

سعد چکرا کر رہ گیا تھا شیر زمان کا کردار اس کی فہم و فراست سے باہر تھا۔

”بھائی میں آپ کا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھوں گی۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔ ”تم نے میری ناموس کی حفاظت کے لیے اس کو مار ڈالا تم میرے لیے سگے بھائیوں سے بڑھ کر ہو ہمیں اپنے گھر جانے دو ہم نے گھر سے بھاگ کر بہت بڑی غلطی کی تھی جس کی ہمیں سزا مل گئی ہے۔“ روشنا کے یہ جملے سن کر تمام معاملہ سعد کی سمجھ میں آ گیا تھا۔

”روشنا ٹھیک کہہ رہی ہے بھائی ہم سے بڑی بھول ہوئی ہے۔“ سعد نے شرمندہ لہجے میں کہا۔

”وہ جگر کے آر پار ہونے والی نظروں سے سعد کو دیکھ رہا تھا، تمہارا قصور اتنا بڑا ہے کہ تمہیں جان سے مار دینا چاہیے۔“ اس نے سخت لہجے میں کہا۔

”ہمیں معاف کردیں بھائی۔“ وہ بولا۔

اچانک روشنا کے دل میں خواہش بیدار ہوئی کہ وہ شیر زمان کے کندھے سے لگ کر رو دے اور اس نے یہی کیا۔

”چپ کرو یہ سب گھر سے قدم نکالنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا ایک لڑکی جب گھر سے باہر قدم رکھتی ہے تو اپنے ساتھ اپنے گھر والوں کی عزت کو بھی ساتھ لے جاتی ہے تم نے اپنی عزت کے ساتھ اپنے گھر والوں کی عزت کو بھی مٹی میں ملا دیا، لوگ یہ نہیں کہیں گے کہ روشنا بھاگی تھی بلکہ یہ کہیں گے کہ فلاں کی بیٹی یا فلاں کی بہن بھاگی تھی۔ لڑکی کا اٹھایا ہوا ایک غلط قدم اس کے گھر والوں کو زندہ درگور کر دیتا ہے۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”بس چپ ہو جاؤ تم دونوں اپنے اپنے گھر جاؤ اور اپنے بزرگوں سے معافی مانگو۔“ شیر زمان نے اس کے سر پر اپنا بھاری بھرکم ہاتھ رکھ دیا۔

”میری خطا بھی معاف کردیں۔“ سعد اس کے قریب آیا۔ سارے بادل چھٹ گئے تھے شیر زمان نے ان دونوں کو اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔

”میرے پیچھے پیچھے آؤ۔“ کچھ دیر بعد شیر زمان نے ان کو اشارہ کیا اس نے انہیں اپنی کار میں بٹھایا اور وہاں سے روانہ ہوگئے کار میں خاموشی چھائی ہوئی تھی پھر اس خاموشی کو شیر زمان کی آواز نے توڑا۔

''کیا سوچ رہے ہو تم دونوں۔''

''سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کریں آپ کے خیال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔'' سعد نے کہا۔

''مردانہ وار حالات کا مقابلہ سب سے پہلے گھر جاؤ اور سب سے معافی مانگو ویسے ہر شخص کو اپنی منشا کے مطابق زندگی گزارنے کی آزادی ہے اور یہ حق تو ہمارا مذہب بھی ہمیں دیتا ہے، مجھے امید ہے کہ وہ تمہاری مرضی کے مطابق فیصلہ کریں گے۔''

''وہ ہمیں قتل کر دیں گے آپ ہماری قبائلی روایات سے واقف نہیں ہیں جرگہ ہمارے بارے میں فیصلہ دے چکا ہوگا۔ ہمارے وہاں پہنچتے ہی ہمیں جرگے کے حوالے کر دیا جائے گا۔ پھر ہم ان کے رحم و کرم پر ہوں گے۔'' سعد نے کہا۔

''وہ ہمارے ٹکڑے کر دیں گے بھائی آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' روشنا خوفزدہ لہجے میں بولی۔

''کیسی باتیں کر رہی ہو تم اتنی کمزور نہیں ہو، جو شیر زمان جیسے شخص کا دل بدل دے وہ کمزور کیسے ہو سکتی ہے تم میں طوفان کا رخ بدلنے کی صلاحیت ہے۔''

وہ لوگ اسٹیشن پہنچ گئے تھے شیر زمان نے ان کے لیے پشاور جانے والی ٹرین کے ٹکٹ لیے کچھ ہی دیر میں ٹرین روانہ ہونے والی تھی۔

''سعد پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے ملک سے جرگہ سسٹم کا خاتمہ ہو گیا ہے پھر بھی میں میڈیا کے نمائندوں کو خبر کر رہا ہوں وہ ایسی خبروں کی تاک میں رہتے ہیں فی الحال تم دونوں جاؤ میں بھی جلد تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا اور اس وقت تک خود کو قانون کے حوالے نہیں کروں گا جب تک روشنا کی تم سے شادی نہیں ہو جاتی۔''

شیر زمان نے انہیں پشاور جانے والی ٹرین میں بٹھا دیا تھا بوجھل دل کے ساتھ روشنا اس منہ بولے رشتے سے رخصت ہوئی تھی جاتے جاتے شیر زمان نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دی تھیں پھر وہ سعد کی طرف متوجہ ہوا۔

''مرد کا بچہ بننا ہے اور عقل کا استعمال کرنا ہے سمجھ گیا نا۔'' سعد نے اثبات میں سر ہلایا۔

''آپ بھی ہوشیار رہنا بلکہ زیادہ بہتر تو یہی تھا کہ آپ ہمارے ساتھ چلتے یہاں پولیس کسی بھی وقت آپ کو گرفتار کر سکتی ہے۔'' اس نے ڈھکے چھپے الفاظ میں تنبیہہ کی۔

ایک طویل سفر کا آغاز ہو گیا تھا وہ موت کی وادی طرف بڑھ رہے تھے دونوں جانتے تھے کہ وہاں پہنچتے ہی انہیں ختم کر دیا جائے گا دنیا میں کہیں ان کے لیے جائے پناہ نہیں تھی اس خیال نے دونوں کو افسردہ کر دیا تھا۔

دونوں کے وہاں پہنچتے ہی ایک بار پھر پوری بستی میں ہل چل مچ گئی تھی پرجوش نوجوانوں نے اسلحہ اٹھا لیا تھا دونوں پر ہر طرف سے طعن و تشنیع کی بارش ہو رہی تھی ہر شخص انہیں برا بھلا کہہ رہا تھا۔ قریب تھا کہ دونوں قبیلوں میں جنگ چھڑ جاتی۔ مگر جرگے کے سرکردہ افراد نے پرجوش نوجوانوں کو یہ کہہ کر ٹھنڈا کر دیا تھا کہ ان دونوں کی قسمت کا فیصلہ جرگہ کرے گا دونوں کو پابند سلاسل کر دیا گیا تھا اور جرگے کا انعقاد دو دن بعد کیا جانا تھا۔

روشنا اور سعد کی دعائیں بے اثر ہو گئی تھیں شیر زمان کا کوئی پتا نہیں تھا کہیں شیر زمان کو پولیس نے دھر نہ لیا ہو یہ سوچ کر روشنا کا دل بیٹھ جاتا تھا کہیں سے امید کی کوئی کرن دکھائی نہ دیتی تھی پھر یہ دو دن بھی پر لگا کر اڑ گئے تھے اس دن کا سورج طلوع ہو چکا تھا جب مخصوص جگہ جرگے کا انعقاد ہونا تھا منتظمین یہ دیکھ کر حیران ہو گئے تھے کہ وہاں میڈیا کے نمائندے پہلے سے موجود ہیں چاروں جانب کیمرے سیٹ کیے جا چکے تھے اور میڈیا کے رپورٹر اور نمائندے چاروں اطراف پھیلے ہوئے تھے۔

پھر آہستہ آہستہ بستی کے افراد آنا شروع ہوئے اور وہ مخصوص میدان لوگوں سے کھچا کھچ بھر گیا۔

جرگے کے سرکردہ افراد بھی سر جوڑے بیٹھے تھے دونوں گھرانوں کے افراد بھی آ گئے تھے پھر مجرموں کو بلایا گیا تھا۔ وہ دونوں سر جھکائے کھڑے تھے ہر شخص سانس روکے بیٹھا تھا ہر شخص جانتا تھا کہ موت دونوں کا مقدر بن چکی ہے۔

اس سے پہلے کہ انہیں سزا سنائی جاتی پولیس کی بھاری نفری وہاں پہنچ گئی اور غیر قانونی جرگے کے جرم میں سرکردہ افراد کو گرفتار کر لیا گیا وہاں ایک طوفان برپا ہو گیا تھا لیکن پولیس نے جلد ہی اس پر قابو پا لیا تھا۔

فی الحال خطرہ ٹل گیا تھا مگر ایک جرگہ ابھی باقی تھا جو دونوں گھرانوں کے افراد نے منعقد کیا تھا ان دونوں نے قبائلی روایات سے روگردانی کی تھی جس کی سزا انہیں ملنی تھی۔

دونوں قبائل کے سرکردہ افراد اور دونوں گھرانوں کے بزرگ سعد کے گھر بیٹھے تھے سعد اور روشنا بھی وہاں موجود تھے کہ اچانک ایک نوجوان نے اندر آنے کی اجازت طلب کی سعد نے سر اٹھایا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ شیر زمان تھا سعد کی نظروں کے تعاقب میں روشنا نے بھی اسے دیکھ لیا تھا اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

دونوں طرف سے تند و تیز جملوں کے تیر برسائے جا رہے تھے ایک دوسرے پر الزام تراشی کی جارہی تھی وہاں ایک شور اور ہنگامہ بپا تھا اسی وقت شیر زمان کی آواز گونجی اس نے کچھ کہنے کی اجازت مانگی تھی جو کچھ پس و پیش کے بعد عطا کر دی گئی تھی۔

شیر زمان نے کہا۔

''کراچی میں روشنا اور سعد میرے پاس تھے میں نے ہی انہیں سمجھا بجھا کر گھر واپس جانے کا مشورہ دیا تھا میں جانتا ہوں ان دونوں نے گھر سے بھاگ کر خاندانی روایات سے بغاوت کر کے ناقابل معافی جرم کا ارتکاب کیا ہے مگر فیصلہ سنانے سے پہلے ان محرکات کو ضرور پیش نظر رکھیں جس کی بنا پر نوجوان بے راہ روی کا شکار ہو رہے ہیں ان بچوں کو سزا دینے سے پہلے ان وجوہات کو تلاش کرنا ضروری ہے میرا اشارہ ان ترغیبات کی طرف ہے جو کچے ذہنوں پر اثر انداز ہو رہے ہیں یہ ہم سب کے لیے لمحہ فکریہ ہیں ہمارے رسل و رسائل اشتہارات فلمیں ٹی وی ڈرامے ان کے موضوع اور انہیں پیش کرنے کا انداز نیٹ موبائل فونز ان چیزوں کے فوائد سے انکار نہیں ہے مگر ان کا غلط استعمال اور بے جا آزادی ان کے لیے وبال ہے۔

انہیں سزا دینے سے پہلے ایک بار اپنی غلطیوں پر بھی نظر ثانی کیجیے انہیں سمندر میں دھکیل کر خشک رہنے کی تلقین کرنا حماقت کے سوا اور کیا ہے۔''

ایک بزرگ نے کہا ''ان کو معاف کر کے ہم برائی کی راہ ہموار کر دیں تاکہ کل کوئی اور جوڑا اس حرکت کا ارتکاب کرے ہرگز نہیں ہم ان کا سر قلم کریں گے۔''

وہ بولا۔

''اگر ان دونوں کے سر قلم کر دینے سے کسی کو کوئی فائدہ ہوتا تو میں خود ان کے سر قلم کرنے کی حمایت کرتا مگر یہ دونوں بے قصور ہیں ان سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا یہ جیسے گئے تھے ویسے ہی واپس آئے ہیں اور اپنے کیے کی سزا بھی خوب بھگت چکے ہیں۔''

''تمہیں جو کہنا تھا کہہ چکے ہم اپنی روایات کے مطابق عمل کریں گے۔'' وہی پرجوش بزرگ دوبارہ بولے۔

جو لوگ آتش فساد کو بھڑکا رہے ہیں وہ کان کھول کر سن لیں روشنا کو میں اپنی بہن کہہ چکا ہوں اور اس کی حفاظت کرنا میں خوب جانتا ہوں سعد کو بھی اپنا چکا ہوں اس لیے کوئی اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا فساد کو ہوا دینے والے میرے دشمن ہوں گے اور دوسری بات میڈیا کے نمائندے یہاں موجود ہیں اور یہ خبر عام ہو چکی ہے اگر انہیں کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی تو آپ سب کو گرفتار کر لیا جائے گا، اگر آپ انہیں قبول نہیں کریں گے تو میرے دروازے ان کے لیے کھلے ہیں۔''

وہاں خاموشی چھا گئی تھی کچھ دیر بعد دونوں گھرانوں کے افراد صلاح و مشورے کرنے لگے ان کی گفتگو سن کر غصہ ور بزرگ اٹھ کر چلے گئے تھے۔

صلاح و مشورے کے بعد دونوں قبیلوں میں اس بنیاد پر دوستی کی بنیاد رکھی گئی کہ سعد اور روشنا کی شادی کر دی جائے اور لڑکی کے والد کو یہ حق دیا گیا کہ وہ سعد پر من چاہا جرمانہ عائد کر سکتے ہیں۔

''میں جرمانہ عائد کر کے کیا کروں گا میرا جو خسارہ ہونا تھا ہو گیا۔'' روشنا کے باپ نے کہا تھا۔

''بابا روشنا کا بھائی ہونے کے ناتے میں آپ کے ہر خسارے کو فائدے میں بدل دوں گا چاہیں تو آزما کر دیکھ لیں۔'' شیر زمان نے آگے بڑھ کر انہیں بازوؤں میں جکڑ لیا یہ شادی ناقابل فراموش رہی تھی دونوں قبائل میں برسوں پرانی دشمنی دوستی میں بدل گئی تھی۔

شیر زمان نے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا تھا بشیر قریشی کے غیر قانونی خفیہ ٹھکانوں اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کرانے میں مدد کی بنا پر اس کی سزا میں خاصی تخفیف ہو گئی تھی۔



# فن پارے

دیس بدیس نئے اور پرانے لکھاریوں کی

رنگا رنگ تحریریں جو آپ کے دل کو چھو لیں گے



| تارا پری | عمارہ کنول |
|---|---|
| عبداللہ | نورین مسکان |
| بوجھ | صوفیہ کاشف |
| کہانی کار | ابن عبداللہ |
| بے لگام محبت | عثمان غنی |
| مقصد | سنبل خان بٹ |

# تارا پری
## عمارہ کنول

اس کے دروازے کے باہر بہت شور وغل تھا۔دروازہ زور زور سے پیٹا جا رہا تھا۔لوگ چلا رہے تھے۔بھیڑ میں کچھ شناسا آوازیں بھی تھیں یہ فاحشہ ہے۔کنجری ہے۔آج سارے کنجر ماردو۔بڑی شریف بنتی تھی اسٹیج ڈانسر ہے۔یہ ہم شریفوں میں رہنے کے قابل نہیں ہے۔

وہ متوحش سی ننگے پاؤں ننگے سر باہر آئی مجمع دیکھا۔اُس کا سانس پھولا ہوا تھا۔سر پر دوپٹہ لٹک رہا تھا۔آنکھوں میں سرخی سی چھائی ہوئی تھی۔دروازے پر دستک سے پہلے ہی وہ روتی رہی تھی۔سوجن اس کی آنکھوں سے ظاہر تھی۔وہ ایک عجیب سے مخمصے میں تھی کہ اس کے دروازے پر زور سے پیٹنے کے انداز میں دستک ہوئی۔یہ اس کے اپنے تھے محلے دار تھے یہ وہ سب تھے جنہیں وہ بچپن سے ماموں، چچا کہتی آئی تھی۔اسے دیکھ کر مجمع کو سانپ سونگھ گیا۔

''کیا بات ہے؟''اس نے ڈرتے ڈرتے پریشان لہجے میں سوال کیا۔

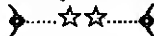
''کیا ہوا؟ آپ سب یہاں کیوں ہیں؟''اپنی آواز اسے خود بھی اجنبی سی لگی۔

''کیا ہوا......؟''

''آپ سب ایسے یہاں جمع کیوں ہیں؟ کیا بات ہے؟''

اس کو جواب کوئی نہیں مل رہا تھا۔سب اس کو تکے جا رہے تھے۔کچھ آنکھوں میں نفرت کا اظہار تھا تو کچھ کے غصے کے مارے نتھنے پھول پچک رہے تھے۔

اور اس کا سانس سینے میں جیسے اٹک رہا تھا اور جان جیسے سولی پہ ٹنگی تھی۔



وہ بہت خوبصورت تھی بچپن میں جانے کس نے اسے پری کہہ کر پکارا کہ پھر اس کا مستقل نام ہی پری پڑ گیا۔اس کا اصل نام طاہرہ تھا مگر اب وہ نام یاد کس کو شوبز کی دنیا میں اس کا نام تارا پری تھا۔آج اس کی سالگرہ تھی، بیک اسٹیج سب نے کیک کاٹا۔اسے دعائیں دی، تحفہ دینے کی کوشش کی تو اس نے کہا۔

''میں گھر کیسے لے کر جاؤں گی آپ کے تحائف؟''

تو ڈائریکٹر صاحب نے کہا۔''پھر پیسے لینے پڑیں گے۔''

تارا نے پوچھا۔''کیوں؟''

تو وہ بولے۔''اب چھوٹی بہنوں کی سالگرہ ہو تو وہ جھگڑ کے پیسے یا تحفہ لیتی ہیں۔اب تحفے سے تم نے انکار کر دیا ہے تو پیسوں کا جرمانہ تو بنتا ہے ناں۔''ڈائریکٹر صاحب نے کیک تارا پری کے منہ میں ڈالتے ہوئے کہا، سب ہنس پڑے۔

اتنے میں گارڈ کی کسی کے ساتھ بحث کی آوازیں آنے لگیں، پوچھنے پر پتا چلا کہ کوئی تارا پری سے ملنا چاہتا ہے اور گارڈ اسے روکنے کی سر توڑ کوشش کر رہا ہے۔ڈرامہ شروع ہو چکا تھا وہ فنکار اپنی انٹری کے لیے بھاگے اور باقی سب گارڈ کی طرف چل دیے۔شور وغل مچانے والا کوئی امیر و کبیر شخص لگ رہا تھا جو پوری طرح ٹن تھا۔

ڈائریکٹر صاحب نے پوچھا۔''کیا بات ہے بھئی؟''

تو وہ شرابی بولا۔''میں تارہ پری کا سب سے بڑا فین ہوں اور اس کی ایک رات خریدنا چاہتا ہوں۔''

اس کے فین ہونے کا سن کر جہاں تارہ پری کے اندر کے فنکار کو خوشی ہوئی وہیں رات خریدنے کی بات سن کر تارہ پری کا چہرہ تاریک پڑ گیا۔وہ تڑپ کر آگے بڑھی اور ایک تھپڑ شرابی کے منہ پر جڑ دیا۔''کنجری نہیں ہوں میں، بکاؤ مال نہیں ہوں، ایک جیتا جاگتا سانس لیتا وجود ہوں میں۔دفعہ ہو جاؤ یہاں سے ورنہ میں تمہیں مار دوں گی۔''

ڈائریکٹر صاحب نے بمشکل تارہ پری کو سنبھالا اور اندر لے آئے تارہ پری کو انٹری کرنا تھی جو کچھ ہوا اُسے بھلا کر اسٹیج پر

ستارے کی طرح چمکتا اور پارے کی طرح تھرکتا تھا۔



وہ گھر آئی سب سو چکے تھے اس نے شام سے کیک کے سوا کچھ نہیں کھایا تھا۔ کچن گئی فریج میں جھانکا سب خالی تھا۔
بہن کے کمرے سے فون پر بات کرنے کی آواز آئی، جا کر کھانے کا پوچھا تو وہ بولی۔ "آج کھانا باہر کھایا ہے سب نے وہ عادل بھائی کے بیٹے کو چوٹ لگ گئی تھی تو اُس کا دل بہلانے گئے تھے سب، بس پھر گھر واپسی پر کھانا باہر ہی کھا لیا۔ آپا آپ نے اپنے پارلر سے کھانا کھا لینا تھا ناں۔"
بہن کے اس طرح جتانے پر تارہ پری گڑبڑائی پھر سنبھل کر بولی۔
"ہاں گڑیا وہ آج دو دلہنوں کا میک اپ تھا تو بس مصروفیت میں یاد ہی نہیں رہا۔"
وہ واپس اپنے کمرے میں آ گئی، بستر پر لیٹی تو تھکاوٹ اور بھوک سے بے حال تھی۔ رات کا آخری پہر شروع ہو چکا تھا وہ سونے کی ناکام کوشش کر رہی تھی کہ فون بجا۔
"اس وقت کون ہو سکتا ہے؟" تارہ پری بڑبڑائی۔
وہ اجنبی نمبرز سے کال نہیں اُٹھاتی تھی مگر تجسس میں اُٹھا لیا کہ رات کے اس وقت کس کا فون ہو سکتا ہے؟
"میں بہت مشکل میں ہوں۔ میری مدد کرو۔ مجھ پر رحم کرو۔ اللہ کا واسطہ ترس کھاؤ۔" فون پر وہ روئے جا رہی تھی۔
"ہیلو...... پر تم ہو کون؟" فون کان سے لگائے ہکا بکا کھڑی تارہ پری نے استفسار کی۔
"میں آپ کی پڑوسن ہوں آسیہ۔ آپ تو جانتی ہیں میرے شوہر رشید کو جوئے کی لت ہے۔ آج تنخواہ لایا اور راتوں رات جوئے میں ہار دیا۔ میرے گھر کا بل کرایہ دینے والا ہے بچوں نے کل دوپہر سے کچھ نہیں کھایا۔ مجھے کہیں بیچ دو۔"
"بیچ دو۔" تارہ پری چونکی "مطلب؟"
"تارہ باجی میرا مطلب چاہے میری عزت کا سودا کروا دیں یا ایک رات کے لیے کہیں......!" وہ بات ادھوری چھوڑ کر سسکی۔
اُس کی بات کا مطلب سمجھ کر تارہ پری کی آنکھیں بھیگ گئیں۔
"تمہیں کتنے پیسوں کی ضرورت ہے۔" تارہ پری نے پوچھا۔
"تارہ باجی، دس ہزار روپے کی۔"
"اچھا سنو ابھی چھت پر آؤ فوری۔" تارہ پری نے کہا۔
"کیوں باجی؟"
"تم آؤ تو سہی۔"





صبح اس کی آنکھ شور کی وجہ سے کھلی۔ اس کے دروازے کے باہر بہت شور و غل تھا۔ لوگ چلا رہے تھے یہ فاحشہ ہے۔ کنجری ہے۔ آج سارے کنجر مار دو۔ وہ ننگے پاؤں ننگے سر باہر آئی مجمع دیکھا یہ اس کے اپنے تھے محلے دار تھے یہ وہ سب تھے جنہیں وہ بچپن سے ماموں، چچا کہتی آئی تھی۔ اسے دیکھ کر مجمع کو سانپ سونگھ گیا۔
"کیا بات ہے؟" اس نے ڈرتے ڈرتے حیرت سے سوال کیا۔
"کیا ہوا؟ آپ سب یہاں کیوں ہیں؟"
جواب میں تارہ پری پر جیسے سنگ باری شروع ہوئی۔
"تو اسٹیج پر ناچنے والی فاحشہ ہے تو ہماری برادری پر کلنک کا ٹیکہ ہے ہم تو شریف اور محنتی لڑکی سمجھتے تھے، ہمیں کیا خبر تھی کہ تو اسٹیج پر جلوے بکھیرتی ہے۔ کنجری ہے تو......!"

"یہ سب کیا کہہ رہے ہیں؟ بولو آپی۔" تارہ پری کی چھوٹی بہن نے اسے جھنجوڑا۔
"آپی آج مجھے آپ کو آپی کہتے ہوئے شرم آرہی ہے آپ نے مجھے جاوید اور اُس کے خاندان کی نظروں سے گرا دیا اچھا خاصہ میرا رشتہ ہونے والا تھا مگر آپ کی وجہ سے بسنے سے پہلے ہی اُجڑ گیا۔ بہنیں تو بھائیوں کا غرور ہوا کرتی ہیں آج تو نے وہ غرور خاک میں ملا دیا کہیں نظر ملانے کے قابل نہیں چھوڑا۔"
اتنے میں اُس کے اسٹیج کے ساتھی فنکار بھی آگئے۔ڈائریکٹر صاحب نے پوچھا۔
"سب ٹھیک تو ہے ناں تارہ پری۔" اُن کو دیکھ کر کسی نے فقرہ کسا۔
"لو دوسرے کنجر بھی آگئے جنوں نے طاہرہ کو تارہ پری بنایا۔ آج تو سارے کنجروں کو اکٹھے ہی آگ لگا دو۔"
دوسرا بولا۔" ارے میں تو کہتا ہوں سارا قصور اس کی ماں کا ہے جس نے اس کی ایسی تربیت کی۔" جانے کون اُس کی ماں کی جانب بڑھا۔
تارہ پری نے ماں کی طرف دیکھا بوڑھی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔لوگوں کو اپنی ماں کی جانب بڑھتے دیکھ کر تارہ پری یکا یک ہوش میں آئی۔"خبردار اگر کسی نے میری ماں کی طرف ایک قدم بھی بڑھایا میں خون پی جاؤں گی۔ کس قدر رو غلے اور منافق لوگ ہو تم۔ بے حس لوگو...... مارنا چاہتے ہو؟ تم نے کہا میں فاحشہ ہوں اور یہ شریفوں کا محلہ ہے تو جب تمہاری بیٹی ان کے بیٹے کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی تھی تب یہ سارے شریف چپ کیوں رہے؟ یہ شریفوں کا محلہ ہے تو آتے جاتے مجھ پر اور محلے کی دوسری لڑکیوں پر فقرے کیوں کسے جاتے ہیں اور تم نے کیا کہا۔ یہ کنجر ہیں اور تم کون ہو؟ گھٹیا آدمی اپنے باس سے بل پاس کروانے کے لیے اُسے گھر لاتے رہے۔ اپنی بیوی کو مار پیٹ کر غلط کام کے لیے اُکساتے رہے ہو تم پھر طلاق کی دھمکی دے کر چپ کروایا تم نے تمہاری بیوی کی چپ اور چہرے کا غم سب کو نظر آتا ہے اس کی ہنسی کا سودا کر کے اپنی خوشی خریدی تم ان کو کنجر کہہ رہے ہو اصلی کنجر تو تم ہو بلکہ تم دلال ہو۔ اپنے مفاد کے لیے اُس بیوی کو جسے قرآن تمہارا لباس کہتا ہے اُس لباس کو نچواڈالا تم نے اور تم سب......" اُس نے گلی کے نوجوانوں کی جانب اشارہ کیا۔
"اسٹیج پر ناچنے والی فاحشہ کہا تم نے مجھے؟ میرے لیے میرا قبلہ ہے وہ جگہ جہاں سے رزق ملتا ہے مجھے اور میرے خاندان کو، عزت نہیں فن بیچتی ہوں نمائش کرتی ہوں بکنے والی جنس نہیں ہوں، مجبور ہوں بوجھ نہیں، خود تم لوگ کیا ہو گندی نالی کے کیڑے گلی میں بھونکنے والے کتے۔ معاشرے کے ناسور۔ جن کا کام ہی سارا دن آوارگی کرنا ہے۔ اتنی ہی گندی جگہ ہے تو وہاں گئے ہی کیوں تھے؟ مسجد جاتے ناں۔"
"دیکھو ذرا اس واہیات کی زبان کتنی چلتی ہے اس کو تو زندہ دفن کر دینا چاہیے۔" رشید نے آواز لگائی۔
اس سے پہلے کہ تارا پری کوئی جواب دیتی۔ آسیہ نے آگے بڑھ کر رشید کے منہ پر تھپڑ مارا اور بولی۔
"ہاں زندہ دفن کردو اسے بھی، مجھے بھی اور اپنے دو بچوں کو بھی خود کے گھر میں اناج کا دانہ نہیں اور چلے ہیں منصف بننے، تمہارے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہیے جسے جوئے کی لت ہے جو اپنے گھر والوں کا رزق حرام میں لٹا دیتا ہے۔ کل اگر تارا آپی نہ ہوتی تو آج مر گئے ہوتے۔ مکان مالک ہمیں گھر سے نکال چکا ہوتا۔ فاقے سے بے حال تمہارے بچے مر گئے ہوتے اور میں اپنی عزت نیلام کر چکی ہوتی اور تم کہہ رہی تھی کہ بہن نے تمہاری زندگی برباد کر دی۔" اب آسیہ کی مخاطب تارا پری کی چھوٹی بہن مائرہ تھی۔
"نہیں ہرگز نہیں۔ بلکہ بچا لیا ہے تمہیں ان گھٹیا لوگوں سے جو صرف پیسے کے پجاری ہیں، کیا تم جانتی ہو جاوید نے اپنی بیوی کو طلاق کیوں دی۔ کبھی ملی ہو اُس لڑکی سے وہ کون ہے کہاں کس حال میں ہے اور جہاں ہے وہاں کیوں ہے اُس یتیم لڑکی کو بیچ دیا تھا اس جاوید نے ہیرا منڈی میں بیس ہزار روپے میں رشید بھی اس جاوید کے ساتھ گیا تھا اور بہت عرصے پہلے نشے میں یہ بات مجھے بتا چکا تھا۔"

آسیہ کو بولتے دیکھ ممانی کو بھی ہمت ہوئی وہ آگے بڑھی اور تارہ کو گلے لگالیا اور تارہ کے بھائی سے بولی۔
"واہ آج تجھے گھر یاد آ گیا غیرت آ گئی خاندان پر کلنک ہی بول دیا تارہ کلنک نہیں جھومر ہے، تم تو شادی کر کے اپنا گھر بسا کے الگ ہو گئے۔ کبھی پلٹ کر خبر نہیں لی کہ ماں بہنیں زندہ بھی ہیں کہ مر گئیں گھر داماد کو معاشرے میں کیا کہا جاتا ہے علم ہے یا وہ بھی میں بتاؤں اور آپ......!" ممانی نے اس بار اپنے شوہر کا ہاتھ پکڑا اور بہتے آنسوؤں میں بتانے لگیں "میں نے آپ کو کبھی بتایا نہیں، ہماری بیٹی سے بھی غلطی ہوئی تھی۔"
تارا تڑپ کر بڑھی اور ممانی کے منہ پر ہاتھ رکھ کر انہیں بولنے سے منع کرنے لگی مگر ممانی نے کہا "نہیں تارا آج بول لینے دے مجھے۔ سنیے جی۔ ہماری بیٹی کے گناہ کا بوجھ تارہ پری نے ہلکا کرایا۔ اُس کی شادی کرا کر ملک سے باہر بھیجنے والی بھی تارہ ہی تھی۔"
اتنے میں محلے کی ایک اور لڑکی بھی نکل آئی اور اپنے باپ سے مخاطب ہو کر بولی۔
ابو تارہ باجی پر گند اچھال رہے ہو کبھی میرے ہاتھ میں مہنگا موبائل دیکھ کر مجھ سے سوال کیوں نہیں کیا تھا کہ یہ کہاں سے آیا؟ آپ تو جائے بیچتے ہیں گھر کا گزارا مشکل سے ہوتا۔ ایک دن میں تارہ آپی کے گھر گئی اُنہوں نے بہت پیار سے پوچھ لیا اور پھر مجھے بہت نرمی سے سمجھایا غلط راستے پر چلنے سے منع کیا جس آگ سے کھیل کر میں جھلسنے والی تھی اُس سے بچایا۔ تارہ آپی تو فرشتہ ہیں آپی میرے ابو کو معاف کر دینا۔" وہ لڑکی روتے ہوئے تارہ سے لپٹ گئی۔
"میں نے تو سب کو معاف کر دیا کومل، اُس کو بھی جس نے شادی کے چند ماہ بعد مجھے بانجھ کہہ کر چھوڑ دیا تھا۔ اپنے ابو کو بھی جو بیرون ملک ایسے گئے کہ کبھی لوٹے ہی نہیں، اپنے ددھیال والوں کو بھی جنہوں نے کبھی پوچھنے کی بھی زحمت نہیں کی کہ کدھر ہو جو بھی یا نہیں ہو۔ انہی کے خون اپنے اس بھائی کو بھی جس نے طلاق یافتہ بہن، بوڑھی ماں اور ایک چھوٹی بہن کی بھی خبر گیری نہیں کی اور آج اگر خبر بھی لی تو کیسے۔ مجھے یہاں جس نے جو کہا برا نہیں لگا مگر میرے بھائی نے جو کہا وہ سب سے زیادہ تکلیف دہ تھا۔ کیونکہ یہ میرا اپنا ہے یہ ایک بار تو جا کر پوچھتا کہ میری معصوم بہن کو طلاق کیوں دے رہے ہو؟ تین شادیاں کر کے بھی بچہ پیدا نہیں کر سکے تو بانجھ کون ہوا پر نہیں کوئی بھی نہیں پوچھے گا کیونکہ مرد ہے نا وہ۔ اپنا قصور اپنی غلطی عورت پر ڈال کر، اپنے اندر کی وحشت عورت پر انڈیل کر سمجھتے ہو مسخر کر لیا دومنٹ کی مردانگی کو اپنا تمغہ سمجھتے ہو۔ شریفوں کے اس محلے میں کتنوں نے چھپ کر نکاح کرنے کا پیغام بھیجا اور وہ جنہوں نے کہا ہماری ایک رات کی مہمان بن جاؤ ساری زندگی خرچہ اُٹھاؤں گا بدلے میں نام بتاؤں شرافت کے اُن خداؤں کا اور یہ جن کو تجر کہا تم لوگوں نے یہ تم جیسے نام نہاد شریفوں سے کئی درجے اچھے ہیں۔ دلالی نہیں کرتے۔ دل میں کفر اور زبان پر کلمہ نہیں رکھتے۔ بری نظر نہیں رکھتے جو زبان دیں، پوری کرتے ہیں مجبوریوں کا سودا نہیں کرتے۔ آج مجھے بہت تکلیف ہوئی کہ تم لوگ میری ماں کو بھی مارنا چاہتے تھے۔ ارے وہ تو پہلے سے ہی زندہ لاش تھی اسی ماں کی تربیت تھی کہ بیٹا حق کے لیے ڈٹ جاؤ۔ اسی کی تربیت کا اثر تھا کہ خود کو نہیں بیچا، کھوکھلی اور بے حس ہو گئی لوگوں کی ذہنی غلاظت سہی اپنے دکھ میک اپ کی تہہ میں چھپا کے ہنستی رہی لوگوں کو خوش کرتی رہی۔ میرے سینے میں بھی دل ہے میرے اندر بھی کہیں ایک معصوم سی لڑکی ہے جو چاہتی ہے کہ چادر اور چار دیواری میں رہے کوئی ایک مرد ہو جو اپنے دل کے سارے جذبے مجھ پر انڈیلے جو صرف میرا ہو جو مجھے کما کر کھلائے میرے آنگن میں بھی پھول کھلیں کر سکتی تھی میں بھی شادی، اپنی الگ دنیا بھی بسا سکتی تھی مگر صرف اپنی ماں کی خاطر ان سارے جذبوں کو ڈپٹ کر سلاتی رہی، پتا ہے ماں چاہتی ہے کہ چھوٹی کی شادی ہو جائے ماں کو کینسر ہے یہ بات دنیا کو پتا چلے گی تو کوئی رشتہ نہیں لے گا، کتنا تھوڑا سا وقت بچا ہے ماں کے پاس، کبھی کسی نے آ کر خبر لی ماں جانتی ہے کہ تم سب بے حس ہو وہ مجھے اپنا دوسرا روپ، اپنا بیٹا کہتی ہے۔ طاہرہ کو تارہ پری بنا کر دنیا کا تماشہ بنانے والو! اپنے اور بیگانو! شرم سے ڈوب مرو۔ اپنے اپنے گریبانوں میں جھانکو اور اپنے گھر بیٹھی کسی طاہرہ کو تارہ پری بننے سے روک لو۔"
آنسو تواتر بہنے لگے۔

گردنیں شرم سے جھکیں اور اس بار انہی بابا جی کا ہاتھ اُس کے سر پر جا ٹکا جنہوں نے اُسے سب سے پہلے طعنہ دیا تھا وہ بولے۔

”تارہ بٹیا، تو ہمارا مان ہے تو بیٹی ہے میری۔ مجھے معاف کر دینا۔ میں بھی تمہارا گناہ گار ہوں۔ تم سے بھی اور اپنے اللہ سے بھی معافی مانگتا ہوں اور اب میں دیکھتا ہوں کہ میری بیٹی کی طرف کون میلی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ تو تو جہاد اکبر کر رہی ہے اپنے نفس کی خواہشوں کو مار کر سب کے پیٹ کا دوزخ بھر رہی ہے ان کے آرام و آسائش کا خیال رکھ رہی ہے۔ اصلی مرد تو تو ہے پری۔ تو صحیح کہتی ہے، ہم مرد کہلانے کے بھی قابل نہیں۔ بابا جی نے ہاتھ جوڑ دیے۔“

ڈائریکٹر صاحب آگے بڑھے بابا جی کے ہاتھ تھام کر بولے۔

”ارے نہیں بزرگو۔ آپ تو باپ کی جگہ ہو اور باپ معافی نہیں مانگا کرتے۔“

پھر ڈائریکٹر صاحب سب کو پکار کر مخاطب ہوئے۔

”کل تارہ پری کی سالگرہ تھی اس نے تحفہ لینے سے انکار کر دیا تو ہم سب نے سوچا کیا تحفہ دیں۔ ہم سب آرٹسٹ پچھلے سال سے کوشش کر رہے تھے لیکن عمرے کا ویزہ نہیں مل رہا تھا کل ہی ایک قرعہ اندازی میں تارہ پری کا نام نکل آیا اور آج ہم میں سے دس لوگوں کے عمرے کا ویزہ منظور ہوا تو ہم نے سوچا تارہ پری کو سالگرہ کا تحفہ ملنا چاہیے بس وہی دینے گھر آئے تھے۔ ہم سب بھی تارہ کے ساتھ عمرے پر جا رہے ہیں۔“

بابا جی کی آنکھوں میں پھر سے آنسو بھرے۔

واہ میرے اللہ، تو واقعی بے نیاز ہے۔ اے لوگو جسے اللہ اپنے گھر بلا رہا ہو کیا اس کی معافی میں اور مغفرت میں کوئی شک ہو سکتا ہے؟

## عبداللہ

### نورین مسکان سرور

ادھر فجر کی اذانیں ہوئیں اور ادھر مائیں ہٹلر کی جانشین بنی اپنے بچوں کو دھوکے جڑتے ہوئے درگاہ کی طرف دھکیلتیں، بچے لاکھ آہیں بھرتے، منتیں کرتے، بس آخری بار چھٹی کا وعدہ کرتے مگر ماؤں پہ کبھی کچھ اثر نہ ہوتا۔

درگاہ کے متولی صاحب نماز فجر کے بعد بچوں کو قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔ ایک ایک حرف کو ایسے ادا کرتے گویا تراش دیتے ہوں۔

اگر کسی جلسہ میں وہ تلاوت کرتے تو لوگوں پر رقت طاری ہو جاتی، لوگ جھوم جھوم جاتے، قلب دہل جاتے۔

نیک اور باعمل تھے، اگر یہی مقصد حیات تھا تو پورا ہو رہا تھا۔ دین سیکھ اور سکھا رہے تھے۔ سیکڑوں لوگوں کو قرآن پڑھا چکے تھے۔

”متولی صاحب میرے بیٹے کو ایسا ہی قرآن سکھانا، جیسا آپ خود پڑھتے ہیں۔“ مائیں اپنے نالائق سپوتوں کو پکڑے، سوالی بن جاتیں اور متولی صاحب سر جھکا کے عاجزی سے مسکرا دیتے۔

”بندہ ناچیز کو کہاں کچھ آتا ہے، ہاں جو آتا ہے اسے آگے پہنچانے کے لیے یہ حقیقی ضعیف حاضر ہے۔“ متولی کی اس عادت پہ ہر شخص قربان ہوا جاتا۔ کبھی در پہ ننھے بچوں کو گود میں لیے کوئی حاضر ہوتا۔

”متولی صاحب، بہت روتا ہے اس پہ دم کر دیں۔“ اور وہ خدمت خلق خدا میں جتے، یہ نیکی بھی کر دیتے۔

چند لمحے بعد بچہ قلقاریاں مارنے لگتا۔ والدین ان کے شکر گزار ہوتے رخصت ہو جاتے۔

”آپ بہت عبادت گزار اور باعمل ہونے کے ساتھ نیک بھی ہیں۔ دم کرتے ہی شفا مل جاتی ہے متولی صاحب۔“ ان کی عاجزی کی انتہا ہوتی۔ اپنی عادت کے مطابق سر جھکا کے ملنساری سے مسکراتے اور تنہائی میں پھر سے ذکر و اذکار میں مشغول ہو جاتے۔

وہ کسی دور دراز کے علاقے سے آئے تھے اور پچھلے دس سالوں سے اس درگاہ پہ درس قرآن جیسی نیکی کا فرض نبھا رہے تھے۔ان کا دنیا میں کوئی نہیں تھا۔لوگ کہتے تھے انہیں اسی تنہائی نے خدا کے نزدیک کر دیا ہے مگر ایک دفعہ کسی کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ انہیں اس مقام تک لانا ان کی ماں کی اولین خواہش تھی اور وہ اپنی ماں کی حیات میں ہی اس راستے پر نکل کھڑے ہوئے تھے پھر ماں بھی دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ان کا دل چاہا سب کچھ چھوڑ دیں مگر اب تو یہ راستہ ان کی فطرت بن گیا تھا اور ماں کی خواہش بھی، تو ان پر فرض تھا کہ وہ مرتے دم تک یہ کام نبھاتے۔

اور اسی لیے وہ اپنے آبائی گاؤں ماں کی قبر پر دعا کے لیے اکثر جاتے تھے اور جانے سے پہلے اہل علاقہ کو مطلع کر دیتے تھے۔



نماز فجر کے بعد سارے گاؤں کے لوگ گلیوں میں نکل آئے تھے۔سارے میں ہاہا کار مچی ہوئی تھی۔لوگ غم و غصے اور پریشانی میں مبتلا تھے۔

''کہاں جا سکتا ہے۔'' سرگوشیاں اب بلند آواز کا روپ دھار گئیں تھیں۔

متولی صاحب اچانک غائب ہو گئے تھے۔دس سال کا بھرم اور اعتبار ٹوٹ گیا۔

مگر ایک امید تھی شاید وہ اپنی ماں سے ملنے گئے ہوں، کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں کے رہنے والے تھے۔کبھی یہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ پیش آئی۔

چند دن انتظار کے بعد لوگ ان کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے تھے مگر وہ کہیں نہیں ملے۔

علاقے کی پولیس کی بھی مدد لی گئی مگر تمام کوششیں بیکار گئیں۔

''سالا جاسوس ہوگا۔'' مجمع سے کسی کی غصے سے بھری آواز ابھری ایک چھوٹے سے گناہ نے انسانوں کی نظر میں انہیں بدکار بنا دیا۔سب نیکیاں برباد گئیں، اکارت، اب بھلا کون کہتا کہ وہ نیک تھے، کون کہتا کہ وہ ان کی نئی نسل کو قرآن سکھا کر گئے تھے، انسان تھے اور انسان نیکی بھول ہی جایا کرتے ہیں، بس ذرا سا گناہ کر کے دیکھو پھر دیکھنا ہر اچھائی اپنی موت آپ مر جائے گی۔

''نہیں وہ ایسے نہیں ہو سکتے۔'' کسی سچے پیروکار کی آواز ابھری کچھ ایسے بھی ابھی باقی تھے جنہیں ان کی پاک دامنی کا یقین تھا۔

''آخر گیا کہاں......اس کا یوں بھاگ جانا سمجھ سے باہر ہے۔'' ہر شخص انگشت بدنداں ہوا ان کی تلاش میں سرگرداں تھا۔

جس نے دس سال اس درگاہ کی خدمت کی وہ اچانک، اسے ویران کیوں چھوڑ گیا۔ان پر الزامات لگائے جانے لگے، برا بھلا کہا گیا، دہشت گرد کا لقب دیا گیا اور برسوں بیت جانے پہ بھی لوگوں نے اپنے بچوں کو یہ کہانی سنائی تھی کہ ایک مجاور یوں بھاگا کہ پھر پلٹ کر نہیں آیا، خدا جانے کمبخت کیسی نیت سے آیا تھا۔

شکر خدا کا کسی کا کوئی نقصان نہیں کیا اس نے، قصہ تو چلتا تھا اور چلتے رہنا تھا۔



جہاں میں ہیں عبرت کے ہر سو نمونے
مگر تجھ کو اندھا کیا رنگ و بو نے
کبھی غور سے بھی یہ دیکھا ہے تو نے
جو معمور تھے، وہ محل اب ہیں سُونے

کالی رات قبرستان پہ اتری ہوئی تھی۔دور دور تک روشنی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔

''یا اہل القبور! کبھی تم بھی اس زمین پر مانند شاہ چلا پھرا کرتے تھے اور آج بے بسی سے اس مٹی کے نیچے سما گئے ہو، کاش

میں جان سکتا کہ تمہارا حال کیسا ہے۔" اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔
"اور کاش تم جان پاؤ کہ میں نے کس قدر گھاٹے کا سودا کیا ہے، اپنی پوری زندگی کس دھوکے میں گزار دی۔" الفاظ اس کی رندھی آواز میں گھٹنے لگے۔ سارا قبرستان سائیں سائیں کر رہا تھا۔
"ماں، تو نے تو مجھے دین کی خدمت کرنے بھیجا تھا اور دیکھ میں کس آفت کو اکٹھا کرتا رہا، میں نے جہنم کی آگ کا سودا کیا، میں نے منافقت برتی ماں...... ماں تیرا بیٹا آج سب کچھ بن گیا۔" وہ اپنی ماں کی قبر کے پاس بیٹھ گیا۔
"میں نے سیکڑوں بچوں کو قرآن کی تعلیم دی اور میرے دل میں سکون اتر گیا کہ میں نے اپنا فرض نبھا دیا جب جب میں نے قرآن کی تلاوت کی ساری دنیا مدہوش ہوگئی، میرے دم کرنے پہ بیماروں کو شفا ملتی رہی اور میں خوش ہوتا رہا، میں بے حد خوش تھا کہ میں نے مقصد حیات پورا کرلیا......!" اس کی ہچکیاں ابھرنے لگیں۔ قبرستان کی خاموشی اس کی ہچکیاں سننے لگی۔
"میں ہار گیا ہوں ماں...... میں مجاور بھی بن گیا، متولی بھی لوگوں نے مجھے اللہ کا ولی پکارا میرے اندر کے شیطان نے جشن منایا...... میں دنیا کی ساری امیدوں پہ پورا اترا اور خود خالی ہاتھ رہ گیا...... دیکھ۔" اس نے اپنے ہاتھ پھیلائے۔
"دیکھ ماں تیرا بیٹا دنیا کے لیے، ولی، قاری، عالم، متولی، مجاور سب کچھ بن گیا مگر اپنے اللہ کا بندہ نہ بن سکا میں عبداللہ نہیں بن سکا اماں جان جو تو چاہتی تھی نہیں بن سکا۔" اس کی سسکیاں بلند ہونے لگیں۔ دل میں درد بڑھنے لگا۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ احساس ندامت نے اسے شکنجے میں جکڑ لیا۔
"تو نے مجھے عبداللہ بنانے بھیجا تھا تاکہ مجھ سے اللہ راضی ہو اور میں دنیا کے پیر دھو دھو کر پیتا رہا، میں منافق بن کے جیتا رہا یہ دیکھ۔" اس کے ہاتھ میں کچھ دبا تھا۔ ایک چھوٹا سا صفحہ۔
حدیث کا مفہوم۔
"میرے نبی ﷺ نے اپنے صحابہ کرام سے فرمایا ایک وقت ایسا آئے گا جب لوگ قرآن کے ایک ایک لفظ کو تراش دیں گے، خوش الحانی میں قرآن پڑھا جائے گا مگر ان کے دل سیاہ ہوں گے، سب دکھلاوا ہوگا اور میں اس حدیث پہ پورا اترا میں آپ کو اللہ اور اپنے نبی کو کیا منہ دکھاؤں گا۔" اس کے حلق سے ایسی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے وہ اندر ہی اندر ذبح کیا جا رہا ہو اور دور درگاہ پہ ایک نیا مجاور مقرر کیا جا رہا تھا۔ رسم دنیا بھی ہے چل رہی تھی۔ کسی کے بنا کچھ نہیں رکتا، نئے مجاور کو بھی قصہ سنایا جا رہا تھا۔
خبردار کیا جا رہا تھا اور قبرستان میں ہزاروں لوگ جمع تھے۔ شاید اس کی انتہا ہوگئی تھی۔ جس نے اب ہمیشہ کے لیے دھتکرد کے لقب سے دنیا والوں میں جینا تھا۔



## بوجھ

### صوفیہ کاشف

اس کی اور کاندھے پر رنگ برنگے خوابوں کا انبار تھا۔ نئے دور کے فیس بک، انسٹاگرام، یوٹیوب کی ترغیبات سے لے کر ٹی وی پر صبح شام چلتے نئے پرانے مسحور کن ڈراموں تک، اک بوجھ سا بوجھ تھا جو سنبھالا نہ جاتا۔ شور سا شور کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ جیسے کپڑوں کی الماری میں ڈھیروں ڈھیر کپڑوں کا گھمسان کا رن مچا ہو، کسی قمیض کا بازو ہاتھ میں آتا ہو اور کسی شلوار کا پائنچہ، پورا ڈوپٹہ ملتا ہو نہ پورا سوٹ! یہی اس کی نوخیز، معصوم، نازک سی کچی کلی جیسی عمر کا عذاب تھا۔ پھولوں پہ گری شبنم بھلی لگتی تو کانٹے چبھو بیٹھتی۔ بارش کی ٹھنڈی بوندوں میں ننگے فرش پر چلنے کی آرزو کرتی تو پتھروں سے پاؤں زخمی ہو جاتے۔ حسین خوبصورت بھلی لگنے والی چیزیں اپنی خامیاں چھپائے رکھتیں اور تب تک نہ دکھاتیں جب تک اس کے لب، ہاتھ یا پاؤں زخمی نہ ہو جاتے! مگر یہ نہ لب تھے نہ نازک انگلیاں نہ گورے مخملیں پاؤں! یہ تو حیات تھی! اس کا کل وجود! جس کو داؤ پہ لگاتے وہ بھول گئی تھی کہ ہار گئی تو اس کا متبادل نہیں تھا اس کے پاس۔ زندگی کی آنے والی دہائیوں کی طرف جاتا ایک موڑ،

اس کے انجام کی سمت کا تعین کرتا ایک پل! اور وہ اس واحد راستے، واحد پل سے پھسل گئی تھی اور اپنی قیمتی حیات کو کسی بیکار شے کی طرح گنوا بیٹھی تھی۔ اپناوجود وہ ایسے ہار گئی تھی جیسے پٹھو گرم کا کھیل ہو یا کینڈی کرش کی بازی۔ یونہی پندرہ منٹ آدھ گھنٹے میں پھر سے باری آجائے گی۔ ہار کہاں مستقل ہے! اسے کسی نے نہ بتایا کہ زندگی کینڈی کرش کی بازی نہیں ہوتی۔ اس میں ہار جانے والوں کو پھر موقع نہیں ملتا۔ اس میں لوگوں سے زندگیاں تحفے میں نہیں ملتیں! ڈوب جانے والوں کو بچانے کے لیے کوسٹ گارڈ نہیں ہوتے۔ یہاں تو مگرمچھ چھوٹی مچھلیوں کو سالم نگل جاتے ہیں! طاقتور کمزور کو ڈھیر کر دیتے ہیں اور بھنوروں سے بے وفا کچی کلیوں کا رس پی کر اڑ جاتے ہیں۔

حماد اور فائزہ کا ٹکرانا ایسا ہی تھا جیسے الفا براوو چارلی کی شہناز کا قاسم سے ٹکرانا۔ وہ بھی نوخیز اور جواں خون تھی اور پرسے کیسے کیسے ڈراموں، خوابوں اور ناولوں کا سایہ تھا۔ وہ بھی چنگھاڑ چنگھاڑ کر قاسم کی بے عزتی کرتی رہی اور آخر میں خود ہار گئی۔ اپنے غرور، اپنے تفخر زدہ اعتماد اور دھماکوں کی طرح برستے فقروں کی داستانیں اس کا گولڈ میڈل ٹھہریں۔ سر پر شہناز سا غرور چمکنے لگا، سہیلیاں مرعوب سی مرعوب ہوئیں اور اسے خبر نہ ہوئی کہ بازی ماری نہیں، اسے مات ہوئی۔ یہی غرور کیا کم تھا کہ کیسا شہرہ آفاق کردار اس کی صورت زندہ تھا، دن بھر چلنے والے نئے پرانے کتنے ہی ڈراموں کی شہناز، اور سفینہ کی طرح!

زندگی ڈرامہ نہ تھی مگر ڈرامہ سے بڑھ کر سنسنی خیز ہوئی۔ مرکزی کردار جو خود اسی کا تھا، کہانی بھی ساری اسی کے گرد گھومتی! وہ اپنے سپرہٹ سیریل کی ملکہ تھی۔ قول و قرار بھی ہوئے، ٹیکسٹ اور واٹس ایپ بھی، تصویروں کے البم بھی بنے اور ویڈیوز بھی۔ مہینوں کے عشق کے سب مراحل چند ہی دنوں میں طے ہوئے۔ مگر فکر کسے تھی۔ کتنی ہی ہندوستانی فلموں میں ہیرو ہیروئین کی گری چادر اٹھا کر اوڑھاتے ہیں اور بکھر جانے کے بعد ذرہ ذرہ سمیٹ کر پھر سے مرکز میں لے آتے ہیں۔ وہ سمجھتی تھی عشق کی اس بازی میں شہہ اسی کی ہے۔ راستے آسان اور خوبصورت تھے اور منزلیں دسترس میں۔ قدیم روایتی زمانوں سے باپوں اور بھائیوں کے پہرے تھے نہ گھر کے واحد فون پر پکڑے جانے کے خطرات۔ جدید زمانے کی چالاکیوں سے چمکتے ستارے فائزہ کے قدموں تلے تھے اور کہکشائیں چند ہاتھ کی حد پہ۔

زندگی فلم نہ تھی مگر فلم سے بڑھ کر خوبصورت تھی۔ ہاتھ کے لمس سے پوروں کے ملاپ تک سنسنی ہی سنسنی تھی، رنگ ہی رنگ اور سرور سا سرور تھا۔ گناہوں کی لذتیں احساس جرم کے بغیر! احساس جرم اور حیا آتی بھی کہاں سے ٹی وی کی اسکرین سے ٹیبلٹ اور موبائل کی نیلی روشنی تک، داد ہی داد تھی، ترغیب ہی ترغیب تھی اور آگ ہی آگ تھی۔ حماد کا ہاتھ تھامے زمین سے آسماں کی حدوں تک کے سفر کی کتنی منزلیں لمحات میں سر ہوتیں۔

کوئی ٹی وی پہ چلتا سیاسی مذاکرہ نہ تھی زندگی مگر مذاکرے کی مانند بے نتیجہ ختم ہوئی۔ کالج اور یونیورسٹی کے سالوں کی گنتی ختم ہوئی۔ خوابناک سفر انتہاؤں سے اختتام تک پہنچا۔ کچھ رنگ برنگے وعدے وعید، کچھ خالی ادھوری قسمیں بستر کے ساتھ باندھے ویکن پر اپنے سامنے رکھے وہ چھوٹے سے گھر کی محدود سی دنیا کی طرف لوٹی۔ بے جان وعدے اور قسمیں جن سے کچھ ہی روز میں مرے ہوئے ناپاک جسموں جیسی سڑاند آنے لگی۔ راتیں چیخنے لگیں، سوال زہریلے درختوں کی طرح سر اٹھانے لگے۔ نیندوں سے نیند رخصت ہوئی دل سے سکون گم گشتہ ہوا۔ راج کے انتظار میں بیٹھی سمرن کے قدم اور وزن بھاری ہوئے۔ کال کوٹھری میں اک ان چاہی جان سانس لینے لگی تو ستاروں اور بہاروں کی حدیں جل کر بھسم ہونے لگیں اور پیروں تلے پاتال جلنے لگا۔ شہر کی دہلیز پر ذرا دیر رکنے والی کسی ریل گاڑی سے ہاتھوں میں جادو، لہجوں میں کمال لیے کوئی راج نہ اترا۔ یہاں تک کہ سانسیں محال ہو جاتیں، لذت و سرور، عشق و مستی کے سب جھوٹے خدا پاش پاش ہوئے اور جھولی میں رہ گئے کچھ بدبودار گناہ، کاندھے پر ذلتوں کا بوجھ، دل پر دھوکے کے عذاب، پلکوں پہ پچھتاوں کا بیکار بے فائدہ سایہ! زندگی فلم نہ تھی۔ باپ بھی ہاری زندگی کی واپسی کی نوید دے کر نہ کہہ سکا، کہ ''جا سمرن! جی لے اپنی زندگی'' ریل گاڑیاں سب نکل گئیں اور آنے والے رستوں کے بیچ سے ہی منزلیں بدل چکے تھے۔! جنت کی گود سے پھسل کر جہنم کی گہرائیوں تک اسے تھامتا اب کوئی ہاتھ نہ تھا، کوئی جواں، نہ کوئی جھریوں بھرا کانپتا ہوا!!

زندگی کی مردہ لاش کا بوجھ اٹھانا مشکل تھا۔زندگی ڈراؤنی فلم بھی نہ تھی مگر اس سے بڑھ کر ڈراؤنی ہوگی۔
ایک مختصر زندگی میں کتنے ہی کردار ساتھ جینے والی، خوابوں کے بوجھ تلے دب کر رنگوں اور جلوؤں کے شور شرابے میں خود کو ہار دینے والی کے سامنے اب صرف ایک ہی رستہ تھا۔اک ان چاہی بے نام زندگی کو جنم دے کر تاریخ کے صفحات پر ڈراموں اور فلموں کے آخری بچے انقلابی کرداروں کو زندہ کر دے۔اپنے گناہ کو تمغہ بنا کر سینے پہ سجائے اور زمانے سے لڑ جائے۔ہاری ہوئی زندگی کی آخری چال اک دوسری زندگی کی خاطر چل کر خود کو بھسم کر لے۔عشق، محبت، گناہ اور ان کے ساتھ بونس کی طرح ملنے والے عذابوں کا اعتراف کر کے سزا کی مدت پوری کرے۔اذیت بھرے حاصل میں جسکو ہاتھ لگاتی اسی حل کا سرا پکڑ پاتی مگر ایک آدھی رات میں اپنے اندر پلتی سانسوں کے ساتھ پنکھے سے لٹک کر یہ آخری داؤ بھی ہار گئی جو خوابوں کا بوجھ نہ سہار سکی تھیں وہ عذابوں کو کس طرح جھیل پاتی!



## کہانی کار
## ابن عبداللہ

شہر کے نامعلوم گوشے میں ایک گھر کے آنگن میں کچھ مردہ تتلیاں چند ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے رنگوں میں مکمل ڈوب چکیں تو بادلوں نے شہر کو تاریکی بھری بارش کا تحفہ ارسال کر دیا۔
چند بوسیدہ خواب مرجھائی ہوئی آنکھوں سے ٹپکے اور گھڑی کی سوئیاں بدبختی کے کالے دائرے میں قید لمبی جدائیوں کا ماتم کرنے لرزنے لگیں۔
تب اس نے اپنی آخری سانسوں کو گننے کا آغاز کر دیا۔
وہ خود لمبے انتظار کی جمی ہوئی سرد دیتی جھیل کہ جیسا تھا۔
جس پر امید کے پھول اپنی پتیوں کے گوشوں میں مکمل طور پر کسی انہونی خواہش کو پانے اور پھر چھپکے سے مرجانے کا انتظار کر رہے تھے۔
یہ شروعات تھیں ایک ایسے سفر کے جہاں جنازوں پر سوکھے پھول دھواں دیتے تھے۔
ایک ایسے شہر کے اندر جہاں رشتے احساس کے قاتل تھے۔جہاں برہنہ درخت خود اپنی بےلباسی کا ماتم کرتے تھے۔
پرندوں نے اپنے وجدان سے کسی پیشگی حادثے کی خبر کو اپنی چیخوں سے تاریک گلیوں کے اندر جدائی کی سیاہی کو گھنا دیا تھا۔
پر شہر میں موجود کسی بھی آدمی نے ان کی چیخوں سے آنے والے اس طوفان کی خبر کو نا پایا جس میں یادوں کی موت تھی۔
چلتی پھرتی لاشوں کے درمیان خداؤں کے خدا نے ایک فیصلہ لیا کہ ان سے بینائیاں اور سماعتیں چھین لی جائیں گی۔
کون جانتا تھا کہ مردہ تتلیوں کا ہجوم شہر کا ماتم کر رہا تھا۔پھولوں کے اترے ہوئے بے رنگ چہرے آنے والی خزاں کی آہٹ کو سن چکے تھے۔
ہر محبت کی موت شہر کو تاریکی میں ڈبا دیتی تھی۔
پر چوڑیوں، تتلیوں اور رنگوں کی موت کوئی اتنا بڑا حادثہ نہیں تھی جس کی خبر ریڈیو یا ٹی وی پر نشر کی جاتی۔
یہی المیہ تھا اس شہر کا یہاں موت جسم کی مانی جاتی تھی روح کی نہیں۔
سب کچھ ویسے کا ویسا تھا۔
بس محبت کی موت پر کوئی اعلان نہ ہوا تھا۔
اور مردہ تتلیوں کی موت رائیگاں چلی گئی تھی۔
داستان گو نے سانس روک کر ایک لمحے کو سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی کی آنکھوں میں پیدا ہونے والی کسی نئی کہانی کو دیکھا

پھر سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔
یہ ایسے کہانی کار کی کہانی ہے جس کا قلم اداسی بھری اور جدائی سے بوجھل کہانیاں لکھتے لکھتے تھک چکا تھا۔
کیا اس کہانی کار نے کسی سے محبت بھی کی تھی جو وہ اداس کہانیاں لکھتا تھا؟
لڑکی نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔
بوڑھے داستان گو نے جیب سے مڑا تڑا سگریٹ نکال کر سلگایا اور لڑکی کے سوال پر غور کرتے ہوئے بولا۔
ہاں۔ جس طرح کوئی کہانی محبت کے بغیر پوری نہیں ہوتی اسی طرح کوئی انسان بنا محبت کی بھٹی میں جلے مکمل نہیں ہوتا۔
تو کیا اسے اس کی محبت نہیں ملی تھی۔۔؟
لڑکی نے ماتھے پر آئی بالوں کی ایک شریر لٹ کو کان کے پیچھے پھنساتے ہوئے پوچھا۔
بوڑھے نے لڑکی کے چہرے پر پھیلی محبت کی روشنی کو دیکھا اور پھر اپنی یادداشت کو ٹٹولتے ہوئے کہنے لگا۔
وہ بچھڑ گئے تھے۔
بلکل ایسے جیسے میلے میں کوئی بچا اپنی ماں سے کھو جائے
وہ ساری زندگی بس ایک اور ایسے میلے کا انتظار کرتا رہا جس میں وہ دوبارہ مل سکیں۔ لیکن وہ میلا لگا ہی نہیں کبھی۔
میلوں میں ہجوم ہوتا ہے۔ بھانت بھانت کے لوگ ہوتے اور ہجوم کبھی کسی کو نہیں ملاتا۔ وہ بس الگ کرتا ہے۔
لڑکی نے ایک تاسف بھرا سانس کھینچا اور بولی۔
ان کے بچھڑنے کی اور کوئی وجہ بھی تھی؟



''ہاں۔'' داستان گو نے سر ہلایا۔
وجہ نہیں وجوہات تھیں۔
وہ کہانی کار چاہتا تھا کہ وہ اس لڑکی کو اپنی یادداشتوں میں ہمیشہ کے لئے مجسم کر دے اس کی خواہش تھی کہ وہ ہمیشہ اس کے اندر کی زمین پر نرم قدموں سے چلے۔
ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ روٹی بنا رہی تھی تو وہ کہانی کار اسے کہنے لگے تم مجھے محبت کی آنچ پر اس روٹی کی طرح پکاؤ۔
پر وہ لڑکی ایسا نہ کر سکی تھی۔
پھر ایک دفعہ اس نے کہا جیسے تم چوڑیاں پہنتی ہو ویسے مجھے بھی اپنی کلائیوں پر کسی ازلی بندھن کی طرح پہن لو۔
پر تب بھی وہ لڑکی چوڑیوں اور بندھن کا مفہوم نہ سمجھ سکی تھی۔
گرمیوں میں جب وہ لسی بنانے لگتی تو وہ کہتا تم مجھے بھی ایسے ہی محنت اور محبت سے عشق کے برتن میں ڈالو اور مجھے کشید کر لو اور پھر ایک ایک گھونٹ کر کے پیو۔
پر وہ لڑکی یہ بھی نہ کر سکی تھی۔
داستان گو نے سگریٹ کا دھواں کسی پرانی ریل کی طرح فضا میں بکھیرا۔
تب وہ بچھڑ گئے۔۔؟
لڑکی نے دھوئیں کو دیکھتے ہوئے اداس لہجے میں کہا۔
بوڑھے نے اس کے اداس لہجے کو سنا اور پھر جب بولا تو اس کی آواز ریل کی سیٹی کی طرح جدائی اور بچھڑ جانے کی اذیت سے بھری ہوئی تھی۔
ہاں۔!۔۔ان کی کہانی میں بچھڑ جانا تو طے ہی تھا۔
ان دونوں میں بہت فرق تھا۔
خود کہانی کار نے ایک جگہ لکھا۔

تم میں اور مجھ میں لمبی مسافتوں کا سا فرق ہے
تم اپریل کی خوشگوار صبح ہو اور میں جون کی حبس آلود شام۔
تم ساگر کی نرم لہر ہو جو اٹھکیلیاں کرتی ہو اور میں ساحل پر پانی کی جھاگ جو قلیل وقت کے لئے ہوتی ہے پس وہ سوکھ جاتی ہے تم میں اور مجھ میں کتنا فرق ہے گویا تم تبسم ہو اور میں ہوں وہ اشک جو آنکھوں سے کبھی ادا نہیں ہوتا۔
تم بہار ہو جس میں رنگ کائنات کو تسخیر کرتے ہیں اور میں۔
ہاں میں تو خزاں ہوں جس کے جلو میں تتلیوں اور پھولوں کی فنا ہے۔
کتنا فرق ہے تم میں اور مجھ میں۔
تم مشرق ہو اور میں ہوں مغرب۔ اس تمثیل سے جانو کہ تمہارے ماتھے میں ابھرنا اور میری پیشانی میں ڈوبنا طے ہے۔
آخر سوچتا ہوں کہ تم میں اور مجھ میں کیا یکساں ہے؟
تو کوئی کہتا ہے۔
تم میں اور مجھ میں بس ''جدائی'' اور گہری تھکا دینے والی ''دوری'' یکساں ہے!
ہم میں یعنی ہم دونوں میں۔
بوڑھے نے کہانی کار کی زبانی ہی ان دونوں کے درمیان فرق سمجھایا تو سننے والی لڑکی کی آنکھوں میں تنہائی گھنی ہوگئی اور جب وہ بولی تو اس کی آواز میں جدائی گھلی ہوئی تھی۔
کیا وہ لڑکی کبھی واپس نہیں آئی؟
نہیں کبھی نہیں وہ لڑکی کبھی نہیں لوٹی۔ بس اس کی یادیں کبھی کبھار کہانی کار کی کھڑکی پر دستک دینے آتی تھیں اور اداسی کے سایوں میں کبھی کبھار وہ اس لڑکی کے سائے کو پہچان کر کچھ اداس گیت اپنے گھر کی دیواروں اور چھت کو سنالیا کرتا تھا جن سے لٹکے ہوئے کہرب کے جالے میں اس کے گیت کسی سوگوار یاد کی طرح پھنس جاتے تھے۔
لڑکی کچھ نہیں بولی۔ بس اداسی سے زمین پر لکیریں کھینچنے لگی۔
کچھ دیر خاموشی کہانی کو بنتی رہی اور پھر داستان گو بولا
اس کہانی کار کی زندگی۔ جدائی کی تپتی دوپہروں اور تنہائی کے گہرے سناٹوں میں کہیں کھوگئی تھی۔
اسے سچ کہنے کا مرض تھا۔ شہر نے اسے لاعلاج قرار دے دیا تھا۔
وہ جبر اور ظلم کے خلاف تھا۔
لوگوں کو اس سے شکایت تھی کہ اس کی کہانیوں کے کردار۔ عام چھوٹے لوگ کیوں ہوتے ہیں۔ کلرک، گھڑی ساز، مزدور، ریڑھی بان۔
وہ ان کو کبھی سمجھا نہیں پایا کہ کہانی تو ہوتی ہی ان لوگوں کی ہے۔
اس کی نظر میں کہانی ایک مفلوک الحال بوڑھیا کی طرح ہوتی ہے جو کھانستے کھانستے مرجائے۔ یا اس بیوہ کی طرح جس کے آنسو کائنات کی ہر چیز کو گیلا کردیں۔
پر شہر کے لوگ جنہیں خداوند نے مٹی سے بنایا تھا سارے پتھر ہو چکے تھے۔ ہر ایک کے اندر ان کی ذات کا خدا بیٹھا تھا۔ جسے وہ پوجتے تھے۔
ایسے میں اس کی باتیں دیوانے کی صدا کی طرح کون سنتا تھا۔
اس لئے وہ تنہا ہوگیا۔
وہ مر تو بہت پہلے چکا تھا لیکن اس کے تابوت میں آخری کیل محبت نے ٹھوک دی تھی۔
وہ سچائی اور سچ کہنے کے جرم میں موت کی سزا کا مستحق تھا۔

وہ کہتا کہ مجھے ان سچائی کے سارے تولوں سے نفرت ہے جو جھوٹے لوگ کہتے۔ مجھے شہر کے قانون سے نفرت ہے جسے مجرموں نے بنایا ہے۔
تم ہی بتاؤ ایسا شخص کب تک زندہ رہ سکتا۔؟
بوڑھے نے کہانی سناتے ہوئے اچانک سامنے بیٹھی لڑکی سے سوال پوچھا تو وہ چونکی۔
لڑکی نے اپنے ہاتھوں کو ایک دوسرے سے رگڑا اور پھر دور اڑتے پرندوں کو دیکھنے لگی۔
شاید اس کے پاس جواب نہیں تھا۔
بوڑھے کی جھریوں زدہ چہرے پر ایک مسکراہٹ نے قدم رکھا اور وہ بولا۔
ایسے لوگ بہت کم جیتے ہیں۔ بچپن کے کچھ سال بس۔
اس کے بعد وہ بس سانسوں کو گھسیٹ رہے ہوتے ہیں۔
ایسے لوگ ہمیشہ اکیلے اور اداس رہتے ہیں۔
ان کی سچائی اور احساس ان کو اقساط میں موت دیتے ہیں۔ تب تک جب وہ مکمل مر نہیں جاتے۔ اور لوگوں کے سامنے ایک مٹی کے ڈھیر کی صورت اختیار نہیں کرتے۔
جس کی یہ کہانی ہے وہ بھی اب دم آخر ہے۔
شاید ایک مدت بعد لوگ اس کی کہانیاں سمجھیں اور اسے ایک ہیرو کا درجہ دیں اور ہر چوک میں اس کا مجسمہ نصب کریں۔
لیکن افسوس کہ اس شہر میں موت ہی واحد راستہ ہے۔ جس پر چل کر آپ اپنے لئے لوگوں سے کچھ اچھے بول لے سکتے ہیں۔
جینے کے لئے مرنا ضروری ہے اور یہی اس کہانی کار کی ادھوری کہانی ہے۔
بوڑھے نے کہانی سمیٹ لی اور وہ لڑکی خاموشی سے اٹھ کر چلی گئی۔
تب شہر کے ایک گوشے میں کہانی کار نے اپنا آخری سانس لیا۔
داستان گو نے ٹھیک کہا تھا۔
جینے کے لئے مرنا ضروری ہے!



☆☆

## بے لگام محبت

### عثمان غنی

ٹرین پوری رفتار سے پٹری پر بھاگ رہی تھی۔ انجن سے ساتویں ڈبے میں تاش کی بازی ٹرین کے انجن جتنی ہی گرم ہو چکی تھی۔ ان تین دوستوں کے علاوہ بھی کوئی اس بازی میں دلچسپی لے رہا تھا اور اس قدر دلچسپی کہ دونوں آنکھیں جھکا کر بھی دل کی آنکھ سے بازیگران میں سے ایک شخص اور تاش کی بازی صاف صاف دکھائی دے رہی تھی۔
جب دل کسی کو اپنی نظر سے دیکھتا ہے تو لب، زبان اور دماغ کو بتائے بنا ہی دعائیں دیتا رہتا ہے۔ ایسی ہی کشمکش یہاں تھی لیکن اس پارسا نے جس شباب کو پسند کر لیا تھا وہ مسلسل دسویں بازی ہار چکا تھا۔ اُدھر وہ بازی ہارتا گیا۔ اِدھر یہ پارسا دل۔
مسلسل دسویں بازی ہارنے کے بعد اس شباب کے ایک دوست نے یہ کہہ کر تاش سمیٹ لی کہ تیری قسمت خراب نہیں۔ تو بازی کے داؤ پیچ نہیں جانتا۔
ہارنے کے بعد پارسا کے لختِ دل نے سگریٹ سلگائی تو جی چاہا کہ ایک نظر اٹھا کر ایسی تنبیہ کی جائے کہ پوری ڈبی جل کر راکھ ہو جائے لیکن اکثر اس طرح کے ارادے کے بعد دل ہی جل کے راکھ ہوتا ہے۔
ہر کش کے دھوئیں نے نومبر کی سردی کو مات دے دی تھی۔ منہ پر نقاب گرم شال اوڑھے کھڑکی کے پاس بیٹھی پارسا نے

دل ہی دل میں گلہ کر دیا تھا۔ دل کے معاملے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ نہ نام پتا نہ ذات۔ اگلے اسٹیشن پر اتر گئے تو کون جانے کبھی ملاقات ہو گی بھی کہ نہیں۔ پر دل کی بیچارگی کہ گلا کرنے لگا۔

پارسا کو شباب سے محبت ہو گئی تھی۔ درجن بھر محبتوں کا گلا گھونٹنے کے بعد پارسا کو ٹرین کے ڈبے میں محبت ہو ہی گئی۔ تاش کی بازی میں کی جانے والی گفتگو نے پارسا کے کانوں کے ذریعے دل کا راستا تلاش کر لیا۔ یہ وہ محبت تھی جو شباب کے خمار سے ہوئی تھی۔ اس نے ابھی شباب کو دیکھا بھی نہیں تھا۔

پارسا نے اتنی محبتوں کو ٹھکرایا تھا کہ اُسے محبت کے نام سے چڑ ہونے لگی تھی۔ وہ یہ سوچ رہی تھی کہ کیا محبت کو پیروں کے نیچے روندنے والا انسان اتنا کمزور بھی ہو سکتا کہ اُسے ایک اجنبی مسافر سے محبت ہو جائے؟

کل تم ایسی ہی ایک ٹرین سے آ رہی ہو۔ میرا انتظار ختم ہونے کو ہے۔ ٹرین کے ڈبے برق رفتاری سے میرے سامنے ایک ایک کر کے گزرتے جا رہے تھے۔

کاش انسان کی زندگی بھی اس ٹرین کی طرح ہوتی۔ برق رفتاری سے گزر جاتی اور پتا بھی نا چلتا۔ اور شاید ایسا ہی ہوتا ہے۔ پاس بیٹھے ہر ذی روح کے لیے آپ تیزی سے گزر جاتے ہو اور اُسے پتا بھی نہیں چلتا لیکن زندگی کے ڈبے میں بیٹھے انسان کے لیے سفر پل پل محسوس ہوتا ہے۔

میں پٹری کے پاس بیٹھا ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ٹرین کی آواز آنا بند ہو چکی تھی۔ سناٹے میرے کانوں کو کھانے لگے۔

آج سے پہلے تک میری زندگی بے حس و حرکت تالاب کے کھڑے پانی کی مانند تھی۔

پھر آج صبح مجھے تمہارے آنے کی خبر ملی کہ کل تم آ رہی ہو۔ تم ابھی کل آؤ گی۔ پر میں صبح سے پڑی کے پاس بیٹھا ہر آنے والی ٹرین کو تک رہا ہوں۔ ٹرین کی آواز مجھے سکون دینے لگی ہے۔

جب سے تم یہ شہر چھوڑ کر گئی ہو میری اور اس تالاب کی حالت ایک جیسی ہو گئی ہے جہاں میں تمہیں چھپ کر دیکھنے آیا کرتا تھا۔

اور اب تالاب میں لوگوں نے کچرا پھینک پھینک کر گندا کر دینے کے بعد کہیں دور جا کے ڈیرے بسا لیے ہیں۔ اسے بالکل تنہا چھوڑ دیا ہے، بے یار و مددگار۔

لیکن آج صبح میں نے دیکھا کہ ایک مینڈکی نے کافی دیر کنارے پر بیٹھے رہنے کے بعد چھلانگ لگا کر اس منجمد پانی کی بے حسی کو للکارا۔ ایک بڑی سی لہر آئی، پھر پورے تالاب کو مینڈکی کی اس حرکت کی خبر ہو گئی۔

زندگی نے اپنے ہونے کا احساس دلایا۔ مجھے تمہاری اطلاع ملی کہ کل تم آ رہی ہو۔

**5 سال 3 ماہ اور 21 دن**

یہ وہ واحد حساب ہے جو انگلیوں پر نہیں گنا جاتا۔

بلکہ انسان کے پھٹے پرانے اور بوسیدہ جسم کو دیکھ کر بالکل صحیح اندازہ لگا لیا جاتا ہے تاریخ بالکل ٹھیک چہرے پہ لکھی ہوئی نظر آ جاتی ہے۔

بالکل اُسی طرح جیسے کوئی اُس تالاب کو دیکھ کر بتا سکتا ہے کہ کتنے عرصے سے اس تالاب کو بے جان سمجھ کر چھوڑ دیا گیا ہے۔

غم ہو یا خوشی۔ دونوں کے اثرات ایک جیسے ہوتے ہیں۔

غم میں نیند نہیں آتی اور خوشی میں انسان جان بوجھ کے نہیں سو پاتا۔ غم ماضی کو یاد کرتے گزر جاتا ہے اور خوشی مستقبل کو۔

میری ریاضی تھوڑی کمزور ہے۔ اس لیے تمہیں بتا نہیں سکتا میں نے ان سالوں میں کتنی محبت کی ہے میں اس کا حساب نہیں رکھ پایا۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ اس محبت کا حساب بہت سیدھا ہے۔ انسان جتنی بھی کر لے اپنے لختِ دل کا قرضدار ہی

رہتا ہے۔
پورے تالاب کو خبر ہونے کے بعد مینڈکی کی اس فتنہ گری کی شکایت لے کر سب پرانے مینڈک سردار مینڈک کے سامنے جمع تھے۔ سردار مینڈک نے حکم دیا کہ ملزم کہیں سے بھی ڈھونڈ کر پیش کیا جائے۔ ملزم کو ڈھونڈنے کے لیے فوج پورے تالاب میں پھیلا دی گئی۔
پورے تالاب میں اس مینڈکی کو ڈھونڈا جا رہا تھا۔ پچھلے پانچ سال میں کسی نے اس طرح کی حرکت نہیں کی۔ اس وجہ سے تالاب کی فوج ناکارہ ہو چکی تھی۔ تالاب میں کچھ ایسی جگہیں بھی تھیں کہ گندگی کی وجہ چھاپہ مارا جانا بہت مشکل تھا لیکن کیونکہ یہ سردار کا حکم تھا اس لیے فوج کو ایسا لباس دیا گیا جسے پہن کر گندی جگہوں کی تلاشی لی جا سکے۔ دربار میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ تلاش کے نئے نئے مشورے سامنے آئے۔
سردار مینڈک کا غصہ اس قدر انتہا کو پہنچ چکا تھا کہ اس نے اعلان کروا دیا کہ اگر مینڈکی کو نہیں ڈھونڈا تو وہ ایک ایک کر کے سب فوجی مینڈکوں کو سزائے موت دے دے گا۔
ملزم کو ڈھونڈتے شام ہو گئی۔ سب لوگ دربار میں ہی جمع تھے۔ شام ڈھلنے کو تھی لیکن ابھی کوئی خبر نہیں آئی۔ ایک سپاہی نے اندر آ کر اطلاع دی کہ اب رات ہو چکی ہے، اندھیرا چھا گیا ہے۔ ہمیں تلاش صبح تک ملتوی کرنی پڑے گی۔ سردار نے 3 دن کا الٹی میٹم دیا اور اپنی آرام گاہ میں سونے کے لیے چلا گیا۔ بستر پر لیٹتے ہی اسے صبح ہونے کا انتظار تھا۔
مغرب کا وقت قریب تھا۔ ٹرین کی کھڑکی سے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ کسی اندھیری جگہ کی طرف سفر کیا جا رہا ہے۔ جیسے جیسے آگے بڑھتے ہیں۔ اندھیرا ٹرین کو اپنی لپیٹ میں لیتا جا رہا ہے۔
تینوں دوست اپنی خوش گپیوں میں مصروف چائے کا لطف لے رہے تھے اور پارسا کھڑکی سے اندھیروں کو روشنیوں پر مات دیتے دیکھ رہی تھی۔
کوئی سورج جتنا دیوہیکل اور بلند ہی کیوں نہ ہو جائے۔ آخرکار اندھیروں سے ہار ہی جاتا ہے۔
ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ کوئی کتنا ہی شاہ زور کیوں نہ ہو جائے شام کی طرح ڈھل ہی جاتا ہے۔ انسان بھی سورج کی طرح ہے۔ خدا نے محبت ان شاہ زور انسانوں کو مات دینے کے لیے بنائی ہے۔
کتنے لوگ سرپٹخ پٹخ کے ہار گئے لیکن پارسا کی شام اس ٹرین میں ہی ہوئی تھی۔ ایک تاش کی بازی ہرانے والے پہ اپنا دل ہار گئی۔
سامنے کی سیٹ پر ایک شخص مسلسل تسبیح کے دانوں کو تھکا رہا تھا۔ سفید سوٹ لیکن جگہ جگہ مٹی کے داغ۔ آنکھیں بند کر کے منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ پورے راستے یوں محسوس ہوا کہ وہ تنہا سفر کر رہا ہے۔ لیکن کھانے کے برتن سامنے سجانے کے بعد شباب نے اُسے سیف اللہ کہہ کر مخاطب کیا کہ کھانا تیار ہے۔ اور وہ شخص تھوڑی دیر بعد شباب اور اُس کے دوستوں کے ساتھ کھانے میں مشغول تھا۔ کھانے کی گفتگو سے محسوس ہوا کہ وہ کسی گہرے صدمے سے گزرا ہے اس وجہ سے الگ تھلگ چپ سادھے بیٹھا تھا۔
دل ہمیشہ کسی اجنبی کو دماغ سے پہلے پہچان کر اُس کے معیار کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ آواز سے شروع ہونے والی محبت، اب اپنا سفر آنکھوں کے راستے کرنا چاہتی تھی اس لیے پارسا نے اپنے دماغ کے سب شکوک کو جھٹک کر شباب کو آنکھوں کے راستے دیکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ آنکھ اٹھانے سے پہلے دل اپنے معشوق کی جگہ کا بالکل صحیح تعین کر چکا تھا۔ نظر نے شباب لیا اور اپنے حدود اربعہ میں واپس آ گئی۔
اس پارسا کے دل میں محبت نے اس قدر جگہ بنالی تھی کہ اُس نے سوچا کہ وہ ابھی جا کر محبت کا اظہار کر دے گی۔
لیکن وہ یہ فیصلہ اپنی دوست کو بتانے سے پہلے نہیں کر سکتی تھی۔ ہر منٹ وہ موبائل کی سکرین جلا کر میسج کھول کر دیکھتی لیکن صرف 2 میسج نظر آتے کہ

میں کل آ رہی ہوں

اور

فائنلی مجھے محبت ہو گئی ہے۔

انتظار کی نیند کتنی کٹھن ہوتی ہے کوئی مجھ سے پوچھے۔کل تم آ رہی ہو۔

میں نے 5 سال 3 ماہ اور 21 دن

خود کو حوصلہ دے کر صحرا میں کسی ایک سمت ہی پانی کی خاطر سفر کیا ہے اور اب تو محسوس ہو رہا ہے جیسے کسی نے پچھلے سارے انتظار کو ایک رات کے کوزے میں بند کر دیا ہو۔

ساری رات کروٹوں کی نذر ہو گئی اور ہر کروٹ پر تمھاری کوئی ایک بات سوچنے لگوں تو ذرا حساب لگا کے بتاؤں۔میں نے ساری رات کتنی کروٹیں بدلی ہوں گی۔آدھی رات میں ہی بستر اور میں ایک دوسرے سے اکتا گئے۔بڑی عجیب ہوتی ہیں ایسی راتیں۔جس میں جاگنا مشکل اور سونا محال ہو جائے۔

تہجد کا وقت ہو چکا تھا۔میں آج ساری رات نہیں سویا۔اگر میں تمھارے آنے کی خوشی میں ساری رات تکیے سے باتیں کر کے نہ گزاری ہوتی تو روز کی طرح میں آج بھی بے غم و غافل سو رہا ہوتا۔

لیکن وہ رب بڑا بے نیاز ہے۔وہ کہتا ہے تو میرے پاس آ۔چاہے کسی بھی بہانے سے آ۔

اور یہ سچ ہے۔میرے جاگنے کا بہانہ کوئی اور تھا۔پھر بھی مجھے اس کے سامنے جاتے شرم نہیں آتی۔

نماز میں دل اور جسم دونوں مشغول تھے مگر عبادت اپنے اپنے محبوب کی ہو رہی تھی۔جانے اس عبادت کا بھی کیا صلہ ملے گا۔شاید واپس منہ پہ ہی آن پڑے۔عبادت میں روح اور جسم کا رابطہ دل سے ہوتا ہے۔اور وہاں تم نے ڈیرا بسا لیا ہے۔آج کی رات بھی گزر گئی۔ تمھیں ڈھونڈنے میں میں نے اس طرح کی کئی راتوں کو صرف کر دیا ہے۔لیکن اب میری تلاش ختم ہو جائے گی۔اب تم آ جاؤ گی۔

صبح ہوتے ہی تالاب کی اُس آفت کو ڈھونڈنے کا کام شروع ہو گیا جس نے تالاب کی سرحدوں کی خلاف ورزی کی تھی۔ تالاب کے کچھ بزرگ مینڈکوں کے ذریعے سب کا یقین تھا کہ اگر اس تالاب کو مزید گندگی سے بچانا ہے تو کسی کو بھی پڑاؤ کی اجازت نہ دی جائے۔بلکہ کوئی بھی آتا ہے تو اُسے مار دیا جائے۔تاکہ کسی اور کو آنے کی جرأت نہ ہو۔

اگلے دن بھی صبح سے شام تک کوئی خبر نہیں آئی۔شام کے بعد مینڈکی کے ملنے کی اطلاع ملی۔پوری رات گندگی کے نیچے چھپے رہنے کی وجہ سے اس کی کایا بوسیدہ ہو چکی تھی۔مینڈکی کو دربار میں لانے کا حکم دے کہ سردار مینڈک نے اپنی رعایا میں سے ایک ہٹے کٹے مینڈک کو بلوایا تاکہ وہ اُسے کچل کر جان سے مار دے۔ملزم کو جب دربار میں پیش کیا گیا تو سردار مینڈک کے چھکے چھوٹ گئے۔اُس نے اس قدر حسین مینڈکی کبھی نہیں دیکھی تھی۔

اب سردار مینڈک کے پاس دو ہی راستے ہیں یا تو رسموں رواجوں کا پاس رکھ کر مینڈکی کا گلا گھونٹ دے یا اپنے دربار کے وزیر اور بزرگوں سے معافی مانگ کر یہ عالی شان سرداری چھوڑ دے۔

ٹرین کا سفر اور تسبیح کا سفر ایک جتنا طے ہو چکا تھا۔پارسا کے سامنے بیٹھا شخص شاید کسی بہت گہرے صدمے سے گزرا تھا۔سفر میں لوگ کتنے ہی اجنبی کیوں نہ ہوں۔صدمے سانجھے ہو جاتے ہیں۔شاید اس انسان کا بھی کوئی بچھڑ گیا ہے۔ خاموشی سے رونے والے انسانوں کے چہرے بہت پر سکون اور آنکھیں خوفناک ہوتی ہیں۔کسی سے بچھڑنا شاید آسان ہو گا۔ پر اُس سے کوئی رغبت نا ہو اگر۔پارسا کے لیے شباب اجنبی ہی رہتا تو چاہے اگلے سٹیشن پر اتر جاتا۔

اجنبی شخص کے منہ سے نکلنے والا پہلا لفظ پانی تھا۔وہ پانی مانگ رہا تھا۔خود غرضی کا یہ عالم تھا کہ کسی سے بچھڑ کر بھی پانی کے دو گلاس حلق سے اتر گئے۔لیکن وہ تو شاید اپنی پیاس نہیں۔اپنے دل میں لگی آگ بجھا رہا تھا۔

شباب نے حسرت سے پانی کی بوتل کی طرف دیکھا۔لیکن دو گلاس پی لینے کے بعد ایک گھونٹ ہی بچا تھا۔ایک لمحے کو

پارسا کا دل کیا کہ وہ دریاؤں کا رخ موڑ دے۔
شباب کی طرف سے اپنے لیے سنائی دینے والا پہلا لفظ بھی پانی تھا۔ پارسا کو بوتل میں رکھا پانی دنیا کا نایاب ترین پانی محسوس ہوا۔
صبح ناشتے میں صرف ایک بریڈ کھا کر کر جی چاہا کہ چہل قدمی کی جائے۔ روح کی تھکاوٹ دور کرنے کے لیے جسم کو تھکانا پڑتا ہے اور جسم ساری رات جاگنے کے باوجود تھکاوٹ سے دور تھا۔ شام تک ٹائم کسی طرح پاس کرنا ہے؟
تم سے باتیں کرتا ہوا مین روڈ کے کنارے چلتا چلتا شہر سے باہر نکل آیا۔ لیکن ایک شور انسان کے اندر بھی ہوتا ہے۔ یہ شور صرف کسی زبردست ناکامی کے وقت ہی سنائی دیتا ہے۔ میں وہ شور سننا چاہتا تھا۔ اس کے لیے مجھے مزید خاموشی کی ضرورت تھی۔ شہر کی تیز رفتار زندگی کو پیچھے چھوڑتا ہوا میں ایک کچے راستے پر چل پڑا جس پر کوئی آبادی نہیں تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں ایک چھوٹے سے تالاب کے سامنے بیٹھا تھا
میں نے ایک پتھر اٹھایا اور اسے پوری قوت سے تالاب میں پھینک دیا۔ پتھر پانی کو چیرتا ہوا گم ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے لیے پانی کا جسم پھڑ پھڑایا اور کچھ دیر بعد ایسا ساکت ہوا جیسے کسی نے روح کھینچ لی ہو۔ میرا جی چاہا کہ میں اس پانی کو چھو کے دیکھوں۔ میں تالاب کے قریب آیا تو اپنا عکس دکھائی دیا۔ اس چہرے کے سکون نے میرے اندر کی بیچارگی کو اور ہوا دے دی۔

محبت اگر آگ ہوتی تو
میں کہرام مچا دیتا
محبت اگر سزا ہوتی تو
میں پتھر بھی کھا لیتا



محبت بھی بھلا کوئی بتانے کی چیز ہے۔ میں بھلا کیسے بتاؤں کہ شباب مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔ میں کیسے بتاؤں کہ صرف کچھ گھنٹوں کے سفر نے مجھے گزرے ہوئے سارے سوال بھلا دیے ہیں۔ اور سارے خط۔ وہ سب لوگ۔ وہ شہر۔ یہ شاید زندگی کا دستور ہے۔ ظالم ظلم بھی اُسی پر کرتا ہے۔ جس سے اُسے ڈر ہو کہ یہ میری سانس نہ دبوچ دے۔ مجھے اس محبت کی سانسیں بڑھانے کے لیے ظالم ہونا پڑے گا۔ کوئی شخص مرتا ہے تو مر جائے۔ پر میں اس محبت کی سانس نہیں دبوچنے والی۔
سیف اللہ کی آنکھوں کے آنسوؤں نے مجھے ایک ظالم سے محبت گیر بنا دیا۔ پارسا نے اُس شخص کو مخاطب کر کے پوچھا کہ آپ کو پانی چاہیے۔ شاید وہ ان آنسوؤں کی وجہ جاننا چاہ رہی تھی۔ سیف اللہ نے آنکھیں صاف کر کے صرف اتنا جواب دیا کہ میرا کوئی اپنا مر گیا ہے۔ اور پھر سے آنکھیں موند لیں۔
پارسا کو ایک سیکنڈ کے لیے محسوس ہوا جیسے جسم کے پنجرے نے روح کو جکڑ لیا ہو۔
آج موسم بھی خوبصورت ہے۔ شاید اس لیے کہ آج میرے اندر کا موسم خوبصورت ہے۔ پینٹ کوٹ اور شوز پہن کر میں بس میں سوار تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ بس کو پر لگ جائیں۔ پھولوں کی باسکٹ میں نے بہت احتیاط سے رکھی ہوئی تھی۔ خراب اور مرجھائے پھول تمہیں بالکل نہیں پسند۔ پھول مرجھا جائے تو تم کتنی اداس ہو جاتی تھیں اور کہتی تھیں کہ ایک دن ہم بھی مرجھا جائیں گے۔ کتنے سال پہلے میں اس شہر میں صرف تمہارے لیے آیا تھا اور اس شہر میں ہی رک گیا کیونکہ تم نے مجھے ایک بار کہا تھا کہ میں کبھی بھی ناراض ہو کر گئی تو لوٹ کر اس شہر میں ضرور آؤں گی۔ میرا اس شہر میں ہی انتظار کرنا۔ سورج غروب ہونے کو تھا۔ اس سورج کے غروب ہونے کے بعد تمہاری ناراضگی بھی غروب ہو جائے گی۔ کچھ دیر کے بعد میں اسٹیشن کے باہر کھڑا تھا۔
اگلا اسٹیشن پارسا کا آخری اسٹیشن تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اگلے اسٹیشن سے پہلے وہ شباب کو پیار کا اظہار کر دے گی۔ اس کے بعد چاہے وہ اگلے اسٹیشن پر اتر ہی کیوں نہ جائے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اظہار نہ کرنے کا ملال رہ جائے۔ وہ

جانتی تھی کہ اگر وہ ہمت ہار گئی۔ تو اس کی محبت کا سورج ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو جائے گا۔ جیسے جیسے سورج غروب ہوتا جا رہا تھا اس کے دل کی دھڑکن بھی تیز ہوتی جا رہی تھی۔ وہ مسلسل کلائی پر لگی گھڑی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ گھڑی کا ایک ایک سیکنڈ اس کے دل میں چھید کر رہا تھا۔ دل نے اس کے جسم کو جکڑ کر اپنی تحویل میں کر رکھا تھا۔ ہر سانس کے ساتھ زہر گھل کر رگوں میں حرارت پیدا کر رہا تھا۔ اس کو شباب ٹرین کے دروازے کی طرف جاتا دکھائی دیا۔ پارسا کے لیے یہ آخری موقع تھا اس سرطان کی جڑیں کمزور کرنے کا۔ اس کے دل نے 440 وولٹ کا جھٹکا دیا اور وہ اپنی سیٹ سے اٹھ گئی۔ شباب کا تعاقب اس کے پاؤں نے اس طرح کیا جیسے وہ کوئی نشان چھوڑ گیا ہو۔

440 وولٹ کا جھٹکا اب کی بار اُس نے بیچ میں محسوس کیا۔ کانوں سے شروع ہونے والی محبت کا پہلا جھٹکا بھی کانوں کے ذریعے لگتا تھا۔ کچھ فاصلے پر کھڑے وہ شباب کے جن الفاظ کو سن چکی تھی۔ دوبارا انہیں سننا چاہتی تھی۔ دماغ میں سیٹیوں کی آوازیں یوں محسوس ہو رہی تھی جیسے دل کی حرکتوں پر قہقہے لگا کر ہنس رہی ہو۔

میں نے پلیٹ فارم کی ٹکٹ خریدی۔ تو جی چاہا کہ دو ٹکٹ اپنے شہر کے بھی لے لوں۔ تمہارا ہاتھ پکڑ کر ٹرین پر سوار کروں اور اپنے شہر لے چلوں۔ اگلا اسٹیشن میرے شہر کا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ بات فی الوقت سچ نہیں ہو سکتی لیکن پھر بھی۔ میں نے جانے کیا سوچ کر اپنے شہر کی دو ٹکٹ خرید ہی لیے۔ ٹکٹ پر اپنے شہر کا نام دیکھ کر میری حسرت نے مجھے شدید جھنجوڑا۔ میں چل کر پلیٹ فارم پر پہنچا اور ایک بینچ پر چپ چاپ بیٹھ گیا۔

اسٹیشن پر کام کرنے والے بھی جانے کتنے سخت دل ہوتے ہوں گے۔ روز لوگوں کو بچھڑتا دیکھتے ہیں۔ جی چاہا کہ آج ان سب کو بلا کر مجھے تم سے ملتا دکھاؤں۔

اسٹیشن تک کے سفر میں...... میں نے تمہارے پھول خراب نہیں ہونے دیے۔

تم عورتوں کے ساتھ گھر آ جانا میں میت لے کر سیف اللہ بھائی کے ساتھ آؤں گا۔

شباب جس سے مخاطب تھا وہ اس کی شریکِ حیات تھی اور میری شریکِ محبت۔

وہ کچھ دیر ڈبے کے دروازے کو پکڑے آندھی کے تھم جانے کا انتظار کرتی رہی لیکن اب یہ آندھیاں اُس کے اندر تھیں۔ وہ جہاں جائے گی۔ یہ اس کے ساتھ ہی جانے والی ہیں۔ جیسے جیسے اسٹیشن قریب آ رہا تھا۔ ٹرین کی رفتار آہستہ اور آندھیوں کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ٹرین اسٹیشن پر رک چکی تھی۔ پر وہ ابھی تک ڈبے کے دروازے کو تھامے کھڑی تھی۔

ٹرین کے رکتے ہی میرے اندر طوفان کی رفتار تیز ہو چکی تھی۔ میں کسی بھی لمحے بس تمہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ ٹرین پوری طرح رک چکی تھی۔ میری نظر ٹرین کے ہر ڈبے کے دروازے کی طرف یوں دیکھ رہی تھی جیسے کوئی بچہ میلے میں کھو جانے کے بعد اپنے جانے والوں کو ڈھونڈتا ہے۔

ایک درمیانے قد کا شخص سیف اللہ کے ساتھ آتا دکھائی دیا۔ میں سیف اللہ کے پاس گیا اور سیف اللہ میرے کاندھے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کسی بچے کی طرح۔

اس نے میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیا اور میرے چہرے پر دیکھ کر رونا بند کر دیا اور بولا۔

''تم نے جو امانت مجھے دی تھی وہ اس دنیا سے جا چکی ہے لیکن تم پر سکون کیوں ہو۔ تم تو اُس سے محبت کرتے تھے۔ تم رو کیوں نہیں رہے۔

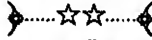
مجھے زمانے نے بیچ میں لا کھڑا کیا تھا۔ ہاں میری شادی اس سے ہوئی تھی اور اُس نے کبھی ان 5 سالوں میں تمہارا نام تک نہیں لیا لیکن اس کی باتوں میں ہمیشہ کہیں نا کہیں تم نظر آتے رہے۔ میں اس بات کو لے کر اسے بہت طعنے دیتا تھا۔ مجھے معاف کر دو۔ پلیز مجھے معاف کر دو۔ وہ اس دنیا سے جا چکی ہے۔

وہ یہ سب کہتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن مجھے اس کے ہونٹ ہلتے دکھائی دیے۔ پر کچھ سنائی نہیں دیا۔

پچھلے ڈبے سے کچھ لوگ میت لے کر نکلے۔ تم میرے سامنے سے گزر رہی تھی۔ میرے ہاتھ میں جو پھول تھے وہ میں

نے تمہاری ڈولی میں رکھ دیے۔ میرے دوسرے ہاتھ میں دو ٹکٹیں تھیں۔ میں نے اُن پر اپنے شہر کا نام دیکھا اور ٹرین کے ڈبے میں سوار ہونے لگا تو شباب نے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ جنازہ بھی نہیں پڑھ کر جاؤ گے۔ میں شباب کی بات کو ان سنی کر کے ڈبے میں سوار ہو گیا۔

مینڈک نے اپنی سرداری کی ویٹو پاور کا استعمال کیا اور مینڈکی کی سزائے موت کو پانچ سال کی سزا میں تبدیل کر کے خود سرداری سے دستبردار ہو گیا اور پانچ سال کے گزر جانے کا انتظار کرنے لگا۔



## مقصد

### سنبل خان بٹ

"افوہ! پریشان نہ ہوں، یہ پروجیکٹ ہمیں ہی ملے گا، میں نے فائل کو اچھی طرح سے دیکھ لیا تھا۔" داور کب سے فائل میں سر دیے بیٹھے تھے۔ نائلہ نے چڑ کر کہا۔

دورویہ درختوں کے بیچ گاڑی اپنی مخصوص رفتار سے جا رہی تھی۔ سورج کسی مووی میکر کے کیمرے کی طرح گاڑی کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھا۔ نائلہ نے ٹشو باکس سے ٹشو پیپر نکالا اور پیشانی پر آئے پسینے کے قطروں کو بڑی نفاست سے پونچھتے ہوئے ایک اچٹتی نگاہ ساتھ بیٹھے داور پر ڈالی۔

"پلیز داور!" وہ بری طرح جھلا کر بولی۔

"جب تم کہہ رہی ہو تو مجھے فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" انہوں نے مسکرا کے فائل بند کی اور اپنی گود میں رکھ لی۔

"آج گرمی کچھ زیادہ نہیں ہے؟" وہ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے بولا۔

"ہاں! بالکل......" اس کی بات پوری ہونے سے پہلے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

"کیا ہوا سکینہ؟ خیریت تو ہے نا؟" فون کی اسکرین پر گھر کا نمبر جگمگاتا دیکھ کر نائلہ تفتیشی انداز میں بولی۔

"نہیں بی بی جی! خیریت ہی تو نہیں ہے۔" سکینہ پریشان لہجے میں گویا ہوئی۔

"کیا مطلب؟" وہ جھنجلائی۔

"بی بی جی! چھوٹے صاحب ابھی تک گھر نہیں آئے۔"

"کیا......" نائلہ کے چونکنے پر داور بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"جی بی بی جی......چھوٹے صاحب ابھی تک کالج سے گھر نہیں لوٹے۔" پریشانی کے باعث سکینہ بول نہیں پا رہی تھی۔ وہ بمشکل اتنا ہی کہہ پائی۔

"سکینہ! پریشان مت ہو، زاہد اپنے کمرے میں ہوگا یا پھر لائبریری میں تم جانتی ہو نا آج کل وہ پڑھائی پر کتنی توجہ دے رہا ہے۔" سیٹ سے ٹیک لگاتے ہوئے وہ قدرے پرسکون ہو کر بولی۔

"نہیں بی بی جی! میں نے پورا گھر دیکھ لیا ہے وہ کہیں نہیں ہے، میں نے چوکیدار شفیق سے بھی پوچھا ہے تو انہوں نے بتایا کہ وہ ابھی تک نہیں آئے۔" سکینہ نے تفصیلاً کہا۔

"اچھا تم پریشان مت ہو، وہ آ جائے گا، جیسے ہی گھر پہنچے مجھے کال کر دینا، ابھی ہم ایک اہم میٹنگ کے لیے جا رہے ہیں، ہمیں اور پریشان مت کرو!" نائلہ نے جھنجلا کر کال بند کر دی۔

"کیا ہوا؟" ساتھ والی سیٹ پر خاموش بیٹھے داور نے پوچھا۔

"زاہد گھر نہیں آیا، اس لیے پریشان ہو رہی تھی۔" نائلہ نے سرسری انداز میں کہا۔

"سکینہ بی بی زاہد کی کچھ زیادہ فکر نہیں کر رہیں۔" اس نے استفہامیہ نظروں سے نائلہ کی جانب دیکھا۔

"پانچ سال کا تھا زاہد جب سے وہ اس کی دیکھ بھال کر رہی ہے، فکر تو ہو گی ہی۔" اس کی بات پر داور نے سر ہلایا اور گود

میں پڑی بلیو رنگ کی فائل کی طرف پھر سے متوجہ ہو گیا۔
''ویسے آج کل زاہد بہت بدلا بدلا سا لگ رہا ہے۔'' وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔
''مطلب؟'' وہ چونکا۔
''کالج سے لیٹ آنا اس کا روز کا معمول بنتا جا رہا ہے، گھر آتا ہے تو کمرے میں خود کو بند کر لیتا ہے، کھانا بھی نہیں کھاتا۔'' اس کے متفکر ہونے پر داور نے استہزائیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
''کیا......'' وہ الجھ کر بولی۔
''بیگم صاحبہ! ہمارا بیٹا کالج جاتا ہے، وہ کوئی اسکول کا ننھا منا بچہ نہیں ہے کہ کہیں کھو جائے اور اب وہ کالج جاتا ہے تو ظاہر ہے اس کی سرگرمیاں بھی بدلے گی ہی، پریشان مت ہو۔'' داور کے کہنے پر نائلہ نے سر جھٹکا اور اپنی طرف کا شیشہ نیچے کر کے باہر جھانکنے لگی۔



داور اور نائلہ کی شادی ان کے گھر والوں کی رضامندی سے طے پائی تھی۔ یوں بھی داور اور نائلہ ایک ساتھ پلے بڑھے تھے ایک ہی اسکول و کالج سے اپنی تعلیم مکمل کی تھی دونوں میں کافی مفاہمت پائی جاتی تھی دونوں ہی ایک دوسرے کی عادات و اطوار جانتے تھے اس لیے اس شادی میں ان کی رضامندی بھی شامل تھی۔ شادی کے بعد بابا کی طرف سے تحفے میں ملنے والے گھر میں منتقل ہو گئے تھے۔ داور اپنا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کرنا چاہتا تھا جس کے لیے اس کے بابا نے ایک معقول رقم اسے بھیج دی تھی شادی کے کچھ ہی عرصے کے بعد زاہد ان کی زندگی میں خوشی کی نوید بن کے آیا تھا۔ نائلہ داور کے ساتھ اس کی فرم میں مگن ہو چکی تھی جبکہ زاہد کے لیے حویلی سے پرانی ملازمہ (سکینہ) کو بلوایا گیا تھا۔ سکینہ ہی نے زاہد کی دیکھ بھال و پرورش کی تھی۔ سکینہ کافی سمجھدار تھی اس لیے نائلہ کو زاہد کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں اٹھانا پڑی تھی۔ زاہد نے ہوش سنبھالا تو یہ آگہی عذاب کی صورت اس پر نازل ہوئی کہ وہ جو سکینہ کو اپنی ماں سمجھتا تھا اسے پتہ چلا کہ وہ تو ان کے گھر کی ملازمہ ہے۔
وہ سونے کی دیواروں میں مقید تھا، اکیلا تن تنہا۔
ان دیواروں کو کھڑا کرنے والے کوئی اور نہیں اس کے اپنے ماں باپ تھے۔ وہ گھر میں چپ چاپ رہتا، سکینہ کے ساتھ اس کا تعلق پہلے جیسا نہیں تھا اور اس کے ماں باپ کے پاس اس کے لیے وقت نہیں تھا۔
زاہد دن بدن روکھا و چڑچڑا ہوتا جا رہا تھا۔ اسکول میں جانے کے بعد بھی اس کی طبیعت میں رتی برابر بھی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ کلاس میں ہمیشہ گم صم رہتا، مسکراہٹ تو اس کے لبوں کو چھو کر ہی نہیں گزری تھی۔ اس کی کسی سے بھی دوستی نہیں تھی لیکن کالج آنے کے بعد سب بدل گیا تھا۔
زاہد ہنسنے لگا تھا، اس کی کالج میں کافی لوگوں سے دوستی تھی لیکن بیسٹ فرینڈ دو ہی تھے۔ تابش اور علی۔
وہ ہمیشہ ہر جگہ ایک ساتھ دکھائی دیتے تھے، کالج کی ہر سرگرمی میں حصہ لیتے اور جیتتے بھی پھر اچانک ہی زاہد عجیب و غریب حرکتیں کرنے لگا۔



''زاہد......'' وہ جو ابھی لاؤنج میں داخل ہی ہوا تھا نائلہ کی رعب دار غصیلی آواز پر ٹھٹک کر رکا۔
''مم......مما۔'' وہ بے حد حیران ہو کر بولا۔
''کیا ہوا؟ مجھے دیکھ کر تمہاری رنگت کیوں اڑ گئی؟'' آرام دہ کرسی پر نائلہ سرخ چہرہ لیے اسے گھور رہی تھی۔
''نہ......نہیں تو۔'' اس کی زبان لڑکھڑائی ہوئی۔
''اگر ایسا نہیں ہے تو پھر تم خوف زدہ کیوں ہو تمہاری زبان بھی تمہارا ساتھ نہیں دے رہی۔'' وہ کھوجتی نگاہوں سے بیٹے کو دیکھ رہی تھی۔

''مما! آپ اتنی جلدی آفس سے آ گئی۔'' تھوک حلق میں نگلتے ہوئے بمشکل بولا۔
''میں تو جلدی آ گئی ہوں بیٹا جی! تمہیں اتنا وقت کہاں لگ گیا۔'' نائلہ تفتیشی نظروں سے دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں بولی۔
''مما! وہ کالج میں ٹیسٹ ہو رہے ہیں۔'' وہ خود کو نارمل کر چکا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلا خوف اب نہیں تھا۔
''کالج میں ٹیسٹ ہو رہے ہیں تو کیا کالج دو بجے کی بجائے شام کے پانچ بجے بند ہونے لگا ہے؟'' ان کا رویہ ابھی تک سخت تھا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس کے پاس چلی آئی۔
''نہیں مما! چھٹی تو پہلے والے وقت پر ہوتی ہے۔'' وہ سر جھکا کے دھیمے لہجے میں بولا۔
''تو پھر اتنی دیر کہاں تھے تم؟'' ان کے سوال پر زاہد جز بز ہو گیا۔
''میں اور میرے کچھ دوست ہم سب مل کر کالج کے بعد ٹیسٹ کی تیاری کرتے ہیں۔'' وہ نگاہیں چرا کر بولا۔
''کہاں کرتے ہو؟'' اس کے چہرے پر پھیلے خوف کے بادل نائلہ کو بہت کچھ باور کرا گئے تھے۔
''کبھی کسی دوست کے گھر تو کبھی کسی دوست کے پاس؟ ہم ایک جگہ ٹک کر نہیں پڑھتے تاکہ گھر والے ہم سے تنگ نہ ہوں۔'' وہ بڑے تحمل سے وضاحت کر رہا تھا۔
''ہمارے گھر تو کبھی نہیں آئے۔'' وہ پوائنٹ لے کر آئی۔
''جی......کل کے ٹیسٹ کی تیاری ہمارے گھر پر ہوگی۔'' وہ نظریں چراتا انگلیاں چٹختا ایک اور جھوٹ بول رہا تھا جسے دور کھڑی سکینہ نے بخوبی نوٹ کیا تھا۔
''گڈ! اچھے سے دل لگا کر ٹیسٹ کی تیاری کروان شاء اللہ میرا بیٹا ہر ٹیسٹ میں نمبر ون پر ہوگا۔'' اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں اس کا چہرہ لے کر نائلہ محبت سے کہتی ہوئی اس کا ماتھا چومنے لگی تو وہ جھٹکے سے ان سے الگ ہو کر دو قدم پیچھے ہٹا۔
''سوری! میں ایسے رویوں کا عادی نہیں ہوں۔'' وہ بے حد روڈ ہو کر بولا۔
''زاہد......!'' وہ ماں کی باتیں سنی ان سنی کرتا وہاں سے جا چکا تھا۔ نائلہ بے آواز آنسو بہاتی پیچھے تنہا رہ گئی۔

......☆☆......

نائلہ زاہد کو لے کر کافی پریشان رہنے لگی تھی۔ آفس کا سارا کام داور سنبھال رہا تھا اور وہ گھر پر زاہد کی نگرانی کرنے لگی تھی۔ وہ کالج وقت پر جاتا تھا لیکن کالج سے واپسی کافی لیٹ ہوتی تھی۔ وہ جب بھی کالج سے واپس آتا اس کی آنکھیں سرخ ہوئی ہوتی وہ ہچکولے کھا کر چلتا جیسے ابھی گرنے والا ہو اور پھر فوراً سو جاتا اور گھنٹوں گہری نیند سوتا۔ وہ بہت الجھ چکی تھی۔ عجیب سے واہمے دل میں جنم لے رہے تھے۔ بالآخر اس نے کالج پرنسپل سے ملنے کی ٹھانی۔
''السلام علیکم! میں زاہد حیات خان کی مما ہوں۔'' اس نے کرسی سنبھالتے ہوئے اپنا مختصر تعارف کروایا۔
''وعلیکم السلام! جی کہیے، کیسے آنا ہوا۔'' پرنسپل سجاد صاحب مہذب انداز میں گویا ہوئے۔
''مجھے زاہد کے بارے میں جاننا تھا، اس کی تعلیم کیسی چل رہی ہے۔'' ایک گہری سانس ہوا میں خارج کرتے اس نے بات کا آغاز کیا۔
''یہ تو آپ کو معلوم ہوگا۔''



''کیا مطلب؟'' وہ چونکی۔
پرنسپل سجاد کو ایک سیکنڈ میں ان کا چونکنا سمجھ آ گیا تھا۔ کیونکہ ان کا آئے دن ایسے کیسز سے واسطہ پڑتا رہتا تھا۔
''آپ کا بیٹا دو ماہ سے کالج نہیں آ رہا، کیونکہ اس نے کوئی اکیڈمی جوائن کر لی ہے پر افسوس! میں نے کئی بار اسے آوارہ لڑکوں کے ساتھ گھومتے دیکھا ہے مجھے ڈر ہے آپ کا بیٹا کسی غلط کام میں نہ پھنس جائے وہ اچھے لڑکے نہیں ہے اپنے بیٹے کو دور رکھے ان سے۔'' پرنسپل سجاد نے جو انکشاف کیے تھے وہ ناقابل یقین تھے۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ مزید

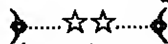
ایک لمحے کی دیری کیے بغیر گاڑی میں آبیٹھی تھی کہ اب وہاں بیٹھنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔
گھر آنے کے بعد وہ سیدھا اپنے کمرے میں گئی تھی اور خوب جی بھر کے روئی تھی۔ رات کو داور گھر آیا تب بھی وہ کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔
"کیا ہوا؟" داور نے اس کی سوجی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔
"کچھ نہیں ہوا......" انداز سرسری تھا۔
"تو پھر آنکھیں کیوں سوجی ہے تمہاری اور ناک بھی سرخ ہورہی ہے۔" بہت ہی پیار سے اس کی چھوٹی سی ناک دباتے ہوئے کہا۔ وہ ہنس دی۔
"سب ٹھیک ہے۔ بس سر میں درد تھا، میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔" وہ چہرے سے کافی مضمحل لگ رہی تھی۔ وہ سر ہلا گیا۔
"اچھا تم آرام کرو۔ میں اسٹڈی روم میں ہوں۔" وہ کمرے کی بتی بجھا کر چلے گیا تو وہ بیڈ پر آ کے لیٹ گئی۔
......☆☆......
"ڈاکٹر! کب ٹھیک ہوگا میرا بیٹا؟" زاہد کی طبیعت دن بدن بگڑتی جارہی تھی۔ عجیب ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہورہا تھا۔
"سمجھ نہیں آرہا کچھ بھی، بخار ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔" ڈاکٹر ہارون فیملی ڈاکٹر تھے زاہد کو لے کر وہ بھی کافی پریشان تھے۔
"مجھے لگتا ہے اب اسے اسپتال میں داخل کرانا ہوگا، یہ کوئی عام بخار نہیں لگ رہا۔ ٹیسٹ ہوں گے تو ہر چیز واضح ہوجائے گی۔" ڈاکٹر ہارون ایک نئی پریشان دے کر وہاں سے جا چکے تھے۔ وہ بھی نیچے لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئی۔
"سکینہ، ایک کپ کافی۔" دونوں ہاتھوں سے کنپٹیاں سہلاتے ہوئے آواز لگائی۔ سکینہ کچھ ہی دیر میں گرما گرم کافی کا بڑا سا مگ لے آئی۔
"مما، مجھے اپنے دوستوں سے ملنے جانے دیں۔" زاہد پورے پانچ دن سے گھر میں نظر بند تھا۔ اس کے بارے میں سب جاننے کے بعد نائلہ نے اس کا گھر سے نکلنا بند کردیا تھا۔
"تم کہیں نہیں جاسکتے...... چپ چاپ کمرے میں جاؤ اور آرام کرو۔" اس نے گرم کافی کا گھونٹ بھرا۔
"پر کیوں......؟" انداز بے حد روڈ تھا۔
"کیونکہ...... میں نہیں چاہتی۔" وہ اپنے مخصوص لہجے میں گویا ہوئی۔
"آپ اپنی چاہت مجھ پر تھوپ نہیں سکتی۔" وہ سخت غصیلے انداز میں چلایا۔
"میں تمہارے ساتھ کچھ بھی کرسکتی ہوں، کیونکہ میں تمہاری ماں ہوں۔" نائلہ ابھی تک خود کو نارمل رکھے ہوئے تھی لیکن زاہد اسے طیش دلانے سے باز نہیں رہا تھا۔
"ہونہہ...... ماں۔" اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ رینگ گئی۔ نائلہ پہلو بدل کے رہ گئی۔
"مجھے جانا ہے، بس......" وہ دانت کچکچاتے ہوئے بولی۔
"اچھا، جا کر دکھاؤ۔" وہ چیخ کر بولی۔
"خدا حافظ۔" اس نے استہزایہ ہنسی ان پر اچھالی اور پھر ایسا بھاگا کہ پینتیس سالہ نواز (چوکیدار) بھی اسے پکڑ نہیں پایا تھا۔ نائلہ ہونق بنی کھڑی رہی۔
......☆☆......
"بس کرو زاہد آج کچھ زیادہ نہیں ہورہا۔" تابش نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لے کر دھواں ناک سے نکالتے ہوئے کہا۔
"بھائی مجھے مت روکو، آپ نہیں جانتے میری گھر پر کیا حالت تھی۔" اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جس پر سفید رنگ کا

کوئی پاؤڈر سا پڑا تھا جسے وہ وقفے وقفے سے سونگھ رہا تھا۔
"سمجھ نہیں آتا تمہاری ممانے تمہیں گھر میں نظر بند کیوں کیا، تم کونسا لڑکی ہو۔" علی نے اس کے ہاتھ سے کاغذ لیا اور اس پر جھک کر لمبی سانس اپنے اندر کھینچی۔
"دماغ خراب ہو گیا ہے ان کا۔" زاہد نے نخوت سے سر جھٹکا۔ تابش سے سگریٹ لے کر اپنے گلابی ہونٹوں میں دبالی۔
"زاہد، بس بہت ہو گیا، تم کچھ زیادہ لے رہے ہو، تمہاری طبیعت بگڑ سکتی ہے۔" تابش وقفے وقفے سے اسے روک رہا تھا۔
"ارے نہیں بھائی کہاں، اس سے تو طبیعت سنبھل رہی ہے، ورنہ اب تک تو ڈاکٹر کی کڑوی کسیلی دوائیاں ہی کھا رہا تھا۔" زاہد نے ایک چٹکی سفید پاؤڈر کی لی اور زبان پر رکھ لی۔
"بس بہت ہوا، اٹھو، گھر جاؤ اپنے......" تابش نے اس کے ہاتھ سے کاغذ جھپٹ لیا۔
"بھائی تھوڑی سی اور......" زاہد نے معصوم سی شکل بنائی۔
"نہیں......تم پہلے ہی زیادہ لے چکے ہو اگر کچھ ہو گیا تو ہم بھی پکڑے جائیں گے۔" علی نے اس کا ہاتھ جھٹکا۔
"پلیز بھائی......" وہ منت کرنے لگا۔
"یہ مفت نہیں آتی پیسے بھرے ہیں میں نے اور علی نے تم تو خالی ہاتھ لٹکائے ہوئے چلے آئے۔ اب جاؤ......" تابش بھڑک اٹھا تو وہ اٹھ گیا۔
"چلتا ہوں، اگلی بار آؤں گا تو پیسے لے کر آؤں گا۔" وہ لڑکھڑاتا ہوا جیسے تیسے دروازے سے باہر نکلا اور دوسرے کمرے میں گھس گیا۔
"آپ......" کمرے سے نسوانی آواز ابھری تھی۔
"حوریہ میری جان!" زاہد لڑکھڑاتا ہوا بیڈ کی طرف بڑھا۔ اس کا پاؤں لڑکھڑایا، وہ توازن برقرار نہ رکھ سکا، حوریہ پر جا گرا۔
"بچاؤ......بچاؤ، تابش بھائی......علی بھائی۔" حوریہ کی بلند و بالا چیخیں سن کر تابش اور علی دوڑے آئے اور زاہد پر برس پڑے، وہ تینوں اپنے ہوش میں نہیں تھے۔ حوریہ بھاگتی ہوئی پڑوس سے ظفر اور فیصل کو بلا لائی۔ ان دونوں نے مل کر تابش اور علی کو اپنی مضبوط گرفت میں جکڑا اور دوسرے کمرے میں بند کر دیا۔ زاہد خون میں لت پت فرش پر ادھ مرا پڑا تھا۔ فیصل اور ظفر اسے قریب کے اسپتال میں لے آئے۔



"داور، ہمارا بیٹا آپریشن تھیٹر میں کیوں ہے؟ کیا ہوا ہے اسے کچھ تو بتائیں ناں!" وہ دونوں ہاتھوں سے ان کا گریبان پکڑ کر بولی۔
داور کو نامعلوم نمبر سے کال آئی تھی، زاہد کی طبیعت کے بارے میں جیسے اسے پتہ چلا وہ نائلہ کو لے کر اسپتال آ پہنچا۔ ڈاکٹرز زاہد کے ساتھ پورے ایک گھنٹے سے آپریشن تھیٹر میں بند تھے۔ کیا ہوا تھا اس کے بیٹے کو؟ کیا ہونے جا رہا تھا؟ وہ کچھ بھی تو نہیں جانتا تھا۔
نمبر ون بزنس مین "مسٹر داور حیات خان" آج خود کو دنیا کا سب سے بے بس و لاچار آدمی سمجھ رہا تھا وہ تو آج تک یہی سمجھتا آیا تھا کہ وہ پیسوں سے ہر چیز خرید سکتا ہے، دنیا و جہاں کی خوشیاں خرید سکتا ہے وہ کچھ بھی حاصل کر سکتا ہے پیسوں سے لیکن وہ غلط تھا اس کی سوچ غلط تھی، وہ سب کچھ کر سکتا تھا لیکن اپنے بیٹے کی پل پل ساتھ چھوڑتی زندگی کو نہیں روک سکتا تھا اپنے بیٹے کی سانسوں کو جسم میں قید نہیں کر سکتا تھا وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا کچھ بھی نہیں......" آپریشن تھیٹر کے باہر جلتی سرخ بتی کو دیکھتا ہوا وہ سوچ گیا۔ نائلہ دروازے کے سامنے دیوار سے لگی پلاسٹک کی کرسی پر بیٹھ کر رو دی۔

”میرے بیٹے کو کچھ ہوا تو میں اپنی جان دے دوں گی۔“ وہ ہزیانی انداز میں بولی۔
”میں رو نہیں سکتا کیونکہ میں مرد ہوں، میرے بابا حیات خان نے کہا تھا کہ داور! مرد کبھی نہیں روتا، رونا اس کی شان کے خلاف ہے، جو روتا ہے وہ مرد نہیں ہوتا، اپنے درد و غم کو اپنے اندر دبا لیتا۔“ وہ کسی گہرے نقطہ پر نظریں جمائے عمیق سوچوں میں گم تھا۔ یک لخت سرخ بتی بجھی آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر برآمد ہوا۔
”ڈاکٹر! میرا بیٹا کیسا ہے......؟“ ڈاکٹر کو دیکھ کر نائلہ پوری قوت سے کرسی سے اٹھی۔ داور بھی پریشان سا ڈاکٹر کی طرف بڑھا۔ بے حد حیران ہو کر ڈاکٹر احتشام نے مسٹر اینڈ مسز داور حیات خان کو دیکھا۔
”میرے روم میں چلیے کچھ ضروری بات کرنی ہے آپ سے۔“ وہ دونوں ڈاکٹر کی تقلید میں ان کے کمرے میں چلے آئے۔
”ڈاکٹر! کیا ہوا ہے میرے بیٹے کو؟“ نائلہ نے کرسی پر بیٹھتے پوچھا۔
”آپ کا بیٹا ٹھیک نہیں ہے۔“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ڈاکٹر گویا ہوا۔
”کیا ہوا ہے اسے؟“ داور کو اپنی آواز کسی کھائی سے آتی محسوس ہوئی۔
”آپ کے بیٹے کا کسی کے ساتھ جھگڑا ہوا تھا، بہت زیادہ مار پیٹ کی وجہ سے ان کا کافی خون بہہ چکا تھا، اسے بچانے کے لیے خون کی اشد ضرورت تھی، جس کے لیے آپ کے بیٹے کا خون ٹیسٹ کرایا گیا، آپ کو معلوم ہے آپ کے بیٹے کے خون میں ہمیں کیا ملا؟“ ڈاکٹر نے بے حد سنجیدگی سے ان کی طرف دیکھا۔ وہ نفی میں سر ہلا گئی۔
”آپ کا بیٹا ڈرگ کرتا رہا ہے۔“ ڈاکٹر کے انکشاف نے داور کے پیروں تلے سے زمین ہی کھینچ لی تھی۔ جبکہ نائلہ منہ پر ہاتھ رکھے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔
”ڈرگز......؟“ وہ ناقابل یقین انداز میں سر ہلاتا ہوا بولا۔ جیسے اسے یقین ہی نہ آیا ہو۔
”جی ہاں......ڈرگز۔“ صدمہ بہت بڑا تھا۔ وہ خالی الذہن ان کو تکے گئے۔
”دیکھیے آپ کے بیٹے کے خون میں جو مقدار ڈرگز کی پائی گئی ہے اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ اسے ڈرگ کرتے ابھی زیادہ وقت نہیں ہوا، اس لیے بہتر علاج اور آپ دونوں کا پیار اسے نئی زندگی دے سکتا ہے۔“
”کچھ بچے بہت حساس ہوتے ہیں، انہیں پیار توجہ کی بہت ضرورت ہوتی ہے لیکن جب یہ چیزیں انہیں میسر نہیں ہوتی، تو وہ خود کو فالتو چیز تصور کرنے لگتے ہیں، ایسے لوگوں کو تھوڑی سی توجہ کیا مل جائے، یہ خود کو ان پر نچھاور کر دیتے ہیں، صحیح غلط کچھ بھی نہیں دیکھتے۔“ ڈاکٹر کچھ توقف کے بعد پھر بولے۔
”ایک بات جان لیجیے اگر آپ نے اپنے بیٹے کو نہیں سنبھالا تو آپ اپنے بیٹے کو کھو دیں گے، ڈرگز انسان کو جیتے جی جہنم واصل کر دیتا ہے اور مجھے نہیں لگتا کہ آپ اپنے بیٹے کو یوں تڑپ تڑپ کر مرتا دیکھنا چاہیں گے، اس لیے آپ کو اپنے بیٹے کا خاص خیال رکھنا ہوگا، اپنی آنکھوں کو کیمرہ کی آنکھ بنانا ہوگا جو ہر وقت آپ کے بیٹے پر نظر رکھے، ذرا سا فوکس اِدھر سے اُدھر ہوا نہیں کہ آپ کا بیٹا......“
”ڈاکٹر! جیسا آپ کہیں گے ہم ویسا ہی کریں گے، پلیز میرے بیٹے کو بچا لیجیے۔“ داور نے انہیں کچھ سخت کہنے سے پہلے ٹوک دیا تھا۔ ان کے چہرے پر غم و غصہ کے ملے جلے تاثرات تھے۔ نائلہ سے اور برداشت نہ ہوا تو وہ اٹھ کر زاہد کے پاس چلی آئی۔ جسے اب دوسرے کمرے میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔



زاہد کئی گھنٹے دوائیوں کے اثر رہا آنکھ کھلی تو سب سے پہلے جو چہرہ دیکھا وہ ماں کا تھا، جو آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ نائلہ جائے نماز پر بیٹھی اپنے بیٹے کی زندگی کی سلامتی مانگ رہی تھی، وہ اپنے رب سے اپنے جگر کے ٹکڑے کی خیر مانگ رہی تھی۔ اس کی سسکیاں پورے کمرے میں گونج رہی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر بے حد حیرت سے نیم وا آنکھوں سے ماں کا یہ روپ دیکھ رہا

تھا۔

"میں نے تو ہمیشہ خود کو بے ضرر سمجھا تھا، پھر مما کیوں میرے لیے رو رہی ہیں؟ کیوں میری لمبی زندگی کی دعائیں کر رہی ہیں؟ کیونکہ میں خاص ہوں بہت خاص۔" اس کی اپنی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

"م......مما۔" شدید تکلیف کے باعث لفظ ٹوٹ کر ادا ہوئے تھے۔

"میرا بیٹا" نائلہ کے جسم کا ہر عضو کان بنا ہوا تھا۔ وہ فوراً جائے نماز سے اٹھی اور زاہد کو بے اختیار چومنے لگی۔ ان کے آنسو متواتر بہہ رہے تھے۔

"ایم سوری، مما میں نے آپ کو دھوکہ دیا، مجھے معاف کر دیں۔" وہ ماں سے چمٹا رو رہا تھا۔ نائلہ بھی شدت سے رو دی۔

"معافی تو ہمیں مانگنی چاہیے تم سے ہم نے اپنے اکلوتے بیٹے کو نظر انداز کر دیا اس کے حصہ کا سارا وقت اپنی بزنس سرگرمیوں میں صرف کرتے رہے، کبھی تم پر توجہ ہی نہیں دی، ایم سوری بیٹا......ایم ریئلی سوری۔" داور بھی کمرے آ چکے تھے۔ شدت جذبات سے آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے۔

"ایم سوری پاپا، میں نے آپ دونوں کو غلط سمجھا، مجھے لگا آپ مجھ سے محبت ہی نہیں کرتے، میں آپ کے لیے ضروری ہی نہیں ہوں، بس فالتو سی کوئی چیز ہوں۔" جو شکوے اس نے کب سے دل میں دبا رکھے تھے وہ آج زبان پر تھے۔

"بہت بری بات ہے زاہد جو ماں باپ اپنے بچوں کے مستقبل کے لیے اپنے آج کو قربان کر دیتے ہیں، تمہیں کیا لگتا ہے وہ ماں باپ اپنے بچوں سے محبت نہیں کرتے ہوں گے جو دن رات انہیں آرام و سکون اور انجوائے کر کے گزارنا چاہیے وہ دن رات اپنے بچوں کی خاطر محنت و مشقت میں گزار دیتے ہیں کیونکہ وہ اپنے بچوں سے محبت کرتے ہیں، انہیں زندگی میں در بدر بھٹکتا اور سسکتا نہیں دیکھنا چاہتے، ماں باپ ہمیشہ اپنے بچوں سے محبت کرتے ہیں۔" نرس کے انفارم کرنے پر ڈاکٹر بھی روم میں آ چکے تھے اور وہاں سب کی گفتگو بھی سن چکے تھے۔

"زندگی بہت خوب صورت ہے اس لیے یہ صرف ایک بار ملتی ہے، اس کی قدر کرنا سیکھو، یوں غلط روش اختیار کر کے برباد مت کرو، ہو سکے تو اپنے ماں باپ کی بھی قدر کرو کیونکہ وہ تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔" ڈاکٹر احتشام بہت محبت سے اس کا برین واش کر رہے تھے۔

"میں وعدہ کرتا ہوں، آئندہ ایسی کوئی غلط حرکت نہیں کروں گا جس سے میرے مما پاپا کو تکلیف پہنچے مجھے اللہ پاک نے دوبارہ زندگی عطا کی ہے اور میں یہ نئی زندگی اپنے مما پاپا اور اپنے ملک و قوم کی خدمت میں گزاروں گا۔" اس نے ایک ہاتھ میں مما کا اور ایک ہاتھ میں پاپا کا ہاتھ تھام کر سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں جگنو جگمگا رہے تھے۔ نائلہ اور داور کے ہونٹوں پر آسودہ مسکراہٹ سمٹ آئی تھی۔

"ویسے میں ایک اور بات بتا تا چلوں کہ ہم ڈاکٹرز مل کر منشیات پر کام کر رہے ہیں، اس میں سوشل میڈیا، نیوز چینلز، اخبار اور آپ ہی کے جیسے نوجوان لوگ ہماری مدد کے لیے ہمارے ساتھ کھڑے ہیں۔ ہم سب کا ایک ہی مقصد ہے کہ ہم پاکستان سے منشیات کو ختم کر دیں۔ اسے جڑ سے اکھاڑ دیں اور مجھے پورا یقین ہے کہ ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔"

"ان شاء اللہ" بیک وقت سب نے ایک ساتھ کہا۔

"اور آج سے ہم بھی اس مقصد میں آپ کے ساتھ شامل ہیں۔" زاہد نے پر عزم لہجے میں کہا۔ تو سب مسکرا اٹھے۔



# ذوق آگہی

**سباس گل**

دعا

بیٹے نے بڑی انکساری سے اپنے والد سے کہا۔
''ابا جی میرے حق میں دعا فرمائیں تاکہ کوئی کاروبار شروع ہو اور گھر میں برکت بے روزگاری سے جان چھوٹے گھر میں خوشحالی آئے۔'' باپ نے کہا۔
''بیٹے میں تو ہر وقت تیرے لیے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تیری بانہاں پکڑے یعنی تیرا بازو پکڑے اور ہاتھ تھام لے اللہ پاک جس کا ہاتھ پکڑتا ہے اس کے دکھ دور ہوجاتے ہیں۔''
باپ کئی روز تک یہ دعا کرتا رہا اور بیٹا خوشی سے سنتا رہا اور آمین کہتا رہا۔ ایک روز باپ نے یہ الفاظ کہے تو بیٹا بولا۔
''ابا جی یہ دعا نہ کیا کریں یہ دعا بڑی خطرناک ہے۔''
باپ نے پوچھا ''میں کچھ سمجھا نہیں، پیارے بیٹے۔''
بیٹے نے کہا۔
''کل میں ماسی صغراں کے گھر بیٹھا تھا اس کا بیٹا زمین پر کھیل رہا تھا ماسی صغراں چارپائی پر بیٹھی تھی اس نے اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑا پھر اسے اوپر اٹھا لیا۔''
بشیر احمد بھٹی...... بہاولپور

آنسو

آنسو انسانی وجود کی بے بسی کی علامت ہوتے ہیں جب انسان کسی انہونے معاملے میں الجھ کر اپنے آپ کو بے بس پاتا ہے تو بے اختیار اس کی آنکھوں کے گوشہ نم ہو کر آنسو باہر نکلنے کو بے تاب ہوجایا کرتے ہیں۔
آنسو بے سبب ہرگز نہیں بہتے دل پر گہری چوٹ لگتی ہے تو آہ لبوں پر مچلنے لگتی ہے وہ آنسو جو پلکوں پر اٹکا رہ جائے بذات خود ایک بددعا ہوا کرتا ہے اور دکھا ہوا دل خود ایک بددعا کی گزرگاہ بن جاتا ہے۔
دل کے بارے کو پانی کی صورت میں بہانے والے یہ آنسو بھی کس قدر عجیب ہوا کرتے ہیں جب بیکراں خوشیاں ملتی ہیں تب بھی بہتے ہیں اور جب کوئی اندوہناک غم ملتا ہے تب بھی یہ بہتے ہیں ہم ان بہتے ہوئے دھاروں کو روک ہرگز نہیں سکتے نہ ہی ہمارا ان پر کوئی اختیار چلتا ہے۔
مگر اپنوں کے ستم اور ناروا سلوک پر یہ بڑھ کے پانیوں سے بھی تجاوز کر جاتا کرتے ہیں اور سب سے بہتر وہ آنسو ہوا کرتے ہیں جو خوف خدا سے آنکھوں سے چھلک پڑیں اور فرشتے فوری طور پر گواہی کے طور پر انہیں خدا کے حضور پیش کریں اور نجات کا ذریعہ بن جائیں۔
ایم حسن نظامی...... قبولہ شریف

فیثا غورث کہتے ہیں

- جو شخص عیبوں سے تمہیں مطلع کرے وہ اس شخص سے بہتر ہے جو غلط تعریف کر کے تمہارا دماغ بگاڑ دے۔
- تمام اعضاء جسمانی میں زبان سب سے بڑی نافرمان ہے۔
- مرد کا امتحان عورت سے عورت کا روپ پیسے سے اور روپے پیسے کا امتحان آگ سے ہوتا ہے۔
- تقدیر بہت کم تدبیر کا ساتھ دیتی ہے۔
- دوستی بہت کم دوست کا ساتھ دیتی ہے۔
- دوستی میں شبہ زہر ہے۔
- انسان برسوں میں جوان ہوتا ہے لیکن اگر وہ اپنے وقت کو بہترین طریقے سے صرف کرے تو گھنٹوں میں بوڑھا یعنی تجربہ کار ہوجاتا ہے۔
- احساس دعوت عمل ہے اور عمل خضر راہ ہے جو عامل کو منزل مقصود سے روشناس کرا دیتا ہے۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال

قبولیت دعا کے اوقات

اذان اور نماز کی جماعت ہونے کے درمیان وقفے میں دعا مانگنا۔
☆ بارش کے وقت
☆ فرض نماز کے بعد
☆ تلاوت قرآن کے بعد
☆ جمعہ کے دن کی ایک خاص گھڑی
☆ ہر رات کی ایک مخصوص ساعت
☆ آب زم زم پیتے ہوئے
☆ سفر کی حالت میں
☆ بیماری کی حالت میں

☆مصیبت اور پریشانی کے وقت
☆سجدے میں دعا مانگنا
☆عرفات کے میدان میں
☆کعبہ کی زیارت کے وقت
☆طواف کرنے کے وقت
☆حجر اسود کی زیارت کے وقت
ایس حبیب خان......ناظم آباد، کراچی

## چند باتیں

اس نے غصے سے کہا آپ کی تعریف۔ ہم نے پیار سے کہا جی بھر کے کیجیے جناب۔

سندھ میں دیہی علاقے میں وائی فائی سروس کا آغاز واہ بھئی واہ اب تو سندھ والے روٹی پانی ڈاؤن لوڈ کر کے کھائیں پئیں گے۔

میں نے فقیر سے کہا بابا میرا یار مجھ سے بہت ناراض ہے اس کا کوئی حل تو بتائیں، فقیر نے رو رو کر کہا اگر یار کی ناراضگی کا کوئی حل ہوتا تو آج میں فقیر نہ ہوتا۔
پرنس افضل شاہین......بہاولنگر

## عورت

باکرم کردار تاریخ روشن عظیم المرتبت لے کر بصیرت و بصارت تخلیق سرمایہ، صنف نازک اسلامی معاشرے میں اس منصب پر فائز ہے جس کا تصور بھی محال ہے، تاریخ کے اوراق میں آج بھی سنہری لفظوں میں خواتین کی داستانیں موجود ہیں جن کو کسی بھی حال میں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ مقام افسوس عہد ساز خواتین شاذ و نادر نہیں ہیں بس آج تک دنیا صرف اور صرف بری عورتوں کا ہی سراغ زیادہ لگا سکی ہے جبکہ یہ امر اپنی جگہ بجا ہے کہ جو مرد دنیا تعمیر کرتا ہے اس کو اک عورت ہی پیدا کرتی ہے یہ بات متعلق سے بالاتر ہے کہ آج تک یہ باوقار عورت اپنے مساوی حقوق سے محروم ہے اور آج کے دور جدید میں بھی حوصلہ شکنی کی علامت سمجھا جاتا ہے اور بہت سی جگہ پر انسانیت سوز سزائیں عورت کو سہنا پڑی ہیں قدرت حق نے عورت کو نازک بنایا شاید اس لیے عورت دنیا کے جس کونے میں بھی موجود ہو اس کو مساوی حقوق فراہم نہیں ہیں یہ بات اور ہے کہ ترقی یافتہ معاشرے میں خواتین کی تذلیل کے طریقے قدرے سے مختلف ہیں شاہراہ حیات پر عفت حیا کا یہ مجسم اپنے اندر جاہ و جلال کا سمندر رکھنے کے باوجود مسلسل زوال پزیر ہیں اور اس سے بڑھ کر قسمت کی کیا ستم ظریفی ہوگی کہ ذہن کے گوشوں میں ظلم و تفرت کے آتش فشاں لاوا ابل رہے ہیں اس کے باوجود کہ اسلامی معاشرے میں بلند مقام حاصل ہے زندگی کی گاڑی ہو یا کوئی آفت حادی ہو خواتین نے ہر حال مردوں کا شانہ بشانہ ساتھ دیا ہے اور اپنے صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے لیکن اس سب کے باوجود مساوی حقوق سے ہر دور میں محروم ہی رہی ہے عورت نے اپنی آزادی کے لیے بہت سی تحریکیں چلائیں اور افسوس کہ عورت آزادی حاصل کر کے مزید ذمہ داریوں کے بوجھ تلے آ گئی اس کو اپنی عصمت کی چادر کو مزید بڑا کرنا پڑا افسوس کہ عورت آج بھی غیرتوں کے نام پر قتل ہو رہی ہیں تنگ ذہن معاشرے میں عورت کا جینا مشکل ہی نہیں نہ ممکن ہے اور نہ ممکن کے باوجود عورت نے ممکن بنایا ہوا ہے پچھلی صدیوں میں جو لوگ مریخ پر گئے تھے اب وہ واپس آ رہے ہیں زمانے کی جدیدیت مزید بڑھ رہی ہے اور اس کے باوجود عورت گھٹ گھٹ کر مر رہی ہے عورت اچھی ہو یا بری دونوں صورتوں میں اپنے مرد کی عکاسی کرتی ہے۔
حسین خواجہ......مچن آباد

## سنہری اقوال

۞ اللہ کی ذات پر بھروسا کرنے والا کبھی ناکام نہیں ہوتا۔
۞ کسی کا راز تلاش مت کرو اگر معلوم ہو جائے تو پھیلاؤ نہیں۔
۞ کوئی بھی مصیبت پڑنے پر موت کو یاد نہ کرو۔
۞ انسان کے سب سے بڑے دشمن اس کے برے دوست ہیں۔
۞ کسی کو خوش کرنا نیکی ہے۔
ایس ایچ شجاع بخاری جعفری......چکوال

## سنہری باتیں

! محنت اور ہنر مندی کے آگے کچھ بھی ناممکن نہیں۔ (سیموئل جانسن)
! عادت کی اگر مزاحمت نہ کی جائے تو یہ جلد ہی ضرورت بن جاتی ہے۔ (اگسٹائن)
! اپنے آپ پر قابو حاصل کرنا سب سے بڑی جیت

ہے۔(پلیٹو)
❗ تمام حیلے بے کار ہوجائے تو پھر تلوار سے کام لینا جائز ہے۔(ہلاکوخان)
❗ جس سے مجھ کونفرت ہے اس سے میں کبھی نہیں ملتا۔ (راجرز)
❗ اگر آپ کسی بھی بے وقوف کی شکل نہیں دیکھنا چاہتے تو آپ کو پہلے اپنا آئینہ توڑ دینا چاہیے۔(ریب لائیس)
کائنات اشرف...... بوسال سکھا

## اچھی بات

جولوگ دوسروں کے دلوں کو کانٹوں سے زخمی کرتے ہیں ان کے اپنے اندر بھی کیکر اُگے ہوتے ہیں وہ چاہیں یا نہ چاہیں ان کے وجود کو کانٹا بننا ہوتا ہے وہ پھول نہیں بن سکتے۔

فائزہ بلال اقرأ...... جام پور، پنجاب

## اقوال زریں

▪ لوگوں کو دعا کے لیے کہنے سے زیادہ بہتر ہے ایسے عمل کرو کہ لوگوں کے دل سے آپ کے لیے دعا نکلے۔
▪ دوست پھولوں کی طرح ہوتے ہیں انہیں گرم و سرد ہوا سے بچانا پڑتا ہے۔ کسی بھی دوست کے دل کو اس طرح نہیں توڑتے جیسا کہ شاخ سے پھول توڑا جاتا ہے۔
▪ کامیابی حوصلوں سے ملتی ہے اور حوصلے دوستوں سے ملتے ہیں، جبکہ دوست مقدروں سے ملتے ہیں اور مقدر انسان خود بناتا ہے۔

سیدہ علیشاہ...... بہاولپور

## کسب حلال کی فضیلت

حضور اقدسؐ ارشاد فرماتے ہیں" کہ اللہ پاک ہے اور پاک ہی کو دوست رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے مومنین کو بھی اسی کا حکم دیا ہے کہ" پاک چیزوں سے کھاؤ اور اچھے کام کرو۔"

اور فرمایا" اے ایمان والو! جو کچھ ہم نے تم کو دیا ان میں سے پاک (حلال) چیزوں میں سے کھاؤ۔"

پھر فرمایا کہ ایک شخص طویل سفر کرتا ہے جو پریشان حال اور بدن گرد آلود ہے (یعنی کہ اس حالت میں ہے کہ جو دعا کرے وہ قبول ہو) وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا کرتا ہے مگر حالت یہ ہے کہ اس کا کھانا حرام، پینا حرام، لباس حرام پھر اس کی دعا کیونکر قبول ہو؟

یعنی اگر قبولیت دعا کی خواہش ہو تو کسب حلال اختیار کرو کیونکہ اس کے بغیر دعا کے اسباب بے کار ہیں۔

سلمٰی ملک...... قادر پوراں

## حکمت کے موتی

✚ ایمان داری سے خرید و فروخت کرنے والے کا انجام نیکوکار اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔
✚ بنی اسرائیل اس لیے تباہ ہوئے کہ وہ غریبوں کو سزا دیتے تھے اور امیروں کو چھوڑ دیتے تھے۔
✚ جولوگوں کا شکریہ ادا نہ کرے وہ خدا کا شکر گزار نہیں ہوسکتا۔
✚ سب سے بہتر جہاد یہ ہے کہ تم انتقام کی قدرت رکھتے ہوئے بھی غصہ کو پی جاؤ۔
✚ علم مال سے بہتر ہے کہ وہ تمہاری حفاظت کرتا ہے اور تم مال کی حفاظت کرتے ہو۔
✚ صرف خواہش کرنے سے ہر چیز نہیں مل جاتی، خواہش کے ساتھ جدوجہد بھی لازمی ہے۔
✚ کسی کی خوبیوں کی تعریف کرنے میں اپنا وقت برباد نہ کرو بلکہ اس کی خوبیاں اپنانے کی کوشش کرو۔
✚ اللہ سے اس کا فضل طلب کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ اس سے مانگا جائے۔

سونی علی...... ریشم گلی، مورو سندھ

## جن کا یہ کلیہ تھا

ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا" یہ بتاؤ کہ اپنے ملک کا شریف آدمی کون ہے؟"

دوست نے کہا:" یہ بتا کر میں اپنے منہ میاں مٹھو نہیں بننا چاہتا۔"

" اچھا...... تو سب سے بے ایمان شخص کون سا ہے؟"

" یہ بتا کر میں تم سے دشمنی نہیں مول لینا چاہتا۔"

دوست نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

عنبر فاطمہ...... فیصل آباد

## باتیں کچھ خاص

ہمیشہ یہ ہی سوچ کے جیو کہ میرے رب نے مجھے بہت کچھ دیا ہے اگر وہ مجھے میرے اعمال کے برابر دیتا تو میرے پاس آج کچھ بھی نہ ہوتا

دو چیزیں زندگی کی وضاحت کرتی ہیں: "آپ کا صبر جب آپ کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔
آپ کا رویہ جب آپ کے پاس سب کچھ ہو۔"
نادیہ یٰسین......ساہیوال

## نفرت اور انتقام

نفرت اور انتقام کی آگ میں ہم خود جل رہے ہوتے ہیں' نفرت بھی تو ہمیں اسی شخص سے ہوتی جسے انتہا کی حدوں تک چاہا ہو۔ انتقام اندھا ہوتا ہے نہ غیروں کو دیکھتا ہے نہ اپنوں کو۔ وقت گزرنے کے ساتھ جب نفرت کی آگ سرد ہوتی ہے تو تب خبر ہوتی ہے کہ نقصان تو خود ہمارا اپنا ہوا ہے۔ اس آگ میں ہم خود جھلسے ہیں۔
فائزہ بلال اقرا آفرین......جام پور

## حرف اول

ایک بات تو یہ طے ہے کہ
تاریخ ادب میں جتنا بھی محبت پر لکھا ہے
مردنے ہی لکھا ہے
لیکن اب علم کے درجے طے کرتے ہوئے
مجھے یہ تو پتا چل گیا کہ
کم ازکم جو لوگ جس موضوع پر لکھتے ہیں
کبھی کبھی
اس کے حرف اول
سے بھی واقف نہیں ہوتے

ابر گل......جھڈو سندھ

## سوال

حضرت علیؓ ایک دشمن سے جنگ لڑ رہے تھے انہوں نے تلوار کا زور سے وار کیا اور اس کی تلوار دو ٹکڑے کردی۔ حضرت علیؓ غیر مسلح شخص پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے اس لیے فوراً ہاتھ روک لیا وہ شخص کہنے لگا۔
"مجھے تلوار دو میں مقابلہ کروں گا۔"
حضرت علیؓ نے اپنی تلوار دی' وہ حیران ہوکر بولا۔
"تعجب ہے آپ خود غیر مسلح ہوگئے۔"
حضرت علیؓ نے جواب دیا "ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں نے مانگنے والے کا سوال رد کیا ہو' تم نے مجھ سے تلوار مانگی میرے پاس ایک ہی تلوار تھی' اس لیے میں نے تمہیں وہ دے دی۔"

یہ دیکھ کر وہ کافر مسلمان ہوگیا۔
عظمٰی فرید خان......ڈی آئی خان

## لطیفہ

چرسی "پہلوان جی! تم ایک وقت میں کتنے لوگوں کو اٹھا سکتے ہو؟"
پہلوان "کم ازکم دس لوگوں کو۔"
چرسی "چھوڑو یار! تم سے تو تگڑا میرا مرغا ہے جو صبح پورے محلے کو اٹھاتا ہے۔"
عائشہ پرویز......کراچی

## انمول موتی

رشوت......انصاف کو کھاجاتی ہے
توبہ......گناہ کو کھاجاتی ہے
غیبت......عمل کو کھاجاتی ہے
نیکی......بدی کو کھاجاتی ہے
غصہ......عقل کو کھاجاتا ہے
جھوٹ......رزق کو کھاجاتا ہے
اور فکر......عمر کو کھاجاتی ہے
مبین رانا......سمندری

## قول حضرت علیؓ

حضرت علیؓ نے فرمایا "کوشش کرو کہ تم دنیا میں رہو' دنیا تم میں نہ رہے کیونکہ کشتی جب تک پانی میں رہتی ہے خوب تیرتی ہے لیکن جب پانی کشتی میں آجاتا ہے تو وہ ڈوب جاتی ہے۔"
جسم ایک دکان ہے اور زبان اس کا تالا ہے' تالا کھلتا ہے تو معلوم ہوجاتا ہے کہ دکان سونے کی ہے یا کوئلے کی۔"
سدرہ شاہین......خانیوال



# خوش بوئے سخن

## نوشین اقبال نوشی

غزل

پا بہ زنجیر کیے جاتا ہے
عشق تسخیر کیے جاتا ہے
ایک اِک کر کے میری سوچوں کو
اپنی جاگیر کیے جاتا ہے
آ گئی جان لبوں تک میری
زہر تاثیر کیے جاتا ہے
کر کے چھوڑے گا مکمل مجھ کو
میری تعمیر کیے جاتا ہے
میری نسبت کا حوالہ دے کر
اپنی تشہیر کیے جاتا ہے
خود ہی آنے کو کہا تھا اُس نے
خود ہی تاخیر کیے جاتا ہے
برسرِ بزم کوئی دیوانہ
غم کی تفسیر کیے جاتا ہے
کون پھر خونِ جگر سے رابیل
مجھے تحریر کیے جاتا ہے

گلِ رابیل......

غزل

نفرتیں دل میں، بہت ان میں دھڑے ہوتے ہیں
لوگ کہنے کو بظاہر تو بڑے ہوتے ہیں
تم کو سائے کی ضرورت ہو تو آسکتے ہو
ہم یہیں پیڑ کی مانند کھڑے ہوتے ہیں
چار لوگوں میں بھرم کتنا بنا دیتے ہیں
یہ کلائی میں جو پیتل کے کڑے ہوتے ہیں
دیکھ سکتا ہے وہ تصویر تو نادانستہ
ہم کہ دیوار پہ دانستہ جڑے ہوتے ہیں
یعنی کچھ بھید نظر آ بھی نہیں سکتے ہیں
یعنی کچھ تیر کہیں دل میں گڑے ہوتے ہیں
سوچتی ہوں کہ سفر کردوں یہیں پر موقوف
روز ہی رستے مرے پاؤں پڑے ہوتے ہیں

کول جوئیہ......

غزل

زندگی، موت، الم، وصل فراقت لکھنا
پھر بھی جو وقت ملے لفظ "محبت" لکھنا
سنگدل ہیں وہ سبھی اُن پہ اثر ہو کہ نہ ہو
اشکِ غم کے کے اِن آنکھوں کی حکایت لکھنا
میرا مقصد ہو مرا رب رہے راضی مجھ سے
مری تقدیر میں جتنی بھی عبادت لکھنا
اتنی بیصری نہیں اچھی مرے ہمدم کہ
ہر ستم، جور و جفا، غم کو قیامت لکھنا
یہ عجب سی ہے چلی ریت محبت ہے روا
پر نبھانے کا یہاں نام بغاوت لکھنا
تُو جو کہتا ہے میں شاعر ہوں تو اک بار فقط
اپنے لفظوں میں پرو کر مری وحشت لکھنا
پھر کبھی بات نہ کر مہر و وفا کی شاہد
دل لگانے کو سراسر ہی حماقت لکھنا

مشہود شاہد چترالی......لاہور

غزل

آئینہ ٹوٹا ہوا اور تم نہیں
عکس ہوں بکھرا ہوا اور تم نہیں
قربتوں کے اس سفر میں چور ہوں
فاصلہ بڑھتا ہوا اور تم نہیں
رنج و غم کے زہر کی تم ہو دوا
وقت ہے ڈستا ہوا اور تم نہیں
تشنگی کیسے مری اب دور ہو
دشت ہے جلتا ہوا اور تم نہیں
شاخ شاخ اپنی ہے زخموں سے سجی
میں شجر کٹتا ہوا اور تم نہیں
پی کے تیری مسکراہٹ جھومنا
یہ نشہ چڑھتا ہوا اور تم نہیں
زیست کے گلشن سے کیونکر میں چنوں
ہر ثمر گرتا ہوا اور تم نہیں
آج تو مشکل ہے بازی جیتنا
چاند ہے چمکا ہوا اور تم نہیں
تیرگی بڑھتی ہوئی میری طرف

ہر دِیا بجھتا ہوا اور تم نہیں
نوید ملک

## غزل

ترا ہی ذکر کروں گی میں ہر فسانے میں
کہ ایسا اور نہیں کوئی بھی زمانے میں
تو روٹھ جائے تجھے خود ہی میں مناتی ہوں
مزا بھی آتا ہے کتنا تجھے ستانے میں
یہ اور بات کہ کرتی ہوں میں یقیں تیرا
ذرا بھی سچ نہیں ہوتا ترے بہانے میں
وہ شاہ زادی مجھ کہہ کے چھیڑتا ہے بہت
تو حرج کیا ہے مرے ناز بھی اٹھانے میں
مری غزل تو وہ پڑھتا ہے وال سے عنبر
مگر مزا ہے الگ اس کو خود سنانے میں
عنبرین عنبر......کراچی

## بنت حوا

بنت حوا کے دکھ
کہاں سمجھ پائیں گے یہ آدم زاد
زمانے کے تقاضوں کو اپناتی ہیں تو باغی کہلاتی ہیں
بڑوں کے رسم ورواج پر سر جھکاتی ہیں
تو رد کر دی جاتی ہیں
سعدیہ محسن......لاہور

## غزل

زباں پر طنز کا اور آنکھ سے آنسو گرانے کا
عمل ہے جاری و ساری جلانے کا بجھانے کا
سبب معلوم ہے مجھ کو مری بے چین نیندوں کا
ہے جاری سلسلہ خوابوں میں ان کے آنے جانے کا
ابھی تک میں تو پیوستہ امیدوں کے شجر سے ہوں
اسی نے توڑا ہے وعدہ تعلق کو نبھانے کا
ستاروں کہکشاؤں کو خلا میں کھوجنے والو
کبھی دیکھا ہے منظر آنسوؤں کے جھلملانے کا
غمِ جاناں ہے بادہ جام اور خلوت میّسر ہے
یہ میرے پاس ہے سامان کافی شب بِتانے کا
اسیرِ عشق محوِ رقص لب پر ہو کا نعرہ بھی
کہیں در ٹوٹ نہ جائے تمہارے قید خانے کا
غضب کی تشنہ ہیں آنکھیں مگر سیراب چہرہ ہے
نرالی ہر ادا نخرہ عجب تیرے دِوانے کا
عامر شہزاد تشنہ......یو ایس اے

## پانچواں موسم

سب کہتے ہیں میرے یار
ایک برس کے موسم چار
گرمی سرد بسنت بہار
پانچواں موسم پیار کا موسم
چاہت کے اظہار کا موسم
اس موسم میں چلتے تھے ہم تم
پھولوں جیسے کھلتے تھے ہم تم
کتنے اچھے دن تھے وہ بھی
کتنی اچھی تھیں وہ راتیں
مہکے مہکے لہجے میں جب
خوش بو جیسی تیری باتیں
پھر نہ جانے کیا ہوا تھا
کس کی نظر بد لگی تھی
غم کی آندھی چل نکلی تھی
ارمان حسرت وصل کی خواہش
پیار کے پیڑ سارے پتے
دھیرے دھیرے سوکھ گئے تھے
ہجر کا موسم آن کھڑا تھا
فریدہ فری یوسفزئی......لاہور

## غزل

تجھے اپنا بنانے کی کوشش کروں
جان تک گنوانے کی کوشش کروں
دیکھتی بھی رہوں چاہتی بھی رہوں
اپنی دھڑکن بنانے کی کوشش کروں
تیری آنکھوں کی جھیلوں میں بہتی رہوں
پھر وہیں ڈوب جانے کی کوشش کروں
تیری آنکھوں کی برسات اچھی لگے
ان کو یونہی رلانے کی کوشش کروں
کاش آجائے چاہت اسی سال وہ
اپنے گھر کو سجانے کی کوشش کروں
شاعرہ: رفعت ناز چاہت
انتخاب: پرنس افضل شاہین......بہاولنگر

نظم

بکھرے ہوئے ہیں ستارے آسماں پر
اور سمٹا ہوا ہے چاند
رات بھی اندھیری ہے
اور خاموش ہے آس پاس
دھیمے سے آئی ہیں
یادیں تمہاری
محسوس کیا جب
تو بھیگی ہیں پلکیں
مگر خاموش ہیں لب
وقت کی روانی میں
ٹھہرے ہیں ہم
یوں لگ رہا ہے
گمنام سی راہوں میں
آباد ہو تم
بھولے ہیں سب کو
مگر یاد ہو تم

حافظہ رضیہ رمضان

غزل

جہاں چاروں طرف آسانیوں کا رقص جاری ہے
وہیں پہ بے سرو سامانیوں کا رقص جاری ہے
ادھر صحرا؟ں میں ہر سو بگولے رقص کرتے ہیں
ادھر دریا؟ں میں طغیانیوں کا رقص جاری ہے
ادھر فاقہ کشی ہے خود کشی ہے رونا دھونا ہے
ادھر اشراف کی من مانیوں کا رقص جاری ہے
جہاں غربت گزیدہ لوگ روٹی دال کو ترسیں
وہیں پہ قورمے، بریانیوں کا رقص جاری ہے
جہاں آلو ٹماٹر پیاز مہنگے دام بکتے ہیں
وہیں انسان کی ارزانیوں کا رقص جاری ہے
ادھر بھرمار ہے چاروں طرف اونچے پلازوں کی
ادھر کٹیاؤں میں قربانیوں کا رقص جاری ہے
قمر میں تاب بھی لاؤں تو کیسے ان کے جلوؤں کی
یہاں تو ہر طرف حیرانیوں کا رقص جاری ہے

ریاض حسین قمر......منگلا ڈیم

غزل

اپنے دل کو سکون نہیں ملتا
وہ جو اپنا ہے کیوں نہیں ملتا
عشق لیلیٰ سے کر گیا مجنوں
ہم کو ویسا جنوں نہیں ملتا
وہ جو ملنے کی آس رکھتے ہیں
ان سے کیسے کہوں نہیں ملتا
اپنی قسمت میں درد لکھے ہیں
جس کی چاہت کروں نہیں ملتا
ہم تو کوشش بھی کر چکے حیدر
جب بھی جا کے کیوں نہیں ملتا

حمید حیدر اعوان......اٹک

غزل

ضبط جب حد سے گزرتا ہے تو یاد آتے ہو
خون آنکھوں سے برستا ہے تو یاد آتے ہو
جب کوئی غنچہ چٹکتا ہے تو یاد آتے ہو
جب کوئی پھول بکھرتا ہے تو یاد آتے ہو
ایسا لگتا ہے مجھے بھولتے جاتے ہو تم
دل تجھے یاد یہ کرتا ہے تو یاد آتے ہو
دیکھ کر سرخی خورشید میں رو پڑتا ہوں
چاند آنگن میں اترتا ہے تو یاد آتے ہو
خشک ہوتی ہیں جب آنکھیں تو لہو رستا ہے
زخم جب دل کا یہ بھرتا ہے تو یاد آتے ہو
جب کوئی نقش بناتا ہوں تو رو پڑتا ہوں
رنگ تصویر میں بھرتا ہے تو یاد آتے ہو
باندھتا کھولتا رہتا ہوں میں سامان سفر
جب کوئی گھر سے نکلتا ہے تو یاد آتے ہو

حکیم خان حکیم......اٹک

غزل

وفا کی راہ بڑی پر خار سی لگتی ہے
زیست آنسوؤں کی دیوار سی لگتی ہے
میں نے چاہا نہیں تھا پھر سے کسی کو
ہر سوچ اپنی غمگسار سی لگتی ہے
زندگی ڈھل گئی پھر سے غم کے سانچے میں
تیری ہر خوشی ہمیں یادگار سی لگتی ہے
جا کے پھر کوئی نہیں آتا ہے زمانے میں

تیری یاد بھی اب تو پر نور سی لگتی ہے
کسی سے جب ملاقات ہوتی ہے جاوید
اس کی ہر بات پھر ہمیں تلوار سی لگتی ہے
محمد اسلم جاوید......فیصل آباد

غزل

روٹھ گیا تو مجھ سے نہ جانے کیونکر
آہ تیری یاد میں یہ دل مچلنے سا لگا
سمجھایا نہیں جاتا اب اس بے دردی کو صنم
تیرے بن اب یہ قلب بھی ہے تڑپنے سا لگا
آنگن میں میرے جو چراغ روشن تھا ہوا
ماہی تیری محبت میں وہ بھی بجھنے سا لگا
کیا یقین دلاؤں اپنے اس بدنصیب دل کو
جو انتظار میں تیرے بے قرار رہنے سا لگا
آنکھیں یہ جو شب و روز بہاتی ہیں آنسو
میرا چہرہ بھی ان کی شدت سے اب بھیگنے سا لگا
من کرتا ہی نہیں میرا جینے کو اب اے محبوب
میرے سینے پہ جو آپ کے لیے داغ محبت سا لگا
طلحہ کھرل

یقین

وہ کیا اقرار، کیا اظہار کرتا
مری سوچیں وہ اپنے روز و شب کی
کہانی کا کوئی کردار کرتا
مجھے خوابوں کی وہ تعبیر کرتا
مری خاطر کوئی تعبیر کرتا
کبھی وہ مجھ سے چلا آتا ملنے
کبھی وہ اپنے گھر مجھ کو بلاتا
قصد کرتا اگر وہ واپسی کا
تو رکنے کے لیے اصرار کرتا
اسے مجھ سے محبت ہی نہیں تھی
وہ کیوں پھر مجھ سے اتنا پیار کرتا
عبدالغفار عابد......چیچہ وطنی

نظم

جدائی کے لمبے دن
اور لمبی راتیں
اک طویل خاموشی
سوچتی ہوں میں
کاش یہ دھوکے نہ ہوتے
زندگی کتنی حسین ہوتی
میں، تم اور محبت ہوتے
تو کتنا اچھا ہوتا
آسیہ نذیر......چوہنگ

غزل

کسی کے روگ میں بھیگی عبادت بھاڑ میں جائے
ضرورت کی عبادت ہو ضرورت بھاڑ میں جائے
میری تجویز تھی چندا مگر تُو مانتا کب ہے
تو یہ لے روشنی اپنی یہ طاقت بھاڑ میں جائے
محبت یہ نہیں ہوتی کہ عزت پیش کر دیجئے
لٹی ہوں عصمتیں جس میں محبت بھاڑ میں جائے
گلے جو کاٹ کر اپنے گھروں کو روشنی بخشیں
تو ایسی سنگدل ظالم قیادت بھاڑ میں جائے
جہاں گھربار لٹتے ہوں محبت بین کرتی ہو
تو ایسے شہر گلیاں گھر ریاست بھاڑ میں جائے
گریباں چاک کر کے دربدر پھرنے سے کیا حاصل
محبت گر یہی ہے تو محبت بھاڑ میں جائے
رقیبوں کی طرح جو گھورتا رہتا ہے محفل میں
اب ایسے شخص سے تنہا رفاقت بھاڑ میں جائے
کسی نے بھی جو اس کی آنکھ سے قطرہ گرا دیکھا
مجھے سہنا ہے سہہ لوں گا اذیت بھاڑ میں جائے
عاصم تنہا......بھکر



قسط نمبر 9

# مرشد

**ساحر جمیل سید**



قدم قدم ہنگاموں اور حادثوں کے ساتھ ساتھ
پروان چڑھنے والے عشق کی روداد دل گداز
اس نے نزہت جہاں بیگم کے کوٹھے پر آنکھ
کھولی
مسلے، مرجھائے گجرے، باسی پھول اور گھنگرو
اس کے کھلونے بنے
بدمعاشوں کی دنیا نے اسے مرشد مانا اور
پھر..... وہ کسی کا مرید ہوگیا.....!!
شاہی محلے کا نمازی بدمعاش جس نے سرکار سے
عشق کیا اور عشق کی مریدی کی





"اوکاشی اوئے..... کیا چکر ہے۔ یہ گولیاں کون چلا رہا ہے؟"
کچھ فاصلے سے کسی چھت پر سے پکار کر پوچھا گیا۔
جواب میں کوئی نہیں بولا تو ایک بار پھر پکارا گیا۔
"اوئے کاشیا....."
"ڈاکو ہیں.....ڈاکو ڈاکو۔"
کسی طرف سے ایک لرزیدہ سی آواز ابھری۔ پھر وہی پہلی آواز بلند ہوئی۔
"اوئے! کون لوگ ہو تم؟"
"نیچے اترو نکل جاؤ ادھر سے۔"
جواب میں مرشد کے دشمنوں میں سے کسی نے ایک ننگی گالی سے بولنے والے کو دبکا تو آگے سے اس نے بھی ویسی ہی ننگی اور غلیظ زبان استعمال کی اور ساتھ ہی دو تین ہوائی فائر بھی کر دیئے۔ آواز سے مرشد کو اندازہ ہوا کہ یہ پسٹل کے فائرز تھے۔ ادھر سے رائفل کا برسٹ مارا گیا۔ چند لمحوں کو فضا میں صرف آوارہ کتوں کی آواز بلند ہوتی رہی پھر اچانک پسٹل کے دو تین فائرز مزید ہوئے اور کوئی چیخ چیخ کر پکارنے لگا۔
"صدیقے.....اکبرے.....رائفلیں اٹھاؤ اوئے۔ ان کی تو بہن کی....."
اگلے الفاظ رائفل کی تڑتڑاہٹ میں دب کر رہ گئے۔ اذان کی آواز بھی جیسے پس منظر میں چلی گئی تھی۔ مرشد اپنی جگہ سے سرکتا ہوا نیچے کھڑی حجاب کے قریب پہنچ آیا۔
اس گھر میں مکمل طور پر اندھیرا تھا البتہ مرشد کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ ایک مختصر سے صحن کا چھوٹا سا مکان ہے۔ سیڑھیوں سے آگے محض دو قدم کے فاصلے پر بیرونی دروازہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی آگے چھوٹا سا غسل خانہ، جب کہ صحن کی دوسری طرف ایک مختصر سا برآمدہ تھا اور وہاں موجود چارپائیوں پر مکان کے مکین ڈرے سہمے بیٹھے اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے غالباً انہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔
"اب.....اب کیا کریں گے..... باہر گلی میں بھی کچھ لوگ موجود ہیں۔
حجاب نے لرزیدہ آواز میں پوچھا۔ مرشد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ صحن کی دیواریں خاصی اونچی تھیں وہ خود تو پھر بھی پھلانگ جاتا مگر مسئلہ حجاب کا تھا۔
"ہم لوگ پکڑے جائیں گے۔"
حجاب نے اندیشے کا اظہار کیا۔
"تو درست۔ ابھی اس رائفل میں گولیاں باقی ہیں اور میں بھی زندہ کھڑا ہوں۔"
اوپر پھر چند فائرز ہوئے۔ بستی میں سے کوئی ایک دو افراد شاید ان کے دشمنوں کو چور ڈاکو سمجھ کر ان سے الجھ بیٹھے تھے۔ مرشد کا اندازہ تھا کہ ان کے تعاقب میں موجود یہ لوگ کوئی معمولی بدمعاش یا ڈاکو نہیں ہیں۔ جس دیدہ دلیری سے وہ حجاب کو اغواء کرلائے تھے اور اب جس بے خوفی سے وہ فائرنگ کر رہے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سب انتہائی خطرناک اور بے خوف لوگ ہیں۔
مرشد چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ لکڑی کا تھا۔ جس کے درمیان میں زنجیر لگی ہوئی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر آہستہ سے زنجیر ہٹائی ہی تھی کہ باہر سے ایک تیز آواز سنائی دی۔
"ادھر دوسری طرف والی گلی میں۔"
"جلدی کرو۔ ایک بندہ ادھر نکڑ پر کھڑا ہو جائے۔"
وہ لوگ تقریباً دوڑنے والے انداز میں اس دروازے کے سامنے سے گزر کر آگے نکل گئے تو مرشد نے آہستہ سے زنجیر چھوڑ دی۔ وہ حجاب کو لے کر اس چار دیواری سے باہر نکل جانا چاہتا تھا کہ اچانک برآمدے کی طرف سے ایک سہمی ہوئی سرسراتی سی نسوانی آواز بلند ہوئی۔
"حجاب....."
حجاب اور مرشد دونوں ہی بری طرح چونک پڑے۔ بولنے والی کے لہجے میں سوال کا رنگ تھا۔ جیسے وہ تصدیق چاہ رہی ہو کہ آیا اس نے صحیح نام پکارا ہے۔ مرشد اور حجاب نے ایک ساتھ حیرت و بے یقینی سے برآمدے کی طرف دیکھا۔ وہ جو کوئی بھی تھی برآمدے کے ستون کے قریب کھڑی تھی۔ اندھیرے کے باعث وہ صرف ایک ہیولے کی صورت دکھائی دے رہی تھی۔
"حجاب....." ایک بار پھر پکارا گیا تھا۔
مرشد کے لیے تو وہ آواز قطعی اجنبی تھی۔ البتہ اس بار حجاب کے قدموں کو جنبش ہوئی اور وہ بے اختیار برآمدے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے لیے اب وہ آواز اجنبی نہیں

رہی تھی۔ وہ آواز پنو کی تھی۔ اس کی بچپن کی سہیلی اور کلاس فیلو پروین عرف پنو کی۔ جو اس کے گھرانے پر ٹوٹنے والی قیامت سے ایک دو روز پہلے ہی گلزارے نائی کے پتر جیدے کے ساتھ گاؤں سے نکل بھاگی تھی۔

وہ برآمدے کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ چند لمحے تک دونوں اپنی اپنی جگہ ساکت کھڑی رہیں۔ دونوں ہی کو اس وقت اور اس طرح ایک دوسرے کی وہاں موجودگی کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ پھر پنو نے ہی آگے بڑھ کر حجاب کو اپنے بازوؤں میں لپیٹا تھا۔ حجاب بھی بری طرح سسکتی ہوئی پنو سے لپٹ گئی۔

دونوں ایک ہی گاؤں سے تھیں۔ ایک ہی فضا میں پلی بڑھی تھیں۔ بچپن سے جوانی تک برسوں کا ساتھ رہا تھا۔ حجاب کو اس کے وجود سے اپنے گاؤں کی آب و ہوا کی وہی مخصوص اور مانوس خوشبو آ رہی تھی جو اس کے اپنے مشام جاں کا حصہ تھی۔

مرشد چند لمحے اسی جگہ متذبذب سا کھڑا رہا۔ پھر اس نے دروازے کے پٹ کو تھوڑا سا کھولتے ہوئے سر نکال کر باہر گلی میں جھانکا اور پلٹ کر تیزی سے ان کے قریب پہنچ آیا۔

''حجاب! دشمن کسی اور طرف متوجہ ہیں۔ ہمیں اس دوران یہاں سے نکل جانا چاہئے۔''

''کہاں..... کہاں جانا چاہتی ہے تو؟''

حجاب پنو سے الگ ہوئی تو وہ اس کا بازو تھامتے ہوئے جلدی سے بولی۔

''ہمارے پیچھے کچھ خطرناک لوگ ہیں۔ ہمیں ان سے بچ کر لاہور پہنچنا ہے۔ جلد از جلد۔''

جواب مرشد نے دیا تھا۔ پنو کے پیچھے برآمدے میں جیدا بھی حیران پریشان سا کھڑا تھا۔

''نن..... نہیں..... میں ..... میں تجھے ایسے نہیں جانے دوں گی نہیں۔''

پنو نے دونوں ہاتھوں میں حجاب کا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

''وہ بہت خطرناک لوگ ہیں اور کسی بھی وقت وہ یہاں پہنچ جائیں گے۔''

''میں سب جانتی ہوں۔ چوہدریوں کے بندے ہی ہوں گے۔ وہ باہر گھیر لیں گے تم لوگوں کو۔ میں تمہیں چھپاتی ہوں۔ آؤ..... آؤ میرے ساتھ۔''

اس نے حجاب کو اندرونی طرف کو کھینچا۔

''جیدے! تو جلدی سے پیٹی کھول۔ تو آ میرے ساتھ۔''

پنو نے پہلے جیدے سے کہا جو فوراً کونے والے کمرے کی طرف بڑھ گیا پھر حجاب کو بازو سے پکڑے اسے کھینچتے ہوئے اس کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ مرشد نے ایک نظر بیرونی دروازے اور سیڑھیوں پر ڈالی۔ اور ان کے پیچھے ہی برآمدے میں داخل ہو گیا۔ چھت کے علاوہ اب باہر کسی گلی سے بھی فائرنگ کی دل دہلا دینے والی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ پوری بستی کی فضا ایک سراسیمہ کر دینے والی سنسنی سے بھر چکی تھی۔ با جماعت نماز ادا کرنے والے نمازی بھی اپنے اپنے گھروں میں دبک کر بیٹھ رہے تھے۔ کسی میں ہمت نہ تھی کہ ایسے میں نکل کر مسجد کا رخ کرتا۔

ان تینوں کے پیچھے پیچھے مرشد بھی اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ جیدا بلب روشن کر چکا تھا۔ مگر اینٹوں کی کوری دیواروں کے باعث روشنی خاصی مدقوق تھی۔ سامنے ہی ایک بڑی سی میز تھی۔ جس کے ایک کونے میں دھری اینٹ پر کوئلے والی استری رکھی تھی۔ ایک طرف چارپائی اور اس کے ساتھ ایک پانچ فٹ کی لوہے کی پیٹی رکھی تھی جس میں بستر اور لحاف وغیرہ رکھے جاتے ہیں۔ چارپائی اور پیٹی دونوں پر دھلے ان دھلے کپڑوں کے ڈھیر بکھرے ہوئے تھے۔ دائیں بائیں کی دیواروں میں دو رسیاں باندھی گئی تھیں۔ جن پر استری شدہ کپڑے لٹکائے گئے تھے۔ جیدا یقیناً دھوبیوں کا کام کرتا تھا۔

جیدے نے جلدی جلدی پیٹی سے سارے کپڑے سمیٹ کر چارپائی پر ڈالے اور پیٹی کا ڈھکن کھول دیا۔ پیٹی آدھی سے زیادہ خالی تھی۔ اس میں صرف دو تین بستر موجود تھے۔

''جلدی کرو..... تم دونوں اس میں گھس جاؤ۔'' پنو کی بات پر حجاب نے مرشد کی طرف دیکھا۔

''تو بیٹھ جا اندر۔ میں باہر ہی رہوں گا۔''

''دونوں اس میں چھپ جاؤ۔ ہم لوگ ڈھکن بند

کر کے دوبارہ اوپر کپڑوں کا ڈھیر ڈال دیں گے۔''
پنو نے مرشد کی طرف دیکھتے ہوئے۔ تیزی سے کہا۔
اب یہاں مرشد کو اور اس کے حلیے کو دیکھ کر اس کے تاثرات عجیب ہوگئے تھے۔ اس سے زیادہ برا حال جیدے کا تھا۔ وہ زیادہ گھبرایا ہوا تھا۔اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔
''نہیں...... میں باہر رہوں گا۔ اگر دشمن ادھر آ گئے تو میں ان سے نمٹوں گا۔''
''اور اگر تم اتنے دشمنوں سے نمٹنے میں ناکام رہے تو تمہارے بعد اس کا کیا ہوگا۔'' پنو نے حجاب کی طرف اشارہ کیا۔
''اس کے ساتھ وہ لوگ ہم دونوں کا بھی ککھ نہیں چھوڑیں گے۔ اس وقت چھپ جاؤ۔ نمٹنا نمٹانا بعد میں کر لینا۔''
''پپ...... پنو ٹھیک کہہ رہی ہے جی! اس وقت آپ لوگ چھپ جاؤ۔'' جیدا بھی ہکلایا تھا۔ مرشد کو پریشانی تھی کہ کہیں یہ کمرہ اور پیٹی اس کے لیے چوہے دان نہ بن جائے۔
''جلدی کرو۔''
حجاب متذبذب سی کھڑی مرشد کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کے لیے فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ پنو کی مانے یا مرشد کی!
''جلدی کرو۔ یہ سوچنے کا وقت نہیں ہے۔''
پنو گھبراہٹ کے ساتھ ساتھ پریشان اور اضطراب کا شکار بھی تھی۔
مرشد نے باری باری ان دونوں کو دیکھا۔ جیدا نامی وہ جوان اچھے ہڈ پیر کا مالک تھا۔ لیکن حوصلے میں دبلی پتلی وہ لڑکی زیادہ دکھائی دے رہی تھی۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے وہ اور حجاب جس طرح آپس میں ملی تھیں اس سے مرشد کو یہ اندازہ تو بخوبی ہوگیا تھا کہ دونوں میں پرانی اور گہری آشنائی ہے۔ پنو کے لہجے اور چہرے سے بھی حجاب کے لیے فکرمندی اور پریشانی ہویدا تھی۔ مرشد ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔
''ٹھیک ہے۔ ہم دونوں چھپ جاتے ہیں۔ اگر وہ لوگ ادھر آئیں تو انہیں بتانا کہ ہم گلی میں نکل گئے ہیں۔''
اس کے بعد وہ دونوں اس پیٹی میں بیٹھ گئے اور جیدے نے ڈھکن بند کر کے چارپائی سے کپڑے اٹھا کر یونہی بے ترتیبی سے پیٹی پر ڈھیر لگا دیا۔
''جلدی کر جیدے۔ یہ بلب بھی اتار لے یہاں سے۔''
''تو باہر چل میں بھی آ رہا ہوں۔''
''ہاں ٹھیک ہے۔''
پنو غالباً کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ مرشد اور حجاب پیٹی کے اندر بستروں پر خاموش بیٹھے رہے۔ رائفل بدستور مرشد کے ہاتھوں میں تھی۔ پیٹی کے اندر اندھیرا تھا البتہ ایک دو کونے کھدروں سے کمرے میں پھیلی بلب کی روشنی کا اندازہ ضرور ہوتا تھا۔
چند لمحے کمرے میں کھٹ پٹ کی آوازیں ابھرتی رہیں۔ پھر شاید جیدا بھی بلب اتار کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا چھا گیا تھا۔ پیٹی کے اندر وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ دونوں کے درمیان ایک ڈیڑھ فٹ کا فاصلہ رہا ہوگا۔ دونوں ہی کو اپنے قریب ہی ایک دوسرے کی موجودگی کا پورا احساس تھا۔ لیکن دونوں کے محسوسات الگ الگ تھے۔ مرشد کی پوری توجہ باہر کی طرف تھی۔ فائرنگ کی آواز رہ رہ کر ابھر رہی تھی۔ البتہ اب چھت پر سے فائرنگ بند ہو چکی تھی۔
''یہ لڑکی لڑکا کون ہیں؟''
کچھ دیر بعد مرشد نے دھیمی آواز میں پوچھا۔
''یہ...... یہ پنو اور جیدا ہیں۔ میرے گاؤں کے ہیں دونوں۔ شادی کے بعد گاؤں سے آ گئے تھے۔''
حجاب نے کسی قدر ہچکچاہٹ سے جواب دیا۔ اسے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ ان دونوں نے گاؤں سے بھاگنے کے بعد کب' کہاں اور کس طرح نکاح کیا۔ اور نکاح کیا بھی ہے یا ابھی تک ایسے ہی رہ رہے ہیں۔ لیکن یہ بات وہ مرشد سے تو نہیں کہہ سکتی تھی۔
دونوں ایک بار پھر خاموش ہو بیٹھے۔ پیٹی کے اندر قدرے گھٹن کا احساس تو تھا البتہ حبس یا گرمی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ رات بھر ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چلتی رہی تھی۔ اور ویسے بھی رات کے آخری پہر میں قدرے خنکی اتر آتی تھی۔
پیٹی کے اندر لوہے کی چادر کی مخصوص مہک تھی یا پھر

اس میں بند پڑے بستروں کی عجیب سی بو۔ اس کے علاوہ ایک اور خوش گوار سی خوشبو تھی جس کی پہلے تو مرشد کو سمجھ ہی نہیں آئی۔ پھر جب اس نے توجہ دی تو اسے محسوس ہوا کہ یہ خوشبو حجاب کی سانسوں سے پھوٹ رہی ہے۔ اس کے گھنے اور لمبے بالوں سے اٹھ رہی ہے۔ اس نے گردن موڑ کر حجاب کی طرف دیکھا مگر اندھیرا اتنا گاڑھا تھا کہ حجاب تو کیا اسے اپنا آپ تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بس محسوس کیا جا سکتا تھا کہ اس کے قریب ہی وہ موجود ہے۔ اتنی قریب کہ وہ ہاتھ بڑھائے تو اسے چھو لے۔ ایک بار تو اس کے جی میں آئی بھی کہ وہ سچ میں حجاب کو چھو کر محسوس کرے لیکن اگلے ہی پل اس نے سر جھٹک کر اس خیال سے دھیان ہٹا لیا۔ وہ اپنی جگہ بیٹھا رہا اور حجاب اپنی جگہ سکڑ سمٹ کر بیٹھی رہی۔ اس قدر اندھیرے میں مرشد کی اس قدر قربت اسے گھبراہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔ اس کے لاشعور میں کہیں رہ رہ کر یہ خیال بھی کسمسا رہا تھا کہ کہیں اس بدمعاش بندے کے دماغ میں کوئی فتور نہ در آئے۔ خالہ حسن آرا کی غیر موجودگی میں اس کے تیور تو وہ دیکھ ہی چکی تھی اور اس کی باتیں...... وہ بھی اسے اچھی طرح یاد تھیں۔ یکا یک حجاب کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ اسے مرشد سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔

''میرا دم گھٹ رہا ہے۔'' وہ بلا ارادہ بول پڑی تھی۔

''کیوں؟''

مرشد نے جیسے پوچھا نہیں بلکہ اعتراض اٹھایا تھا۔

''بس گھٹ رہا ہے۔ مجھے باہر نکلنا ہے۔''

اس نے ہاتھ اٹھا کر ڈھکن اٹھانا چاہا مگر ناکام رہی۔ پیٹی کے کنڈے لگے ہوئے تھے۔ لوہے کی کھڑکھڑاہٹ پر مرشد نے دھیمے مگر کرخت لہجے میں کہا۔

''آرام سے بیٹھی رہ۔''

''میرا سانس بند ہو رہا ہے۔''

''میرا تو نہیں ہو رہا۔''

''مگر میرا ہو رہا ہے۔ مجھے نکلنا ہے یہاں سے۔''

''یہاں سے نکل کر جاگیردار کے پاس پہنچنے کی جلدی ہے کیا۔'' مرشد کے لہجے میں قدرے ناگواری در آئی۔

''باہر میں نے جب کہا تھا کہ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئے اس وقت تو منہ میں دہی جم گئی تھی۔ اب چپ چاپ بیٹھی رہ...... الو کی دم نہ ہو تو۔''

ٹھیک اسی وقت باہر سے کچھ آہٹوں کی آواز سنائی دی۔ کچھ گڑبڑ تھی باہر۔ حجاب فوراً اپنی جگہ سہم کر ساکت ہو گئی۔ یکا یک ہی باہر صحن اور برآمدے میں ایک ہلچل سی بیدار ہوئی۔

''اسی گھر میں اترے ہیں وہ دونوں۔ دیکھو۔''

''دھیان سے۔ اس حرامی کے پاس رائفل ہے۔''

''کیوں اوئے! کدھر ہیں وہ دونوں۔''

''نکل گئے۔''

''ادھر سیڑھیوں سے اترے اور دروازہ کھول کر گلی میں نکل گئے۔''

کچھ مدھم مگر واضح آوازیں ان کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ پہلے جیدے اور پھر پپو کی آواز بھی سنائی دی۔

آوازیں اور آہٹیں برآمدے میں پہنچ آئیں۔ پھر غالباً کسی نے پپو کو تھپڑ مارا۔ اس کے چیخنے کی آواز سنائی دی تھی۔

''ہم...... ہم سچ کہہ رہے ہیں جی۔''

جیدے کی ہکلاہٹ سنائی دی اور اگلے ہی پل اس کی کراہ اور غالباً کسی چیز سے ٹکرا کر گرنے والا بھی وہی تھا۔

''تیرے بچولے کی ماں......''

ایک انتہائی گندی گالی دی گئی تھی۔ مرشد ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ اس نے صرف حجاب کی وجہ سے اس پیٹی میں بند ہونا' چھپنا گوارا کر لیا تھا۔ ورنہ اگر وہ اس وقت باہر ہوتا تو شاید نتیجے کی پروا کئے بغیر ان لوگوں پر فائر کھول دیتا۔

''سارا گھر آپ کے سامنے ہے۔ آپ لوگ خود دیکھ لیں۔ جیسے مرضی تلاشی لے لیں۔ وہ دونوں یہاں نہیں ہیں۔ ہم...... ہم لوگ گولیوں کی آواز سن کر جاگے تو وہ سیڑھیوں سے نیچے اتر رہے تھے۔ ایک...... ایک آدمی تھا اور ایک عورت۔ بس.... سیڑھیوں سے اترتے ہی آدمی نے صحن والے دروازے کی کنڈی کھول کر پہلے باہر جھانکا پھر دونوں باہر نکل گئے۔''

یہ ڈری گھبرائی آواز پپو کی تھی۔ وہ برآمدے میں موجود تھی۔ آنے والے کم از کم بھی چار پانچ افراد تھے۔ ایک دو صحن اور برآمدے میں تھے اور باقی شاید ساتھ والے کمرے میں گھس گئے تھے۔

''ادھر اندر جا کے لائٹ جلا۔'' ایک کرخت تحکمانہ آواز ابھری۔

''ادھر......ادھر بلب نہیں ہے۔''

''کیوں نہیں ہے۔ ادھر تیری بہن......''

بولنے والا کوئی انتہائی غلیظ اور گندی ذہنیت کا مالک تھا۔

''یہ کمرہ صرف دن میں استعمال کرتے ہیں ہم۔ کپڑے وغیرہ استری کرتا ہوں ادھر میں۔ دھوبی کا کام ہے جی میرا۔''

''دھوبی کا۔''

''ادھر تو نہیں ہیں۔''

''یہ کمرہ بھی دیکھو۔''

آنے والے اسی کمرے کے دروازے پر آ پہنچے تھے۔ حجاب کا دل بری طرح سے دھڑک اٹھا۔ جب کہ مرشد نے رائفل پر گرفت مضبوط کرلی۔

''لگتا ہے وہ نکل گئے ہیں۔''

ایک اور آواز سنائی دی۔

''بستی سے باہر تو اب نکل نہیں سکتے نہ ہی نکلنے دیں گے۔'' اچانک کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ شاید ٹارچ روشن کی گئی تھی۔

''یہ تو واقعی دھوبی خانہ ہے۔''

''یہاں نہیں تو دائیں بائیں کسی اور گھر میں گھس گئے ہوں گے۔''

''پولیس کسی بھی وقت پہنچ سکتی ہے۔''

''اچھی بات ہے۔ پولیس آ گئی تو تلاش کا کام آسان ہوجائے گا۔ فوجی نے رانا صاحب سے بات کرلی ہے۔''

''ادھر بھی نہیں ہیں۔''

یہ آواز کمرے کے اندر سے بلند ہوئی تھی۔ غالباً کمرے کے اندر صرف ایک ہی شخص آیا تھا اور اس کے باقی ساتھی دروازے ہی پر رک گئے تھے۔

''اگر یہاں نہیں ہیں تو پھر یقینی طور پر دائیں بائیں کے کسی گھر میں گھس بیٹھے ہیں۔'' وہی پہلی آواز دروازے سے اندر داخل ہوئی تھی۔

''اس پیٹی میں بھی نظر ڈال لے۔''

سرسری سے انداز میں کہا گیا تھا۔ حجاب نے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس کی۔ مرشد کے جبڑے بھینچ گئے۔ اعصاب پوری طرح تناؤ میں آ گئے اور اس نے رائفل پر گرفت مزید مضبوط کرتے ہوئے رائفل کا رخ پیٹی کے ڈھکن کی طرف کردیا۔

براہ راست ٹکراؤ یقینی ہوگیا تھا۔ مرشد کو شدت سے احساس ہوا کہ ان کا پیٹی میں گھسنے چھپنے کا فیصلہ درست نہیں تھا۔

کمرے کے اندر موجود ٹارچ بردار پیٹی کے قریب چلا آیا اور مرشد کی انگلی رائفل کی لبلبی پر جم کر رہ گئی۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ ایک لمحے کی بھی تاخیر کیے بنا فائر کھول دے گا۔

آنے والے نے پیٹی کے کنڈے کھولے۔ وہ ڈھکن اٹھانے والا تھا اور مرشد فائر کھولنے والا تھا مگر بالکل آخری لمحے ایک غیر متوقع کام ہوگیا۔

صحن سے ایک دھماکے جیسی آواز سنائی دی تھی اور یہ آواز صحن والے دروازے کی تھی۔ کسی نے انتہائی عجلت اور بوکھلاہٹ میں دروازے کو غالباً دھکا مار کر کھولا تھا۔ ساتھ ہی کوئی بلند آواز میں پکار کر بولا۔

''ملنگی استاد! فوجی کو گولی لگی ہے۔''

پیٹی کا ڈھکن دو انچ اوپر اٹھا اور دوبارہ بند ہوگیا۔ فوجی کو گولی لگنے والی اس اطلاع نے وہاں موجود لوگوں پر کچھ ایسا اثر چھوڑا کہ وہ سب فوراً ہی پلٹ کر بیرونی جانب دوڑ پڑے۔ کمرے میں ایک بار پھر اندھیرا ابھر آیا۔

ایک لمحے......محض ایک لمحے کی رعایت سے قیامت برپا ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ مرشد نے بے اختیار ایک گہرا سانس چھوڑا اور رائفل گود میں رکھ لی۔ تبھی اسے حجاب کا خیال آیا۔ حجاب کے سانس تک کی آواز نہیں آرہی تھی۔

''حجاب!'' اس نے سرگوشی کے انداز میں پکارا۔

''ج......جی۔'' وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔

''تو ٹھیک ہے نا؟''

''میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ پیاس بھی لگی ہے۔''

''حوصلہ رکھ ہم محفوظ ہیں۔''

''جی۔''

کچھ ہی دیر بعد کمرے میں آہٹ ہوئی اور کوئی پیٹی کے قریب پہنچ آیا۔

''سارے کتے باہر نکل گئے ہیں مگر تم لوگ فی الحال یہیں رہو۔''

دبی دبی سی وہ آواز پنو کی تھی۔ حجاب فوراً بولی۔

''میرا یہاں دم گھٹ رہا ہے۔ پیاس...... پیاس بھی لگی ہوئی ہے۔''

''میں پانی لاتی ہوں۔''

پنو فوراً ہی پلٹ کر باہر نکل گئی۔ باہر سے سنائی دینے والی فائرنگ کی آواز اب مکمل طور پر بند ہو چکی تھی۔ کچھ دیر بعد پنو واپس آئی تو اس بار جیدا بھی اس کے ساتھ تھا۔ کنڈے کھول کر پیٹی کا ڈھکن اسی نے اٹھایا تھا۔

''لے پانی پی لے۔'' پنو نے آگے بڑھ کر گلاس حجاب کی طرف بڑھایا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں سلور کا جگ تھا۔

کمرے کے دروازے سے باہر برآمدے میں صبح کی ملگجی سی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ ایک ہنگامہ خیز رات گزر چکی تھی۔ اب دن کے دامن سے کیا نمودار ہونے والا تھا۔ اس بارے میں کچھ کہنا دشوار تھا۔

حجاب نے گلاس تھام کر ہونٹوں سے لگالیا۔ مرشد اٹھ کر کھڑا ہوا تو پنو فوراً بولی۔

''ابھی اندر ہی رہو۔ وہ لوگ واپس آسکتے ہیں۔''

مرشد بغیر کچھ کہے پیٹی سے باہر نکل آیا۔ اس کے دائیں گھٹنے میں ہلکا ہلکا درد تھا۔ سر کا عقبی حصہ اور گردن زیادہ متاثر محسوس ہو رہی تھی اور سینے کے زخم میں بھی درد اور جلن ہو رہی تھی۔ رات بھر کی بھاگ دوڑ کی وجہ سے خون گرم رہا تھا شاید اسی لیے جسمانی چوٹوں کا زیادہ احساس نہیں ہوا تھا۔ اب کچھ دیر آرام سے بیٹھتے ہی چوٹوں کا درد جیسے جاگ اٹھا تھا۔

''تو بھی باہر آجا۔ کہیں سچ ہی میں دم نہ گھٹ جائے تیرا۔'' مرشد نے حجاب کو مخاطب کیا تھا۔

''پاگل مت بنو۔ وہ لوگ ارد گرد ہی موجود ہیں۔ باہر سے آوازیں آرہی ہیں ان کی۔ ابھی پیٹی ہی میں چھپے رہو۔''

پنو نے مضطربانہ انداز میں کہا۔ مگر مرشد نے جیسے سنا ہی نہیں۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھا اور کمرے کے دروازے پر جارکا۔ صحن کا دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔

دروازے کی زنجیر چڑھی ہوئی تھی۔ اس نے گردن جھکا کر دیکھا۔ پیروں پر کیچڑ جمی ہوئی تھی۔ شلوار بھی کیچڑ میں لتھڑی ہوئی تھی۔

''حجاب! کون ہے یہ؟'' سمجھا اسے کچھ۔''

چند لمحے مرشد کو گھورنے کے بعد پنو حجاب کی طرف متوجہ ہوئی۔ باہر کی فضا میں گھل آنے والی روشنی کی وجہ سے کمرے کا اندھیرا اس حد تک ضرور چھٹ چکا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے۔

''مرشد جی!''

حجاب نے گلاس پنو کو تھماتے ہوئے قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ اسے پکارا۔ لیکن اس کے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی مرشد پلٹتے ہوئے بول پڑا۔

''تجھے پتا ہے نا ابھی کیا ہونے والا تھا۔ تو نے یہاں بیٹھنا ہے تو بیٹھی رہ۔ میں اب باہر ہی رہوں گا۔''

اس کے خشک اور دوٹوک انداز پر پنو پریشانی سے ہونٹ چبا کر رہ گئی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ بدمعاش صورت بندہ جتنا دکھائی دیتا ہے شاید اس سے کچھ زیادہ ہی الٹی کھوپڑی کا مالک ہے۔

حجاب چند لمحے کے تذبذب کے بعد خود بھی پیٹی سے باہر نکل آئی۔ اب تک گلے میں جھولتا دوپٹہ اس نے سر پر ڈال لیا تھا۔ مرشد اب چارپائی پر بکھرے کپڑوں کے ڈھیر کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔

''جیدے! تو باہر برآمدے میں جا بیٹھ۔''

پنو کے حکم پر پریشان صورت جیدا کمال فرماں برداری سے فوراً کمرے سے باہر نکل گیا۔ مرشد نے ایک میلی سی قمیص اٹھا کر اس کا جائزہ لیا۔ پھر پیچھے ہٹ کر رائفل استری والی میز پر رکھی اور وہ قمیص پہن لی۔ پنو حجاب کی طرف متوجہ تھی۔ اس نے کپڑوں کا ڈھیر قدرے سمیٹ کر جگہ بنائی اور حجاب کو چارپائی پر بیٹھادیا۔

مرشد نے قمیص پہننے کے بعد اس کے ساتھ کی شلوار اٹھا کر کندھے پر ڈالی اور رائفل سنبھالتا ہوا باہر نکل گیا۔ پنو اس کو دیکھتے ہوئے سٹپٹا کر رہ گئی۔

''یہ جنگلی سانڈ کون ہے حجاب؟''

''اس کا نام مرشد ہے۔ لاہور کا رہنے والا ہے۔''

''تجھے کہاں ملا اور...... اور تیرے ساتھ کیوں ہے

یہ؟“
پینو اس کے برابر ہی چارپائی پر ٹک گئی۔
”لاہور ہی میں ملا تھا۔ وہاں کا بدمعاش ہے۔ اس کی ماں نے مجھے پناہ دیئے رکھی۔ اس کے کہنے پر یہ مجھے چوہدریوں سے بچاتا پھر رہا ہے۔“
”ہاں شکل ہی سے بدمعاش دکھتا ہے۔ مگر یہ لوگ جو تھے۔ یہ چوہدریوں کے بندے تو نہیں تھے کون لوگ ہیں یہ؟“
”مجھے نہیں پتا۔“
حجاب کی آواز بھیگ گئی۔
”میں نہیں جانتی میرے ساتھ یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔ آگے کیا ہونے والا ہے۔ کیا ہوگا۔ میری کس خطا پر خدا مجھ سے ناراض ہے۔ میں...... میں کچھ نہیں جانتی۔ کچھ بھی نہیں جانتی۔“
پینو نے بے اختیار اسے بازوؤں میں لپیٹ کر اس کو اپنے سینے سے لگالیا۔ حجاب بری طرح سسک اٹھی تھی۔ اس کو حوصلے دلاسے دیتے دیتے خود پینو بھی رونے لگی۔ غم کی اس کیفیت سے انہیں جیدے کی آواز نے چونکایا۔
”پینو۔“
وہ دروازے میں کھڑا تھا۔
”وہ...... بھائی بلا رہا ہے تجھے۔“
پینو نے ایک نظر اسے دیکھا، پھر حجاب کے رخساروں سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔
”بس حجاب! بس کر۔ نہ رو۔ مجھے تیرے ساتھ بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔ بہت کچھ سننا ہے تجھ سے اور بہت کچھ سنانا ہے۔ دعا کر کہ ان پاگل کتوں میں سے اب کوئی اس طرف نہ آئے۔ تو آرام سے بیٹھ میں ابھی آئی۔“
وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی ہی تھی کہ حجاب نے اسے پکارا۔
”پینو...... میرے سر اور کمر میں بہت درد ہے۔ میں لیٹنا چاہتی ہوں۔“
”ہاں کیوں نہیں۔“
پینو نے واپس پلٹ کر جلدی جلدی چارپائی سے کپڑے سمیٹ کر پیٹی پر ڈال دیئے۔
”تو آرام کر میں سرہانے بیٹھتی ہوں۔“

پھر وہ جیدے کو لے کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ مرشد برآمدے میں چارپائی پر بیٹھا تھا۔ وہ پاؤں اور ہاتھ منہ دھو کر شلوار بھی تبدیل کر چکا تھا۔ رائفل اس کی گود میں دھری تھی اور وہ آسمان کی طرف نظریں اٹھائے ہوئے تھا۔ آسمان پر گہرے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ آثار بتا رہے تھے کہ کسی بھی وقت بارش شروع ہوسکتی ہے۔
”اپنی سہیلی کا حال دیکھا ہے نا تو نے۔ اس کا منہ ہاتھ دھلا اور کوئی کپڑوں کا جوڑا دے اسے۔“
مرشد کی بات سن کر پینو نے چارپائی پر پڑے دونوں سرہانے اٹھا کر جیدے کو تھمائے۔
”یہ اندر دے آ۔ میں کپڑے دیکھتی ہوں۔“
”جیدا حجاب کے کمرے کی طرف بڑھ گیا اور پینو دوسرے کمرے میں گھس گئی۔ مرشد چپ چاپ اسی جگہ بیٹھا رہا۔ اس نے پیروں میں جیدے کی چپل پھنسا رکھی تھی۔ سائز میں تھوڑی چھوٹی تھی لیکن وقتی گزارا ہوگیا تھا۔ دس منٹ بعد حجاب بھی فریش ہو چکی تھی۔ دبلی پتلی پینو کی قمیض تو اسے نہیں آسکی تھی البتہ شلوار اس نے تبدیل کرلی تھی۔ پینو نے اپنی ایک نائیلون کی چپل اور ایک بڑی سی چادر اس کے حوالے کردی تھی۔ جو حجاب اچھے سے اوڑھ کے اندر جاکر کمرے میں اسی چارپائی پر نیم دراز ہوگئی تھی۔ البتہ مرشد کو برآمدے میں سے پینو نے اٹھا کر اندر بھیجا تھا۔
”میں ناشتے پانی کا انتظام کرتی ہوں۔ تو یہاں نہ بیٹھ۔ اندر چلا جا۔ اگر یہاں باہر کوئی کھڑکا دھڑکا سنائی دے تو تم دونوں دوبارہ پیٹی میں چھپ جانا۔“
مرشد نے ایک نظر ان دونوں کو دیکھا۔ دونوں ہی کے چہرے اڑے اڑے دکھائی دے رہے تھے۔ ظاہر ہے وہ پریشان بھی تھے اور اندر سے خوف زدہ بھی۔ جیدے کے ماتھے پر ایک نیلگوں سا گومڑ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ مرشد خاموشی سے اٹھ کر کمرے میں پہنچ گیا۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی حجاب نے سیدھا ہوکر بیٹھنا چاہا تو مرشد نے فوراً اسے ٹوکا۔
”لیٹی رہ۔ تیری حالت کا اندازہ ہے مجھے۔ ابھی آنے والے وقت کا کچھ پتا نہیں۔ ان لمحوں کو غنیمت جان اور دو

گھڑی کمر سیدھی کر لے۔ بعد میں شاید اس کا موقع نہ مل سکے۔"

وہ بے پروائی سے آگے بڑھ کر استری والی میز پر چڑھ بیٹھا۔ اس نے حجاب سے مختصر انداز میں معلوم کر لیا تھا کہ کل رات وہاں کھر کیا واقع پیش آیا تھا اور اسے کس طرح سہولت کے ساتھ اغوا کر لیا گیا تھا۔

مرشد کے دل و دماغ میں کسی قسم کا کوئی ڈر خوف نہیں تھا۔ البتہ فکر مندی اور پریشانی ضرور تھی اور وہ بھی حجاب کی وجہ سے، حجاب کے حوالے سے۔ اسے اندازہ تھا کہ دشمن دوبارہ آئیں گے۔ پولیس کے آنے کی بھی توقع تھی اسے۔ لیکن کچھ دیر پہلے دشمنوں کے منہ سے جو چند باتیں اس نے سنی تھیں، ان کے بعد یہ واضح ہو گیا تھا کہ پولیس سے بھی کوئی اچھی امید نہیں رکھی جا سکتی۔ ان اجنبی دشمنوں کے متعلق اس کی رائے تھی کہ یہ چوہدریوں کے بندے نہیں ہیں۔ ان کے لب و لہجے اور انداز الگ تھے۔ لیکن یہ بات طے تھی کہ یہ لوگ کام چوہدریوں کے لیے ہی کر رہے ہیں۔

رانا صاحب کا ذکر وہ دو بار سن چکا تھا۔ مگر سوچ بچار کے باوجود وہ نہیں سمجھ سکا تھا کہ یہ رانا صاحب کون ہیں۔ بس اتنی بات سمجھ آئی تھی کہ یہ لوگ رانا صاحب کے پالتو ہو سکتے ہیں اور یقیناً رانا صاحب کے پیچھے اکبر علی اور فرزند علی ہوں گے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد جیدا ناشتے کے برتن اٹھائے اندر داخل ہوا۔ بھاری بھرکم پراٹھوں کے ساتھ چنے کی دال تھی۔ دونوں کو الگ الگ برتن تھما کر وہ واپس پلٹا۔

"میں پانی اور چائے لاتا ہوں۔"

"بات سن ذرا۔"

مرشد کے پکارنے پر وہ ٹھٹک کر پلٹا۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟"

"جی.... اس بستی کا نام دھوپ سڑی ہے۔"

"کیا سڑی ہے؟"

"دھوپ سڑی۔ بستی سے ادھر ایک مل ہے۔ آگے روڈ ہے، لاہور روڈ، قریب ہی جوئیانوالہ موڑ اسٹاپ ہے...... شیخوپورہ کا علاقہ ہے یہ۔"

"ہوں، ٹھیک ہے، جا۔"

مرشد کے اندازے کی تصدیق ہو گئی تھی کہ وہ لوگ اس وقت شیخوپورہ کے انڈسٹریل ایریا کی ایک بستی میں موجود ہیں۔ یہاں سے لاہور اور بازار حسن تک کا فاصلہ اور راستہ اس کے ذہن میں واضح ہو آیا تھا۔

وہ برتن سامنے کرتے ہوئے میز پر پالتی مار کر بیٹھ گیا اور خاموشی سے ناشتہ کرنے لگا۔ دماغ آگے کے حالات و واقعات کے متعلق ضرب تقسیم میں مصروف ہو گیا تھا۔ جیدا آکر پانی دے گیا۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ خاموشی سے ناشتے میں مصروف رہے۔ باہر ہلکی ہلکی بونداباندی شروع ہوئی اور اچانک ہی زور پکڑ گئی۔ تابڑ توڑ بارش شروع ہو گئی تھی۔ چھت اور صحن سے موسلادھار بارش کی آواز سنائی دینے لگی۔ کمرے میں بھیگتی مٹی اور بارش کی خوش گوار اور خنک مہک آ گھلی۔

اسی وقت پنو ایک تھالی میں چائے کی تین پیالیاں رکھے کمرے میں داخل ہوئی۔

"بہت زور کی بارش ہے۔ امید نہیں کہ ایسے میں کوئی کتے کا پلا ادھر کو منہ کرے گا۔"

اس نے ایک پیالی مرشد کو تھمائی۔ تھالی حجاب کو اور ناشتے کے برتن سمیٹ کر پیٹی کے کونے پر ٹکا دیئے۔ پھر کمرے کے وسط میں رسیوں پر لٹکتے استری شدہ کپڑے دائیں بائیں سمیٹتے ہوئے حجاب کے برابر بیٹھ گئی۔

"یہاں کسی گھر میں ٹیلی فون ہے؟" مرشد کے سوال پر پنو اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"پتا نہیں، ادھر سڑک پار پی سی او ہے۔ ادھر کا پتا نہیں۔"

"تم لوگ یہاں کب سے ہو؟"

"مجھے تو تھوڑے دن ہی ہوئے ہیں۔ جیدا پہلے سے یہاں تھا۔"

"پہلے سے تھا تو پھر اس کے یہاں جاننے والے بھی ہوں گے؟" مرشد نے ایک اور سوال کیا۔

"ہاں، ہیں تو سہی...... وہ پہلے یہاں مل میں کام کرتا تھا۔ اس کے مل والے دوستوں نے ہی یہ مکان اسے کرائے پر دلوایا تھا۔ بعد میں اس نے یہ استری اور دھلائی کا کام شروع کر دیا۔"

"ہوں۔"

مرشد ہنکارا سا بھر کر کسی سوچ میں پڑ گیا اور پتو حجاب کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بغور اس کی صورت دیکھنے لگی۔

"یہ سر اور چہرے پر پٹی کیسی ہے۔ کوئی چوٹ لگی ہے کیا؟"

اس کے سوال پر حجاب نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے چائے کا سپ لیا۔

"ہاں سر پھٹا تھا۔ ٹانکے لگے ہیں۔ شاید اسی کی وجہ سے سر دکھ رہا ہے۔"

"رنگ بھی پیلا ہلدی ہو رہا ہے تیرا۔ چائے پی لے گی تو سر درد کو کچھ سکون مل جائے گا۔ گھر میں کوئی گولی شولی ہوتی تو میں دے دیتی تجھے...... ہم نے تو اڑتی اڑتی سنی تھی کہ تجھے چوہدری فرزند نے گھر سے اٹھوالیا ہے۔ لاہور کیسے پہنچ گئی تو...... اتنے دن سے لاہور میں ہی تھی کیا؟"

"ہاں۔" حجاب کے ہونٹ تھرا کر رہ گئے۔

"اور چوہدری فرزند کے چنگل سے کیسے نکلی تو؟"

"وہ ...... اس نے مجھے لاہور بدمعاشوں کے ایک محلے میں قید کر رکھا تھا۔ وہاں خالہ حسن آرا نے مجھے اپنی پناہ میں لے لیا۔ انہوں نے ہی اب تک مجھے چوہدریوں سے بچائے رکھا ہے۔"

"خالہ حسن آرا!"

پتو متعجب ہوئی۔

"بدمعاشوں کے محلے میں اور چوہدریوں جیسے پاگل درندوں سے ایک عورت نے بچائے رکھا تجھے! یہ عورت خود کیا بلا ہے؟"

حجاب نے بے اختیار ایک نظر مرشد کی طرف دیکھا۔ مگر وہ لاتعلق سا بیٹھا چائے پی رہا تھا۔

"وہ ان کی والدہ ہیں۔" حجاب نے مرشد کی طرف اشارہ کیا۔

"بہت شفیق اور مہربان خاتون ہیں وہ۔ اگر وہ نہ ہوتیں تو......"

حجاب ہونٹ بھینچ کر خاموش ہو رہی۔ پتو نے اچٹتی سی نظر مرشد پر ڈالی اور ہاتھ میں پکڑی پیالی کی طرف متوجہ ہوگئی۔

باہر بارش اپنے زوروں پر تھی۔ اپریل کے آخری دن تھے لیکن بارش کی وجہ سے ہلکی ہلکی ٹھنڈ محسوس ہونے لگی تھی۔

مرشد آئندہ حالات کے متعلق سوچتے سوچتے پتو اور حجاب کی باتوں کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد پتو نے پھر حجاب کو مخاطب کیا۔

"تیرے بعد گاؤں میں کیا ہوا۔ تیرے گھر پر اور گھر والوں پر کیا گزری اس کی خبر ہے تجھے؟"

پتو کے سوال پر حجاب عجیب خاموش نظروں سے اس کی صورت دیکھنے لگی۔ اس کے گھر اور گھر والوں پر کیا گزری تھی یہ اسے خالہ حسن آرا کی زبانی معلوم ہو گیا تھا پھر بھی وہ پتو کے منہ سے سننا چاہتی تھی۔ ایک مدہم سی امید کہ شاید کہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔ شاید پتو سے کچھ مختلف سننے کو مل جائے۔

ان دونوں سے لاتعلق سے بیٹھے ہوئے مرشد کی سماعت پوری طرح ان دونوں ہی کی طرف متوجہ تھی۔ حجاب کے متعلق وہ زیادہ نہیں جانتا تھا مگر جاننا چاہتا تھا اور اب وہ لمحات آن پہنچے تھے پتو بول رہی تھی۔

"ہم لوگ تو تجھے پتا ہے گاؤں میں تھے نہیں۔ بس لوگوں سے سنا ہے کہ وہ صبح بڑی ہولناک تھی۔ تیرے بھائیوں اور چوہدریوں کے درمیان بڑے زور کی لڑائی ہوئی تھی۔ سنا ہے کہ کئی گھنٹے تک گولیاں چلتی رہیں۔ گاؤں والے اس صبح اپنے اپنے گھروں میں بند رہے کوئی باہر نہیں نکلا۔ تیرے بھائیوں نے چوہدریوں کے چھ بندوں کو چھلنی کر کے کتوں کی موت مارا۔ کئی بندے پھٹڑ بھی ہوئے چوہدریوں کے۔ تیرے بھائی شاید تیری تلاش میں حویلی کے اندر گھسنا چاہتے تھے۔ سنا ہے اس صبح فجر کی اذان سے پہلے تیرے بابا سائیں نے مسجد کے اسپیکر سے اعلان کر کے بتایا تھا کہ چوہدریوں نے تجھے گھر سے اٹھالیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ چکی والی گلی میں تیرے بھائیوں کے پاس گولیاں ختم ہوگئی تھیں ورنہ اس روز حویلی کے اندر کوئی ایک بھی زندہ نہ بچتا۔ چوہدریوں کے شیطان ٹبر سے اس روز علاقے کو نجات مل جاتی۔ جب گولیاں ختم ہوگئیں تو چوہدریوں نے تیرے بھائیوں کو گھیر لیا۔ پھر بھی تیرے دونوں بھائیوں نے گھٹنے نہیں ٹیکے۔ وہ شیر جوانوں

کی طرح دو بدو لڑتے ہوئے اپنی زندگیاں ہار گئے..... تیرے بابا سائیں تیرے پیچھے حویلی تک جا پہنچے تھے۔ وہاں چوہدریوں نے انہیں بہت مارا پیٹا، پھر......پھر حویلی کے بھوکے بولی کتوں میں پھینک دیا اور وہ وہیں ختم ہوگئے۔"

لاکھ ضبط اور ہونٹ بھینچنے کے باوجود حجاب اپنی سسکیاں روکنے میں ناکام رہی۔ اس کے سینے میں رنج و غم کے ہزار ہا بھنور بیدار ہوآئے تھے۔ اپنے بابا سائیں اور بھائیوں کا انجام اس نے اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا تھا مگر ان کے آخری لمحات کے اذیت و کرب کو وہ پوری شدت سے محسوس کرسکتی تھی۔ باپ بھائی اسی کی عزت و سلامتی کے لیے تو قربان ہوئے تھے۔ ماں باپ اور بھائیوں، سب کی لاڈلی تھی وہ۔ سب کی ہتھیلی کا چھالا تھی وہ۔ کبھی کسی نے سخت لہجے میں بات نہ کی تھی جان چھڑکتے تھے سب اور اسی کے لیے وہ سب کٹ مرے تھے۔

اس کے کھبرو جوان بھائیوں میں کوئی عیب کوئی خرابی نہ تھی۔ باپ علاقے بھر کا شریف ترین اور بے ضرر انسان تھا۔ ان سے کسی کو بھی کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچی تھی۔ لیکن قدرت نے خود ان کو کیسے دردناک انجام سے دوچار کیا تھا..... حسن آرا سے اسے صرف ان کی موت کا علم ہوا تھا۔ اب پتو کی زبانی ان کی موت کا منظر بھی اس پر واضح ہوگیا تھا۔ اس سب کے بعد ضبط اور حوصلے کا کیا سوال رہ جاتا تھا بھلا۔

سسکیاں گھٹی گھٹی چیخوں میں تبدیل ہوئیں۔ پتو نے اسے پچکارنا چاہا تو ضبط کے تمام بند یکبارگی ٹوٹ گئے۔ گھٹی گھٹی چیخیں دھاڑوں میں بدل گئیں۔

پتو نے گھبرا کر اٹھتے ہوئے فوراً کمرے کا دروازہ بند کیا اور دوبارہ حجاب کو سنبھالنے میں لگ گئی۔ مرشد فرش پر نظریں جمائے اپنی جگہ ساکت بیٹھا تھا۔ بے رحمی اور سفاکی کی اس داستان کا ایک ایک لفظ اس کے ذہن و دل میں اتر گیا تھا۔ جہاں چوہدریوں کے لیے اس کا اندر غم و غصے سے بھر گیا تھا وہیں حجاب کے لیے اس کے سینے میں ایک عجیب سی شفقت و ہمدردی کا سمندر موج زن ہو آیا تھا۔ اس کا دل شدت سے چاہ رہا تھا کہ آگے بڑھ کر حجاب کو حوصلہ تسلی دے۔ اس کا سارا دکھ..... سارا غم سمیٹ لے۔ لیکن اس معاملے میں وہ بالکل کورا تھا۔ آج تک اس نے جس طرح زندگی گزاری تھی اس کے باعث وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ ایسے میں اسے کیا کہنا چاہیے۔ کیا کرنا چاہیے۔ شاید اس کے پاس موزوں الفاظ نہیں تھے۔ حجاب کی دل دوز چیخیں اس کے رگ و پے میں پھریریاں سی دوڑا رہی تھیں مگر وہ اپنی جگہ پتھر کے مجسمے کی طرح چپ چاپ بیٹھا رہا۔ باہر بارش اپنے زوروں پر تھی اور کمرے کے اندر حجاب کی چیخیں۔ پتو اسے سنبھالتی ہوئی خود بھی رو رہی تھی۔

"بس کر حجاب۔ خدا کے لیے بس کر۔ تیری آواز باہر تک جا رہی ہوگی وہ...... وہ درندے کہیں تیری آواز سن کر پھر سے نہ آ جائیں...... بس کر۔"

"آ جانے دو میں...... میں جینا ہی کب چاہتی ہوں۔ مجھے نہیں جینا۔ میں بھی مرجانا چاہتی ہوں۔"

"ایسا نہ بول حجاب۔ ایسے مت کہہ۔"

"میرے ویر میرے بابا سائیں۔ سب ...... سب میرے لیے مرمٹے سب ختم ہوگئے۔ میں...... میں اب کس کے لیے جیئوں۔ کیوں جیئوں۔ میرا...... میرا گھر اجڑ گیا۔ برباد ہوگیا سب کچھ۔ پھر میں کیوں زندہ ہوں۔ کیوں زندہ ہوں میں۔"

"حوصلہ کر حجاب۔ چپ کر جا۔"

"ویر جی...... بابا۔"

وہ کلیجہ چیر دینے والے انداز میں مرجانے والوں کو پکار رہی تھی۔ مرشد نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے زرد چہرے پر سرخی اتر آئی تھی۔ چارپائی کے ساتھ ہی نیچے جگ گلاس رکھا تھا۔ مرشد نے اپنی جگہ سے اٹھ کر گلاس پانی کا بھرا اور حجاب کی طرف بڑھایا۔

"لے...... تھوڑا سا پانی پی لے۔"

"مجھے اپنے بابا سائیں کے پاس جانا ہے۔"

پتو نے مرشد کے ہاتھ سے گلاس پکڑ کر اس کے ہونٹوں کی طرف بڑھایا تو حجاب نے ہاتھ سے گلاس ہٹا دیا۔

"نہیں پینا میں نے پانی۔ نہیں جینا مجھے۔"

مرشد چند لمحے کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے جھکتے ہوئے حجاب کو کندھوں سے تھامتے ہوئے بری طرح جھنجوڑ ڈالا۔

"ہوش کر۔"
ایک لمحے کے لیے حجاب کو چپ لگی تو مرشد نے پھر سے اسے جھنجوڑا۔
"ادھر دیکھ میری طرف...... دیکھ ادھر...... اپنے باپ بھائیوں کی کوئی عزت قدر ہے تیری نظر میں یا نہیں؟"
حجاب نے اس کے الفاظ پر بے اختیار اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی سرخ سرخ آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑے مزید بولا۔
"جن کے لیے اتنا چیخ رہی ہے...... تڑپ رہی ہے۔ ان کی توہین مت کر۔ تیری عزت وآبرو اور زندگی کے لیے انہوں نے اپنی جانیں تک قربان کردیں اور تو ہے کہ مرجانا چاہتی ہے..... مرنے کی باتیں کررہی ہے۔ ان کی قربانیوں کی کوئی اہمیت اور وقعت ہی نہیں تیری نظر میں۔"
"وہ...... وہ میرا...... میرا سب کچھ تھے۔"
حجاب کی ہذیانی چیخوں کو تو بریک لگ گئی لیکن ساتھ ہی اس کی ہچکی بندھ گئی۔
"وہ سب اس لیے مرمٹے تاکہ تو زندہ رہے۔ سمجھ آئی کچھ...... ذرا ہوش سے کام لے۔ اپنے اس پاگل پن پر تھوڑا قابو رکھ...... تجھے مرنا نہیں جینا ہے۔ پتا ہے کیوں جینا ہے؟"
مرشد نے چند لمحے کو توقف کیا۔ حجاب اور پٹھو دونوں اس کی صورت تک رہی تھیں۔
"تجھے اس لیے جینا ہے تاکہ تو اپنے باپ بھائیوں کے قاتلوں کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے۔ ان سب کی بربادی۔ ان کے عبرت ناک انجام تک تجھے زندہ رہنا ہے۔ جینا ہے۔ اس طرح مرنے کی آرزو کرکے اپنے باپ بھائیوں کے خون کی بے حرمتی مت کر۔"
مرشد اس کے کندھے چھوڑ کر سیدھا کھڑا ہوگیا۔ اس کا انداز اور لہجہ تو ہمیشہ سے تھا ہی کرخت اور کھردرا۔ لیکن اس کی باتیں حجاب کی سمجھ میں آگئی تھیں۔ مرشد کے اشارے پر پٹھو نے پانی کا گلاس پھر سے حجاب کے ہونٹوں کی طرف بڑھایا تو اس بار اس نے تعرض نہیں کیا۔
مرشد نے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے باہر جھانکا۔ دروازے کے سامنے ہی جیدا اپنی پریشان صورت لیے کھڑا تھا۔ بارش اب بھی جاری تھی۔ البتہ اب اس کی شدت میں کمی آچکی تھی۔
حجاب کے سر درد میں کچھ مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سر کو سنبھالتے ہوئے قدرے جھک کر بیٹھ گئی۔ مرشد دوبارہ پیچھے ہٹ کر میز پر چڑھ بیٹھا۔
"حجاب! پیچھے ہوکر آرام سے لیٹ جا۔"
پٹھو نے کہا۔ حجاب نے نفی میں سر ہلایا۔
"خدا کے کاموں میں انسانوں کا کوئی زور نہیں چلتا حجاب! جنہوں نے جانا تھا وہ چلے گئے۔ ان کے بارے میں سوچ سوچ کر خود کو ہلکان کرنے کی بجائے ان کے بارے میں سوچ جو ابھی زندہ ہیں۔ تیری ماں جی ہیں...... اسرار ہے۔ تجھے پتا ہے وہ دونوں اب کہاں اور کس حال میں ہیں؟"
حجاب نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا۔
"گاؤں والے اس فساد کے تین روز بعد اسرار یہاں ہمارے پاس آیا تھا۔ دو دن وہ یہیں، اسی کمرے میں رہا تھا۔"
حجاب نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر پٹھو کی طرف دیکھا۔
"ہاں سچ کہہ رہی ہوں۔ دو دن اسی چار پائی پر گزارے تھے اس نے۔ میں نے اور جیدے نے اسے بہت روکنا چاہا مگر تیسری رات وہ بغیر بتائے چپ چاپ یہاں سے چلا گیا۔"
"کہاں...... کہاں چلا گیا؟"
"پتا نہیں۔ اس نے بتایا بھی نہیں۔ اس کی جذباتی اور دماغی حالت بڑی ابتر تھی۔ گاؤں والی ساری تباہی بربادی کا ذمہ دار وہ خود کو مانتا تھا۔ نہ دن کو سوتا تھا نہ رات کو۔ ساری ساری رات یہاں کمرے میں ٹہلتا رہتا۔ غسل خانے میں گھس کر کپڑوں سمیت ہی نلکے کے نیچے بیٹھ جاتا۔ تیرے اور ماں جی کے لیے حد سے زیادہ پریشان اور فکر مند تھا۔ یا تو بالکل چپ اور گم صم بیٹھا رہتا یا پھر عجیب عجیب باتیں بڑبڑاتا رہتا اور روتا رہتا۔ وہ بھی جینا نہیں چاہتا تھا۔ کہتا تھا کہ مروں گا لیکن چوہدری فرزند کو کتے کی موت مارنے کے بعد مروں گا۔" پھر بغیر کہے بتائے ہم سے چوری یہاں سے نکل گیا۔"

حجاب چپ چاپ بیٹھی پچو کی شکل دیکھتی رہی۔ لیکن در حقیقت وہ اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اسرار کی معصوم اور ہنستی مسکراتی صورت تھی۔ پچو بول رہی تھی۔

''اس کے جانے کے بعد جیدے نے اپنے یاروں بیلیوں سے اچھی طرح اُگ سگ لی، تیری ماں جی کی کسی کو بھی کوئی خبر نہ تھی، البتہ یہ بات یقینی ہے کہ وہ چوہدریوں کے ہاتھ نہیں آئی۔ وہ خود اسرار اور ماں جی کی تلاش میں پاگل ہوئے پھر رہے ہیں۔

حجاب کے ذہن میں وہ منظر لہرا گیا جب چوہدری فرزند نے اسے اس کے گھر سے اغوا کیا تھا۔ ماں جی اسے بچانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ چوہدری کے ایک ڈشکرے نے رائفل کا بٹ ماں جی کی کنپٹی پر رسید کیا تھا اور وہ لڑکھڑا کر صحن کے کچے رش پر گر کر تڑپنے لگی تھیں۔ اس کے بعد کی حجاب کو کچھ خبر نہ تھی۔ اب جو معلومات اسے پچو کی زبانی ملی تھیں ان سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ ماں جی اور اسرار زندہ ہیں بس لا پتہ ہیں۔ کسی نامعلوم جگہ پر روپوش ہیں۔

''دیکھ حجاب! جو ہونا تھا وہ تو ہو گزرا۔'' مرشد کی بھاری آواز اس کی سماعت تک پہنچی۔

''اس بارے میں تو کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں آگے کے لیے تسلی رکھ۔ میں تجھے تیری پھوپھی کے گھر تک پہنچا کر تیری ماں جی اور بھائی کو بھی ڈھونڈ کر وہاں تیرے پاس پہنچا دوں گا۔ تو اب گزری ہوئی کو چھوڑ کر آگے آنے والی زندگی کے متعلق سوچ۔''

''اور...... اگر آپ سے پہلے چوہدریوں نے انہیں ڈھونڈ لیا تو؟''

حجاب نے عجیب یاس انگیز نظروں سے مرشد کی طرف دیکھا تھا۔

''دعا کر کہ ایسا نہ ہو۔ بالفرض ایسا کچھ ہو گیا تو انہیں چوہدری کے چنگل سے زندہ سلامت نکال کر تجھ تک پہنچانا میری ذمہ داری۔ بس تو یہ رونا دھونا ختم کر دے۔ آنکھیں پونچھ لے اپنی۔ تو آنسو بہاتی ہوئی بالکل بھی اچھی نہیں لگتی۔ بے شک اس پچو سے پوچھ لے۔''

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد مرشد دوبارہ بولا۔

''اب ایک بات اور بتا دے مجھے۔''

پچو اور حجاب دونوں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم لوگوں کی اور چوہدریوں کی آپس میں کیا دشمنی ہے؟ اتنا کچھ ہو چکا۔ اب بھی چوہدریوں کے کتے تم لوگوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں تو کیوں؟ کیا وجہ ہے اس سب کی؟''

''جاگیردار اکبر علی کی ایک بیٹی ہے۔ نازیہ...... وہ اور میرا بھائی اسرار ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ اس نے اسرار کو بلایا تو وہ اس سے ملنے حویلی چلا گیا۔ وہاں اسے کسی نے دیکھ لیا۔ اسی بات پر چوہدری لوگ ہمارے دشمن ہو گئے۔''

''بس۔''

حجاب خاموش ہوئی تو مرشد تعجب سے بولا۔

''جی۔''

''کیا اسرار نے وہاں کسی کو کوئی نقصان پہنچایا تھا؟''

''نہیں۔''

مرشد سوچ میں پڑ گیا۔ وہ شاید مزید کوئی سوال کرتا مگر اچانک بیرونی دروازے پر ہونے والی تیز دستک نے ان تینوں کو بری طرح چونکا دیا۔ حجاب اور پچو نے بیک وقت فق ہوتے چہروں کے ساتھ مرشد کی طرف دیکھا۔ مرشد رائفل سنبھالتے ہوئے فوراً دروازے کی طرف لپکا تھا۔ ٹھیک اسی وقت جیدا ہراساں صورت لیے کمرے کے دروازے پر نمودار ہوا۔

''وہ باہر کوئی آیا ہے۔''

مرشد نے صحن میں نظر دوڑائی۔ بارش تقریباً تھم چکی تھی۔ بس ہلکی ہلکی بوندا باندی جاری تھی۔

''جا دیکھ جا کے کون ہے۔''

''اور اگر وہی لوگ ہوئے تو؟''

''تیرے کنڈی نہ کھولنے سے وہ واپس نہیں چلے جائیں گے۔ جا کے دروازہ کھول۔''

جیدا ایک ذرا ہچکچایا پھر ناچار پلٹ کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ مرشد دروازے کا ایک پٹ لپیٹتے ہوئے اس کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ دروازے کی جھری سے وہ باآسانی بیرونی دروازے پر نظر رکھ سکتا تھا۔

دروازے کے قریب پہنچ کر جیدے نے ڈرتے

ڈرتے زنجیر ہٹا کر دروازہ کھولا۔
باہر سے کسی کی مدھم آواز سنائی دی۔ الفاظ سمجھ میں نہیں آسکے تھے۔ پھر جیدا دروازے سے باہر نکل گیا تو مرشد بولا۔
''کوئی اور ہے۔''
ظاہری بات تھی کہ اگر باہر دشمن یا پولیس والے ہوتے تو جیدا باہر نہیں جاتا بلکہ وہ لوگ اندر آتے۔ پھر بھی مرشد محتاط اور چوکنے انداز میں اسی جگہ کھڑا رہا۔
''بارش تقریباً تھم چکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم لوگوں کو اب یہاں سے نکل جانا چاہئے۔''
''کہاں۔''
مرشد نے کہا تو پنو نے بے ساختہ سوال کیا۔
''وہ لوگ ہوسکتا ہے ابھی بستی میں ہی ہوں۔ تم لوگ فوراً نظروں میں آجاؤ گے۔''
''اگر وہ لوگ بستی میں موجود ہیں تو پھر یقیناً وہ دوبارہ ادھر آئیں گے اور یہ ہمارے حق میں زیادہ خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ اس رائفل میں زیادہ گولیاں نہیں ہیں یہاں ہم بری طرح پھنس کر رہ جائیں گے۔''
''تم دونوں دوبارہ پیٹی میں چھپ جانا۔''
مرشد چڑ کر بولا۔
''پیٹی' پیٹی' پیٹی...... پیٹی نہ ہوئی سلیمانی ٹوپی ہوگئی۔ عمرو عیار کی زنبیل ہوگئی۔ پیٹی میں سے کوئی سرنگ بستی کے باہر جاتی ہے کیا۔''
پنو ہونٹ بھینچ کر خاموش ہورہی۔
جیدے کی واپسی تقریباً پانچ منٹ بعد ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک شاپر تھا جس میں دو تین میلے سوٹ تھے۔
''بستی میں پولیس آئی ہوئی ہے اور وہ سارے گھروں کی تلاشی لینے کا پروگرام بنا رہی ہے۔'' جیدے نے اندر آتے ہی گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔
''ببلو نے بتایا ہے کہ آٹھ دس پولیس والے ہیں۔ ان کا یا افسر ادھر...... اشفاق خان کی بیٹھک میں بیٹھا ہے۔ کچھ پولیس والے باہر گاڑی میں بیٹھے ہیں اور کچھ ''دتو'' کی دکان کے چھپر نیچے کھڑے ہیں۔ کچھ اجنبی اور مشکوک قسم کے بندے بھی ادھر ادھر موجود ہیں۔
جیدے نے اندر آتے ہی باری باری ان تینوں کی شکلیں دیکھتے ہوئے بتایا۔
''ببلو بتا رہا تھا کہ بستی میں باتیں ہورہی ہیں کہ رات کچھ خطرناک مجرم بستی میں گھسے ہیں جو یہیں کسی گھر میں چھپے بیٹھے ہیں اور جو فائرنگ ہوتی رہی ہے اس میں ملک قسور کا بیٹا مارا گیا ہے کچھ...... کچھ لوگ زخمی بھی ہوئے ہیں۔ پولیس والے کہہ رہے ہیں کہ نہ وہ مجرموں کو چھوڑیں گے اور نہ ان کو بخشیں گے جنہوں نے مجرموں کو پناہ دے رکھی ہے..... چھپا رکھا ہے۔''
مرشد نے ایک نظر حجاب کی طرف دیکھا۔ وہ اور پنو مرشد ہی کو تک رہی تھیں۔
''ان پولیسوں کی تو ایسی کی تیسی۔ میں انہیں اشفاق خان کی بیٹھک ہی میں ٹھنڈا کرآتا ہوں۔ آ میرے ساتھ اور مجھے بتا کہ کدھر ہے یہ اشفاق خان کی بیٹھک، چل آگے لگ۔''
مرشد نے جیدے کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس کا چہرہ فق ہوگیا۔
''کک...... کیا کہہ رہے ہیں آپ۔''
''یہ تو آ بیل مجھے مار والی بات ہوگی۔ کوئی ہوش کی بات کرو۔''
''مم...... مرشد جی! یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔'' وہ تینوں ہی گھبرا گئے تھے۔ مرشد کی مونچھیں ہلکے سے مسکرادیں۔
حجاب کا ''مرشد جی'' اس کی سماعتوں کو گدگدا گیا تھا۔
''کیا خیال ہے؟ مرشد جی باؤنتر گئے ہیں...... ہے نا۔''
وہ حجاب کی طرف دیکھتے ہوئے خوش دلی سے مسکرایا۔ پھر پنو سے مخاطب ہوا۔
''گھبرا نہ پنو ڑا خان! مرشد کی وجہ سے تم لوگوں پر کوئی آفت نہیں آئے گی۔ چل تو آ میرے ساتھ۔''
آخری جملہ اس نے جیدے سے مخاطب ہوکر کہا۔ پھر اس کی گردن میں بازو ڈالتے ہوئے اس کو ساتھ لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔
''حجاب! یہ سانڈ کوئی عذاب نہ کھڑا کردے۔ اسے روک جاکے، سمجھا کچھ اسے۔'' پنو نے پریشانی سے کہا۔
''میرے بس کی بات نہیں۔ اس کی ماں کے علاوہ اسے کوئی لگام نہیں دے سکتا اور وہ بے چاری یہاں ہے

نہیں۔“
”اگر اس نے باہر جا کے کوئی پنگا لیا تو وہ اسے پولیس مقابلے میں ماردیں گے۔“
”میرا نہیں خیال کہ یہ ایسی کوئی احمقانہ حرکت کرے گا۔“
”خدا کرے کہ تیرا خیال ہی ٹھیک ثابت ہو۔ ورنہ اس کی مونچھیں دیکھ دیکھ کر مجھے تو لگ رہا ہے کہ یہ پٹھے کام کرنے کا شوقین ہے۔“
”ہاں وہ تو ہے۔“
”یہ اس کی گردن اور سینے پر خون کے دھبے کیسے تھے؟ تم لوگ یہاں کیسے پہنچ گئے؟“
”کل صبح لاہور میں چوہدریوں کے بندوں نے مرشد پر حملہ کیا تھا۔ بڑے زور کی لڑائی ہوئی تھی۔ رات کو کچھ بندوقوں والوں نے گھر گھس کر مجھے اغوا کیا اور ایک کار میں ڈال کر ادھر...... پیچھے کہیں کسی ڈیرے پر لا کر ایک کمرے میں بند کر دیا تھا۔ پتا نہیں یہ مرشد کیسے پیچھے پہنچ آیا۔ اسی نے مجھے وہاں سے نکالا۔ وہ لوگ ہمارے پیچھے لگ گئے اور ہم ان سے بھاگتے چھپتے یہاں تیرے گھر تک پہنچ آئے۔ اسی دوران اسے چوٹیں وغیرہ آئی ہوں گی۔“
”تو یہ تیرے لیے کیوں چوہدریوں سے دشمنی پالتا پھر رہا ہے؟“
”بتایا تو تھا کہ اس کی ماں نے مجھے پناہ دے رکھی تھی۔ اسی کے کہنے پر یہ مجھے بچاتا پھر رہا ہے۔“
”بس...... ماں کے کہنے پر؟“
پینو نے عجیب سے لہجے میں کہا۔
”ہاں بدمعاش سہی مگر اپنی ماں کا بہت فرماں بردار ہے۔ بہت محبت کرتا ہے اپنی ماں سے۔“
اچھا...... اور ماں کے علاوہ؟“
کیا مطلب ہے؟ ماں کے علاوہ!
”ماں کے علاوہ بھی کسی سے محبت کرتا ہے کیا؟“
”مجھے کیا پتا...... میں اس کی جاسوسی تو نہیں کرتی رہی۔“
حجاب کے جواب پر پینو چند لمحے بغور اس کے چہرے کو پڑھتی رہی۔ پھر ایک گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔
”تو بڑی ہی جھلی ہے حجاب! بندے کو اتنا بھولا بھی نہیں ہونا چاہیے۔“
”کیا مطلب ہے تیرا؟“
”مطلب کیا ہونا ہے اللہ کی بندی! وہ تجھ سے بھی محبت کرتا ہے۔“
”کیا بکواس کر رہی ہے؟“
”بکواس نہیں کر رہی۔ سچ کہہ رہی ہوں۔ وہ تیری محبت میں گرفتار ہے۔ اس نے بتایا نہیں کیا تجھے؟“
”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تو فضول میں الٹی سیدھی نہ ہانک۔“ حجاب نے قدرے بدمزگی سے کہا۔
”ایسی کوئی بات تیرے دل میں نہ ہوگی۔ ادھر تو سو فیصد ہے...... باقی اس کی مونچھیں بتاتی ہیں کہ اکھڑ مزاج بندہ ہے۔ جلدی اور آسانی سے اظہار نہیں کرے گا...... تو نے شاید توجہ نہیں دی کہ تجھے دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں کیسی چمک بے دار ہو جاتی ہے...... ابھی جب تو نے اسے مرشد جی کہہ کر پکارا تھا اس وقت اس کے چہرے پر آنے والی مسکراہٹ پر تو نے غور نہیں کیا...... مرد کی ایسی مسکراہٹ اس کے دل کا حال بتا دیتی ہے۔ وہ تجھ پر دل ہار بیٹھا ہے حجاب بی بی!“
”تجھے تو جیسے مردوں کی مسکراہٹ کی بڑی پہچان ہے۔“
”تو جانتی ہے میں اس معاملے میں گاؤں کی بدنام ترین لڑکی ہوں اور میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں، وہ اندر سے بری طرح گھائل ہے۔“
حجاب اپنی جگہ کسمسا کر رہ گئی۔ وہ مرشد کی طرف سے قدرے الجھن کا شکار تو پہلے ہی تھی اب پینو نے جیسے اس الجھن پر اپنے تجربے کی مہر ثبت کر دی تھی۔
”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ پینو نے جیسے اس کے اندر پھیلتی ہوئی بے چینی کو محسوس کر لیا تھا۔
”بھلے سے وہ بدمعاش بندہ ہے مگر اس کی آنکھ میں تیرے لیے کوئی میل نہیں ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ جیسی بھی مصیبت آ پڑے وہ پیچھے نہیں ہٹے گا۔ تیرے لیے لڑ کر کٹ مرنا گوارا کر لے گا۔ مگر تجھے کسی مشکل مصیبت میں اکیلا چھوڑ کر بھاگے گا نہیں۔“
حجاب خاموشی سے پینو کی صورت دیکھے گئی۔ اس کا دل عجیب سے انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔ کچھ پریشانی سی

ہونے لگی تھی تو کچھ گھبراہٹ سی۔
"شاید تیرے لیے یہ قدرت کا کوئی انتظام ہو...... تجھے جو حالات درپیش ہیں ان میں اگر جیدے جیسا کوئی سیدھا سادا اور شریف بندہ تیرے ساتھ ہوتا تو خود بھی مرتا اور تجھے بھی مروا دیتا۔ ان حالات میں تجھے ایسے ہی کسی مضبوط سہارے کی ضرورت تھی جو، اس مرشد کی صورت میں تیرے ساتھ ہے۔"
"بس کر پیو...... کوئی اور بات کر۔ مجھے ایسی باتیں پسند نہیں ہیں۔" حجاب کو خود اندازہ نہیں تھا کہ وہ کیوں پریشان ہوگئی ہے۔ اس کے خشک انداز پر پیو کو بھی چپ لگ گئی۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ دزدیدہ نظروں سے حجاب کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑانے والے انداز میں بولی۔
"یہ بدمعاش کا بچہ پتا نہیں کدھر چلا گیا ہے۔ میرے بے چارے جیدے کو بھی ساتھ لے گیا ہے۔"
"تو اٹھ کر باہر دیکھ ذرا۔"
اس نے ابھی ایک قدم ہی آگے بڑھایا تھا کہ دروازے سے مرشد اندر داخل ہوا۔ اس نے ایک کھیس کی بکل مار رکھی تھی۔ یہ کھیس غالباً اس نے برآمدے میں پڑی چارپائی کی پائنتی سے اٹھایا تھا۔ اس کے پیچھے ہی جیدا اندر چلا آیا۔
"چل حجاب...... چلیں۔"
"کہاں جا رہے ہو...... بستی سے باہر کیسے نکلو گے؟"
پیو نے بے ساختہ سوال کیا تھا۔ مرشد اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے جیدے سے مخاطب ہوا۔
"یہ کپڑے شپڑے واپس پہنچ جائیں گے۔ پریشان نہیں ہونا ان کے لیے۔"
"کوئی بات نہیں جی!" حجاب خاموشی سے چادر سنبھالتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ پیو سے گلے مل کر باہر نکلنے لگی تو پیو نے فوراً مرشد کو پکارا۔
"مرشد باؤ!"
مرشد دروازے سے پلٹ کر اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔
"حجاب ہمارے گاؤں کی سب سے پیاری، شریف اور معصوم لڑکی ہے۔ اس کا بہت خیال رکھنا۔"

حجاب نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔
"تو فکر نہ کر پیو ڑا خان! مرشد کے جیتے جی اس پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔"
پیو نے گہری نظروں سے حجاب کی آنکھوں میں جھانکا جیسے کہہ رہی ہو کہ اس جملے اور لہجے پر غور کر۔ پھر وہ ان کے ساتھ ہی برآمدے میں آئی۔ دعاؤں کے ساتھ اسے رخصت کیا اور حجاب مرشد کے پیچھے پیچھے سیڑھیوں سے چھت کی طرف بڑھ گئی۔
آسمان ویسے ہی گہرے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ہوا میں نمی تھی۔ ٹھنڈک تھی۔ مرشد نے کھیس اچھے سے لپیٹ لیا تھا تو حجاب وہ بڑی سی سیاہ چادر لپیٹتی ہوئی اس کے پیچھے زینے طے کرتی ہوئی چھت پر پہنچ آئی۔
چھت پر پہنچتے ہی مرشد فوراً بائیں طرف کو آگے بڑھ گیا۔ چھت کی گیلی مٹی پر ان کے چپلوں کے نشان نقش ہوتے گئے۔ حجاب نے دیکھا وہاں پہلے بھی جوتوں کے تازہ نشان موجود تھے۔ اور یہ مرشد اور جیدے کے تھے۔ یعنی وہ یہیں سے ہو کر واپس نیچے پہنچے تھے۔ حجاب کو کچھ پتا نہیں تھا کہ مرشد کا رخ کدھر ہے...... وہ اسے لے کر کہاں جا رہا ہے۔ پولیس اور مسلح دشمنوں کے بستی میں ادھر ادھر پھیلے ہوئے ہونے کے باوجود وہ یہاں سے کیسے نکل پائیں گے۔ اسے تو بس چپ چاپ مرشد کی پیروی کرنی تھی۔ وہ جیسے کہتا...... جدھر لے جاتا۔
برابر والی چھت کے دائیں بائیں موجود دونوں گھروں کی چھتوں کے گرد پردے کی چادر موجود تھی۔ مرشد اسی چار دیواری کی اوٹ میں آگے بڑھا۔ فضا میں طلوں کے اندر چلنے والی مشینوں کا مدھم شور تھا۔ روڈ سے گزرنے والی گاڑیوں اور ان کے ہارنز کی آوازیں بھی ڈوب ابھر رہی تھیں۔ یقیناً روڈ یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا مگر وہ اس طرف کا رخ نہیں کر سکتے تھے۔ دبے قدموں دو چھتیں پار کرنے کے بعد مرشد ایک برساتی نما اوٹ میں بیٹھ گیا۔ حجاب نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔
"یہ سامنے والی چھت سے ہمیں بیٹھے بیٹھے گزرنا ہے ورنہ دیکھ لیے جائیں گے۔" مرشد نے دھیمے لہجے میں کہا۔ حجاب نے سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا تو مرشد کھیس کے نیچے موجود رائفل کو سنبھالتے ہوئے آگے کھسکنے لگا۔

بیس پچیس فٹ کا فاصلہ تھا۔ مگر کچی اور گیلی چھت پر بیٹھے بیٹھے آگے بڑھنا خاصا دشوار ثابت ہوا۔ لیکن جیسے تیسے حجاب نے یہ چھت بھی پار کرلی۔ اب ان کے سامنے ایک چوبارہ تھا۔ آمنے سامنے کافی فاصلے پر دو کمرے اور ایک خاصی لمبی دیوار۔ مرشد اس دیوار کے ساتھ چپک کر بیٹھ گیا اور اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔ حجاب کا سانس پھول چکا تھا۔ مرشد نے سرگوشی والے انداز میں اسے مخاطب کیا۔

''ذرا سانس لے لے تھوڑا اور آگے جانا ہے ابھی۔'' حجاب نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔

کچھ دیر بعد مرشد اس چوبارے کی دیوار کے ساتھ جھکے جھکے انداز میں آگے بڑھا تو حجاب بھی اسی انداز میں اس کے پیچھے چل پڑی۔ انہوں نے اسی طرح محتاط اور چوکنے انداز میں مزید دو چھتوں کا فاصلہ طے کیا۔ اس سے آگے والی چھت خاصی کشادہ اور طویل تھی۔ چھت پر لوہے کے زنگ آلود اسکریپ کے چھوٹے بڑے ڈھیر بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ ٹوٹے پھوٹے آہنی صندوق تھے۔ ناکارہ اینگلیں' ٹی آر اور گارڈرز کے چھوٹے بڑے ٹکڑے اور مختلف سائزوں کے ٹیڑھے اور پچکے ہوئے پائپس اور اسی طرح کا بہت کچھ۔ اسی چھت کے ایک طرف ایک اور کمرہ تھا۔ اس کی چھت نسبتاً نیچی تھی۔ اس کے ساتھ دوسری چھوٹی چھت یقیناً غسل خانے وغیرہ کی تھی۔ برابر میں چار دیواری اور اس چار دیواری کے اندر بکھرے سامان اور چھوٹے سائز کی چند مشینوں اور اوزاروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کوئی کارخانہ ہے۔

مرشد اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے اس کارخانے کی چار دیواری کے اندر نیچی چھت والے کمرے پر اتر گیا۔ صرف تین چار فٹ کی بلندی کا فرق تھا۔ حجاب بھی آہستہ سے اس پر کود آئی۔ چھت پر کودتے ہی اس کے سر کے زخم میں ٹیس اٹھی۔ اور اس نے بے اختیار کراہتے ہوئے سر پر ہاتھ رکھ لیا۔

''سر میں درد ہے نا؟'' مرشد نے ہمدردانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''زخم میں رہ رہ کر ٹیسیں اٹھتی ہیں۔''

''ہاں تجھے آرام کی ضرورت تھی۔ پٹی بھی تبدیل نہیں ہوئی اور...... اغوا ہوتے وقت تو نے میڈیسن بھی ساتھ نہیں لی کہ چلو کوئی پین کلر ہی لے لیتی۔''

حجاب نے گھور کر اس کی طرف دیکھا مگر وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ پنجوں کے بل بیٹھا کارخانے کے اندرونی حصے کا جائزہ لے رہا تھا۔

''چل آ جا ادھر۔''

مرشد غسل خانے والی چھت پر اتر گیا۔ یہ مزید تین فٹ نیچی تھی۔ یہاں سے کارخانے کا فرش سات فٹ نیچے تھا۔ مرشد تو گھٹنے میں درد کے باوجود نیچے کود گیا البتہ حجاب غسل خانے کی چھت ہی پر رک گئی۔ ہلکی ہلکی رم جھم ایک بار پھر شروع ہوگئی تھی۔ حجاب کی متذبذب صورت دیکھتے ہوئے مرشد مسکراتے ہوئے بولا۔

''اب کیا سوچ رہی ہے؟''

''مم...... میں کیسے نیچے آؤں؟''

''جیسے میں آیا ہوں۔''

ایک لمحے کو تو لگا کہ حجاب کود پڑے گی' لیکن وہ اپنی جگہ ہی کھڑی رہی۔ مرشد کو مطمئن انداز میں کھڑے ہوئے دیکھ کر وہ اندر ہی اندر تلملا کر رہ گئی تھی۔

''اب یہاں کھڑی کیا منتر پڑھ رہی ہے۔ بارش تیز ہو رہی ہے۔ چھلانگ مار۔''

''میں کوئی غنڈہ بدمعاش نہیں ہوں جو چھلانگیں مارتی پھروں۔''

''اتنے غنڈے بدمعاش تیرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ ایک غنڈہ بدمعاش مسلسل تیرے ساتھ ساتھ ہے۔ اب تھوڑی سی غنڈی تو تجھے بھی بن ہی جانا چاہیے۔''

وہ جیسے اس کی حالت' اس کی بے بسی سے لطف اٹھا رہا تھا۔ حجاب خون کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔ چند لمحے بعد وہ دوبارہ اس سے مخاطب ہوا۔

''چل اب چھلانگ مار بھی دے بے بے! کیا پتھر بنی کھڑی ہے۔''

''بس میں یہیں ٹھیک ہوں۔'' اس نے منہ پھلا کر کہا۔

''اچھا...... ٹھیک ہے' تیری مرضی۔'' مرشد نے بے پروائی سے کندھے اچکائے اور پلٹ کر کارخانے کی اندرونی جانب بڑھ گیا۔

حجاب توقع کر رہی تھی کہ وہ نیچے سے کچھ ڈھونڈ کر دیوار کے ساتھ کسی آسرے سہارے کا انتظام کرے گا۔ مگر وہ

کوڑھ مغز لاتعلقی سے آگے بڑھ کر کارخانے میں کہیں غائب ہو چکا تھا۔ ایک بار تو حجاب کے دل میں آئی کہ یہاں سے واپس پلٹ کر دوبارہ پینو کے گھر چلی جائے لیکن عملی طور پر ایسا کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔

وہ چند لمحے پریشان سی کھڑی دانتوں سے ہونٹ کاٹتی رہی۔ بارش کی رم جھم میں تیزی آ گئی تو وہ چھت کے کنارے پر آ کر نیچے کا جائزہ لینے لگی۔ دیواریں ننگی اینٹوں کی تھیں۔ بائیں ہاتھ والی دیوار میں ایک اینٹ کا خلا تھا۔ اس میں پاؤں رکھا جاسکتا تھا۔ دیوار کی تعمیر ایسی تھی کہ اس میں دیوار گیر الماریوں کی طرح خانے سے بنے ہوئے تھے۔ حجاب کو اندازہ ہوا کہ اگر وہ تھوڑی سی ہمت سے کام لے تو از خود نیچے اتر سکتی ہے۔ وہ منڈیر کے قریب بیٹھی اور بائیں ہاتھ والی دیوار کا سہارا لیتے ہوئے ڈرتی ڈرتی نیچے لٹک گئی۔ تھوڑی سی دقت کے ساتھ اس کا دایاں پاؤں دیوار کے خلا تک جا پہنچا اور پھر وہ با آسانی فرش تک پہنچ آئی۔ سینے سے بے اختیار ایک اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ اسے احساس ہوا کہ یہ کام اتنا بھی مشکل نہیں تھا جتنا کہ وہ چند لمحے پہلے، اوپر کھڑے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔

نیچے پہنچتے ہی وہ اس طرف بڑھ گئی جدھر کچھ دیر پہلے اس نے مرشد کو غائب ہوتے دیکھا تھا۔

یہ کارخانہ اچھا خاصا بڑا تھا اور پورے کارخانے میں ویرانی اور خاموشی کا راج تھا۔ لوہے کا بہت سا خام مال ادھر ادھر بکھرا ہوا تھا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ لوہے کے بڑے بڑے چوکھٹے کھڑے تھے۔ کچھ دروازے اور کھڑکیاں تھیں۔ مختلف شکلوں کی کچھ مشینیں تھیں۔ چھوٹے بڑے کئی اوزار ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ ہر چیز پر گرد و غبار اور زنگ کی تہہ جمی دکھائی دے رہی تھی۔

حجاب قدرے دائیں طرف سامنے موجود راستے کی طرف بڑھی۔ ادھر ایک بڑا ہال تھا اور ہال کے برابر سے ایک سیدھا کشادہ راستہ سامنے کی طرف جاتا تھا جس کا اختتام کافی فاصلے پر سامنے بڑے سے گیٹ پر ہوتا تھا۔ گیٹ سے اس طرف سریئے ٹی آر اور گارڈرز کے ڈھیر پڑے تھے۔ بائیں ہاتھ میں موجود ہال کی حیثیت غالباً شوروم کی سی تھی۔ جس میں تیار شدہ مال رکھا گیا تھا۔ لوہے کی الماریاں، صندوق، رنگ شدہ گیٹ، دروازے اور ونڈرز..... حجاب آگے بڑھتی گئی۔ مرشد وہاں کہیں بھی موجود نہیں تھا۔

ہال سے تھوڑا آگے بائیں ہاتھ پر ایک اور بڑا سا کمرہ موجود تھا جس میں خام مال بھرا ہوا تھا۔ مرشد یہاں بھی نہیں تھا۔ حجاب کے اعصاب میں کھنچاؤ پیدا ہونے لگا وہ مرشد کو پکارنے کا سوچ رہی تھی کہ ایک کھٹکے کی آواز پر چونک پڑی۔ تھوڑا آگے دائیں ہاتھ والی دیوار میں ایک دروازے جتنا خلا تھا اور آواز ادھر ہی سے ابھری تھی۔

حجاب بے اختیار اس طرف کو بڑھ گئی۔ یہ ایک وسیع و عریض گیلری تھی جس میں بائیں ہاتھ قطار در قطار الماریاں کھڑی تھیں جب کہ دائیں ہاتھ شیشے کا ایک دروازہ تھا۔ اندر صوفے رکھے تھے۔ ایک ٹیبل تھی اور ٹیبل کی دوسری جانب ریوالونگ چیئر۔ یہ آفس تھا اور اندر مرشد بھی موجود تھا۔ حجاب دروازہ کھولتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ یہاں بائیں ہاتھ میں ایک درمیانے سائز کی لوہے کی الماری تھی اور مرشد پنجوں کے بل بیٹھا الماری کے نچلے خانے کی تلاشی لے رہا تھا۔ اس کے پیروں کے قریب ہی ایک ٹوٹا ہوا تالا پڑا تھا۔

''پاؤں میں کوئی موچ شوچ تو نہیں آئی تیرے؟''

مرشد نے گردن موڑ کر اس پر ایک سرسری سی نظر ڈالی اور دوبارہ الماری کی طرف متوجہ ہوگیا۔ جہاں فرسٹ ایڈ کا سامان اور مختلف ادویات موجود تھیں۔

حجاب نے اس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

''آرام سے بیٹھ ادھر...... دل کرے تو صوفے پر لیٹ جا۔ کوئی پنگا نہ پڑ گیا تو اب رات تک کا وقت ہم یہیں گزاریں گے۔'' وہ مختلف دوائیں اور ریپر الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ حجاب آگے بڑھ کر ٹیبل کی دوسری جانب پہنچ گئی۔ اس نے صوفے پر بیٹھنے کے بجائے ٹیبل کے اس طرف کرسی پر بیٹھنا زیادہ محفوظ خیال کیا تھا۔

''یہ اپنی ضرورت کی دوائیں بھی مل گئی ہیں۔''

اس نے چھوٹی سی ٹرے میں چند چیزیں رکھیں اور ٹرے اٹھا کر حجاب کے سامنے ٹیبل پر سجادیں۔ کاٹن اور سفید پٹی کے رول تھے۔ اسپرٹ کی بوتل تھی۔ ایک ٹیوب تھی۔ دو پلاسٹک کی ڈبیاں اور ٹیبلٹس وغیرہ۔ ٹرے ٹیبل پر

رکھتے ہی وہ آفس سے باہر نکل گیا۔ کچھ ہی دیر بعد اس کی واپسی بھی ہوگئی۔ پتا نہیں کدھر سے وہ ایک جگ اور گلاس ڈھونڈ کر پانی لے آیا تھا۔ گلاس پانی سے بھر کر اس نے حجاب کے سامنے رکھا اور پھر دو ٹیبلٹس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''لے ...... یہ دو گولیاں کھالے۔ اس کے بعد میں تیرے سر کی پٹی بھی تبدیل کر دیتا ہوں۔''

''نہیں اس سب کی ضرورت نہیں ہے۔''

''مجھے تجھ سے زیادہ پتا ہے۔ پکڑ یہ اور نگل جا۔''

''نہ پٹی کی ضرورت ہے نہ گولیوں کی۔ پتا نہیں کب سے یہ سب پڑا ہے ادھر۔''

''اتنی عقل ہے مجھے۔ میں تسلی کر چکا ہوں۔ ابھی کافی معیاد باقی ہے ان دواؤں کی...... چل پکڑ یہ۔''

حجاب نے گولیاں نگل لیں تو مرشد ٹیبل کے گرد گھوم کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

''یہ چادر سر سے نیچے کر لے۔ میں پٹی بدل دیتا ہوں۔''

''پٹی یہی ٹھیک ہے۔''

''نہیں ہے ٹھیک۔ یہ میڈیسنز خوش قسمتی سے یہاں مل گئی ہیں تو ان سے فائدہ کیوں نہ لیا جائے۔''

''بس یہ گولیاں کھالی ہیں نا میں نے...... پٹی رہنے دیں۔'' حجاب اس سے نظریں چراتے ہوئے کرسی پر تھوڑا سٹ کر بیٹھ گئی۔ اصل میں اسے مرشد کے یوں قریب چلے آنے پر وحشت سی ہونے لگی تھی۔

''الو کی دم! تیرے سر کا زخم خراب ہو رہا ہے۔ اس لیے اس میں رہ رہ کر ٹیسیں اٹھتی ہیں۔ زخم کی صفائی کے بعد پٹی تبدیل ہو جائے گی تو سکون آ جائے گا۔''

''مجھے سکون نہیں چاہیے۔''

''انفیکشن بڑھ گیا تو اور مصیبت آ جائے گی۔''

''کوئی بات نہیں۔''

لہجہ کچھ اور روکھا ہو گیا۔ اس نے قدرے رخ بھی پھیر لیا تھا۔ اچانک جیسے مرشد پر اس کی اندرونی الجھن اور پریشانی عیاں ہوگئی۔ وہ چند لمحے چپ چاپ کھڑا اسے گھورتا رہا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر ایک جان دار سی مسکراہٹ اتر آئی لیکن وہ کرخت لہجے میں بولا۔

''چادر ہٹاتی ہے یا دوں رکھ کے تیرے کان کے نیچے؟''

حجاب خاموش بیٹھی رہی۔ مرشد نے ٹرے ایک طرف کھسکائی۔ کندھے سے جھولتی رائفل اتار کر ٹیبل پر رکھی۔ حجاب دزدیدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مرشد کے کرخت لہجے نے اسے اندر سے سہا دیا تھا۔

ٹیبل پر جگہ بنانے کے بعد مرشد مطمئن انداز میں حجاب کے سامنے ٹیبل پر نیم دراز ہو گیا۔ کہنی اس نے ٹیبل پر ٹکائی تھی اور ہاتھ کا مکا کنپٹی پر جب کہ اپنی لو دیتی نظریں اس نے حجاب کی ناک پر جمادیں۔ رخ پھیرنے کے باعث اس کا پورا چہرہ ہی چادر کی اوٹ میں چھپ کر رہ گیا تھا۔ آفس کی فضا میں ایک گمبھیر خاموشی پھیل گئی۔ محض چند ہی لمحوں میں یہ خاموشی اور مرشد کا انداز حجاب کی اندرونی بے چینی میں مزید اضافے کا باعث بن گیا۔

''آپ ادھر صوفے پر بھی لیٹ سکتے ہیں۔'' اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی تھی۔

''میں کچھ سوچ رہا ہوں۔''

''ادھر جا کر بھی سوچ سکتے ہیں۔''

''تجھے تیرے دشمنوں سے تو میں بچاتا پھر رہا ہوں۔ لیکن اگر...... تجھ پر میری اپنی نیت خراب ہو جائے تو مجھ سے تجھے کون بچائے گا؟''

مرشد کا جملہ ہتھوڑے کی طرح حجاب کے دماغ میں لگا۔ اس نے چونک کر مرشد کی طرف دیکھا۔ بار بار ایک یہی خیال تو اسے وحشت و پریشانی میں مبتلا کر جاتا تھا۔ اب یہی خیال سوال بن کر مرشد کی زبان پر اتر آیا تھا۔ وہ یک ٹک اسی کو گھورے جا رہا تھا۔ حجاب کی دھڑکنوں میں گھبراہٹ شامل ہوگئی۔

''آ...... آپ مجھے کو...... کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔'' وہ ہکلائی تھی۔

''اس خیال خام کی وجہ؟''

''کیوں کہ...... آپ ایسے نہیں ہیں ...... مم...... مجھے خالہ حسن آرا نے اس بات کا یقین دلایا تھا۔ وہ...... وہ آپ کو سب سے زیادہ جانتی ہیں۔''

مرشد کے سرخ و سپید چہرے پر ایک پُراسرار سی مسکراہٹ اتر آئی۔ حجاب اضطراری انداز میں کرسی پیچھے

ہٹاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے سامنے ٹیبل پر مرشد موجود تھا۔ ٹیبل کے برابر والے راستے میں ایک ٹانگ حائل تھی۔ حجاب کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ وہ اپنی مرضی سے یہاں سے نکل نہیں سکتی۔ وہ بے اختیار پیچھے ہٹ کر دیوار سے جا لگی۔ مرشد اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے اس کی صورت تک رہا تھا۔

''دیکھیں آ...... آپ ایک اچھے انسان ہیں اور آپ......''

''میں بہت ہی برا انسان ہوں۔'' مرشد نے اس کی بات درمیان ہی میں کاٹ دی۔

''اور تو یہ بات اچھی طرح جانتی ہے۔ پھر بھی اگر تجھے غلط فہمی سے مجھ میں کوئی اچھی بات نظر آئی ہے تو کیا ہوا...... آخر کار میں ہوں تو ایک غنڈہ بدمعاش ہی نا!''

باہر یکا یک ہی بارش نے زور پکڑ لیا۔

''اگر آپ کو میری وہ...... غنڈہ بدمعاش والی بات بری لگی ہے تو میں اس کے لیے آپ سے معافی مانگتی ہوں۔''

حجاب روہانسی ہوگئی۔ اس نے باقاعدہ مرشد کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ مرشد کو اس پر بے تحاشہ ترس آیا۔ وہ بالکل ایک ڈری سہمی سی چڑیا کی طرح دکھائی دے رہی تھی لیکن مرشد اسی طرح سنجیدہ رہا۔

اس کی تپش دیتی نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے حجاب نے سر جھکا لیا البتہ ہاتھ اسی طرح جوڑے کھڑی رہی۔

''میں آئندہ ایسی کوئی بات نہیں کہوں گی مرشد جی! پہلی غلطی سمجھ کر معاف کردیں۔'' دو موٹے موٹے آنسو پلکوں کی دہلیز سے لڑھک کر اس کے رخساروں پر آ بہے۔

''ایک شرط پر معاف کرسکتا ہوں۔''

''کک' کیا......'' حجاب نے فوراً اس کی طرف دیکھا۔ منظر میں کچھ تبدیلی محسوس ہوئی۔ مرشد کے چہرے پر انتہائی نرم و ملائم سی مسکراہٹ تھی۔ چہرے کے تاثرات یکسر بدل چکے تھے۔

''تجھے ایک وعدہ کرنا پڑے گا مجھ سے۔''

''جی' کیسا وعدہ؟''

''یہ وعدہ کہ تیرا جب دل چاہے تو مجھے غنڈہ بدمعاش کہے گی اور اس کے علاوہ بھی تیرا جو دل چاہے گا تو بلا جھجک کہا کرے گی۔''

''جج' جی۔'' حجاب نے ایک بار پھر سر جھکا لیا۔ عجیب شخص تھا یہ۔ وہ حیران و پریشان تھی۔

''وعدہ کرتی ہے یا پھر اٹھوں میں؟''

''جج' جی...... جی وعدہ کرتی ہوں۔''

''ادھر دیکھ میری طرف۔''

حجاب نے نظریں اٹھا کر دیکھا مگر فوراً گھبرا کر دوبارہ نظریں جھکا لیں۔

مرشد کے چہرے پر ایک عجیب سی مسرت کھیل رہی تھی اور آنکھوں میں ایک جہان شوق آباد تھا اور یہی چیز اسے پریشان کرتی تھی۔ اسے نہ تو ایسی نظروں کا کوئی تجربہ تھا اور نہ ایسی نظروں سے دھڑکنوں میں پیدا ہونے والی اتھل پتھل سے کوئی واقفیت...... اسی باعث وہ گھبرا جاتی تھی...... ذہن الجھن کا شکار ہوتا تھا اور سمجھ میں نہ آنے والی ایک پریشانی اسے آ دبوچتی تھی۔

''کیا تو پاگل ہے؟'' مرشد کے اگلے سوال نے اسے چونکا دیا۔

''نن' نہیں۔''

''بڑی کب ہوگی تو؟''

''جی...... پتا نہیں۔''

''مجھے ایک سوال کا جواب چاہیے۔''

''جی......''

''درست جواب۔''

''جی...... پوچھیے؟''

مرشد ٹیبل سے اٹھ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

''پہلے سکون سے بیٹھ جا اور دو چار گھونٹ پانی بھی پی لے۔''

حجاب فرماں برداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے واپس کرسی پر بیٹھ گئی اور آدھا گلاس پانی بھی پی گئی۔

''اب ادھر دیکھ۔''

حجاب نے نظروں کا زاویہ اس کی طرف پھیرا تو مرشد بولا۔

''میری طرف دیکھتے ہوئے میرا سوال سن اور میری طرف دیکھتے ہوئے سوچ سمجھ کر سچ سچ جواب دے۔''

''سوال کیا ہے؟''

"اگر...... میں ابھی یہاں...... تجھ پر مجرمانہ حملہ کروں تو...... کیا تو اپنا بچاؤ کر سکتی ہے؟"

حجاب کی نظریں ازخود جھک گئیں۔

"ادھر دیکھ۔" مرشد کے دبکے پر اس نے گھبرا کر دوبارہ اس کی طرف دیکھا۔

"بتا...... کیا لگتا ہے تجھے...... بچ کر نکل سکے گی تو؟"

"ن...... نہیں۔" آنکھوں میں پھر سے پانی ابھر آیا۔

"تو کیا میں ایسا کچھ کر رہا ہوں...... نہیں نا! پھر یہ بات تیری سمجھ میں کیوں نہیں آ رہی کہ میرے دل و دماغ میں تیرے لیے کوئی غلط خیال' غلط سوچ نہیں ہے...... تجھے مجھ سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں تجھے کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا...... میرے لیے اپنے ذہن میں بدگمانیاں مت پال...... مت الٹا سیدھا سوچا کر۔"

"جی ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" وہ جزبز ہو کر رہ گئی۔ اسے یوں لگا تھا جیسے مرشد نے اس کے دماغ میں جھانک کر دیکھ لیا ہو۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے تو پھر مجھ سے اتنا گھبراتی کیوں ہے...... کیوں اتنا ڈرتی ہے؟"

"وہ...... وہ مجھے......"

"ہاں' کیا وہ؟"

"وہ...... مجھے آپ کی آنکھیں...... آپ دیکھتے ایسے ہیں کہ...... مجھے گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔" اس نے پھر گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔ چند لمحے دونوں خاموش رہے۔ آفس میں باہر ہوتی موسلا دھار بارش کی مدھم آواز آتی رہی۔ پھر کچھ دیر بعد مرشد کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"کچھ کچھ ٹھیک ہے تیری بات...... میں کچھ زیادہ ہی نظریں بھر لینا چاہتا ہوں شاید اس لیے۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ بولا۔

"تجھے خدا نے شکل و صورت ہی اتنی پیاری اور من موہنی دی ہے اور...... اور تو مجھے اتنی اچھی لگتی ہے کہ میں بیان ہی نہیں کر سکتا...... اس کی وجہ میری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ تیری رگوں میں جن ماں باپ کا دودھ خون دوڑ رہا ہے وہ بہت اچھے اور پیارے لوگ ہوں گے...... تو اچھے ماں باپ کی اولاد ہے۔ اس لیے خود بھی اچھی ہے۔ اب تو اچھی دکھتی ہے، اسی لیے مجھے بھی اچھی لگتی ہے...... اس لیے تجھے نظریں بھر بھر کر دیکھتا ہوں...... مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ کوئی پیار محبت یا عشق معشوقی والا معاملہ ہے...... یا میرے دل میں کوئی اور ایسی ویسی بات ہے۔ نہیں، ہرگز بھی نہیں...... تو کچھ ایسا ویسا، اوٹ پٹانگ سوچ کر نہ اپنی توہین کر اور نہ میری...... سمجھ رہی ہے نا میری بات کو؟"

"جی۔" حجاب نے آہستہ سے کہا۔

بالکل سیدھا صاف سا انداز تھا مرشد کا۔ حجاب کو عجیب تو محسوس ہو رہا تھا مگر اس کے بے ساختہ انداز میں کوئی ایسی بات تھی کہ حجاب کو یہ سب ناگوار نہیں گزر رہا تھا۔ وہ بول رہا تھا۔

"میں نے تجھے باحفاظت عزت و آبرو کے ساتھ تیرے پھوپھا کے گھر تک پہنچانے کی ذمہ داری قبول کی ہے۔ اور تو ہے کہ مجھ ہی سے عزت کا خطرہ محسوس کرتی ہے...... مجھے اپنی آبرو کے حوالے سے خطرناک سمجھتی ہے...... واپس اماں کے پاس پہنچ کر محلے بھر سے میرے کردار اور مزاج کے بارے میں پوچھ لینا۔ وہ طوائفوں اور رنڈیوں کا بازار ہے۔ زمانے بھر کی خراب اور بری عورتیں۔ وہ سب بھی میرے کردار کی گواہی دیں گی، مگر تو...... مرشد کو اتنا ذلیل تیرے سوا اور کوئی نہیں سمجھتا۔"

مرشد کے لب و لہجے میں کچھ ایسا دکھ اور افسوس تھا کہ حجاب کو عجیب سے احساس جرم اور شرمندگی کا احساس ہوا۔

"ایسی بات نہیں ہے مرشد جی! آپ...... آپ اور خالہ تو میرے محسنوں میں سے ہیں۔"

لفظ اس کی زبان سے ادا ہوئے تو دل نے جیسے فوراً گواہی دی کہ سچ کہا ہے۔ اس شخص کی ماں...... اور خود یہ شخص واقعی تیرے محسنوں میں سے ہیں۔ ایسے محسنوں میں سے جن کا احسان کبھی نہیں چکایا جا سکتا۔

"ایسی بات نہیں ہے تو پھر مجھے اپنے سر کی پٹی کیوں نہیں بدلنے دیتی؟" وہ جیسے اصل مدعے پر آ گیا تھا۔ حجاب کو چپ لگ گئی۔

"یا تو تیرے اپنے ذہن' اپنی سوچ سمجھ میں کوئی گڑبڑ ہے یا پھر تو نے میرے متعلق کچھ سستے اور گھٹیا اندازے قائم کر رکھے ہیں ورنہ مجھ سے اس قدر گھبرانے اور جھجکنے کی

بھلا اور کیا وجہ ہوسکتی ہے؟''

وہ حجاب کی جھجک اور گھبراہٹ کی وجہ جاننے' سمجھنے کی کوشش میں تھا۔ لیکن یہ کم از کم اس کی سمجھ میں آسانی سے آنے والی بات نہیں تھی۔ ایک تو اس لیے کہ وہ ایک بے باک اور اکھڑ مزاج شخص تھا..... دوسرا یہ کہ اس کا کسی عام لڑکی سے کبھی کوئی واسطہ رہا ہی نہیں تھا..... اور تیسرا یہ کہ اس کی اب تک کی زندگی جس ماحول میں گزری تھی، جس قماش کی عورتوں' لڑکیوں کو وہ جانتا تھا۔ ان کے نزدیک شرم وحیا اور جھجک وگھبراہٹ ویسے ہی شخصی خامی اور خرابیوں کا نام تھا۔

اس کی باتوں پر حجاب کچھ دیر پرسوچ انداز میں سر جھکائے بیٹھی رہی۔ پھر اس نے مرشد کی طرف دیکھا تو اس کی نگاؤں کو اپنی ہی جانب مرکوز پایا۔ چند لمحے وہ گہری سنجیدہ نظروں سے مرشد کی پررعب صورت کو دیکھتی رہی پھر آہستہ سے اس نے اپنی چادر سر سے نیچے سرکا لی۔ یہ بے زبان خاموشی اس بات کا اجازت نامہ تھا کہ وہ اس کے سر کا زخم دیکھ سکتا ہے، پٹی تبدیل کرسکتا ہے۔ ساتھ ہی یہ اس بات کا بھی اظہار تھا کہ مجھے تم پر بھروسا ہے۔ تمہاری نیت پر مجھے کوئی شک وشبہ نہیں اور درحقیقت یہ ان کے درمیان باہمی اعتماد کا ابتدائی لمحہ تھا..... مرشد کا چہرہ کھل اٹھا۔

''تھینک یو باس۔'' اس نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے حجاب کو خوش دلی سے سلیوٹ کیا اور اس کے قریب جا کر ٹیبل پر ٹک گیا۔

''گاؤں میں پینو کے علاوہ بھی تیری کچھ سہیلیاں تو رہی ہوں گی۔''

''ہاں' چند ایک تھیں۔''

''ان میں کوئی مونچھوں والی بھی تھی؟''

''نہیں۔''

''چلو..... اب ہوگئی۔''

حجاب اس کی بات کا مطلب سمجھ گئی مگر خاموش رہی۔ مرشد اس کے چہرے اور سر کے گرد لپٹی پٹی کو آہستہ آہستہ کھولتے ہوئے بولنے لگا۔

''میں بدمعاش بندہ ہوں مگر..... پکے والا بدمعاش۔ شریف بندہ نہیں ہوں۔ اس لیے دوغلا پن نہیں ہے مجھ میں۔ لہٰذا اپنے دل ودماغ سے سارے شکوک وشبہات نکال پھینک..... اماں چاہتی ہے کہ میں جلد از جلد تجھے بلوچستان تیرے پھوپھا کے ہاں پہنچا دوں۔ اماں کا حکم سر آنکھوں پر۔ ان کے حکم کے علاوہ آج میں خود تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگلے چند روز تک تجھے باحفاظت وہاں تک چھوڑ آؤں گا..... تیری ہر طرح کی حفاظت مرشد کی ذمہ داری۔ اس حوالے سے مرشد آج خود تجھے زبان دیتا ہے اور..... ایک زمانہ جانتا ہے کہ مرشد جان دے سکتا ہے مگر زبان سے نہیں پھر سکتا..... یہ بات اچھے سے اپنے ''یہاں'' بٹھالے.....'' اس نے انگلیوں سے حجاب کی کنپٹی تھپتھپائی۔

''لٹیروں کی اس بستی میں ہر قدم پر تو اس بدمعاش بندے کو اپنا محافظ پائے گی۔''

پٹی اتارنے کے بعد مرشد نے خاموشی سے اس کے زخم کی صفائی کرکے نئی پٹی باندھ دی۔ اس دوران حجاب کی یہ قربت خود بخود اس کے دل ودماغ کو اپنا احساس دلاتی رہی تھی۔ حجاب کے گھنے اور لمبے بال جو چادر کے نیچے کہیں گم ہوتے تھے۔ روکھے اور بے جان ہورہے تھے۔ لیکن ان بالوں سے اٹھنے والی عود وعنبر کی سی مہک ویسی ہی بھرپور اور جاندار تھی۔ حجاب کا ورم زدہ ہونٹ ٹھیک ہوچکا تھا۔ آنکھ کے قریب موجود نشان بھی بڑی حد تک مدہم پڑ چکا تھا۔ اس کی اس مرہم پٹی کے بعد مرشد ٹیبل کے ساتھ پڑے صوفے پر بیٹھ گیا۔ دواؤں والی ٹرے کھسکا کر اس نے اپنے قریب کرلی اور قمیض کے بٹن کھول کر اپنے سینے کے زخم کا جائزہ لینے لگا۔

حجاب نے چادر دوبارہ سے سر پر اوڑھ لی۔ اس کے ذہن میں پینو کی آواز گردش کررہی تھی۔

''وہ تیری محبت میں گرفتار ہے۔''

بدمعاش بندہ ہے مگر اس کی آنکھ میں تیرے لیے کوئی میل نہیں ہے۔''

''تیرے لیے لڑ کر کٹ مرنا گوارا کرلے گا۔''

''شاید تیرے لیے یہ قدرت کا کوئی انتظام ہو۔''

''میں اس معاملے میں گاؤں کی بدنام ترین لڑکی ہوں اور پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ اندر سے بری طرح گھائل ہے۔''

حجاب نے آہستہ سے نظریں اٹھا کر مرشد کی طرف

دیکھا......وہ باہر سے بھی گھائل تھا۔ سامنے ہی صوفے پر بیٹھے اپنے گریبان میں جھانکتے ہوئے وہ پوری توجہ سے اپنے سینے کے زخم کے ساتھ چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھا۔ اس کی گردن اور قمیض کے کالر پر بھی خون کے داغ موجود تھے۔ ان کے علاوہ یقیناً اسے کچھ اور چوٹیں بھی آئی ہوں گی۔ حجاب نے محسوس کیا تھا کہ چلتے وقت وہ دائیں ٹانگ پر قدرے کم وزن ڈالتا تھا۔ یقیناً ٹانگ پر بھی کوئی چوٹ آئی تھی اسے، اور یہ ساری چوٹیں اسے حجاب کی وجہ سے لگی تھیں......حجاب کو یقین نہیں تھا، البتہ موہوم سی امید تھی کہ شاید یہ بندہ بچ میں کامیاب ہو جائے اور وہ بلوچستان اپنی پھوپھو کے ہاں پہنچ جائے۔ وہاں پہنچ کر وہ یقیناً چوہدریوں کی درندگی سے محفوظ ہو جاتی، لیکن اس کے بعد......مرشد کو تو واپس ادھر ہی لوٹ کر آنا تھا......حجاب کا یہی اندازہ تھا کہ مرشد کو ٹھیک سے معلوم نہیں کہ اس کی حفاظت کے چکر میں اس نے کن لوگوں سے دشمنی مول لے لی ہے۔ وہ کتنے طاقت ور اور ظالم لوگ ہیں۔ ابھی اگر وہ دونوں یہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو بھی جاتے......مرشد اسے بلوچستان پہنچانے میں کامیاب ہو بھی جاتا تو واپسی پر اس کے ساتھ کیا نہیں ہو سکتا تھا۔ چوہدری کچھ بھولنے اور معاف کر دینے والے لوگ تو نہیں تھے۔ آج نہیں تو کل......کل نہیں تو پرسوں انہوں نے مرشد کی جان لے لینی تھی......اسے قتل کیے بنا وہ اب سکون سے بیٹھنے والے نہیں تھے۔ وہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ اس کی مدد کے جرم میں مرشد نے اپنی زندگی مختصر کر لی ہے۔ اس کے باپ بھائیوں کی طرح عنقریب وہ بھی ایک دردناک انجام سے دوچار ہونے والا تھا۔ اس خیال کے ساتھ ہی پہلی بار......حجاب نے اپنے دل میں مرشد کے لیے ہمدردی کے جذبات کو محسوس کیا۔ اسے اس بدمعاش پر ترس آ رہا تھا!

سینے کے زخم کے بعد اب وہ سر جھکائے سر کے عقبی حصے میں موجود زخم کو اسپرٹ اور روئی کی مدد سے صاف کرنے کی کوشش میں مصروف ہو چکا تھا اور اس کام میں اسے قدرے دشواری پیش آ رہی تھی۔ چہرے پر تکلیف کے آثار بھی تھے۔

چند لمحوں کے فطری تذبذب کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب چلی آئی۔ اس کے ہاتھ سے حجاب نے روئی کا پھاہا پکڑا تو مرشد نے سر اٹھاتے ہوئے خوش گوار حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”یہ میں صاف کر دیتی ہوں۔“

”اچھا جی......یعنی میرے سر پر ڈاکٹری سیکھے گی تو۔“ مرشد نے مسکراتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی سر دوبارہ جھکا لیا۔

گندی سی نائیلون کی چپل میں سے جھلک دکھلاتے اس کے گورے گداز پاؤں مرشد کی آنکھوں کے عین نیچے تھے۔ اس کے سر کا زخمی حصہ دیکھتے ہی حجاب کے ہونٹوں سے بےاختیار ایک سسکی خارج ہو گئی۔

”مہربانی کر۔ اب یوں ڈرامت مجھے۔“

پتا نہیں مرشد نے اسے ٹوکا تھا یا احتجاج کیا تھا۔

”دو جگہ سے کھال پھٹی ہوئی ہے۔ سوجن بھی کافی ہے......گردن تک آ رہی ہے۔“

”یہ کارخانہ کسی تنازعے کی وجہ سے ڈیڑھ مہینے سے بند پڑا ہے ورنہ پھٹی ہوئی کھال پر ویلڈنگ کا ٹچ لگوا لیتا میں۔ ابھی مجبوری ہے بس تو خون اچھے سے صاف کر دے، اگر کر سکتی ہے تو۔“

حجاب کپکپاتے ہاتھوں سے زخم کے آس پاس سے بال ہٹاتے ہوئے روئی سے خون صاف کرنے لگی۔ مرشد کی بے پروائی اور بے فکری پر وہ حیران تھی۔ گردن سے اوپر کا حصہ اچھا خاصا متاثر تھا۔ وہ زخم صاف کرتے کرتے سوچ رہی تھی کہ اگر یہی چوٹیں اسے آئی ہوتیں تو شاید دو چار دن تک وہ سر اور گردن کو ٹھیک سے حرکت بھی نہ دے پاتی۔

”بڑی تگڑی قسم کی انا والی لڑکی ہے تو۔“

”وہ کیسے؟“ مرشد کی بات پر وہ متفسر ہوئی۔

”فوراً سر کا بدلہ چکانے جو اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔“

حجاب خاموش رہی۔ مرشد نے ٹیبل ٹٹول کر فرے میں سے پلاسٹک کی ڈبیا اٹھالی۔

”زخم صاف کر کے یہ پوڈر اوپر سے چھڑک دے۔“

حجاب نے سر کے بعد اس کی گردن سے بھی خون صاف کیا اور مرشد کی ہدایت کے مطابق وہ پوڈر زخموں پر چھڑک دیا۔

''ہوگیا۔'' وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔
''ٹھیک ہے جی...... بڑی مہربانی۔''
اس نے گردن کو دائیں بائیں حرکت دی۔ دو گولیاں لے کر منہ میں ڈالیں اور پانی پیتے ہوئے حجاب سے مخاطب ہوا جو دوبارہ اپنی جگہ پر جا بیٹھی تھی۔
''ابھی میں باہر بیٹھوں گا، تو ادھر صوفے پر کچھ دیر ستا لے، سردی محسوس ہو تو یہ کھیس بھی پڑا ہے۔'' اس نے دوسرے صوفے پر پڑے کھیس کی طرف اشارہ کیا۔
''باہر تو تیز بارش ہے۔''
''تو میں بارش میں بیٹھنے کا تو نہیں کہہ رہا...... تین چار گھنٹے اس دفتر سے باہر رہوں گا تاکہ تو اطمینان سے آرام کر سکے۔''
حجاب نے نظریں جھکالیں۔ مرشد نے اٹھتے ہوئے ٹیبل سے رائفل اٹھا کر کندھے کے ساتھ لٹکالی۔
''میں نہیں چاہتا تھا کہ ہماری وجہ سے پٹوڑا خان کے لیے کسی بھی قسم کی کوئی پریشانی یا مصیبت بنے۔ ویسے بھی اس چار دیواری کی نسبتاً یہ جگہ میری نظر میں بہتر ہے...... مغرب کے بعد جیسے ہی اندھیرا پھیلے گا ہم لوگ اس بستی سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔ تو فی الحال آرام کر...... بے فکر ہو کر...... سمجھ لے میں باہر ہی بیٹھا ہوں...... پہرے پر۔''
''میں ٹھیک ہوں آپ بے شک یہیں رہیں۔'' حجاب کی آواز پر مرشد دروازے کی طرف پلٹتے ہوئے رک گیا۔ پھر حجاب کی طرف دیکھ کر ہنس پڑا۔
''تیری شکل بتا رہی ہے کہ تو کتنی ٹھیک ہے۔ تھکاوٹ اور نیند کے ہاتھوں کہیں فیک گئی تو خواہ مخواہ ایسے میرے سر مدعا پڑ جائے گا۔ آرام کر تو۔''
مرشد پلٹ کر آفس سے باہر نکل آیا۔ اسے اندازہ تھا کہ اس کی موجودگی میں وہ آرام نہیں کر سکے گی۔ اسے خود بھی تنہائی چاہیے تھی۔ سوچنے سمجھنے اور آگے کی منصوبہ بندی کے لیے ضروری تھا ورنہ تو دھیان حجاب کی طرف ہی لگا رہتا۔ حالات و واقعات جیسے بھی تھے۔ حجاب کے ساتھ ہونے کا احساس اس کے باقی تمام احساسات اور خیالات پر حاوی تھا۔ رگ و پے میں ایک عجیب سی ترنگ جاگی ہوئی تھی۔

صبح اسے خیال آیا تھا کہ جیدے کے ذریعے لاہور اپنے ساتھیوں کو فون پر اطلاع کردے کہ میں کہاں پھنسا ہوا ہوں۔ مگر پھر اس نے ارادہ بدل دیا تھا۔ وہ ان لوگوں کو کسی بھی امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔
یہاں کارخانے میں پہنچتے ہی اس نے سب سے پہلے ٹیلی فون ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی مگر ناکامی ہوئی تھی۔ سب سے زیادہ فکر اسے اماں کی طرف سے تھی اور اس کے بعد ارشاد اور دلبر کی طرف سے...... ارشاد کی ران میں گولی لگی تھی اور موٹر سائیکل کے ایکسیڈنٹ کے وقت اس نے دلبر کی چیخ سنی تھی۔ اس کے بعد کچھ دیر کے لیے تو اس کے اپنے حواس بھی مختل ہو کر رہ گئے تھے پھر اس سے پہلے کہ وہ سنبھل پاتا دشمنوں نے اس پر غلبہ پالیا تھا۔ اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ دلبر کا انجام کیا ہوا۔ ابھی وہ کس حال میں ہوگا۔ کہیں ہوگا بھی یا......
مراد اور اکو پہلے ہی اچھے خاصے زخم کھانے کے بعد ڈاکٹر ظفر کے کلینک میں پڑے تھے۔
باہر موسم کے تیور ہنوز بگڑے ہوئے تھے۔ بارش پورے پاگل پن سے برس رہی تھی اور موسم کی یہ شدت انگیزی کافی حد تک ان کے حق میں ہی جاتی تھی۔
صبح ہنگامہ خیزی کے باعث وہ فجر کی نماز ادا نہیں کر پایا تھا۔ اب ظہر اور عصر کی نماز اس نے یہیں...... آفس کے باہر گیلری کے فرش پر ادا کی تھی۔ بارش وقفے وقفے سے جاری تھی۔ کبھی زور پکڑ جاتی اور کبھی معمولی بونداباندی کی صورت اختیار کر جاتی۔ اس دوران اس نے دو بار آفس میں جھانک کر دیکھا، حجاب سر تک کھیس اوڑھے تخت پر پڑی سو رہی تھی۔
آسمان پر چھائے ہوئے سیاہ بادل اس قدر گاڑھے تھے کہ مغرب کی اذان کے ساتھ ہی باہر گہرا اندھیرا محسوس ہونے لگا۔ تب ہی مرشد نے حجاب کو جگایا تھا۔ اسے جگانے کے بعد خود وہ گیلری میں نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ نماز کے ایک گھنٹے بعد یہاں سے نکل لیں گے لیکن بارش ایک بار پھر شروع ہو گئی تھی۔ مغرب کے بعد عشاء کی نماز بھی ان دونوں نے وہیں ادا کی۔ عشاء کی نماز کے بعد بارش تھمی تو مرشد کھیس کی بکل مارتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''چل حجاب خان! کھڑی ہو جا۔ حرکت میں آنے کا وقت آ گیا ہے۔'' دونوں آفس سے نکل کر واپس اسی طرف آ گئے جدھر سے اس کارخانے میں اترے تھے۔ حجاب تھوڑی سی پریشان تھی کہ جیسے تیسے وہ چھت سے اتر تو آئی تھی لیکن اب دوبارہ اوپر چڑھے گی کیسے؟ عقبی طرف پہنچ کر اس کی یہ پریشانی جاتی رہی۔ غسل خانے کی دیوار کے ساتھ لوہے کے چند صندوق اس ترتیب سے رکھے گئے تھے کہ چھت تک تین زینے بن گئے تھے جن کے ذریعے با آسانی چھت پر پہنچا جا سکتا تھا۔ یقیناً یہ انتظام مرشد ہی کا کیا ہوا تھا۔

پہلے مرشد چھت پر پہنچا پھر حجاب۔

''بستی سے نکلنے میں تھوڑی بہت دشواری کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ کسی بھی قدم پر دل نہیں چھوڑنا...... ٹھیک ہے؟'' مرشد مخاطب تو اس سے تھا مگر اس کی نظریں اطراف کی چھتوں پر سرسرا رہی تھیں۔

حجاب بس ''ٹھیک ہے'' کہہ کر خاموش ہو رہی۔

وہاں سے وہ کمرے کی چھت سے ہوتے ہوئے کارخانے کی وسیع چھت پر پہنچ گئے۔ بستی کے تقریباً تمام گھروں میں روشنیاں جل رہی تھیں لیکن فضا میں ایسی تاریکی پھیلی ہوئی تھی کہ کارخانے کی اس چھت پر کھڑے ان دونوں کو یہ روشنیاں ٹمٹماتے دیوں کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ مرشد آگے بڑھ کر چھت کی عقبی منڈیر کے قریب جا بیٹھا۔ وہ وہاں سے نیچے جھانک رہا تھا۔ حجاب اس کے برابر موجود تھی اسے کوشش کے باوجود نیچے تاریکی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا۔

''کیا ہم نے یہاں اترنا ہے؟''

''ہاں' یہ سارا قبرستان ہے اور یہ...... نیچے قبرستان کے احاطے کی دیوار ہے۔''

حجاب نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا لیکن اسے کوئی قبر نظر آئی نہ دیوار۔

''مجھے تو کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ یہ چھت بھی کافی اونچی ہے...... میں...... میں کیسے اتر سکوں گی؟'' وہ پریشان ہو گئی تھی۔

''کیسے اتر سکو گی، یہ مت سوچ۔ ایسی سوچ خوف اور پریشانی پیدا کرتی ہے۔ صرف اتنا سوچ کہ ہم نے یہاں سے اترنا ہے۔ دکھائی خود ہی دینے لگ جائے گا۔'' وہ ایک لمحے کے توقف سے پھر بولا۔

''میں یہاں سے نیچے دیوار پر اترتا ہوں۔ دیوار پر پہنچ کر میں کارخانے کی اسی دیوار کے ساتھ کمر لگا کر کھڑا ہو جاؤں گا۔ تو ادھر پیچھے...... کارخانے کی طرف منہ کرتے ہوئے اپنا دایاں پاؤں میرے دائیں کندھے پر رکھے گی۔ تیرے بائیں پاؤں کو میں بائیں ہاتھ سے سہارا دوں گا۔ اس کے بعد تو منڈیر سے دایاں ہاتھ نیچے مجھے تھمائے گی۔ اس سے آگے کا کام میرا۔''

''یہ تو بہت مشکل کام ہے۔ میں گر جاؤں گی۔'' وہ واقعی بری طرح پریشان ہو گئی تھی۔ اسے لگا تھا کہ مرشد اسے سرکس کے کسی کرتب کے متعلق سمجھا رہا ہے۔

''شاباشے...... اوئے! مرشد اتنا مرا ہوا نہیں ہے کہ تیرا پھول جیسا وزن نہ سنبھال سکے۔''

''نن...... نہیں یہ میں نہیں کر سکتی...... مجھ سے نہیں ہوگا یہ۔''

''فٹے منہ......'' مرشد نے بدمزگی سے برا سا منہ بنایا۔

''تو تو سوچنے سے بھی پہلے ہی شکست تسلیم کیے کھڑی ہے۔ ایک ذرا حوصلہ کر کے تسلی اور سنجیدگی سے سوچ تو سہی...... ڈنگر نا ہو تو!''

''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔ ڈرتے ڈرتے ہی اتر آنا۔''

اس نے حجاب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور ایک ہاتھ منڈیر سے ہٹا لیا۔ حجاب کا دل دھک سے رہ گیا۔ لیکن وہ کامیابی سے دیوار پر منتقل ہو چکا تھا۔

''چل حجاب! آ جا۔''

وہ دیوار سے پشت لگا کر کھڑا ہو گیا۔ حجاب کو وہ ہیولے کی صورت دکھائی دے رہا تھا۔ منڈیر سے اس کا سر تقریباً تین فٹ نیچے تھا۔

''منتر پڑھنا بند کر۔ نیچے آ۔'' وہ دبی دبی زبان میں بولا۔

''کوئی اور طریقہ نہیں ہو سکتا کیا؟'' وہ منمنائی تھی۔

''نہیں۔''

''مرشد جی......''

''اوئے ہوئے ...... تیرا یہ ''مرشد جی'' لے ڈوبے گا مرشد کو۔ جھلیے! ایک بدمعاش کو اتنی عزت نہ دیا کر بدمعاش خراب ہو جائے گا...... چل اب نیچے آ۔'' مرشد نے مصنوعی بے زاری سے کہا۔ وہ حجاب کے اترنے کا منتظر کھڑا تھا اور حجاب کا خوف کے مارے حلق خشک ہوا پڑا تھا۔

''اب کیا ساری رات یہی ڈرامہ جاری رہے گا؟'' مرشد کے لہجے میں نا گواری تھی۔

حجاب چار و نا چار کپکپاتے ہاتھ پیروں کے ساتھ اس کٹھن مرحلے کو سر کرنے کے لیے تیار ہو گئی۔ چادر کو سمیٹ کر اس نے کندھوں پر ڈالا اور خدا کو یاد کرتی ہوئی پیٹ کے بل گیلی اور یخ سرد منڈیر پر لٹک گئی۔ مرشد نیچے جم کر کھڑا ہو گیا۔ حجاب کا دایاں پاؤں اس نے خود تھام کر داہنے کندھے پر ٹکایا۔ حجاب کو لگا کہ اس کا پاؤں گوشت پوست کے وجود کے بجائے کسی ٹھوس اور سخت چیز پر جا ٹکا ہے۔ وہ ڈرتے ڈرتے منڈیر سے سرک کر تھوڑا مزید نیچے ہوئی تھی کہ مرشد کا چوڑا چکلا اور مضبوط ہاتھ اس کے بائیں گھٹنے کے عین نیچے کسی مضبوط شکنجے کی طرح آ جما۔

''دایاں ہاتھ ادھر مجھے پکڑا۔''

مرشد کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی مگر منڈیر چھوڑنے کا اسے حوصلہ نہیں ہوا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور سارا وجود ہولے ہولے لرز رہا تھا۔

''ہاتھ پکڑا مجھے۔''

مرشد نے گردن موڑ کر اوپر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ حجاب منڈیر سے چمٹی ہوئی تھی۔ اسے بے اختیار رونا آیا اور رونے کی آواز کو اس نے ہونٹ بھینچ کر روکا۔ اس کی گھٹی گھٹی ٹھنوں ٹھنوں کی آواز مرشد کے کان تک پہنچی تو وہ بے اختیار بولا۔

''اوئے...... اوئے! ایسی سچویشن میں ہنستے نہیں، توازن بگڑتا ہے اس سے...... چل دایاں ہاتھ پکڑا ادھر۔''

حجاب نے آنکھیں بند کرتے ہوئے دایاں ہاتھ منڈیر سے ہٹا کر آہستہ آہستہ نیچے جھکایا تو فوراً ہی مرشد نے اسے اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔

''یہ ہوئی نا بات چل اب منڈیر چھوڑ دے...... شاباش۔''

مرشد نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا اور اپنے گھٹنوں کو خم دیتے ہوئے آہستہ آہستہ نیچے بیٹھنے لگا۔ یہ خاصا مشکل اور خطرناک کام تھا۔ نیچے ایک اینٹ کی دیوار تھی اور اس دیوار پر مرشد نے آگے پیچھے رکھ کر پاؤں جما رکھے تھے حجاب ذرا بھی دائیں بائیں ڈگمگاتی تو مرشد کے لیے توازن برقرار رکھنا بہت مشکل ہو جاتا۔ وہ دونوں قبرستان کی اس چھ سات فٹ اونچی دیوار سے نیچے آ گرتے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔

مرشد کے نیچے سرکنے کی وجہ سے منڈیر پر سے حجاب کا ہاتھ بھی خود بخود نیچے سرک آیا تو اس نے قدرے جھکتے ہوئے فوراً اس ہاتھ سے مرشد کا سر تھام لیا۔ مرشد نے اسی طرح دیوار سے کمر لگائے لگائے حجاب کا بایاں پاؤں اپنی نصف خمیدہ ران پر لکا دیا۔ دوسرا پاؤں دو فٹ اوپر ہنوز مرشد کے کندھے پر دھرا تھا۔ حجاب کی قمیض اور چادر کا کچھ حصہ مرشد کے چہرے پر سرسراہا تھا۔ اس نے حجاب کی ٹانگ چھوڑتے ہوئے اپنے سر پر موجود اس کا ہاتھ تھام لیا دوسرا ہاتھ پہلے ہی اس کی گرفت میں تھا۔

''چل اب دایاں پاؤں نیچے دیوار پر ٹکا۔''

مرشد کی آواز پر حجاب نے دھیرے دھیرے پاؤں اس کے کندھے سے ہٹایا اور ڈرے ڈرے انداز میں پاؤں سے نیچے دیوار کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔ چند لمحوں کے لیے دونوں کے چہرے آمنے سامنے ہوئے۔ اس طرح کہ دونوں نے ہی ایک دوسرے کی گرم سانسوں کا لمس اپنے چہروں پر بکھرتا محسوس کیا۔ حجاب کی تو ویسے ہی جان پر بنی ہوئی تھی البتہ وہ چند لمحے مرشد کو بھی انتہائی جان لیوا محسوس ہوئے تھے۔

آئندہ چند ہی لمحوں میں حجاب دونوں پاؤں نیچے لٹکائے دیوار پر بیٹھی لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا دل سینے سے اچھل کر کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا ہے۔ مرشد دیوار سے کود کر قبرستان کے اندر اترا تو چپل کے اندر سے اس کے پاؤں بھی کیچڑ سے لتھڑ گئے۔ یہاں مرشد نے ایک بار پھر وہی عمل دوہرایا جو کل رات کے آخری پہر وہ رانا اور فوجی لوگوں والے ڈیرے سے فرار کے وقت سرانجام دے چکا تھا۔ اس نے اچانک ہاتھ بلند کرتے ہوئے حجاب کی نرم و گداز کمر کو تھاما اور اسے

دیوار سے کھینچ کر نیچے کھڑا کر دیا۔ اس کی اس اچانک کارروائی پر حجاب کے پورے وجود میں ایک سنسناہٹ سی دوڑ گئی تھی۔

''چل آ جا۔''

وہ حجاب کا ہاتھ پکڑتے ہوئے دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ وہ پوری طرح چوکنا تھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ ہو نہ ہو دشمن بستی سے باہر جانے والے تمام راستوں کو نظر میں رکھے ہوئے ہوں گے۔ پولیس کی موجودگی بھی بعید از قیاس نہیں تھی۔

دن بھر ہونے والی بارش نے قبرستان کی زمین کو دلدل جیسی کیچڑ میں تبدیل کر رکھا تھا۔ دونوں کے پاؤں اس کیچڑ میں دھنس دھنس جا رہے تھے اور انہیں آگے بڑھنے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ پیر جوتیوں میں پھسل رہے تھے اور جوتیاں پیروں سے پھسل رہی تھیں۔ ایک جگہ تو حجاب پھسل کر گرنے لگی تھی کہ مرشد نے فوراً اسے سنبھال لیا۔

''اتنی بے صبری کیوں دکھا رہی ہے۔ آرام سے چل۔''

''جوتی پھسل رہی ہے۔''

''دھیان سے، جوتی پیروں میں ہی رہے۔ ادھر سے نکل کر پاؤں کہیں دھو لیں گے۔''

''ہم ادھر کدھر جا رہے ہیں؟''

''ابھی تو پتا نہیں لیکن..... جدھر سے یہ گاڑیوں کی آوازیں آ رہی ہیں، ادھر پہنچنا ہے ہم نے۔''

تقریباً سو قدم دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے رہنے کے بعد مرشد نے رخ بدلا اور قبرستان کی اندرونی طرف کو چل پڑا۔ چاروں طرف بے شمار کچی پکی قبریں بکھری ہوئی تھیں۔ یعنی وہاں چاروں طرف زمین کے اندر بے شمار لاشیں موجود تھیں۔ بہت سارے مردے، بہت سارے ڈھانچے۔

حجاب سہمی سہمی سی چل رہی تھی۔ مرشد کا ساتھ اسے چلتے رہنے کا حوصلہ بخش رہا تھا ورنہ اس قدر اندھیرے میں قبرستان کے اندر لڑکھڑاتے ڈگمگاتے ہوئے آگے بڑھتے رہنے کا اس میں تو یارا نہیں تھا۔

جگہ جگہ موجود خود رو جھاڑیاں اور جنگلی کیکروں کے درخت ماحول کی پراسراریت اور خوف ناکی میں مزید اضافے کا باعث بنے ہوئے تھے۔

چلتے چلتے اچانک ایک جگہ پاؤں رکھتے ہی حجاب کے وجود کو زور کا دھچکا لگا اور بے ساختہ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس کی بائیں ٹانگ پنڈلی تک ایک قبر کے اندر دھنس گئی تھی مرشد نے اس کا ہاتھ نہ تھام رکھا ہوتا تو وہ بری طرح گر پڑی ہوتی۔

''ایک تو تو کسی کھوتے کے کھر کی بات نہیں سنتی مانتی۔ کہا بھی ہے کہ زیادہ بے صبری نہ دکھا، پھر بھی۔''

''اس میں میرا کیا قصور ہے۔''

وہ بے چارگی سے بولی اور مرشد کا سہارا لیتے ہوئے ٹانگ اس نے کھینچ کر قبر سے باہر نکال لی۔

''چوٹ تو نہیں آئی؟''

مرشد کی آواز میں اسے اپنے لیے فکر مندی محسوس ہوئی تھی۔

''نہیں۔''

''دھیان سے چل ذرا۔''

ایک بار پھر وہ آگے بڑھنے لگے۔ سامنے چند قدم کے فاصلے پر ایک برگد کا پیڑ تھا اور اس پیڑ کے نیچے ایک جھگی کا ہیولہ سا محسوس ہو رہا تھا۔ شاید کسی ملنگ نے یہاں ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ مرشد کا ارادہ وہاں سے خاموشی سے گزر جانے کا تھا لیکن بالکل اچانک اس جھگی کے اندر سے دو ہیولے تڑپ کر باہر نکلے اور ایک طاقت ور ٹارچ کی روشنی نے ان کی آنکھیں چندھیا کر رکھ دیں۔ ساتھ ہی ایک بھاری تحکمانہ آواز مرشد کے کانوں سے ٹکرائی۔

''بس اوئے! اپنی جگہ سے ہلنا نہیں ورنہ سینہ چھانی کر دوں گا۔''

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

